ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(دوم)



ثروت صولت

ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(دوم)

ثروت صولت

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

نام کتاب: ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (دوم)
مصنف: ثروت صولت
اشاعت: دسمبر 2014ء
ایڈیشن: 10
تعداد: 600
قیمت: -/480 روپے
مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

اہتمام:
عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-35417074, 35417071
فیکس: 042-35417072
موبائل: 0300-8485030
ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk
ای میل: islamicpak@yahoo.com

فہرست عنوانات

فہرست نقشہ جات وتصاویر صفحہ نمبر ۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مقدمہ

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ نئی ترتیب کے ساتھ پیش خدمت ہے اور جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ اشاعت پہلی اشاعتوں سے بہت مختلف ہے اس مرتبہ میں نے پوری تاریخ پر نظر ثانی کی ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ پوری تاریخ از سرنو لکھی ہے اور اس کی حیثیت بڑی حد تک ایک نئی کتاب کی ہوگئی ہے۔ اب اس تاریخ کا حصہ اول حجم کے لحاظ سے پہلے کے مقابلے میں دوگنا اور دوسرا حصہ اس سے بھی زیادہ ضخیم ہوگیا ہے۔ پہلے میرا ارادہ ایک مفصل تاریخ اسلام لکھنے کا تھا، لیکن کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کی وجہ سے اس کی تکمیل ممکن نظر نہیں آ رہی۔ ایسی صورت میں قارئین سے اشاعت اول کے مقدمہ میں مفصل تاریخ لکھنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے ایفا کی یہی صورت نظر آئی کہ مختصر تاریخ کو کسی قدر مفصل کر دیا جائے تا کہ تاریخ اسلام کا طالب علم تشنگی بھی محسوس نہ کرے اور اہم واقعات اور مسائل بھی نظر انداز نہ ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر ان اہم واقعات کو جو پہلی اشاعت میں بہت مختصر تھے نئی اشاعت میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ متعدد نئے مباحث کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کے مختصر حجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے تاریخ اسلام کا کوئی دَور اور اسلامی دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ رہے جس کی تاریخ نئے ایڈیشن میں پیش نہ کی گئی ہو۔

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے دوسرے حصے کی ترتیب میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پہلے اس حصے میں کل ۲۸ باب تھے اب ان کی تعداد ۳۶ ہوگئی ہے۔ اس حصے میں یہ ملک کی تاریخ اُس سال تک پہنچا کر ختم کر دی گئی ہے۔ جس سال اس ملک پر غیر مسلم طاقتوں کا اقتدار قائم ہوا یا جس سال قدیم دور ختم ہو کر جدید دور کا آغاز ہوا۔ مثال کے طور پر الجزائر کی تاریخ ۱۸۳۰ء پر، اسلامی

ہند کی تاریخ ۱۸۵۷ء پر، انڈونیشیا کی تاریخ ۱۸۷۴ء پر، مشرقی ترکستان کی تاریخ ۱۸۷۶ء پر، تونس کی تاریخ ۱۸۸۱ء پر، مشرقی افریقہ کی تاریخ ۱۸۸۹ء پر، مغربی افریقہ کی تاریخ ۱۹۰۲ء پر، مراکش کی تاریخ ۱۹۱۲ء پر اور ترکی کی تاریخ ۱۹۲۴ء پر جبکہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، ختم کی گئی ہے۔

ملت اسلامیہ کی تاریخ کے تیسرے حصے میں اسلامی دنیا کے دورِ جدید کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس حصے میں ہر اسلامی ملک کی آزادی کی جدوجہد، آزادی کے بعد تعمیر و ترقی کا حال اور جدید نظریاتی کشمکش کی داستان پیش کرنے کے علاوہ علمی و ادبی ترقی پر بھی ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ آبادی، رقبہ، زرعی اور صنعتی پیداوار سے متعلق اعداد و شمار اس حصے کی ایک بڑی خصوصیت ہیں۔

ہماری تاریخ کے اس نئے ایڈیشن میں تاریخ کے مختلف ادوار کے تجزیہ اور تحلیل کے علاوہ اسلامی دنیا کے اسباب زوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو پہلے ایڈیشن میں بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس نئے ایڈیشن میں نظریاتی نقطۂ نظر سے کتاب کو زیادہ سے زیادہ جاندار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکمران خاندانوں کے شجروں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر سنہ ہجری اور سنہ عیسوی دونوں دیئے جائیں، اہم واقعات کی فہرست زیادہ مکمل اور مفصل کر دی گئی ہے اور آخر میں اہم اشخاص، مقامات اور اصطلاحات کے انگریزی مترادفات کی ایک فہرست کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ فہرست ان حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ جو انگریزی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے وقت صحیح ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

تعارف مصنف

اس کتاب کے مؤلف ثروت صولت ایک مسلمان ادیب ہیں اور تاریخ اسلام اور اسلامی دنیا کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اردو اور انگریزی میں اب تک ایک سو پچیس سے زیادہ مضامین لکھ چکے ہیں۔ جو پاکستان میں ممتاز روزناموں اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی مضامین پر انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

اَب تک ثروت صولت کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ (۱) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ'' (تین حصے) (۲) ''تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ جو'' محمد بن قاسم سے مولانا مودودی تک'' پاکستان کے ۳۹ مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے۔ (۳) The Life of the Prophet (۴) بدیع الزمان سعید نورسی (۵) ''مولانا مودودی کی تقاریر'' سات سو سے زیادہ تقریروں اور بیانات کا مجموعہ' جو گیارہ جلدوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔

ثروت صولت آج کل اسلامی تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کر رہے ہیں۔ آپ ترکی زبان سے بھی واقف ہیں اور ترکی مآخذ کی مدد سے ''ترکی ادب کی تاریخ'' مرتب کر رہے ہیں۔

آپ کی تحریر میں سلاست اور روانی ہے۔ مستند واقعات دلچسپ انداز میں پیش کرنا آپ کی خصوصیت ہے۔ نقطۂ نظر اسلامی ہے۔

ان تبدیلیوں اور اضافوں کے بعد ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے اس نئے ایڈیشن نے ایک ایسی مکمل اور جامع اسلامی تاریخ کی شکل اختیار کر لی ہے جس کی مثال میری معلومات کی حد تک کسی زبان میں موجود نہیں۔ ان تمام تبدیلیوں کے باوجود کتاب کی زبان حسب دستور آسان اور اندازِ بیان حسب سابق دلچسپ اور عام فہم رکھا گیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ قوی اُمید ہے کہ اِن اضافوں کے بعد ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ قارئین کے لیے پہلے سے زیادہ دلچسپ، مفید اور معلومات افزا ثابت ہوگی۔

مصنف کا تعارف
مصنف کے قلم سے

مسلمانوں کے عروج کا دُوسرا دَور

(۱)

(۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ تا ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ)

[آغاز اسلام سے ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ تک ایک ہزار سال کا زمانہ دنیا میں مسلمانوں کے عروج کا دَور ہے۔ اس دَور کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) آغاز اسلام سے ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ میں سقوط بغداد تک کا زمانہ جس کی تاریخ اس کتاب کے پہلے حصے میں پیش کی جا چکی ہے۔

(۲) ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ سے ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ تک کا زمانہ، جس سے موجودہ جلد میں بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے اس دوسرے دَور کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ سے ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تک کا زمانہ۔ یہ اسلامی تاریخ کا عبوری دَور ہے۔ جس میں عروج کے پہلے دَور کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں اور آنے والے دَور کی خصوصیات بھی۔ اس دَور میں مغرب مسلمانوں کے ہم پلہ ہو گیا۔ اس زمانہ میں سیاسی میدان میں نہ سہی علمی اور تمدنی میدانوں میں مسلمانوں کی یورپ پر برتری بتدریج ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ اس دَور کے آخر میں قرون وسطیٰ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ سے ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ میں اورنگ زیب کی وفات تک کا زمانہ' اس دَور میں اگرچہ مسلمانوں کو مغرب پر سیاسی برتری حاصل رہی لیکن علمی، تمدنی اور سماجی امور میں یورپ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ زمانہ عالمی تاریخ کے دَور جدید سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا سیاسی زوال بھی شروع ہو جاتا ہے۔

باب ۱

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

۱۲۵۸ء/ ۶۵۶ھ میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اسلامی تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے۔ سقوط بغداد کے ساتھ اسلامی تاریخ کے عروج کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دوسرا دَور بھی مسلمانوں کے عروج ہی کا دَور ہے اگرچہ یہ پہلے دَور کے برابر روشن اور تابناک نہیں، لیکن بعض حیثیتوں سے پہلے دَور سے کم شاندار بھی نہیں۔

چنگیز خاں اور اس کے جانشین

چنگیز خاں ترکستان، افغانستان اور شمالی ایران کو فتح کرنے اور وہاں کے شہروں کو تباہ و برباد کر دینے کے بعد ۱۲۲۳ء/ ۶۲۰ھ میں منگولیا واپس چلا گیا جہاں ۱۲۲۷ء/ ۶۲۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ چنگیز اگرچہ منگولیا کے غیر مہذب اور جاہل خانہ بدوشوں کے درمیان پیدا ہوا تھا، لیکن فوجی اور انتظامی معاملات میں وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ فوجی صلاحیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے چین اور خوارزم جیسی مضبوط اور طاقتور حکومتوں کی فوجوں کو شکست دی اور انتظامی صلاحیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی حکومت قائم کر دی جس کو اس کے جانشینوں نے چند سالوں میں دنیا کی سب سے وسیع سلطنت بنا دیا۔ یہ سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں چین سے وسط یورپ تک پھیلی ہوئی تھی اور تاریخ میں اُس وقت تک کوئی قوم اتنی وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ منگولوں کی یہ سلطنت بنوامیہ کے دَور میں عربوں کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ چنگیز خاں نے اپنی قوم کو ایک قانون بھی دیا جو تورۂ چنگیزی کہلاتا تھا اور جس پر منگول صدیوں عمل کرتے رہے۔

منگول اپنے ابتدائی دَور میں جمہوری روایات پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان روایات میں سے ایک یہ تھی جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تھا تو تمام منگول سرداروں اور امیروں کا ایک اجتماع کیا جاتا تھا جس کو ترکی اور منگولی زبان میں قورلتائی کہا جاتا ہے، اور اس اجتماع میں

سب کے مشورے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جاتا تھا۔ تخت نشینی کا مسئلہ بھی قورلتائی میں طے کیا جاتا تھا۔ منگولوں میں بادشاہت موروثی تھی یعنی یہ کہ باپ کے بعد اس کی اولاد حکمران ہوتی تھی، لیکن یہ فیصلہ کہ اولاد میں سے کس کو بادشاہ منتخب کیا جائے، قورلتائی کرتی تھی۔ منگول بادشاہ خان یا قاآن کہلاتا تھا۔ قراقرم جس کے کھنڈر منگولیا کے موجودہ دارالحکومت کے قریب پائے جاتے ہیں منگول سلطنت کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں حسب ذیل منگول حکمران تخت نشین ہوئے۔

(۱) چنگیز خاں ۱۲۰۶ء / ۶۰۳ھ تا ۱۲۲۷ء / ۶۲۴ھ

(۲) اوگدائی خاں ۱۲۲۹ء / ۶۲۶ھ تا ۱۲۴۱ء / ۶۳۹ھ (چنگیز کا بیٹا تھا)

(۳) گیوک خاں ۱۲۴۶ء / ۶۴۴ھ تا ۱۲۴۸ء / ۶۴۶ھ (اوگدائی کا بیٹا تھا)

(۴) مونگو خاں ۱۲۵۱ء / ۶۴۹ھ تا ۱۲۵۹ء / ۶۵۷ھ (چنگیز کے دوسرے بیٹے تولی خاں کا بیٹا تھا)

اس فہرست میں ایک حکمران کی وفات اور دوسرے کی تخت نشینی کے درمیان جو وقفہ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو اس دوران میں تخت نشینی کے لیے لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں یا قورلتائی میں شامل ہونے کے لیے وسیع سلطنت کے ہر حصے سے منگول امراء کے قراقرم میں جمع ہونے میں ایک ایک دو دو سال صرف ہو جاتے تھے۔ اوگدائی کے بعد اس کا بیٹا گیوک کم سن تھا اس لیے ۱۲۴۱ء / ۶۳۹ھ سے ۱۲۴۶ء / ۶۴۴ھ تک اوگدائی کی بیوی نے قائم مقام حکمران کے فرائض انجام دیئے۔

چنگیز خاں اپنی وسیع و عریض سلطنت کو مرنے سے پہلے اپنے چار بیٹوں میں اس طرح تقسیم کر گیا تھا:

(۱) سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو منگولیا اور بیشتر فوج ملی۔

(۲) سب سے بڑے بیٹے جوجی کو سائبیریا میں دریائے ارتش سے مغرب کی طرف وہ سارا علاقہ جو جنوبی روس تک پھیلا ہوا ہے۔

(۳) چغتائی کو ترکستان اور ماوراء النہر کا علاقہ۔

(۴) اور اوگدائی کو مغربی منگولیا۔

جب اوگدائی خان منتخب ہو گیا تو وہ قراقرم چلا گیا۔ اس کے دوسرے بھائی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار تھے، لیکن قراقرم کے خان کی بالادستی کو سب تسلیم کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کا اقتدار کمزور ہوتا چلا گیا اور منگول سلطنت جلد ہی حسب ذیل چار حکومتوں میں

تقسیم ہوگئی:

(۱) چین کی ''یوان'' بادشاہت ۱۲۵۹ء/۶۵۷ھ تا ۱۳۶۸ء/۷۷۰ھ

(۲) قپچاق میں آلتین اوردہ خاندان کی بادشاہت ۱۲۳۷ء/۶۳۵ھ تا ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ

(۳) ترکستان میں چغتائی خاندان کی بادشاہت ۱۲۲۷ء/۶۲۴ھ تا ۱۳۶۹ء/۷۷۱ھ

(۴) ایران میں ایل خانی بادشاہت ۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ تا ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ

چین میں اسلام

ان میں پہلی حکومت کا بانی قولی خاں کا لڑکا قوبلا خاں (۱۲۶۰ء تا ۱۲۹۴ء) تھا، دوسری کا بانی جوجی خاں کا لڑکا باتو خاں تھا، تیسری حکومت کا بانی چنگیز خاں کا لڑکا چغتائی خاں تھا اور چوتھی حکومت کا بانی قولی خاں کا دوسرا لڑکا ہلاکو خاں تھا۔ یہ حکومتیں اگرچہ آزاد تھیں لیکن مونگو خاں کے دور تک مرکزی حکومت کی بالادستی تسلیم کرتی تھیں۔ ان میں سے چین کی یوان حکومت جسے قوبلا خاں نے قائم کیا تھا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ قوبلا خاں نے بدھ مت قبول کر لیا تھا اور چین میں آباد ہونے والے منگولوں نے بدھ مت کے ساتھ چینی تہذیب اور ثقافت کو اختیار کر لیا تھا۔ ایک بات جو اس ضمن میں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ چین کے منگول دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوسکے، لیکن ان کی حکومت پر اسلام اور مسلمانوں کا اچھا خاصہ اثر تھا۔ ان مسلمانوں کی وجہ سے جن کا تعلق ترکستان اور ایران سے تھا چین میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ ان مسلمان عہدیداروں میں غالباً سب سے اہم شخصیت شمس الدین عمر (۱۲۱۰ء تا ۱۲۷۹ء) کی ہے جو سید اجل کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے چینی حکومت کے مالی نظام کی اصلاح کی۔ آخر وہ صوبہ یونن (برما سے متصل) کے گورنر ہوگئے جہاں انہوں نے دو مسجدیں تعمیر کرائیں جو جلد ہی صوبہ میں اسلام کا مرکز بن گئیں۔ چین کے نظام مالیات کی اصلاح میں امیر احمد بناکتی کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ وہ سید اجل کے جانشین تھے اور انہوں نے ۱۲۷۶ء سے ۱۲۸۲ء تک کاغذ کے نوٹوں کے اجراء کے سلسلے میں مفید اصلاحات کیں۔ منگول دور کے ایک اور ممتاز مسلمان امیر محمود یلاوش ہیں انہوں نے ۱۲۳۸ء سے ۱۲۵۴ء تک کیپلنگ کے گورنر رہے۔

چین میں فوجی امور میں بھی مسلمانوں سے مدد لی جاتی تھی، بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بارود کی

ایجاد جس کا سہرا بعض مورخ چین کے سر باندھتے ہیں۔ اصل میں ان مسلمانوں کی ایجاد ہے جو چین کی منگول فوج میں ملازم تھے۔ قوبلا خاں کے زمانے میں آتشیں اسلحہ کے اس دستے کا سردار ایک ترک جنرل علی یحییٰ اُویغوری تھا جس نے ۱۲۶۸ء اور ۱۲۷۳ء کے درمیان سیانگ یانگ فو اور خان چینگ کے محاصروں میں توپوں کا استعمال کیا تھا۔ جس شخص نے یہ بندوقیں اور توپیں جنرل علی یحییٰ کو بنا کر دی تھیں وہ بھی اسمٰعیل نامی [1] ایک مسلمان تھا۔

چین [2] اور منگولیا کی حدود کے باہر باقی سلطنت میں منگولوں پر اسلام کا زیادہ گہرا اثر پڑا۔ یہ تمام علاقے یعنی ترکستان، ماوراء النہر، ایران اور دریائے والگا کی وادی اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز تھے۔ جو منگول ان خطوں میں آباد ہوئے انہوں نے جلد ہی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کو اختیار کر لیا۔ حکومت چلانے کے لیے بھی وہ مسلمانوں کی مدد کے محتاج تھے اس لیے ان ملکوں میں صوبہ داروں کے علاوہ وزیر تک مسلمان ہوتے تھے۔

مملکت چغتائی

مملکت چغتائی میں جو ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں پر مشتمل تھی سب سے پہلے جس منگول حکمران نے اسلام قبول کیا وہ چغتائی خاں کا پڑپوتا براق خاں (۱۲۶۶ء تا ۱۲۷۰ء) تھا۔ اس نے بادشاہ ہونے سے دو سال بعد اسلام قبول کیا اور غیاث الدین نام رکھا۔ اس کے بعد جو منگول حکمراں ہوئے وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، لیکن خان طرما شرین (۱۳۲۴ء تا ۱۳۲۶ء) پہلا مسلمان حکمراں ہے جس کے بعد چغتائی خاندان ہمیشہ کے لیے مسلمان ہو گیا۔ طرما شرین کا اسلامی نام علاء الدین تھا۔ اس کے جانشین قازان خاں (۱۳۴۳ء تا ۱۳۴۶ء) کے زمانے میں چغتائیوں میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی اور تغلق تیمور (۱۳۴۷ء تا

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے بدر الدین چینی کی کتاب ''چین و عرب کے تعلقات'' ص ۳۶۵ تا ص ۳۷۱ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۴۹ء نیز ولیم لینگر کی انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری (انگریزی) ص ۳۴۵۔۳۴۶۔

(۲) اس جگہ چین کے ممتاز ترین امیر البحر ماچنگ ہو کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، یہ ایک مسلمان خواجہ سرا تھا جس نے مِنگ خاندان کے زمانے میں ۱۴۰۵ء اور ۱۴۳۳ء کے علاوہ سری لنکا اور عرب کے جنوبی ساحل تک چھاپے مارے۔ (ولیم۔ ایل لینگر صفحہ ۳۴۷)

۱۳۶۳ء) کے زمانے تک چغتائی مملکت کے تمام منگول مسلمان ہو چکے تھے۔ اس مملکت کی عام زبان چونکہ ترکی تھی اس لیے منگولوں نے اسلام کے ساتھ ترکی زبان کو بھی اپنا لیا اور اس میل جول کے نتیجے میں ایک نئی ادبی ترکی نے جنم لیا جو چغتائی ترکی کہلاتی ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی میں ہندوستان پر جن منگولوں نے حملے کیے وہ زیادہ تر چغتائی منگول تھے۔

قبچاق روس کے منگولوں اور ایران کے ایل خانی منگولوں نے بھی اسلام قبول کرنے میں دیر نہیں کی اور اس طرح چنگیز خاں کے حملے کے ایک سو سال کے اندر وہ لوگ جنھوں نے اسلامی دنیا کے بڑے حصے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اب خود اسلام کے محافظ اور پاسباں بن گئے۔ [1]

---

(۱) منگولوں میں اسلام کی اشاعت کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ذیل کی کتابیں مطالعہ کیجئے: (۱) تاریخ اشاعت اسلام از ڈاکٹر آرنلڈ (۲) تاریخ دعوت وعزیمت ابوالحسن علی ندوی حصہ اول اور (۳)

3. V.V.Barthold "Four Studies on the History of Central Asia". London 1956.

اہم واقعات

برصغیر پاک وہند پر منگولوں کے حملے

۱۲۲۱ء/۶۱۸ھ جلال الدین خوارزم شاہ کا پاکستان میں داخلہ اور چنگیز خاں کا دریائے سندھ تک آنا اور دس ہزار ہندو قیدیوں کو قتل کرنا۔

۱۲۴۱ء/۶۳۹ء (۱۷/ جمادی الآخر مطابق ماہ دسمبر) لاہور پر منگولوں کا حملہ اور شہر کی تباہی۔ لاہور ایسا تباہ ہوا کہ ایک طویل مدت کے لیے گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔

۱۲۴۵ء/۶۴۳ھ جہلم کے راجہ کی سازش سے منگولوں کا پنجاب پر حملہ۔

۱۲۵۰ء/۶۴۸ھ ماہ شوال میں منگولوں کا ملتان پر حملہ اور شکست۔ شیر خاں کا ملتان کا صوبے دار مقرر ہونا۔

۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ شیر خاں نے منگولوں کو شکست دی اور غزنی تک تعاقب کیا۔

۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ ماہ صفر میں ہلاکو خاں کے سفیر کا ناصر الدین محمود کے دربار میں آنا۔

۱۲۸۵ء/۶۸۳ھ ہرات اور قندھار کے گورنر تیمور خاں کی قیادت میں پنجاب پر منگولوں کا حملہ۔ بلبن کا لڑکا سلطان محمد جو شیر خاں کی وفات کے بعد ۱۲۶۸ء سے ملتان کا صوبے دار تھا، حملہ میں شہید ہو گیا۔

۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ میں عبداللہ کی قیادت میں حملہ، جلال الدین خلجی نے سنام (مشرقی پنجاب) کے پاس شکست دی۔ بہت سے منگول مسلمان ہو گئے۔

۱۲۹۶ء/۶۹۶ھ ظفر خاں نے جالندھر کے پاس دوا خاں منگول کو شکست دی۔

۱۲۹۹ء/۶۹۸ھ قتلق خواجہ نے دو لاکھ منگولوں کے ساتھ حملہ کیا اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ علاء الدین خلجی اور ظفر خاں نے شکست دی۔ ظفر خاں تعاقب کے دوران شہید ہو گیا۔

۱۳۰۳ء/۷۰۳ھ ترغی منگول نے دو ماہ تک دہلی کا محاصرہ جاری رکھا پھر خود ہی واپس چلا گیا۔

۱۳۰۴ء/۷۰۴ھ علی بیگ اور ترپال خواجہ ہمالیہ کے دامن کے ساتھ ساتھ چل کر اچانک روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہوئے، غازی ملک (غیاث الدین تغلق) نے امروہہ کے پاس شکست دی۔

۱۳۰۵ء/۷۰۵ھ گنگ نامی منگول نے علی بیگ کا انتقام لینے کے لیے حملہ کیا۔ غازی ملک نے دریائے سندھ کے کنارے شکست دی۔

باب ۲

دریائے والگا کی وادی

(۹۲۰ء/۳۰۸ھ تا ۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ)

(۱) مملکتِ بُلغار

(۹۲۰ء/۳۰۸ھ تا ۱۲۳۷ء/۶۳۴ھ)

خزر

دریائے والگا کی وادی عہد قدیم سے ترک قبائل کا مسکن رہی ہے۔ ان ہی میں ایک قبیلہ خزر تھا جس نے ۶۵۰ء اور ۹۶۵ء کے درمیان خوارزم سے لے کر بحیرۂ اسود کے شمالی کناروں تک ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔ جنوب میں اس سلطنت کی حدود قفقاز کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ حکمران خاقان کہلاتا تھا اور اس کا دارالحکومت دریائے والگا کے کنارے موجودہ استرا خان کے شمال میں واقع تھا۔ بحیرۂ کیسپین اسی ترک قبیلہ کے نام پر بحیرہ خزر کہلاتا ہے۔

خزر قبائل بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں آرمینہ کے عیسائیوں اور بازنطینی سلطنت کے تعاون سے قفقاز کے راستے اسلامی مملکت پر حملے کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات عراق کی شمالی سرحد تک بڑھ آتے تھے۔ کبھی مسلمان قفقاز کے پہاڑوں کو پار کر کے خزر کے دارالحکومت تک پہنچ جاتے تھے۔ مسلمانوں سے اس تعلق کے نتیجے میں خزر اسلام سے آشنا ہو گئے اور ان کے ایک حکمران نے اموی حکمران ہشام کے زمانہ میں اسلام بھی قبول کر لیا تھا، اگرچہ بعد میں وہ مرتد ہو گیا۔ نویں صدی کے آخر میں خزر کے دارالحکومت آتل میں بیس ہزار مسلمان اور تیس مسجدیں موجود تھیں۔ خزر کے حکمران کا باڈی گارڈ دستہ پورا کا پورا خوارزم کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔

بُلغار

خزر کے زوال کے بعد وادیٔ والگا میں اسلام اور تیزی سے پھیلنے لگا۔ اسلام کی اس تیز رفتار ترقی میں قبیلہ بُلغار کا حصہ بہت نمایاں تھا۔ یہ بھی خزر کی طرح ترکی النسل قبیلوں پر مشتمل ایک قوم

تھی جس کا مرکز آتل سے کافی دور شمال میں اس مقام پر تھا جہاں اب روس کا شہر کازان واقع ہے۔ دارالحکومت کا نام بھی بلغار تھا۔ بلغار کے حکمران نے (جیسا کہ ہم اس تاریخ کے پہلے حصے میں بتا چکے ہیں) عباسی خلیفہ مقتدر باللہ (۹۰۸ء/۲۹۵ھ تا ۹۳۲ء/۳۲۵ھ) کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا اور اس کے بعد سارے بلغار قبائل مسلمان ہو گئے۔ بلغار کا حکمران اسلام قبول کرنے سے پہلے یلطاور کہلاتا تھا، مسلمان ہونے کے بعد امیر کہلانے لگا۔ اس حکمران کا نام الماس بن سلکی تھا، مسلمان ہونے کے بعد اس نے جعفر بن عبداللہ نام رکھ لیا۔ شروع میں بلغار کی حکومت خزر کی باجگذار تھی، لیکن مسلمان ہونے کے بعد خزر کا اثر کم ہو گیا اور ۹۶۵ء میں خزر کی حکومت ختم ہونے کے بعد بالکل آزاد ہو گئی۔ بلغار کی یہ مملکت جو دریائے والگا کی وادی میں پہلی مسلم مملکت تھی ۱۲۳۷ء/ ۶۳۴ھ میں منگولوں کے حملے تک قائم رہی۔ بلغار کے مسلمان بڑے پُرجوش مسلمان تھے اور ان کی کوششوں سے روس کے دوسرے علاقوں میں بھی اسلام پھیل گیا۔ اہل بلغار جہاد کے بہت دلدادہ تھے اور ان کی فوج بیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ ان کی لڑائیاں زیادہ تر روسیوں سے ہوتی تھیں جو خزر کے زوال کے بعد طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔

اسلام لانے سے پہلے بلغار کے لوگ خانہ بدوش تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد شہری زندگی اختیار کرنا شروع کر دی۔ شہر بلغار جسے مغربی مورخین بلغار عظمیٰ لکھتے ہیں۔ قدیم روس کے ان چند شہروں میں سے تھا جن کو ہم بجا طور پر سرزمین روس میں تہذیب کا گہوارا کہہ سکتے ہیں۔ شہر کے گرد چھ میل کی فصیل تھی اور آبادی پچاس ہزار۔

بلغار کی یہ مسلم مملکت ۱۲۳۷ء میں منگولوں کے حملے تک قائم رہی۔ اگرچہ فوجی میدان میں بلغار کے مسلمان منگولوں سے مغلوب ہو گئے لیکن دینی، معاشرتی اور ثقافتی میدانوں میں انہوں نے جلد ہی منگولوں پر فتح حاصل کر لی۔ منگولوں کے باجگذار کی حیثیت سے بلغار کا وجود ۱۳۹۱ء تک قائم رہا۔ آخری حکمران عبداللہ کو اس سال تیمور نے قتل کرا دیا۔[1]

(۱) ڈاکٹر اقدس نعمت کرات: بحیرۂ اسود کے شمال میں ترک قبائل اور حکومتیں (ترکی زبان) انقرہ ۱۹۷۲ء

(۲) سرائے کی سلطنت

(۱۲۳۷ء/۶۳۴ھ تا ۱۵۰۲ء/۹۰۷ھ)

ترکستان اور ماوراء النہر اگرچہ اسلامی تہذیب کے سب سے بڑے اور قدیم مرکز تھے اور دریائے والگا کی وادی اسلام کے ان تہذیبی مرکزوں سے بہت دُور تھی، لیکن منگولوں کو اسلام نے جس خطے میں سب سے پہلے متاثر کیا وہ یہی وادی ہے۔ حکمران کی حیثیت سے بھی اور عام سطح پر بھی والگا کی وادی میں آباد منگولوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں اسلام کو جلدی قبول کیا۔

یہ علاقہ جو چنگیز خاں نے اپنے لڑکے جوجی خاں کو دیا تھا قدیم زمانہ میں دشتِ قپچاق کہلاتا تھا۔ اور سائبیریا کے دریائے اِرتش سے بحیرۂ اسود کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ جوجی خاں کا باپ سے چھ ماہ پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا، اس لیے یہاں کی حکومت جوجی خان کے لڑکے باتو خاں کو ملی۔ باتو خاں ۱۲۳۶ء میں تین لاکھ فوج لے کر اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے بلغار کی مملکت فتح کی (۱۲۳۷ء) اس کے بعد روس کو فتح کیا جو اس زمانہ میں چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم تھا۔ ۱۲۴۰ء میں شہر کیو پر قبضہ کرنے کے بعد جو اس وقت روس کا سب سے بڑا شہر تھا، منگول فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ پولینڈ کو فتح کرتا ہوا جرمنی کے شہر بریلا تک پہنچ گیا اور ۹۔ اپریل ۱۲۴۱ء کو لائگنز (leignitz) کے مقام پر پولینڈ اور جرمنی کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ دوسرا دستہ کارپتھین پہاڑوں کو پار کر کے ٹرانسلوانیا اور ہنگری میں داخل ہو گیا جہاں منلوگوں نے ہنگری کے بادشاہ بیلا کو ۱۱۔ اپریل ۱۲۴۱ء کو شکست دی۔ واپسی کے سفر میں اس دستے نے بلغاریہ، ولاچیا اور مولداویا بھی فتح کر لیے۔ باتو خاں کی واپسی کے بعد ہنگری اور پولینڈ منگولوں کے تسلط سے آزاد ہو گئے، لیکن بلغاریہ ۱۳۱۰ء تک منگولوں کا باجگذار رہا۔

باتو خاں کی قائم کی ہوئی یہ حکومت ترکی زبان کی تاریخوں میں آلتن اوردا (altin orda) کہلاتی ہے جس کا اردو میں شاخ زرّین [1] اور انگریزی میں گولڈن ہورڈ (golden horde) ترجمہ کیا

---

(۱) باتو خاں کے خیمہ کا بالائی حصہ چونکہ سنہرا ہوتا تھا اس لیے اس کو ''آلتن اوردا'' کا نام دیا گیا۔ آلتن ترکی میں سنہرے کو اور اوردا منگولی زبان میں خیمہ کو کہا جاتا ہے۔ آلتن اوردا کو، گوک اوردہ بھی کہا جاتا ہے۔

گیا ہے۔ چونکہ اس علاقہ کو قبچاق کے علاوہ سیر اوردہ بھی کہا جاتا تھا اس لیے یہ سیر اوردہ کی حکومت بھی کہلائی جاتی تھی۔ باتو خاں نے دریائے والگا کے مشرقی کنارے پر ''سرائے'' کے نام سے ایک شہر آباد کیا جو اس سلطنت کا صدر مقام تھا۔

برکہ خاں (۱۲۵۷ء تا ۱۲۶۷ء)

۱۲۵۶ء میں باتو خاں کا انتقال ہو گیا اور اگلے سال اس کی جگہ اس کا بھائی برکہ خاں بادشاہ ہوا۔ برکہ خاں بادشاہ ہونے سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکا تھا۔ وہ منگولوں میں پہلا مسلمان بادشاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بخارا سے ایک تجارتی قافلہ سرائے آیا جس میں دو تاجر مسلمان تھے۔ برکہ خاں ان کو الگ لے گیا اور اسلام سے متعلق سوالات کیے۔ ان مسلمانوں نے بادشاہ کے سامنے اسلام کی باتیں اس خوبی سے بتائیں کہ وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ دریائے والگا کی وادی کے ترک باشندے دسویں صدی ہی میں مسلمان ہو چکے تھے۔ برکہ خاں کے بعد اس علاقے میں آباد منگولوں نے بھی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

برکہ خاں کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے شاخ زریں کی حکومت میں کئی تبدیلیاں آ گئیں۔ اس حکومت نے منگولوں کی مرکزی حکومت کی بالادستی ختم کر کے اس سے قطع تعلق کر لیا اور قاہرہ میں عباسی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ ہلاکو خاں نے جب بغداد پر حملہ کرنا چاہا تو برکہ خاں نے خلیفہ بغداد اور ہلاکو خاں میں مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ ایل خانی حکومت سے تعلقات قائم کیے۔ اس کے علاوہ برکہ خاں نے اپنا سکہ بھی جاری کیا۔ برکہ خاں نے قفقاز کے علاقہ سے ایل خانی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی اور ۱۲۶۳ء میں دریائے تیرک کے کنارے ہلاکو خاں کو شکست فاش دی لیکن اس کے باوجود اس علاقے سے ایل خانی حکومت ختم نہیں کی جا سکی۔

مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو کا باپ اور چچا برکہ خاں کے زمانہ میں چین جاتے ہوئے سرائے آئے تھے اور ہلاکو خاں سے جنگ کی وجہ سے ان کو ایک سال تک سرائے میں ٹھہرنا پڑا۔

برکہ خاں کے بعد مونلکے خاں (۱۲۶۷ء تا ۱۲۸۰ء) بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد شاہی گھرانہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ایک منگول سردار نونمائی نے اتنا اثر بڑھا لیا کہ ۱۲۶۷ء کے بعد سرائے کے حکمران اس کے سامنے بے بس ہو گئے۔ اس نے بحیرۂ اسود کے شمال اور مشرق میں

ایک مملکت بھی قائم کرلی۔ نونمائی نام سے ترکوں کی جو قوم پائی جاتی ہے اس کا مورث اعلیٰ یہی نونمائی ہے۔

۱۲۹۹ء میں سرائے کے حکمران توقتا (۱۲۹۱ء تا ۱۳۱۲ء) نے نونمائی کو شکست دے دی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ اس طرح سلطنت میں ایک بار پھر استحکام و اتحاد قائم ہوگیا۔ برکہ خاں کے ابتدائی جانشین مسلمان نہیں تھے، لیکن ان کا طرزِ عمل ایل خانی حکمرانوں کی طرح اسلام دشمن نہیں تھا۔ توقتا خاں کے بعد اس کا بھتیجا ازبک خاں سرائے کے تخت پر بیٹھا۔

محمد اوزبک خاں (۱۳۱۳ء تا ۱۳۴۱ء)

اوزبک خاں کے دَور کے آغاز میں بلغاریہ اور قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومتیں جو اَب تک باجگذار تھیں آزاد ہوگئیں۔ لیکن اس کے باوجود اوزبک خاں کا دورِ حکومت سرائے کی سلطنت کا نقطۂ عروج سمجھا جاتا ہے۔ اس کا دور شاخ زریں کا عہد زرین ہے۔ اس کے دَور میں سب سے زیادہ ترقی علمی، فنی اور تہذیبی میدانوں میں ہوئی۔ قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا سیاح ابن بطوطہ اس کے زمانہ میں سرائے آیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں سرائے کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ ابن بطوطہ جس نے اوزبک خاں کے ساتھ عصر کی نماز بھی پڑھی تھی لکھتا ہے کہ:

”اوزبک خاں بڑا طاقتور سلطان ہے، اس کی سلطنت وسیع ہے جس میں بڑے بڑے شہر ہیں۔ اوزبک خاں کا شمار دنیا کے سات بڑے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ باشندگان قسطنطنیہ جو خدا کے دشمن ہیں ان کے حق میں بڑا قاہر ہے اور ان کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے“۔

ایک اور ایرانی مؤرخ معین الدین نے لکھا ہے کہ ”اوزبک خاں، عادل اور نیک انسان تھا، سنت نبوی کی پیروی کرتا تھا“۔[1] اوزبک خاں کے دَور میں سرائے کی مملکت نے صحیح معنوں میں اسلامی رنگ اختیار کیا۔ اس کے بعد جتنے حکمران ہوئے وہ سب مسلمان تھے۔ اس کے عہد میں منگولی یاسا کی جگہ شریعت نے لے لی تھی۔

سرائے کے تحت رُوس میں جو مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں ان سے خراج وصول کرنے

(۱) معین الدین نطنزی: منتخب التواریخ مطبوعہ ایران۔

کا کام ماسکو کے حکمران کے سپرد تھا۔ ۱۳۲۸ء میں ماسکو کے بادشاہ ایوان اول کالیتا کو اوزبک خاں نے گرانڈ پرنس یعنی شہزادۂ والی شان کا خطاب دیا تھا اور اس طرح رُوس کے باجگزار حکمرانوں میں ماسکو کے حکمران کو ایک بلند مقام مل گیا۔ ماسکو کی یہ امتیازی حیثیت بعد میں ماسکو کے عروج کا باعث بنی۔

اوزبک خاں نے مصر اور قسطنطنیہ کی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ مصر کے سلطان ناصر سے اپنی لڑکی کی شادی کی اور قسطنطنیہ کی شاہزادی سے خود شادی کی۔ اوزبک کے نام سے جو ترک قوم پائی جاتی ہے، اس کی نسبت اوزبک خاں ہی سے ہے۔

اوزبک خاں کا لڑکا جانی بیگ (۱۳۴۲ء تا ۱۳۵۷ء) سرائے کا آخری طاقتور حکمران تھا۔ ایل خانی حکومت کے زوال کے بعد جب ایران میں طوائف الملوکی پھیلی تو جانی بیگ نے قفقاز اور تبریز پر قبضہ کرلیا اور اپنے لڑکے بردی بیگ کو تبریز کا گورنر مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ لیکن بردی بیگ باپ کے انتقال کی خبر سن کر شمال کی طرف روانہ ہوگیا اور قفقاز اور آذربائیجان ہاتھ سے نکل گئے۔

جانی بک بھی اپنے باپ کی طرح ایک عادل اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں اسلام نے اور فروغ پایا اور بقول ایک قریب العصر مورخ کے اس کے عہد میں تمام الوسِ اوزبک اسلام لے آئے، بُت خانے توڑ دیئے گئے اور مسجدیں اور مدرسے کثرت سے تعمیر کیے گئے۔[1] ایران کے مشہور عالم تفتازانی نے اپنی کتاب مختصر تلخیص اس کے نام سے منسوب کی ہے۔

چودھویں صدی کا نصف اول اور خاص طور پر اوزبک خاں اور جانی بک کا دَورِ حکومت سرائے کی سلطنت کا عہد زریں ہے۔ اسی دَور میں تمام منگولوں نے اسلام قبول کیا، اسلامی تہذیب کی بنیادیں مضبوط ہوئیں، تہذیب وتمدن نے ترقی کی اور علم وادب نے فروغ پایا۔

سرائے کی سلطنت کا زوال

جانی بک کا لڑکا بردی بک صرف دو سال حکومت کرسکا۔ اس کے بعد خانہ جنگی انتشار، اور افراتفری کا ایک طویل دور شروع ہوگیا۔ سرائے کی سلطنت بردی بک کے بعد بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال قائم رہی، لیکن اس تمام مدت میں حالات بتدریج بگڑتے گئے۔ روس اور مشرقی یورپ کی

---

(۱) معین الدین نطنزی: منتخب التواریخ ص ۸۳ مطبوعہ تہران ۱۳۳۶ء شمسی۔

باجگذار ریاستوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک ایک کر کے آزاد ہونا شروع ہو گئیں۔ ۱۳۶۲ء میں پوڈولیا ہاتھ سے نکل گیا، ۱۳۷۰ء میں کیو پر سے تاتاری تسلط ختم ہو گیا، ۱۳۸۷ء میں موالداد یا، ۱۳۷۹ء میں ولاچیا اور ۱۳۹۶ء میں بسرابیا تاتاریوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

طوائف الملوکی کے اس زمانہ میں ایک سردار خان ممائی نے نونمائی کی طرح سرائے میں اقتدار حاصل کر لیا۔ وہ جس کو چاہتا تھا اس کو تخت پر بٹھاتا تھا اور جس کو چاہتا تھا اتار دیتا تھا۔ ماسکو کی حکومت جو اَب تک سرائے کی وفادار تھی، اب اس نے بھی خراج دینا بند کر دیا اور جب خان ممائی نے ماسکو پر اقتدار بحال کرنے کی کوشش کی تو ماسکو کے حکمران نے کولی کووو کے میدان جنگ میں ۱۳۸۰ء میں خان نمائی کو شکست فاش دی۔ روس کی تاریخ میں اس جنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ تاتاریوں نے پہلی مرتبہ روس اور مشرقی یورپ کے مقابلہ میں ایک بڑی جنگ میں شکست کھائی۔

اس دوران میں شاخ ابیض یا آق [1] اوردہ کا حکمران اردس خاں، سرائے پر قابض ہو گیا اور سرائے کے حکمران توقتمش کو بے دخل کر دیا۔ توقتمش (۱۳۷۷ء تا ۱۳۹۵ء) سمرقند کے حکمران تیمور کے پاس پہنچا اور اس کی مدد سے ۱۳۷۸ء میں پھر سرائے پر قابض ہو گیا۔ توقتمش نے ۱۳۸۱ء کے قریب خان ممائی کو بھی شکست دے دی اور ۱۳۸۲ء میں ماسکو کا محاصرہ کر کے وہاں کے حکمران کو خراج دینے پر پھر مجبور کر دیا۔ توقتمش نے اس دوران میں مشرقی قپچاق کی آق اوردہ کی حکومت پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ مشرقی اور مغربی قپچاق کا واحد حکمران بن گیا۔ اور ناصر الدین کا خطاب اختیار کیا۔

توقتمش اور امیر تیمور

توقتمش نے سرائے کے گرے ہوئے وقار کو اگرچہ بڑی حد تک بحال کر دیا تھا، لیکن وہ اپنی قوت کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنے محسن امیر تیمور سے جس کی مدد سے وہ دوبارہ بادشاہ بنا تھا، خوارزم کے شہر کی واپسی کا مطالبہ کیا جو کسی زمانہ میں سرائے کی سلطنت کا

(۱) مغربی سائبیریا اور قازقستان کے علاقہ پر جو حکومت قائم تھی اُس کو آق اوردہ یا شاخ ابیض کہا جاتا ہے۔ اس کا بانی جو جی خاں کا بڑا لڑکا اوردہ تھا۔ ۱۳۶۰ء میں ارس خاں یہاں کا حکمران تھا جس نے سرائے پر قبضہ کر کے توقتمش کے باپ تولی خواجہ کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی اُرس خاں مر گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا تیمور ملک تخت پر بیٹھا جس سے توقتمش نے سرائے پھر چھین لیا۔

ایک حصہ تھا۔ تیمور نے جب مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو توقتمش نے آذر بائیجان پر حملہ کر کے شہر تبریز تاراج کر ڈالا۔ اس کارروائی کا نتیجہ تیمور سے جنگ کی شکل میں نکلا جس میں توقتمش کو شکست ہوئی۔ تیمور نے ۱۳۹۵ء میں ''سرائے'' کو تاراج کیا اور تیمور قتلق اور ایدگی کو توقتمش کا جانشین مقرر کیا۔ توقتمش نے پہلے لتھوانیہ میں پناہ لی اور اس کے بعد ۱۴۰۶ء میں سائبیریا کے مقام تومن میں بے بسی کی حالت میں انتقال کر گیا۔ ایدگی نے ۱۳۹۹ء میں لتھوانیہ کے حکمران کو پولٹاوا کے پاس شکست دے کر کھویا ہوا وقار پھر بحال کر لیا۔ لیکن ۱۴۱۹ء میں ایدگی کے انتقال کے بعد مملکت کا شیرازہ پھر بکھر گیا۔

سرائے کے تخت کے دو دعویداروں میں سے ایک الغ محمد نے ۱۴۳۸ء میں قازان کے شہر میں ایک علیحدہ حکومت قائم کر لیا۔ ۱۴۴۱ء میں کریمیا میں بھی ایک آزاد تاتاری حکومت قائم ہوگئی اور تقریباً اسی زمانہ میں سرائے کے جنوب میں استرخاں میں بھی ایک تیسری تاتاری حکومت قائم ہوگئی۔

سرائے کی مملکت کا وجود اس کے بعد بھی پچاس سال سے زیادہ قائم رہا لیکن بقول ایک مغربی مورخ کے ''سیر اوردہ کی منگول حکومت جو کبھی ایک عظیم طاقت تھی اب مشرقی یورپ کی حکومتوں کے لیے فٹ بال بن گئی تھی۔ ۱۴۷۶ء میں جب سرائے کے ایک حکمران خان احمد (۱۴۶۵ء تا ۱۴۸۱ء) نے ماسکو سے خراج طلب کیا تو شاہ جان نے انکار کر دیا۔ خان احمد نے ۱۴۸۰ء میں ماسکو کا محاصرہ کیا۔ روسی اس حد تک تنگ ہوئے کہ جان نے اپنی بیوی کو دور شمال میں آرکینجل بھیج دیا اور خود بھی بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن ۱۹۱۹ء نومبر کو تاتاریوں نے خود ہی محاصرہ اٹھا لیا۔ اس طرح ماسکو پر سے تاتاریوں کی بالادستی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

واپسی میں خان احمد کو سوتے میں قتل کر دیا گیا۔ خان احمد کے بعد اس کے لڑکوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سعید احمد (۱۴۸۱ء تا ۱۵۰۲ء) غالب آیا، لیکن کریمیا کے خان منگلی گرائی نے ۱۵۰۲ء میں اس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اس طرح سرائے کی شاخ زرین کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ تقریباً پچاس سال بعد قازان اور استرخان پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ روس میں مسلمانوں کا اقتدار اب صرف کریمیا اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں تک محدود رہ گیا جہاں سے عثمانی سلطنت کی سرپرستی کی وجہ سے روسی حکمران تاتاریوں کو دو سو سال تک بے دخل

نہیں کر سکے۔ (کریمیا کی تاریخ کے لیے دیکھیے باب ۳۳ کا حاشیہ)

کازان اور اَستر خان

شاخ زریں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مشرقی اور جنوبی روس کے وہ علاقے جو سرائے کی حکومت کے تحت تھے، تین آزاد حکومتوں میں تقسیم ہو گئے جو تاتاری بھی تھے اور مسلمان بھی:

(۱) کازان کی مملکت (۱۴۳۸ء تا ۱۵۵۲ء)

(۲) استر خاں کی مملکت (۱۴۴۱ء تا ۱۵۵۶ء)

(۳) کریمیا کی مملکت (۱۴۴۱ء تا ۱۷۹۱ء)

روس میں اسلامی مقبوضات کا بڑا حصہ اگرچہ اب بھی مسلم سیاسی اقتدار کے تحت تھا، لیکن سرائے کے زوال سے ماسکو کی روسی مملکت کے عروج و ترقی کے لیے راہ ہموار ہو گئی اور تاتاریوں اور مسلمانوں کے خلاف روس کی جارحانہ کارروائیوں میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ماسکو کی روسی حکومت نے ۱۴۸۰ء ہی میں تاتاری حکومت کو خراج دینا بند کر دیا تھا۔ ۱۵۴۷ء تک روس کی تمام چھوٹی چھوٹی حکومتیں ماسکو کی حکومت میں ضم ہو چکی تھیں اور ماسکو کے حکمران اپنے لیے "تمام روس کے حکمران" کا لقب اختیار کر چکے تھے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ سے بازنطینی حکومت ختم ہو جانے کے بعد ماسکو نے مسیحیت کے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور ماسکو کو "تیسرا روم" کہا جانے لگا تھا۔

ایوان چہارم (۱۵۴۷ء تا ۱۵۸۴ء) جو مہیب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جب ماسکو کے تخت پر بیٹھا تو روس کے مشرقی اور جنوبی حصوں کو چھوڑ کر جو مسلمانوں کے قبضے میں تھے، تقریباً پورا یوروپی روس ماسکو کی حکومت کے تحت آ چکا تھا۔ کریمیا نے ۱۴۷۵ء سے ترکی کی عثمانی سلطنت کی بالادستی قبول کر لی تھی اس لیے روسی حکومت جنوب کی طرف پیش قدمی کی ہمت نہیں کر سکی۔ مشرق میں کازان اور استر خان کی کمزور مسلمان حکومتیں تھیں اس لیے اب روس کی جارحانہ کارروائیوں کا رُخ ان کی طرف ہو گیا۔

کازان کی تاتاری مملکت کا صدر مقام شہر کازان تھا جسے باتو خاں نے سرائے کے شمال میں دریائے وولگا اور دریائے کاما کے سنگم پر اس جگہ آباد کیا تھا جہاں پہلے بلغار عظمیٰ کا شہر واقع تھا۔ کازان کی اس مسلم مملکت کی ایک سو سال کی مدت میں روس سے ۲۵ لڑائیاں ہوئیں۔ روسیوں

نے کازان کے حکمران خاندان کے باہمی اختلافات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کو جب بھی موقع ملتا تھا وہ کازان میں اپنی مرضی کا خان مقرر کر دیتے تھے جسکو تاتاری عوام جلد ہی بے دخل کر دیتے تھے۔

اکتوبر ۱۵۵۲ء میں جان مہیب نے ایک لاکھ فوج اور ڈیڑھ سو توپوں سے فیصلہ کن حملہ کیا اور اپنی لشکر کشی کو صلیبی جنگ کی حیثیت دی۔ تاتاریوں کے پاس صرف تیس ہزار فوج تھی اور ان کے پاس بڑی توپیں اور دوسرا آتش بار اسلحہ بھی نہیں تھا، مگر اس کے باوجود انہیں نے بڑی بے جگری سے روسی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ چھ ہزار تاتاریوں نے شہادت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی زرہ اتاردی اور روسیوں پر ٹوٹ پڑے اور ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ جب روسی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں تو چپہ چپہ پر مقابلہ کیا گیا۔ جامع مسجد کے امام اپنی مسجد کے سامنے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ فوج کی کثرت اور بہتر ہتھیاروں کی وجہ سے بالآخر روسی کامیاب ہو گئے اور کازان سے مسلم اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

کازان کے مسلمانوں کی یہ شاندار مدافعت غرناطہ کے کم ہمت حکمران ابوعبداللہ کی پسپائی سے کس قدر مختلف تھی، جس نے ساٹھ سال پہلے غرناطہ کا تاریخی شہر بغیر کسی مقابلے کے دشمنوں کے سپرد کر دیا تھا۔

کازان کے بعد روسیوں نے استرخان کا رخ کیا اور چار سال بعد ۱۵۵۶ء میں اس شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب روسیوں کے لیے سائبیریا اور قازقستان کے مسلم علاقوں کی طرف پیش قدمی کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی۔ اندلس کے بعد وادیٔ والگا دوسرا بڑا علاقہ تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا۔ یورپی رُوس میں اب صرف کریمیا میں مسلمانوں کی حکومت باقی رہ گئی تھی جس نے عثمانی تحفظ میں آجانے کی وجہ سے مزید دو سو سال تک روسیوں کا مقابلہ جاری رکھا۔ (ملاحظہ کیجیے باب ۳۳ کا حاشیہ)

والگا کی وادی میں تہذیب وتمدن

آلتن اوردا کے زمانے میں روس کے مسلمانوں نے تہذیب وتمدن کے میدان میں مزید ترقی کی۔ اس دَور کے تمدن کی سطح اگرچہ ایشیا اور شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے تمدن کی سطح سے بہت پست تھی لیکن بلغار کے زمانے کے تمدن سے اس کی سطح واضح طور پر بلند تھی۔ اس دَور میں

وادئ والگا کے مسلمانوں نے مصر اور اناطولیہ سے قریبی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ یہ تعلقات سیاسی بھی تھے اور مذہبی اور ثقافتی بھی۔ مصری علماء، صناعوں اور کاریگروں نے وادئ والگا اور جنوبی روس میں ان علوم، صنعتوں اور فنون کو فروغ دیا جو اسلامی دنیا کے ساتھ مخصوص تھے۔ مصری کاریگروں نے سرائے اور کریمیا میں عالی شان عمارتیں بنائیں جن میں موزیک کا کام ہوتا تھا۔ شیشہ اور چینی کے ظروف کی صنعت نے ترقی کی۔

انتظامی لحاظ سے روسی علاقے دو حصوں میں تقسیم تھے۔ والگا اور یورال کی وادی اور جنوبی روس براہ راست منگول امیروں کے زیر انتظام تھے اور باقی مقبوضات میں روسیوں کی اپنی ریاستیں قائم تھیں جو اندرونی طور پر آزاد تھیں اور سرائے کی حکومت کو سالانہ خراج دیتی تھیں۔

سرائے کی حکومت کا فوجی نظام منگول طرز پر تھا اور اپنے زمانے کے لحاظ سے مکمل اور ترقی یافتہ نظام تھا۔ روس کے فوجی نظام پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ مالی نظام اور ڈاک کا نظام بھی اچھا تھا جس کا روس کے ڈاک اور مالی نظام پر بھی اثر پڑا۔ سرائے اور دوسرے شہروں میں سکہ بنانے کی ٹکسالیں تھیں اور کاغذ بنانے کے کارخانے بھی تھے۔ پوری سلطنت میں مکمل امن وامان تھا جس کی وجہ سے تجارت کو بہت ترقی ہوئی۔ سرائے کی سلطنت سے سمور، مچھلی اور غلہ برآمد ہوتا تھا۔ غلام بھی برآمد کیے جاتے تھے اور یہ تجارت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایشیائی ملکوں اور مصر سے ریشم، قالین، بخورات، عمدہ کپڑے، پھل، مویشی، زیورات، چینی کے برتن درآمد کیے جاتے تھے۔ سرائے، کازان، استرخان، باغچی سرائے اور ازاق (ازدف) اور دربند اہم شہر اور تجارتی مرکز تھے۔

دارالحکومت ''سرائے'' دریائے والگا کی ایک شاخ کے مشرقی کنارے پر استرخان سے ۶۵ میل شمال میں اور اسٹالن گراڈ سے تیس میل مشرق میں واقع تھا۔ یہ نیا سرائے تھا جس کی بنیاد برکہ خاں نے ڈالی تھی اس کو سرائے برکہ خاں بھی لکھا جاتا ہے قدیم سرائے جن کی بنیاد باتو خاں نے ڈالی تھی اس سے تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا سیاح ابن بطوطہ سلطان اوزبک خان کے زمانے میں سرائے آیا تھا۔ وہ اس شہر کے بارے میں لکھتا ہے:

''یہاں عمدہ بازار اور بڑی بڑی سڑکیں ہیں اور مکانات کا سلسلہ مسلسل چلا گیا ہے۔ ایک

صبح ہم گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے تا کہ شہر کا چکر لگائیں اور وسعت معلوم کریں تو دوسرے کنارے پر دو پہر کو پہنچے۔ یہاں تیرہ بڑی مسجدیں ہیں۔ کئی قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ زیادہ تر منگول ہیں۔ ان کے صرف ایک حصے نے اسلام قبول کیا ہے۔ روسی اور یونانی باشندے عیسائی ہیں۔ ہر قوم کے لیے ایک علیحدہ حصہ ہے جس کے چاروں طرف فصیل ہے تا کہ ان کی تجارتی دولت محفوظ رہے۔"

مملکت چغتائی کی طرح یہاں بھی منگولوں اور ترکوں کے اختلاط سے ایک نئی قوم اور نئی ادبی ترکی زبان نے جنم لیا جو تاتاری کہلاتی ہے اور جس کا مذہب اسلام ہے۔

سرائے کے آلتن اوردہ حکمران [1]

(۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء تا ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء)

(۱) باتو خاں	۱۲۳۷ء/۶۳۴ھ	تا ۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ
(۲) برکہ خاں	۱۲۵۷ء/۶۵۵ھ	تا ۱۲۶۷ء/۶۶۶ھ
(۳) منگو تیمور	۱۲۶۷ء/۶۶۶ھ	تا ۱۲۸۰ء/۶۷۹ھ
(۴) تودہ منگو	۱۲۸۰ء/۶۷۹ھ	تا ۱۲۸۷ء/۶۸۶ھ
(۵) تیلے بوغا	۱۲۸۷ء/۶۸۶ھ	تا ۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ
(۶) توقتا	۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ	تا ۱۳۱۲ء/۷۱۲ھ
(۷) ازبک خان	۱۳۱۳ء/۷۱۲ھ	تا ۱۳۴۱ء/۷۴۱ھ
(۸) تینی بک	۱۳۴۱ء/۷۴۱ھ	تا ۱۳۴۲ء/۷۴۲ھ
(۹) جانی بک	۱۳۴۲ء/۷۴۱ھ	تا ۱۳۵۷ء/۷۵۸ھ
(۱۰) بردی بک	۱۳۵۷ء/۷۵۸ھ	تا ۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ
(۱۱) کلپا	۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ	تا ۱۳۶۰ء/۷۶۰ھ

(۱) حکمرانوں کی یہ فہرست ترک محقق نعمت اقدس کرات کی ترکی کتاب "بحیرۂ اسود کے شمال میں ترک قبائل اور حکومتیں" پر مبنی ہے۔ جہاں اقدس نعمت نے ہجری سنہ نہیں دیے وہاں میں نے زامباور کی مدد سے ہجری سنہ کا اضافہ کیا ہے۔

(۱۲) نوروز بیگ	۱۳۶۰ء/۷۶۰ھ
(۱۳) خضر خاں	۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ تا ۱۳۶۱ء/۷۶۲ھ
(۱۴) تیمور خواجہ	۱۳۶۱ء/۷۶۲ھ
(۱۵) مرید	۱۳۶۱ء/۷۶۲ھ تا ۱۳۶۳ء/۷۶۰ھ
(۱۶) اردو ملک	۱۳۶۰ء/۷۶۲ھ تا ۱۳۶۲ء/۷۶۴ھ
(۱۷) عبداللہ	۱۳۶۲ء/۷۶۴ھ تا ۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ
(۱۸) کیلدی بک	۱۳۶۲ء تا ۱۳۶۳ء
(۱۹) فولاد تیمور	۱۳۶۲ء تا ۱۳۶۵ء
(۲۰) توغائے	۱۳۶۵ء
(۲۱) عزیز (قبچاق کے علاقے میں)	۱۳۶۴ء تا ۱۳۶۷ء
(۲۲) عبداللہ (ترکستان میں)	۱۳۶۴ء تا ۱۳۶۷ء
(۲۳) جانی بک دوم	۱۳۶۶ء تا ۱۳۶۷ء
(۲۴) محمد بولاق	۱۳۷۰ء
(۲۵) ایبک	۱۳۷۱ء
(۲۶) قارن خان	۱۳۷۱ء تا ۱۳۷۵ء
(۲۷) اُرُس خان	۱۳۷۴ء تا ۱۳۷۶ء
(۲۸) توقتاقیہ	۱۳۷۵ء/۷۷۷ھ تا ۱۳۷۶ء/۷۷۷ھ
(۲۹) تیمور ملک ابن ارس خاں	۱۳۷۶ء/۷۷۷ھ تا ۱۳۷۷ء/۷۷۸ھ
(۳۰) حسن بک خان	۱۳۷۷ء/۷۷۸ھ
(۳۱) عرب شاہ	۱۳۷۷ء/۷۷۸ھ
(۳۲) توقتمش	۱۳۷۷ء/۷۷۸ھ تا ۱۳۹۵ء/۷۹۸ھ
(۳۳) تیمور قُتلق (تیمور ملک کا بیٹا)	۱۳۹۵ء تا ۱۴۰۱ء
(اس کے بعد ۱۴۱۹ء تک اصل حکمران ایدگی تھا)	
(۳۴) شادی بک	۱۴۰۱ء تا ۱۴۰۷ء

(۳۵) فولاد خان	۱۴۰۷ء تا ۱۴۱۰ء
(۳۶) تیمور (تیمور قتلق کا لڑکا)	۱۴۱۰ء تا ۱۴۱۲ء
(۳۷) جلال الدین ابن توقتمش	۱۴۱۲ء
(۳۸) کریم بردی	۱۴۱۲ء تا ۱۴۱۷ء
(۳۹) کیبک خان	۱۴۱۴ء تا ۱۴۱۵ء
(۴۰) جبار بیردی	۱۴۱۷ء تا ۱۴۱۹ء
(۴۱) چیگرے	۱۴۱۸ء
(۴۲) الغ محمد	۱۴۱۹ء تا ۱۹۲۴ء پھر ۱۴۲۷ء تا ۱۴۳۸ء
(۴۳) دولت بیردی	۱۴۲۰ء تا ۱۴۲۴ء
(۴۴) برق	۱۴۲۲ء تا ۱۴۲۷ء
(۴۵) سید احمد اول	۱۴۳۳ء تا ۱۴۶۵ء
(۴۶) کچک محمد بن تیمور	۱۴۳۵ء تا ۱۴۶۵ء
(۴۷) احمد بن کچک محمد	۱۴۶۵ء تا ۱۴۸۱ء
(۴۸) سید احمد دوم	۱۴۸۱ء
(۴۹) مرتضیٰ (سید احمد کا بھائی)	۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۹ء
(۵۰) شیخ احمد بن سید احمد	۱۴۸۱ء تا ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء

کازان کے حکمران

(۱۴۳۷ء/۸۴۱ھ تا ۱۵۵۲ء/۹۵۹ھ)

(۱) الغ محمد	۱۴۳۷ء تا ۱۴۴۵ء
(۲) محمود	۱۴۴۵ء تا ۱۴۶۱ء
(۳) خلیل	۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۷ء
(۴) ابراہیم	۱۴۶۷ء تا ۱۴۷۹ء

(۵) الہام ۱۴۷۹ء تا ۱۴۸۷ء
(۶) محمد امین ۱۴۸۷ء تا ۱۴۹۶ء
(۷) ماموک (سائبیریا کے خانوں کی اولاد میں) ۱۴۹۶ء تا ۱۴۹۷ء
(۸) عبداللطیف ۱۴۹۷ء تا ۱۵۰۲ء
(۹) محمد امین (دوسری مرتبہ) ۱۵۰۲ء تا ۱۵۱۸ء
(۱۰) شاہ علی ۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۱ء
(۱۱) صاحب گرائی (کریمیا کے خاندان سے تعلق تھا) ۱۵۲۱ء تا ۱۵۲۴ء
(۱۲) صفا گیرائی ۱۵۲۴ء تا ۱۵۳۱ء
(۱۳) جان علی ۱۵۳۱ء تا ۱۵۳۳ء
(۱۴) صفا گیرائی (دوسری مرتبہ) ۱۵۳۳ء تا ۱۵۴۶ء
(۱۵) شاہ علی (دوسری مرتبہ) ۱۵۴۶ء تا ۱۵۴۸ء
(۱۶) صفا گیرائی (تیسری مرتبہ) ۱۵۴۸ء تا ۱۵۴۹ء
(۱۷) اوتے مشن گرائی ۱۵۴۹ء تا ۱۵۵۱ء
(۱۸) شاہ علی (تیسری دفعہ) ۱۵۵۱ء تا ۱۵۵۲ء
(۱۹) محمد یادگار (استرخان کے خاندان سے تعلق تھا) ۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء

(۱۲/ اکتوبر ۱۵۵۲ء کو کازان پر روس کا قبضہ ہوگیا)

استرخان کے حکمران

(۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء تا ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء)

(۱) قاسم بن محمد بن کچک محمد ۱۴۶۶ء تا ۱۴۸۰ء
(۲) عبدالکریم برادر قاسم ۱۴۸۰ء تا ۱۵۰۹ء
(۳) حسین ۱۵۰۹ء تا ۱۵۳۲ء
(۴) آق کوبک ۱۵۳۲ء

(۵) عبدالرحمن بن عبدالکریم ۱۵۳۳ء تا ۱۵۳۷ء
(۶) درویش علی ۱۵۳۷ء تا ۱۵۳۹ء
(۷) یغُرجا ۱۵۳۹ء تا ۱۵۵۴ء
(۸) درویش علی (دوسری دفعہ) ۱۵۵۴ء تا ۱۵۵۶ء

اہم واقعات

۹۲۲ء بلغار کے حکمران کا اسلام قبول کرنا اور ابن فضلان کا خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کے سفیر کی حیثیت سے بلغار جانا۔

۹۸۶ء۔ روسی حکمران ولادمیر نے کیو میں مذہبی کانفرنس طلب کر کے مسیحت قبول کی۔ اس کانفرنس میں بلغار کے علماء نے شرکت کی اور ولادمیر کو اسلام کی دعوت دی۔

۱۲۳۷ء۔ بلغار پر باتو خاں کا قبضہ اور یورپ کی مہم پر روانہ ہونا۔ روس کا بڑا حصہ تسخیر کرنا۔

۱۲۴۰ء کیو پر منگولوں کا قبضہ۔

۱۲۴۱ء بریلا سے آگے لائگنز (leignitz) کے مقام پر منگول لشکر نے جرمنوں کو شکست دی (۹/ اپریل)۔ ایک دوسرے منگول لشکر نے ۱۱۔ اپریل کو ہنگری کے بادشاہ بیلا کو شکست دی۔ واپسی پر باتو خاں نے سرائے کا شہر آباد کیا۔

۱۲۶۳ء (۱۳۔ جنوری) برکہ خاں نے دریائے تیرک (قفقاز) کے کنارے ہلاکو خاں کو شکست دی۔

۱۳۲۸ء ازبک خان نے ماسکو کے روسی والی کو گرانڈ اپرنس کا خطاب دیا۔

۱۳۵۷ء جانی بیگ کا تبریز پر قبضہ۔

۱۳۷۷ء توقتمش نے تیمور کی مدد سے سرائے کا تخت حاصل کیا۔

۱۳۸۰ء سرائے کے شاہ ساز خاں ممائی کو روسیوں نے پہلی مرتبہ کولی کوود (kolikovo) کی جنگ میں شکست دی (۸۔ ستمبر)۔ یہ روسیوں کے مقابلہ میں منگولوں کی پہلی بڑی شکست تھی۔

۱۳۸۲ء توقتمش نے ماسکو کا محاصرہ کیا اور خراج وصول کیا۔

۱۳۹۱ء (۱۸۔اپریل) تیمور نے والگا کے کنارے توقتمش کو شکست دی۔

۱۳۹۵ء (۱۵۔اپریل) تیمور نے دریائے تیرک (قفقاز) کے کنارے توقتمش کو دوسری بار شکست دی۔

۱۳۹۹ء (۱۲۔اگست) سرائے کے ایدگی مرزا نے لتھوانیہ کے بادشاہ کو شکست دی۔

۱۴۰۸ء ایدگی مرزا نے ماسکو کا محاصرہ کر کے خراج وصول کیا۔

۱۴۳۹ء کازان کے حکمران اُلغ محمد نے ماسکو کا محاصرہ کیا۔

۱۴۴۵ء (۷۔جولائی) سوزدال کے مقام پر ماسکو کے حکمران کو اُلغ محمد نے شکست دی اور خراج دینے پر مجبور کیا۔

۱۴۸۰ء ماسکو نے تاتاریوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔

۱۴۸۷ء کازان پر روسیوں کا پہلی بار عارضی قبضہ۔

۱۵۰۶ء ۲۲۔مئی اور ۲۲۔جون کو کازان کے پاس مسلمانوں نے روسیوں کو شکستیں دیں۔

۱۵۲۱ء کازان کے حکمران صاحب گرائی نے کریمیا کے تاتاریوں کی مدد سے ماسکو پر حملہ کیا اور ماسکو کو خراج دینے پر مجبور کیا۔

۱۵۵۲ء روسی بادشاہ ایوان چہارم نے ۲۔اکتوبر کو اپنی تیسری مہم کے دوران کازان پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔

۱۵۷۱ء کریمیا کے خان دولت گرائی نے ماسکو کا محاصرہ کیا اور خراج وصول کیا۔ ماسکو کے خلاف مسلمانوں کی یہ آخری کامیاب مہم تھی۔

۱۵۹۱ء کریمیا کے خان غازی گرائی نے ماسکو پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔

باب ۳

ایل خانی حکمران

(۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ تا ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ)

ہلاکو خان

ایل خانی حکومت کا بانی چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔ چنگیز خاں کے لڑکے تولی خاں کے تین بیٹے تھے۔ ان میں ایک منگو خاں یا منگو قا آن تھا جو قراقرم میں رہتا تھا اور پوری منگول سلطنت کا خان اعظم تھا، دوسرا بیٹا قوبلا خاں یا قوبلائی خاں تھا جو چین میں منگول سلطنت کا بانی تھا تیسرا لڑکا ہلاکو خاں تھا۔ منگو خان کے زمانے میں شمال مغربی ایران میں اسمٰعیلیوں نے بڑا ہنگامہ اور خونریزی شروع کردی۔ یہ علاقہ منگولوں کے زیر حکومت تھا اس لیے وہاں کے باشندوں نے منگو خان سے اس ظلم و ستم کے خلاف فریاد کی۔ منگو خان نے اس شکایت پر اپنے بھائی ہلاکو کو ۶۵۴ھ میں ایران کا حاکم بنا کر روانہ کیا اور اس کو اسمٰعیلیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ ہلاکو خاں نے ۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ میں اسمٰعیلیوں کے مرکز قلعہ الموت پر قبضہ کر کے اسمٰعیلی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور ان کے آخری بادشاہ خورشاہ کو قتل کر دیا۔

اسمٰعیلیوں کا زور توڑنے کے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کا رُخ کیا جو اس زمانے میں شیعہ، سنی فساد کا گڑھ بنا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے خلیفہ مستعصم باللہ کے شیعہ وزیر ابن علقمی نے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ میں بغداد تباہ کرنے کے بعد ہلاکو خاں نے پورے عراق پر قبضہ کر لیا اور بصرہ اور کوفہ کے عظیم شہر تباہ و برباد کر دیئے۔ اس کے بعد منگول فوجوں نے جزیرہ کے راستے شام پر حملہ کیا۔ منگول فوجیں نصیبین، رُہا، اور حران کے شہروں کو تباہ و برباد کرتی ہوئی حلب پہنچ گئیں، جہاں پچاس ہزار مرد قتل عام میں مارے گئے اور ہزاروں عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا گیا۔ منگول فوجیں اس طرح قتل و غارت کرتی اور بربادی پھیلاتی ہوئیں فلسطین تک پہنچ گئیں، لیکن یہاں ناصرہ کے جنوب میں عین جالوت کے

مقام پر ۲۵۔ رمضان ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ کو ایک خونریز جنگ میں مصر کے مملوکوں نے ان کو شکست فاش دے کر پورے شام سے نکال دیا اور اس طرح مصر تباہ ہونے سے بچ گیا۔

منگو خاں کے بعد قراقرم کی حکومت کا اقتدار کمزور پڑ گیا اور ہلاکو خاں نے ایران میں اپنی مستقل حکومت قائم کر لی جو ایل خانی حکومت کہلاتی ہے۔ اس نے مراغہ کو جو تبریز سے ستر میل جنوب میں واقع ہے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ بعد میں دارالحکومت تبریز منتقل کر دیا گیا۔

ہلاکو کے بعد اس کا بیٹا اباقا خاں (۶۶۳ھ تا ۶۸۰ھ) تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی اسلام دشمن حکمتِ عملی جاری رکھی۔ اس نے پوپ اور یورپ کے حکمرانوں سے قریبی تعلقات قائم کیے اور عیسائیوں کو بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ اس نے یورپ کی تائید اور اپنی مملکت کے ارمنی اور گرجستانی باشندوں کی مدد سے شام پر حملہ بھی کیا، لیکن ۱۲۸۰ء میں شہر حمص کے پاس مملوک حکمران قلاؤن سے شکست کھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔

اباقا خاں کے بعد اس کا بھائی نکودار اغلن (۶۸۰ھ تا ۶۸۳ھ) بادشاہ ہوا۔ وہ پہلے عیسائی تھا لیکن بادشاہ ہونے کے بعد وہ وزیر اعظم شمس الدین[1] جوینی کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد خان رکھا۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق منگول حکومت کی پالیسی بدلنے کی کوشش کی۔ سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع دی اور مصر کے خلاف فوجی کارروائیاں بند کر دیں۔ احمد خاں نے اسلامی شعار کو رواج دینے کی کوشش کی اور منگولوں کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی۔ اس نے تورۂ چنگیزی کو چھوڑ کر احکام شریعت کی پابندی کی۔ احمد خاں کی یہ پالیسی اس کے بھتیجے اور اباقا خان کے بیٹے ارغون خاں کو پسند نہیں آئی، اس نے احمد خاں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کو قتل کر کے خود بادشاہ بن گیا۔

ارغون خان (۶۸۳ھ تا ۶۹۰ھ) کے دور میں مسلمان ایک بار پھر بدترین مظالم کا نشانہ بنائے گئے اور بے شمار علماء قتل کر دیے گئے۔ ۶۸۴ھ میں اس نے وزیر اعظم شمس الدین کو بھی قتل کرا دیا۔ ارغون کے جانشین گنجاتو (۶۹۰ھ تا ۶۹۴ھ) کا دور حکومت اس لحاظ سے قابل ذکر

(۱) خواجہ شمس الدین جوینی نصیر الدین طوسی کے بعد ہلاکو خاں کا وزیر مقرر ہوا تھا اور سلطان ارغون کے ابتدائی دور تک اس عہدے پر فائز رہا۔ مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ دوم میں سعدی کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ ہلاکو خاں کے زمانے میں تاتاریوں کی سفاکی کے باوجود اسلام کا جو نام و نشان رہ گیا وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا۔

ہے کہ اس نے چین کی تقلید میں جہاں کاغذ کے نوٹ چلتے تھے ایل خانی حکومت میں بھی کاغذ کے نوٹ چلانے کی کوشش کی۔

غازان خان

گنجاتو کا جانشین غازان خان (۶۹۴ھ تا ۷۰۳ھ) جوارغون خاں کا بیٹا تھا، دوسرا ایل خانی حکمران ہے، جس نے اسلام قبول کیا۔ وہ ایک ممتاز منگول امیر نوروز خاں کی ترغیب سے ۱۲۹۲ء/۶۹۴ھ میں مسلمان ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دس ہزار منگول بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ بادشاہ نے جس روز اسلام قبول کیا اس روز بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لوگوں کے سروں پر سونا چاندی اور موتی نچھاور کیے گئے۔ غازان خاں نے جس کو بعض اوقات قازان خاں بھی لکھا جاتا ہے اسلام کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا اور پیکنگ کے خان اعظم کی بالادستی ختم کر کے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ اس نے نئے سکے ڈھالے جن پر اسلامی عبارت کندہ تھی اور منگول ٹوپی کی بجائے مسلمانوں کی دستار پہنی۔ ان کے علاوہ غازان خان نے کئی مفید اصلاحات بھی کیں مثلاً مملکت سے عصمت فروشی ختم کردی اور سودی کاروبار کی ممانعت کردی۔ یہ تمام اقدامات اس بات کا اعلان تھے کہ اب مملکت ایل خانی نے دین اسلام کو ہمیشہ کے لیے قبول کرلیا ہے اور اب یہاں تورہ چنگیزی پر نہیں بلکہ شریعت محمدی پر عمل ہوگا۔

غازان کے اسلام لانے سے ایل خانی مملکت میں مسلمانوں کے مصائب کے دن ختم ہوگئے، لیکن غازان خاں کے ان تمام اقدامات اور اصلاحات کے باوجود بادشاہ پر اسلامی تعلیمات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مسلمان ہوجانے کے باوجود اس نے شام اور مصر کے خلاف مہم جاری رکھی اور دو مرتبہ شام پر حملے کیے۔ پہلا حملہ ۱۲۹۹ء/۶۹۹ھ میں کیا اور غازان خان نے مملوک سلطان ملک ناجر کو دمشق کے باہر شکست دے کر شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس موقع پر مشہور عالم اور مصلح ابن تیمیہ نے غازان خان سے مل کر اس کو مسلمان ہونے کے باوجود ایک مسلم علاقے پر حملہ کرنے پر سرزنش بھی کی لیکن غازان خان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ یہ دھمکی دے کر ایران واپس گیا کہ اگلے سال وہ مصر پر بھی حملہ کرے گا، چنانچہ ۱۳۰۳ء/۷۰۲ھ میں منگولوں نے دوسری مرتبہ شام پر حملہ کیا لیکن اس موقع پر ۲۵۔ رمضان کو مرج الصفر کے میدان میں مسلمانوں نے منگولوں

کو ایسی شکست فاش دی کہ اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی شام کا رخ نہیں کیا۔

غازان خاں کی افسوسناک کارروائیوں میں سے دوسری کاروائی امیر نوروز خاں کا قتل ہے۔ یہ عظیم منگول سردار جس کی کوششوں سے بے شمار منگول دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور خود غازان خاں بھی مسلمان ہوا غازان خاں نے اس کو بغاوت کے الزام میں قتل کرا دیا، حالانکہ وہ صرف شریعت کی صحیح معنوں میں بالادستی چاہتا تھا۔

غازان خاں شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور اس نے سنیوں کے خلاف کاروائیاں کر کے ظلم وتشدد کی اس پالیسی کی بنیاد ڈالی جو صفوی دور میں عروج پر پہنچی۔

غازان خاں کے بعد اس کا بھائی الجائیتو خدابندہ (۷۰۳ھ تا ۷۱۶ھ) تخت نشین ہوا۔ وہ بھی غازان خاں کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اس نے اپنا دارالحکومت تبریز سے سلطانیہ منتقل کر دیا۔ یہ ایک نیا شہر تھا جو قزوین اور زنجان کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا۔ اب تو یہ شہر عالیشان عمارتوں کا کھنڈر ہے لیکن اس زمانے میں سارے ایران میں تبریز کے بعد سب سے بڑا اور شاندار شہر سمجھا جاتا تھا۔

رشید الدین (۱۲۴۷ء/۶۴۵ھ تا ۱۳۱۸ء/۷۱۸ھ)

غازان خان اور الجائیتو خدابندہ کے حالات رشید الدین کے تذکرے بغیر نامکمل رہیں گے جو ان کے زمانے میں مسلسل بائیس سال تک ایل خانی سلطنت کے وزیر اعظم رہے اور مملکت کی بہتری اور ترقی میں جن کا حصہ بادشاہوں سے کم نہیں۔ رشید الدین مشہور بویہی وزیر صاحب ابن عباد کی طرح بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ انہوں نے کئی جلدوں میں ایک تاریخ لکھی ہے جو جامع التواریخ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے اور فارسی کی سب سے اچھی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ رشید الدین روزانہ فجر کی نماز کے بعد یہ تاریخ لکھنا شروع کرتے تھے اور سورج نکلنے پر لکھنا بند کر دیتے تھے۔ وہ اس طرح پابندی سے کئی سال تک لکھتے رہے یہاں تک کہ کتاب مکمل ہوگئی۔ رشید الدین طبیب بھی تھے اور انہوں نے علم طب میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔

رشید الدین نے علم کی بڑی سرپرستی کی اور رعایا کو بڑے فائدے پہنچائے انہوں نے تبریز کے نواح میں ''ربع رشیدی'' کے نام سے ایک بستی قائم کی تھی۔ یہ بستی کیا تھی علم وفن کا بہت بڑا مرکز تھی۔ اس کی حیثیت یونیورسٹی ٹاؤن کی تھی۔ اس زمانے میں بھی جبکہ دنیا نے بڑی ترقی کر لی ہے

یونیورسٹی سے متعلق ایسی بستیاں دنیا میں بہت کم نظر آئیں گی جو"ربع رشیدی" کا مقابلہ کرسکیں۔

اس بستی میں تیس ہزار خوبصورت مکانات تھے۔ باغوں، حماموں، پن چکیوں، کپڑے کے کارخانوں، کاغذ سازی کے کارخانوں اور ایک ٹکسال کے علاوہ یہاں ۲۴ کاروان سرائیں اور پندرہ سو کارخانے تھے یہاں کے کتب خانے میں ساٹھ ہزار کتابیں تھیں۔ اس بستی میں دو سو حافظ اور قاری تھے جو بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے اور قرأت سکھاتے تھے، چار سو فقہا اور محدثین تھے۔ اسلامی ملکوں کے ایک ہزار طلباء تعلیم پاتے تھے جن کا خرچ حکومت کے ذمہ تھا۔ ربع رشیدی میں ایک عظیم الشان ہسپتال بھی تھا جس میں پچاس اعلیٰ درجہ کے طبیب مقرر تھے۔ یہ طبیب طلباء کو پڑھاتے بھی تھے۔ جراح، کحال وغیرہ ان کے علاوہ تھے۔ کئی دینی مدرسے اور ایک رصد گاہ تھی جہاں علم ہیئت کے تجربے کیے جاتے تھے۔

رشید الدین نے اسی قسم کی ایک اور بستی ایل خانیوں کے نئے دار الحکومت سلطانیہ کے نواح میں بھی قائم کی تھی۔

ابو سعید

سلطان ابو سعید (۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ) ایل خانیوں کا آخری طاقتور حکمران تھا۔ جب اس کے باپ الجائیتو خدا بندہ کا انتقال ہوا تو ابو سعید کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ سلطنت کا سارا انتظام وزیر اعظم امیر چوپان سلدوز کے ہاتھ میں تھا۔ ابو سعید نیک دل انسان تھا۔ وہ ایک اچھا خطاط اور موسیقار بھی تھا۔ ابو سعید نے شیعی طریقے کو چھوڑ کر اہل سنت کا طریقہ اختیار کیا۔

سلطان ابو سعید کے عہد کا افسوس ناک واقعہ وزیر اعظم رشید الدین کا قتل ہے جس کو بغیر کسی گناہ کے محض اس شبہ میں قتل کرادیا کہ اس نے سلطان کے باپ الجائیتو خدا بندہ کو ایسی دوا دی کہ وہ مرگیا۔ لیکن یہ واقعہ اس کے ابتدائی دورِ حکومت کا ہے جب کہ ابو سعید کی عمر صرف چودہ سال تھی اور اقتدار وزیر اعظم امیر چوپان سلدوز کے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں سلطان نے رشید الدین کے لڑکے خواجہ غیاث الدین کو ۷۲۷ھ میں امیر چوپان سلدوز کی جگہ وزیر اعظم مقرر کرکے اپنے اس فعل کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔

سلطان ابو سعید کے بعد ایل خانی حکومت کا زوال شروع ہوگیا۔ امیر امراء آپس میں لڑنے

لگے اور بادشاہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے۔ ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ میں ایل خانی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کی وسیع سلطنت کئی حکومتوں میں تقسیم ہوگئی۔

ایل خانی دَور کی خصوصیات

ایل خانی دَور اسلامی تاریخ میں ایک طرح کا عبوری دَور ہے۔ اس کا آغاز بغداد کی تباہی سے ہوتا ہے جو اپنے زمانے میں نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا بلکہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا۔ بغداد کے بعد ایل خانیوں کی تباہ کاری کا دائرہ عراق کے دوسرے شہروں، مشرقی اور جنوبی اناطولیہ اور شام تک پھیل گیا۔ حلب اور دمشق کے شہر بھی ان کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنے۔ ایل خانیوں کے ابتدائی دَور میں خود اُن کی سلطنت میں رہنے والے مسلمان بھی اُن کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بے شمار علماء قتل کیے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن شروع شروع میں ان کا اسلام صرف رسمی تھا خصوصاً غازان خاں اور الجائیتو خدابندہ مسلمان تو ہو گئے تھے، لیکن اسلامی عقائد کی ضروری تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں اسلام کا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ ایل خانی دور حکومت ہی تھا جس میں مذہبی عقائد اور تعصب نے تشدد کا رنگ اختیار کیا اور سنی آبادی کو ہراساں کیا گیا۔ اسلامی تاریخ میں مذہبی تشدد کی یہ شکل اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ بنو بویہ اور بنو فاطمہ کی شیعی حکومتوں نے بھی اپنی مذہبی عصبیت کے باوجود اہل سنت آبادی کے خلاف تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ایل خانی دور کی یہ پالیسی بعد میں صفوی دور میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

ایل خانی سلطنت اپنے دَور کی عظیم ترین حکومتوں میں سے تھی۔ ایران، عراق، افغانستان، قفقاز اور مشرقی اناطولیہ ان کی سلطنت میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنے قابل وزیروں کی مدد سے جن میں محقق طوسی، خواجہ شمس الدین جوینی، رشید الدین اور غیاث الدین جیسے وزیر شامل تھے، اپنی سلطنت کا انتظام بڑی خوبی سے کیا۔ پوری سلطنت میں مکمل امن وامان تھا جس کی وجہ سے تجارت کو فروغ ہوا اور ان کا دارالسلطنت تبریز دنیا کا ایک عظیم الشان تجارتی مرکز بن گیا۔ فنِ تعمیر نے بھی اس دَور میں ترقی کی۔ مراغہ، تبریز اور سلطانیہ میں شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ان

میں سلطانیہ میں سلطان الجائیتو کا مقبرہ فنِ تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے گنبد کی بلندی ایک سو اسی (۱۸۰) فٹ ہے۔

علم وادب

منگول حملوں کے دوران علوم وفنون کی ترقی پر سخت ضرب لگی تھی۔ کتب خانے اور مدرسے برباد کردیئے گئے تھے۔ ہزاروں علماء شہید کردیئے گئے تھے۔ لیکن ایل خانی دور میں علم وادب کا ایک بار پھر احیاء ہوا۔ اس سلسلے میں محقق طوسی اور وزیر اعظم خواجہ رشید الدین نے قابل قدر کوششیں کیں۔ محقق طوسی، ہلاکو خاں کے وزیر تھے۔ وہ اس وجہ سے بدنام ہیں کہ بغداد پر حملہ کرنے کے لیے انہوں نے ہلاکو خاں کو آمادہ کیا تھا۔ لیکن وہ علم ریاضی، علم ہیئت اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم تھے اور ان علوم میں انہوں نے کئی اعلیٰ درجہ کی کتابیں بھی لکھی ہیں، اس لیے انہوں نے علم کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کی اور تبریز میں ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جس میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ اسی طرح طوسی نے بہت سی کتابوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیا۔ خواجہ رشید الدین نے کتابوں کی حفاظت کے لیے جو کوششیں کیں ان کا ذکر پیچھے کیا جاچکا ہے۔

ایل خانی دور میں تاریخ کی کئی اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سب سے اہم کتاب رشید الدین کی جامع التواریخ ہے۔ یہ دنیا کی پہلی عالمی تاریخ ہے۔ اس سے قبل کسی زمانے میں بھی عالمی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ تاریخ ۱۳۱۰ء میں مکمل ہوئی اور منگولوں کی تاریخ کے علاوہ اس میں چین، ہندوستان اور یورپ کی تاریخ بھی لکھی گئی ہے۔

اس دور کی دوسری اہم تاریخی کتاب عطا ملک جوینی کی ''تاریخ جہانگشا'' ہے جو ۱۲۶۰ء/ ۶۵۸ھ میں لکھی گئی اور منگولوں اور خوارزم شاہیوں کے دَور کی مفصل اور مستند تاریخ ہے۔ عطا ملک وزیر اعظم خواجہ شمس الدین کے بھائی تھے۔

ابو سلیمان داؤد بناکتی کی تاریخ بناکتی بھی جو ۱۳۱۷ء/ ۷۱۷ھ میں مکمل ہوئی، تاریخ عالم ہے۔ اس کا نصف سے زیادہ حصہ غیر مسلم اقوام کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ برطانیہ، اٹلی، فرانس اور اسپین کی تاریخ بھی اس میں آگئی ہے۔ ایران اور منگولوں کی تاریخ کا ایک اور اہم ماخذ تاریخ وصاف ہے جسے عبداللہ ابن فضل اللہ شیرازی نے سن ۱۳۲۰ء میں مکمل کیا۔

اس دَور کے مصنفوں میں ہم حمد اللہ مستوفی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کی "تاریخ گزیدہ" اگرچہ مختصر تاریخ عالم ہے لیکن اس کی لکھی ہوئی جغرافیہ 'نزہۃ القلوب' ایران کے تاریخ جغرافیہ کا ایک اہم ترین ماخذ ہے۔ تاریخ کی یہ تمام کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔

ایل خانی دَور کے حکماء میں محقق طوسی کے علاوہ قطب الدین شیرازی (۱۲۳۶ء تا ۱۳۱۶ء) کا نام بھی ممتاز ہے۔ وہ محقق طوسی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے علم ہیئت اور طب میں شاہکار کتابیں لکھی ہیں۔ پہلے مسلمان ایل خانی حکمران احمد خاں نے مصر کے سلطان قلادون کے پاس ان کو ہی خط دے کر اور سفیر بنا کر بھیجا تھا۔

اس دَور کے اطباء میں کمال الدین فارسی متوفی ۱۳۲۰ء کا کام سرفہرست ہے۔ وہ نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ جدید دَور سے قبل آنکھوں کے علاج کے دنیا میں سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ آنکھ کے سلسلے میں ان کی تحقیقات بڑی اہم ہیں اور انہوں نے ابن ہیثم کے نظریات کو مزید بہتر بنایا۔

شیخ سعدی

ایل خانی دَور کی ایک اور عظیم شخصیت ایران کے مشہور شاعر اور ادیب شیخ سعدی (۱۱۸۴ء/ ۵۸۰ھ تا ۱۲۹۲ء/ ۶۸۲ھ) کی ہے۔ شیخ سعدی کا ایل خانی حکمرانوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اتابکان[1] فارس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے جو ایل خانیوں کا باجگذار ہو گیا

(۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے پہلے حصے میں بتایا جا چکا ہے کہ سلجوقیوں کے زوال کے بعد ان کے مختلف فوجی افسروں نے جن کو اتابک کہا جاتا تھا اور جو سلجوقی حکمرانوں کے قابل اعتماد غلام ہوتے تھے سلطنت کے مختلف حصوں میں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ان حکومتوں میں سے ایک اتابکان آذربائیجان کی حکومت تھی جو ۱۱۳۶ء/ ۵۳۱ھ تا ۱۲۲۵ء/ ۶۳۲ھ) تک قائم رہی اور جس کا صدر مقام تبریز تھا۔ دوسری حکومت اتابکان فارس کی تھی جس کو دولت سلفریہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا بانی ایک ترکمان سردار سلفر تھا۔ یہ حکومت ۱۱۴۸ء/ ۵۴۳ھ تا ۱۲۸۴ء/ ۶۸۶ھ میں قائم رہی اور اس کا صدر مقام شیراز تھا۔ منگولوں کے حملے کے بعد اس حکومت نے ان کی اطاعت قبول کر کے فارس اور جنوبی ایران کو تباہی سے بچا لیا تھا۔ اس خاندان میں کئی اچھے حکمران گزرے ہیں جن میں سعد بن زنگی (۱۲۰۳ء تا ۱۲۳۱ء) اور اس کا لڑکا ابوبکر بن سعد (۱۲۳۱ء تا ۱۲۶۰ء) بہت اہم ہیں۔ شیخ سعدی ان ہی کے دَور سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنا تخلص سعد بن زنگی سے خاندانی تعلق کی بنا پر سعدی رکھا تھا۔ اتابکوں کے دَور کی ایک اور عظیم علمی شخصیت عبداللہ بن عمر بیضاوی (۱۲۲۶ء/ ۶۱۳ھ تا ۱۲۶۰ء/ ۶۵۸ھ) کی ہے۔ وہ ابوبکر کے زمانے میں شیراز کے قاضی تھے۔ ان کی قرآن کی تفسیر آج بھی دینی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اور علماء نے اس کی کثرت سے شرح لکھی ہیں۔

تھا۔ ہاں وزیر اعظم خواجہ شمس الدین اوران کے بھائی علاء الدین، شیخ سعدی کے سرپرست تھے۔ سعدی نے بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے سیاح بھی تھے۔ انہوں نے کاشغر سے مصر تک اور ایشیائے کوچک سے یمن اور حبش تک ساری اسلامی دنیا کی سیر کی تھی۔ اس طرح ان کو جو تجربے حاصل ہوئے ان کی روشنی میں انہوں نے گلستان اور بوستان دو اہم کتابیں لکھیں۔ ان میں بوستان صرف نظم میں ہے اور گلستان نظم ونثر کا مجموعہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی ادب کا ایسا شاہکار ہیں جو دنیا کے بہترین ادب کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے قصوں اور کہانیوں کے ذریعے بڑے کام کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ ان کتابوں نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ ان کا دنیا کی بیشتر بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُردو میں بھی اس کے ترجمے موجود ہیں۔

سعدی فارسی غزل کے (جو فارسی اور اُردو شاعری کی سب سے مقبول صنف ہے) باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی غزلیات اور دوسری نظموں کا مجموعہ بدائع سعدی کہلاتا ہے۔ ان کی غزلیں بھی فارسی زبان کی بہترین غزلوں میں شمار ہوتی ہیں۔ بغداد کی تباہی پر انہوں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں مرثئے لکھے۔ جو بڑے دلگداز ہیں۔

ایل خانی حکومت

(۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ تا ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ)

(۱) ہلاکو خاں	۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ	تا ۱۲۶۵ء/۶۶۳ھ
(۲) اباقا خاں	۱۲۶۵ء/۶۶۳ھ	تا ۱۲۸۲ء/۶۸۰ھ
(۳) تکودار اغلن	۱۲۸۲ء/۶۸۰ھ	تا ۱۲۸۴ء/۶۸۳ھ
(۴) ارغون	۱۲۸۴ء/۶۸۳ھ	تا ۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ
(۵) گنجاتو	۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ	تا ۱۲۹۵ء/۶۹۴ھ
(۶) غازان خان	۱۲۹۵ء/۶۹۴ھ	تا ۱۳۰۴ء/۷۰۳ھ
(۷) اولجائیتو خدابندہ	۱۳۰۵ء/۷۰۳ھ	تا ۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ

(۸)ابوسعید ۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ تا ۱۳۳۵ء/۷۳۶ھ

اس کے بعد ایل خانیوں کا زوال شروع ہوگیا اور ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ ۷۳۶ھ کے بعد منگول سردار جلائر حسن بزرگ اور امیر حسن کوچک چوپان اپنے اپنے بادشاہ مقرر کرتے رہے۔ اس سلسلے کا آخری بادشاہ نوشیرواں تھا جو ۱۳۴۴ء/۷۴۵ھ میں تخت پر بٹھایا گیا۔

اتابکان فارس (سلفریہ)

(۱۱۴۸ء/۵۴۳ھ تا ۱۲۸۴ء/۶۸۶ھ)

(۱)سنقر بن مودود ۱۱۴۸ء/۵۴۳ھ تا ۱۱۶۱ء/۵۵۷ھ

(۲)زنگی بن مودود ۱۱۶۱ء/۵۵۷ھ تا ۱۱۷۵ء/۵۷۱ھ

(۳)مظفر الدین تکلہ بن زنگی ۱۱۷۵ء/۵۷۱ھ تا ۱۱۹۴ء/۵۹۰ھ

(۴)طغرل بن سنقر ۱۱۹۴ء/۵۹۰ھ تا ۱۲۰۳ء/۵۹۹ھ

(۵)سعد بن زنگی ۱۲۰۳ء/۵۹۹ھ تا ۱۲۳۱ء/۶۲۸ھ

(۶)ابوبکر بن سعد ۱۲۳۱ء/۶۲۸ھ تا ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ

اس کو اوگدائی خاں نے قُتلغ خاں کا خطاب دیا تھا۔

(۷)محمد بن سعد ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ تا ۱۲۶۲ء/۶۶۰ھ اکتوبر

(۸)محمد شاہ ۱۲۶۲ء/۶۶۰ھ تا ۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ/۱۸ جولائی

(۹)سلجوق شاہ بن سنقر ۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ تا ۱۲۶۴ء/۶۶۳ھ دسمبر

اتابکان فارس ۱۲۵۶ء سے منگولوں کے باجگذار ہوگئے تھے۔ منگولوں نے جب سلجوق شاہ کو قتل کردیا تو اس خاندان کی ایک عورت آبش خاتون کو ایک سال تک تخت پر بٹھایا۔ اسکے بعد ہلاکو کے چوتھے بیٹے منگو تیمور نے اس سے شادی کرلی اور اس کے نام سے ۶۸۳ھ/ ۱۲۸۴ء میں اس کی وفات تک حکومت کی۔ اس کے بعد سلفری خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

[سالوں کا تعین لین پول کی (Muslim Dynasties) اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

(انگریزی) جلد چہارم مقالہ (Salghurides) کے مطابق کیا گیا ہے۔ ہجری سالوں کا تعین بعض جگہ میں نے تقویم کی مدد سے کیا ہے۔ لین پول نے ہجری سنہ صحیح نہیں دیئے۔ مولف]

اہم واقعات

۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ ہلاکو خاں نے قلعہ الموت فتح کر کے باطنی (اسماعیلی) حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ (ذی الحج مطابق دسمبر) بغداد پر قبضہ۔

۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ (۲۵۔رمضان) عین جالوت (شام) کے مقام پر مملوکوں نے منگول لشکر کو شکست دی۔

۱۲۸۰ء/۶۷۸ھ اباقا خاں کا شام پر حملہ منصور قلاؤن نے منگول لشکر کو شکست دی۔

۶۸۱ھ منگول حکمران تکودار اغلن نے اسلام قبول کیا اور احمد خاں نام رکھا۔

۱۲۸۵ء/۶۸۴ھ ایل خانی وزیر خواجہ شمس الدین کا قتل۔

۱۲۹۵ء/۶۹۴ھ (۴۔شعبان مطابق ۱۹۔جون) غازان خاں نے اسلام قبول کیا۔

۱۲۹۹ء/۶۹۹ھ غازان خاں نے دمشق پر قبضہ کیا۔

۱۳۰۳ء/۷۰۲ھ (۲۵۔رمضان مرج الصفر کی جنگ میں مملوکوں نے غازان خاں کے لشکر کو شکست فاش دے کر شام سے منگولوں کو نکال دیا۔

۱۳۱۸ء/۷۱۸ھ وزیر اعظم رشید الدین فضل اللہ کو قتل کر دیا گیا۔

باب ۴

کالی بھیڑ والے اور سفید بھیڑ والے

(۱۳۱۹ء/۷۱۵ھ تا ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ)

ایل خانی حکومت کے خاتمے کے بعد ایل خانی علاقوں میں کئی آزاد حکومتیں قائم ہوگئیں جن میں چار حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ جنوبی ایران میں آل مظفر کی حکومت، عراق میں جلائر خاندان کی حکومت شمالی ایران اور مشرقی اناطولیہ میں قرہ قویونلو اور آق قویونلو قبائل کی حکومت۔ ان میں آخر الذکر قبیلوں کے جھنڈوں پر کالی اور سفید بھیڑ کی شکلیں بنی ہوئی تھیں اس لیے ان کو قرہ قویونلو یعنی کالی بھیڑ والے اور آق قویونلو یعنی سفید بھیڑ والے کہا جاتا ہے۔ ترکی زبان میں قرہ کالے کو اور آق سفید کو کہتے ہیں، اور قویون بھیڑ کو کہتے ہیں۔

آل مظفر (۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۹۳ء/۷۹۵ھ)

اس حکومت کا بانی ایک ایرانی امیر مظفر تھا جو ایل خانی حکومت کی طرف سے شہر یزد کا حاکم تھا۔ ۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ میں سلطان ابو سعید نے اس کے لڑکے مبارز الدین محمد (۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۵۷ء/۷۵۸ھ) کو یزد اور فارس کی حکومت دی اور وہ ایل خانیوں کے زوال کے بعد آزاد ہوگیا۔ اس نے ۱۳۴۰ء/۷۴۱ھ میں کرمان پر، ۱۳۵۳ء/۷۵۴ھ میں شیراز اور فارس پر، ۱۳۵۷ء/۷۵۸ھ میں اصفہان پر قبضہ کرلیا۔ مبارز الدین کا دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس نے شراب خوری اور دوسری برائیوں کو جو شیراز میں اس زمانے میں عام ہوگئی تھیں روکا اور اس مقصد کے لیے سخت قوانین نافذ کیے۔

مبارز الدین کے بعد شاہ شجاع (۱۳۵۷ء/۷۵۹ھ تا ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ) جانشین ہوا جو اس خاندان کا سب سے ممتاز حکمران ہے۔ اس نے عراق کے جلائر حکمران سلطان اویس کے ۱۳۷۵ء میں انتقال کے بعد شتر، بغداد، سلطانیہ، تبریز، نخچوان اور قرہ باغ پر بھی قبضہ کرلیا اور اس طرح وہ خراسان کو چھوڑ کر پورے ایران پر قابض ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تیمور سمرقند میں ایک

مضبوط حکومت قائم کر چکا تھا اور خراسان پر قابض ہو چکا تھا۔ شاہ شجاع نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگا کر اس کی اطاعت کر لی۔

شاہ شجاع کے بعد اس کا جانشین زین العابدین (۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ تا ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ) صرف تین سال حکمران رہا۔ ۱۳۸۷ء میں تیمور نے اس کو نکال دیا۔ اس کے بعد آل مظفر کے شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ یزد میں شاہ یحییٰ، کرمان میں سلطان احمد اور اصفہان میں شاہ منصور حکومت کرنے لگے۔ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر تیمور نے ۱۳۹۳ء/۷۹۵ھ میں آل مظفر کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

آل مظفر علم و ادب کے سرپرست تھے۔ مشہور شاعر حافظ شیرازی (۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۹۰ء/۷۹۳ھ) کا شاہ شجاع کے دربار سے تعلق تھا۔ حافظ فارسی کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی اہل علم اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ فارسی کے سب سے بڑے ہجو گو اور طنز نگار شاعر عبید زاکانی متوفی ۱۳۷۱ء کا بھی اسی دور سے تعلق ہے۔ اس کی کتاب "اخلاق الاشراف" طنز نگاری کا شاہکار ہے اور اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایرانی اخلاقی لحاظ سے کس قدر پستی میں گر چکے تھے۔

جلائر (۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۴۱۰ء/۸۱۳ھ)

جلائر قبائل ایل خانیوں ہی کی ایک شاخ تھے اور نسلاً منگول تھے۔ جب ایل خانی سلطان ابوسعید کا انتقال ہوا تو امراء مرکز میں صاحب اقتدار ہوگئے۔ وہ جس کو چاہتے تخت نشین کرتے اور جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے۔ ان میں جلائر سردار شیخ حسن بزرگ نے بڑا اقتدار حاصل کیا اور وہ ایل خانی حکمرانوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتا تھا۔ جب آخری ایل خانی حکمران نوشیرواں مر گیا تو حسن بزرگ (۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ) عراق پر قابض ہو گیا اور بغداد کو دار الحکومت بنا کر ایک مستقل حکومت قائم کر لی۔

حسن بزرگ کے بعد اس کا لڑکا اویس خان (۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ تا ۱۳۷۴ء/۷۷۵ھ) تخت نشین ہوا۔ ۷۵۹ھ میں اس نے ترکمانوں سے جو آذربائیجان اور مشرقی اناطولیہ پر قابض ہوگئے تھے تبریز اور آذربائیجان لے لیا اور ۷۶۶ھ میں موصل اور دیار بکر پر بھی قبضہ کر لیا۔

اویس کے جانشین حسین (۱۳۷۴ء/۷۷۵ھ تا ۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ) کی سیاہ بھیڑ (قرہ قویونلو) ترکمانوں سے جو آرمینیہ کے جنوبی حصے پر حکومت کرتے تھے اور آلِ مظفر سے لڑائیاں رہیں۔ ترکمانوں سے تو ۷۷۹ھ میں اس کی صلح ہوگئی لیکن آلِ مظفر کے حکمران شاہ شجاع نے اس کو آذربائیجان اور عراق کے بڑے حصے سے کچھ مدت کے لیے بے دخل کر دیا۔

حسین کے بعد اس کی حکومت دو بیٹوں میں اس طرح تقسیم ہوئی کہ عراق اور آذربائیجان سلطان احمد (۱۳۸۲ء/۷۸۶ھ تا ۱۴۱۰ء/۸۱۳ھ) کو اور کردستان بایزید کو ملا۔ سلطان احمد کو اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تیمور کی فتوحات کا سلسلہ آذربائیجان تک پہنچ چکا تھا اور اس نے ۱۳۹۳ء/۷۹۶ھ میں بغداد اور عراق پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان احمد بھاگ کر مصر چلا گیا۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ جب تیمور بغداد سے چلا جاتا تھا تو سلطان احمد مصری حکومت کی مدد سے بغداد پر قابض ہو جاتا تھا اور جب تیمور اس کی طرف رخ کرتا تھا تو وہ پھر بھاگ جاتا تھا۔ آخر میں وہ بغداد پر قابض ہو گیا تھا لیکن آذربائیجان پر قبضہ کرنے کی کوشش میں وہ قرہ قویونلو حکمران قرہ یوسف خاں کے ہاتھوں ۸۱۳ھ میں شکست کھا کر مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا شاہ ولد بغداد میں جانشین ہوا، لیکن اگلے سال (۸۱۴ھ) ہی قرہ قویونلو ترکمانوں نے بغداد پر قبضہ کر کے جلائر خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ جلائر کی ایک شاخ اس کے بعد بھی ۸۲۹ھ تک بصرہ، واسط اور شُستر کے علاقے پر حکومت کرتی رہی۔ لیکن وہ تیموری سلطنت کی باجگذار تھی۔ بالآخر اس حکومت کو بھی قرہ قویونلو نے ختم کر دیا۔

جلائر کا دور تعمیر و ترقی کے کاموں کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ فارسی کے مشہور قصیدہ گو مسلمان ساوجی متوفی ۱۳۷۸ء اور عرب مورخ ابن عرب شاہ (۱۳۸۸ء تا ۱۴۵۰ء) کا جلائر کے دربار سے تعلق تھا۔ ابن عرب شاہ کی تاریخ عجائب المقدور اس دور کی تاریخ خصوصاً امیر تیمور کے حالات کا بڑا قیمتی ماخذ ہے۔ یہ عربی میں ہے اور اس میں تیمور کی برائیاں کی گئی ہیں۔ امیر تیمور بغداد فتح کرنے کے بعد ابن عرب شاہ کو سمرقند لے گیا تھا۔ احمد جلائر نے فارسی کے شاعر حافظ شیرازی کی سرپرستی بھی کی۔

قرہ قویونلو (۱۳۷۵ء/۷۷۷ھ تا ۱۴۶۸ء/۸۷۳ھ)

ترکمانوں کے اس حکمران خاندان کا بانی خواجہ بیرم (۱۳۷۵ء/۷۷۷ھ تا ۱۳۸۰ء/ ۷۸۲ھ) تھا جو جلائر سلطان اویس کا عہدے دار تھا۔ اویس کے انتقال پر اس نے موصل اور سنجار پر قبضہ کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ خواجہ بیرم کے انتقال پر اس کا لڑکا قرہ محمد (۱۳۸۰ء/ ۷۸۲ھ تا ۱۳۹۰ء/۷۹۲ھ) جانشین ہوا۔ اس کے بعد قرہ محمد کا لڑکا قرہ یوسف ۱۳۹۰ء/۷۹۲ھ تا ۱۴۱۹ء/۸۲۲ھ) حکمران ہو۔ وہ اس خاندان کا حقیقی بانی اور پہلا ممتاز حکمران ہے۔ اس نے تبریز پر قبضہ کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ امیر تیمور سے اس کی کئی بار لڑائیاں ہوئیں۔ تیمور نے اس کو کئی بار تبریز سے بے دخل کر دیا اور اس نے پہلے عثمانی سلطان بایزید کے پاس اور پھر مصر کے مملوک دربار میں پناہ حاصل کی۔ مگر وہ جتنی بار جلاوطن ہوا اتنی ہی دفعہ پھر واپس آ گیا۔ تیمور کے بعد دیار بکر اور تبریز پر ۱۴۰۶ء/۸۰۹ھ پر پھر قبضہ کر لیا۔ ۱۴۱۰ء/۸۱۳ھ میں جلائر سلطان احمد کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اگلے سال بغداد پر قبضہ کر کے جلائر خاندان کی حکومت ختم کر دی۔

قرہ یوسف کا جانشین امیر اسکندر (۱۴۱۹ء/۸۲۲ھ تا ۱۴۳۴ء/۸۳۸ھ) ہوا۔ اور اس کے بعد جہاں شاہ تخت نشین ہوا۔ قرہ قویونلو کی تیمور کے جانشین سلطان شاہ رُخ سے لڑائیاں جاری رہیں۔ یہ ترکمان تیموریوں کی اطاعت کر لیتے تھے، لیکن پھر باغی ہو جاتے تھے۔ جہاں شاہ جس کو شاہرخ نے تخت نشین کیا تھا اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران ہے۔ اس نے ۱۴۳۵ء/ ۸۳۹ھ سے ۱۴۶۶/۸۷۱ھ تک حکومت کی۔ شاہ رخ کے انتقال کے بعد اس نے اصفہان، فارس اور کرمان پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۴۵۸ء/ ۸۶۲ھ میں خراسان پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن تیموری سلطان ابوسعید سے صلح کے بعد خراسان خالی کر دیا۔ آخری زمانے میں خراسان کو چھوڑ کر تقریباً تمام ایران اور عراق جہاں شاہ کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ ۱۴۶۶ء/۸۷۱ھ میں ایک دوسرے ترکمان حکمران اوزون حسن آق قویونلو نے اچانک حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور دو سال بعد قرہ قویونلو کی حکومت کو ختم کر دیا۔

آق قویونلو (۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ تا ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ)

ایل خانیوں کے زوال کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئی تھیں ان میں سب سے پائیدار اور

طاقتور آق قویونلو یا سفید بھیڑ والے ترکمانوں کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا بانی ایک ترکمان قرہ عثمان (۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ تا ۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ) تھا۔ اس نے تیمور کی اطاعت کر لی تھی اور انقرہ کی جنگ (۱۴۰۲ء) میں تیمور کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے صلہ میں تیمور نے اس کو دیار بکر کا علاقہ دے دیا۔

اس خاندان کا سب سے ممتاز حکمران اوزون حسن (۱۴۶۶ء/۸۷۱ھ تا ۱۴۷۸ء/۸۸۳ھ) ہوا ہے۔ اس نے ۸۷۱ھ میں قرہ قویونلو حکمران جہاں شاہ کو شکست دے کر سیاہ بھیڑ والے ترکمانوں کی حکومت ختم کر دی اور ۱۴۶۸ء/۸۷۳ھ میں تیموری سلطان ابو سعید کو بھی شکست دے کر قتل کر دیا اور سلطنت کو خراسان اور ہرات تک توسیع دے دی۔ اب وہ پورے ایران اور مشرقی اناطولیہ کا بلا شرکت غیرے حکمران تھا۔ قرہ قویونلو اور تیموریوں کے خلاف ان کامیابیوں نے اوزون حسن کے حوصلے بڑھا دیئے اور اس نے باقی اناطولیہ پر بھی قبضہ کرنا چاہا اور اس غرض سے وینس کی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن اناطولیہ عثمانی سلطنت کے مشہور حکمران محمد فاتح جیسے طاقتور حکمران کے قبضہ میں تھا۔ اناطولیہ کے شہر ارزنجان کے قریب اور تلک بیلی otlukbeli کے مقام پر اوزون حسن اور محمد فاتح کے درمیان ۱۴۷۳ء میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں اوزون حسن نے شکست فاش کھائی اور وہ مشرقی اناطولیہ کے ایک بڑے حصے سے بھی محروم ہو گیا۔

اوزون حسن کے بعد اس کا لڑکا یعقوب (۱۴۷۸ء/۸۸۳ھ تا ۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ) حکمران ہوا۔ جو ایک اچھا اور کامیاب حکمران تھا۔ اس کے بعد آق قویونلو کا زوال شروع ہو گیا۔ ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ میں بالآخر نئی ابھرتی ہوئی صفوی سلطنت کے حکمران شاہ اسمٰعیل نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

آق قویونلو حکومت کا صدر مقام پہلے دیار بکر تھا جہاں اُس زمانے میں متعدد عمدہ عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ بعد میں تبریز دارالحکومت ہو گیا۔ اس خاندان کے بعض حکمرانوں نے علم و ادب کی سرپرستی بھی کی۔ ایران کے مشہور عالم جلال الدین دوانی (۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء تا ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء) نے اپنی مشہور عالم کتاب "اخلاق جلالی" سلطان اوزون حسن کے نام معنون کی تھی۔

سلاطین کرت

مذکورہ بالا چار بڑی حکومتوں کے علاوہ ہرات میں سلاطین کرت کی چھوٹی حکومت بھی قابل ذکر ہے۔ سلاطین کرت کا تعلق علاقہ غور سے تھا اور ہرات میں منگولوں سے پہلے سے ان کا اقتدار قائم تھا۔ شروع میں انہوں نے منگولوں کی اطاعت کر لی لیکن ایل خانیوں کے زوال کے بعد وہ خود مختار ہو گئے۔ سلاطین کرت کا دور حکومت ۱۲۴۵ء/۶۴۳ھ سے ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ تک ہے۔ اس خاندان کی حکومت تیمور نے ختم کر دی۔

سلاطین کرت علم دوست تھے۔ ان کے زمانے کی سب سے بڑی علمی شخصیت سعد الدین تفتازانی ۷۲۲ھ/۱۳۲۲ء تا ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) کی ہے۔ وہ ایک ممتاز ترک عالم تھے اور منطق اور علم کلام سے متعلق سولہ کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے سعدی کی بوستاں کا ترکی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔

جلائر

(۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۴۱۰ء/۸۱۳ھ)

(۱) حسن بزرگ ۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ

(۲) اویس ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ تا ۱۳۷۴ء/۷۷۵ھ

(۳) حسین ۱۳۷۴ء/۷۷۵ھ تا ۱۳۸۲ء/۷۸۶ھ

(۴) احمد ۱۳۸۲ء/۷۸۶ھ تا ۱۴۱۰ء/۸۱۳ھ

آل مظفر

(۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۹۳ء/۷۹۵ھ)

(۱) مبارز الدین محمد ۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۵۷ء/۷۵۹ھ

(۲) شاہ شجاع ۱۳۵۷ء/۷۵۹ھ تا ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ

(۳) زین العابدین ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ تا ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ

(تیمور نے نکال کر شیراز پر قبضہ کرلیا)

(۴) شاہ یحییٰ ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ یزد میں حکمران

(۵) سلطان احمد ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ کرمان میں حکمران

(۶) شاہ منصور ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ تا ۱۳۹۳ء/۷۹۵ھ اصفہان میں حکمران

قرہ قویونلو

(۱) بیرم خواجہ ۱۳۷۵ء/۷۷۷ھ تا ۱۳۸۰/ ۷۸۲ھ

(۲) قرہ محمد ۱۳۸۰ء/۷۸۲ھ تا ۱۳۹۰ء۷۹۲ھ

(۳) قرہ یوسف ۱۳۹۰ء/۷۹۲ھ تا ۱۴۱۹ء/۸۲۲ھ

(۴) امیر اسکندر ۱۴۱۹ء/۸۲۲ھ تا ۱۴۳۴ء/۸۳۸ھ

(۵) جہاں شاہ ۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۶۶ء/۸۷۰ھ

آق قویونلو

(۱۴۰۲ء/۸۰۵ھ تا ۱۵۰۲ء/۹۰۸ھ)

(۱) فخر الدین قرہ یولوق عثمان ۱۴۰۲ء/۸۰۵ھ تا ۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ

(۲) علی جلال الدین ۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۳۸ء/۸۴۲ھ

(۳) نور الدین حمزہ ۱۴۳۸ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۴۴/ ۸۴۸ھ

(۴) جہانگیر ۱۴۴۴ء/۸۴۸ھ تا ۱۴۵۳ء/۸۵۷ھ

(۵) اوزون حسن (نصرۃ الدین ابونصر) ۱۴۵۳ء/۸۵۷ھ تا ۱۴۷۸ء/۸۸۲ھ

(۶) یعقوب ۱۴۷۸ء/۸۸۲ھ تا ۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ

(۷) بائیسنقر ۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ تا ۱۴۹۲ء/۸۹۷ھ

(۸) رستم ۱۴۹۲ء/۸۹۷ھ تا ۱۴۹۸ء/۹۰۳ھ

(۹) احمد	۱۴۹۸ء/۹۰۲ھ	تا	۱۴۹۸ء/۹۰۳ھ
(۱۰) محمد مرزا	۱۴۹۸ء/۹۰۳ھ	تا	۱۵۰۰ء/۹۰۵ھ
(۱۱) سلطان الوند	۱۴۹۸ء/۹۰۳ھ	تا	۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ
(۱۲) سلطان مراد	۱۴۹۸ء/۹۰۳ھ	تا	۱۵۰۸ء/۹۱۴ھ

احمد کے بعد محمد مرزا، الوند اور مراد میں لڑائیاں جاری رہیں۔ بالآخر اسمٰعیل صفوی نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مراد شکست کھا کر بغداد بھاگ گیا جہاں اس نے ساڑھے چار سال حکومت کی۔

باب ۵

وسط ایشیا کے تیموری

(۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ تا ۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ)

ایل خانیوں کے بعد قائم ہونے والی وہ تمام حکومتیں جن کا حال پچھلے باب میں گزر چکا ہے چودھویں صدی کے آخر میں وسیع تر تیموری سلطنت میں شامل کر لی گئیں یا اس کی باجگذار بنالی گئیں۔

(۱) امیر تیمور

(۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ تا ۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ)

تیموری سلطنت کا بانی تیمور ایک ترک قبیلے برلاس سے تعلق رکھتا تھا جس کا چنگیز خاں کے خاندان سے قریبی تعلق تھا۔ عہد قدیم کے ایک معاہدہ کے تحت حکومت کے فرائض چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سپہ سالاری برلاس خاندان سے۔ تیمور دریائے جیحوں کے شمالی کنارے پر واقع شہر سبز میں جس کو کش بھی کہتے تھے ۱۳۳۶ء/۷۷۶ھ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت چغتائی سلطنت میں شامل تھا جو زوال کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ چغتائی حکمران بے بس ہو چکے تھے اور ہر جگہ منگول اور ترک سردار اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ تیمور نے جو ایک اچھا سپاہی اور بے مثل سپہ سالار تھا ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور تمام مقامی سرداروں کو شکست دینے کے بعد ۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ میں بلخ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک وہ ترکستان اور موجودہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے صاحب قران[1] کا لقب اختیار کیا۔ تیمور اگرچہ اب آزاد اور خودمختار حکمران تھا لیکن اس نے خود کو ہمیشہ امیر کہا کیونکہ معاہدے کے تحت حکمرانی کا حق چنگیز خاں کی اولاد کو حاصل

---

(۱) علم نجوم کی رو سے وہ شخص صاحب قران کہلاتا ہے جس کی پیدائش کے وقت زہرہ اور مشتری یا زحل اور مشتری ایک ہی برج میں ہوں۔ ایسا شخص اقبال مند، بہادر اور جری سمجھا جاتا ہے۔ مجازاً اپنے دور کا عظیم ترین حکمران۔

تھا۔ تیمور نے اس غرض سے عرصے تک چنگیز خاں کے خاندان کے ایک شخص کو بادشاہ بنائے رکھا لیکن اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔

فتوحات

بلخ میں تخت نشین ہونے کے بعد تیمور نے ان تمام علاقوں اور ملکوں پر قبضہ کرنا اپنا حق اور مقصد قرار دیا جن پر چنگیز خاں کی اولاد حکومت کر چکی تھی۔ اس غرض سے اس نے فتوحات اور لشکر کشی کے ایک ایسے سلسلے کا آغاز کیا جو اس کی موت تک پورے ۳۷ سال جاری رہا۔ تیمور کے ابتدائی چند سال چغتائی سلطنت کے باقی ماندہ حصوں پر قبضہ کرنے میں صرف ہوئے۔ وہ ۷۷۶ھ میں کاشغر اور ۷۸۱ھ میں خوارزم پر قابض ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے خراسان کا رُخ کیا۔ ۱۳۸۱ء/۷۸۳ھ میں ہرات کے خاندان کرت کو اطاعت پر مجبور کیا۔ اگلے سال نیشاپور اور اس کے نواح پر اور ۷۸۵ھ میں قندھار اور سبستان پر قبضہ کیا۔ ۱۳۸۶ء/۷۸۸ھ میں اس نے ایران کی مہم کا آغاز کیا جو یورش سہ سالہ کہلاتی ہے اور اس کے دوران مازندران سے آذربائیجان تک پورے شمالی ایران پر قابض ہوگیا۔ اس مہم کے دوران اس نے گرجستان پر بھی قبضہ کیا۔

رُوس کی مہم

۱۳۹۱ء/۷۹۳ھ میں تیمور نے سیر اُوردہ یعنی سرائے کے خان توقتمش کے خلاف لشکر کشی کی جو فوجی نقطۂ نظر سے فن حرب کا ایک عظیم کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ سرائے کے خان توقتمش کو سائبیریا کے آق اوردہ خاندان کے حکمران اُرس خاں نے تخت سے بے دخل کر دیا تھا۔ تیمور نے توقتمش کی مدد کی اور اس کو دوبارہ تخت دلا دیا، لیکن توقتمش خوارزم کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا تھا، اس لیے اس نے تیمور کا احسان ماننے کی بجائے تیمور سے خوارزم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ خوارزم دونوں حکمرانوں کے درمیان ایک مستقل نزاع بن گیا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے توقتمش بار بار تیموری مملکت پر حملہ آور ہوا۔ کبھی سیر دریا اور خوارزم کے راستے اور کبھی قفقاز اور آذربائیجان کے راستے۔ تیمور نے توقتمش کی سرکوبی کے لیے دو مرتبہ روس پر لشکر کشی کی۔ ان میں پہلی لشکر کشی ۱۳۹۱ء/۷۹۳ھ میں سیر دریا یعنی دریائے سیحوں کے راستے کی گئی۔ تیمور اپنے عظیم لشکر کو قزاقستان

کے راستے جنوبی ارتش اور یورال تک بے آب وگیاہ میدانوں اور برف زاروں سے کامیابی سے گزار کر لے گیا اور دریائے قندزجہ کے کنارے موجودہ سمارہ کے قریب ۱۸۔ اپریل ۱۳۹۱ء/ ۷۹۳ھ کو توقتمش کو ایک خونریز جنگ میں شکست دی۔

روس کی مہم سے واپسی کے بعد تیمور نے ایران میں نئی لشکر کشی کا آغاز کیا جو یورش پنج سالہ (۱۳۹۲ء/۷۹۳ھ تا ۱۳۹۵ء/۷۹۷ھ) کہلاتی ہے۔ اس مہم کے دوران اس نے ہمدان، اصفہان اور شیراز کو فتح کیا۔ آل مظفر کی حکومت کو ختم کیا اور بغداد اور عراق سے احمد جلائر کو بے دخل کیا۔ اطرح وہ پورے ایران اور عراق پر قابض ہوگیا۔ تیمور ایران کی مہم سے فارغ ہوکر ابھی تبریز واپس آیا ہی تھا کہ اس کو اطلاع ملی کہ توقتمش نے دربند کے راستے پھر حملہ کردیا ہے۔ تیمور نے دریائے تیرک کے کنارے ۱۵۔ اپریل ۱۳۹۵ء/ ۷۹۷ھ کو ایک بار پھر توقتمش کو شکست فاش دی۔ اس کے بعد تیمور نے پیش قدمی کرکے سیر اوردہ کے دارالحکومت سرائے کو تباہ برباد کردیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس مہم کے دوران تیمور استراخان، موسکو کیف اور کریمیا کے شہروں کو فتح کرتا اور تباہی پھیلاتا ہوا براہ قفقاز گرجستان اور تبریز ۷۹۸ھ میں سمرقند واپس آ گیا۔

ہندوستان پر حملہ

۱۳۹۸ء/۸۰۱ھ میں تیمور ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ ملتان اور دیپالپور ہوتا ہوا دسمبر ۱۳۹۸ء/ ۸۰۱ھ میں دہلی پہنچا۔ دہلی کو فتح کرنے اور وہاں قتلِ عام کرنے کے بعد میرٹھ گیا اور وہاں سے دریائے جمنا کی بالائی وادی میں ہردوار میں جو ہندوؤں کا مقدس مقام ہے لوگوں کا یہ سمجھ کر قتل عام کیا کہ کافروں کو مار کر ثواب کمایا جارہا ہے۔ اس جگہ تیمور کو اپنی سلطنت کی مغربی سرحدوں سے تشویش ناک خبریں ملیں۔ احمد جلائر سلطان مصر کی مدد سے پھر بغداد واپس آ گیا تھا اور اس کے اور قرہ یوسف ترکمان کے ورغلانے سے عثمانی سلطان بایزید یلدرم ان سب کے ساتھ مل کر تیمور کے خلاف محاذ بنا رہا تھا۔ چنانچہ تیمور فوراً سمرقند واپس ہوا۔

سمرقند سے تیمور ۱۳۹۹ء/ ۸۰۱ھ میں اپنی آخری اور طویل ترین مہم پر روانہ ہوا۔ تبریز پہنچ کر اس نے سلطان مصر کے پاس سفیر بھیجے جن کو قتل کردیا گیا۔ چنانچہ تیمور سلطان مصر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا جو احمد جلائر کی مدد اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سیورس، حلب، حماہ، حمص اور بعلبک فتح

کرتا ہوا دمشق پہنچا اور حسب دستور لوگوں کا قتل عام کیا اور شہر میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد بغداد آیا لیکن احمد جلائر اس کے بغداد پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔

جنگ انقرہ

اس دوران میں سلطان بایزید نے احمد جلائر اور قرہ یوسف کی تحریک پر جو اس کے پاس پناہ گزیں تھے ایشیائے کوچک میں تیموری علاقوں پر حملہ کیا۔ تیمور نے اختلافات کو خط و کتابت کے ذریعے حل کرنا چاہا لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے مملکت عثمانیہ پر لشکر کشی کر دی۔ سیورس کا دفاع کرنے والے چار ہزار سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا۔ بایزید اس وقت قسطنطنیہ (استنبول) کے محاصرے میں مصروف تھا۔ تیمور کے حملے کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھا کر فوراً اناطولیہ کی طرف روانہ ہوا۔ انقرہ کے قریب ۲۱۔ جولائی ۱۴۰۲ء/ ۸۰۴ھ کو فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ بایزید کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا لیکن تیمور اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آیا۔ یہ روایت کہ تیمور نے اس کو پنجرہ میں قید کر دیا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا بالکل غلط ہے۔ انقرہ کی جنگ کے بعد تیمور کے لشکر نے بروصہ اور ازمیر تک سارا ایشیائے کوچک اجاڑ ڈالا۔ مصر کے مملوک سلطان کو جب اطلاع ملی کہ تیمور نے بایزید جیسے طاقتور حکمران کو شکست دے کر گرفتار کر لیا تو سفیر بھیج کر تیمور کی اطاعت کر لی۔ مصر میں تیمور کے نام کا سکہ ڈھالا اور مکہ اور مدینہ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔

سمرقند واپس آنے کے بعد تیمور نے چین پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چین بھی ایک زمانے میں چنگیز خاں کی اولاد کے قبضے میں رہ چکا تھا اس لیے تیمور اس پر بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ تیمور کفارانِ چین کے خلاف جہاد کر کے اس خونریزی کی تلافی کرنا چاہتا تھا جس کا شکار اب تک صرف مسلمان ہوئے تھے۔ سردیاں شباب پر تھیں اور تیمور بوڑھا تھا۔ سیر دریا کو پار کر کے جو منجمد ہو چکا تھا جب وہ اترار پہنچا تو اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور اسی جگہ ۱۸۔ فروری ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۵ء کو انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش سمرقند لا کر دفن کر دی گئی۔ لڑائیوں میں زخم کھانے کی وجہ سے تیمور کا دایاں ہاتھ شل ہو گیا تھا اور دائیں پاؤں میں لنگ تھا۔ اس لیے مخالف مورخین اس کو حقارت سے تیمور لنگ لکھتے تھے۔

تیمور بحیثیت فاتح اور حکمران

فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے تیمور کا شمار سکندر اعظم اور چنگیز خاں کے ساتھ دنیا کے تین سب سے بڑے فاتح سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ فتوحات کی کثرت میں وہ شاید چنگیز سے بھی بازی لے گیا۔ چنگیز کے مفتوحہ علاقہ کا طول مشرق سے مغرب تک بہت زیادہ تھا لیکن شمالاً جنوباً عرض تیمور کے مقابلہ میں کم تھا۔ پھر چنگیز کی سلطنت کا ایک بڑا حصہ اس کے سپہ سالاروں نے فتح کیا تھا جب کہ تیمور دہلی سے ازمیر تک اور موسکو سے دمشق اور شیراز تک ہر جگہ خود گیا اور ہر جنگ میں خود شرکت کی۔ چنگیز جنگ کی منصوبہ بندی اچھی کرسکتا تھا جب کہ تیمور میدان جنگ میں فوجوں کولڑانے میں استاد تھا۔[1] تیمور فن محاصرہ کا بھی استاد تسلیم کیا گیا ہے۔ کلات اور تکریت (۱۳۹۴ء/ ۷۹۶ھ) کے ناقابل تسخیر پہاڑی قلعوں کی تسخیر اس کی اس صلاحیت کا بڑا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔

تیمور کی بحیثیت ایک سپہ سالار حیرت انگیز صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نے اس خداداد صلاحیت سے جو کام لیا وہ اسلامی روح کے خلاف تھا۔ اس کی ساری فتوحات کا مقصد ذاتی شہرت اور ناموری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس لحاظ سے وہ خالدؓ بن ولید، اور محمود غزنوی، طغرل اور صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ انتقام کے معاملے میں بھی بہت سخت تھا۔ مخالفت برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مسلمان ہونے کے باوجود خونریزی اور سفاکی میں چنگیز اور ہلاکو سے کم نہیں تھا۔ دہلی، اصفہان بغداد اور دمشق میں اس نے جو قتل عام کئے ان میں ہزاروں بے گناہ موت کا شکار ہو گئے۔ وہ انتقام کی شدت میں شہر کے شہر ڈھا دیتا تھا۔ خوارزم، بغداد اور سرائے کے ساتھ اس نے یہی کیا۔ صرف مسجد، مدرسے اور خانقاہیں غارت گری سے محفوظ رہتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں منگولوں کی طرح وہ بھی اللہ کا عذاب تھا۔

تیمور نے اپنی فتوحات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور کوئی تعمیری کام نہیں کیا۔ مفتوحہ ممالک کا بڑا حصہ ایسا تھا جس کو اس نے اپنی سلطنت کا انتظامی حصہ نہیں بنایا۔ ان ملکوں کو وہ مقامی حکمرانوں کے سپرد کردیتا تھا اور ان سے صرف اطاعت کا وعدہ لے کر مطمئن ہوجاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

(۱) چنگیز اور تیمور کی جنگی صلاحیتوں کے تقابل کے لیے دیکھیے ہیرلڈ لیمب کی کتابیں ''چنگیز خاں'' اور ''تیمور''۔ ان دونوں کتابوں کا مولوی عنایت اللہ مرحوم نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور ان میں دونوں عظیم فاتحوں کے کارناموں کا جنگی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ایشیائے کوچک، شام، روس اور ہندوستان کے وسیع مفتوحہ علاقے جو بڑی خونریزی کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ تیموری سلطنت کا حصہ نہ بن سکے۔ اگر وہ ان ملکوں کو اپنی سلطنت کا انتظامی حصہ بنالیتا تو دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت وجود میں آجاتی۔ اس معاملے میں چنگیز اور منگول تیمور سے بہتر تھے کہ وہ جس علاقے کو فتح کرتے تھے اس کو براہ راست اپنے زیر انتظام بھی لے آتے تھے۔ اس نے قفقاز کے علاقے میں لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش بھی کی جو اسلام کی روح اور تعلیم کے خلاف ہے۔

تیمور نے توقتمش' بایزید اور سلطان مصر کو شکست دے کر عالم اسلام کی دو بڑی طاقتوں کو ختم تو کر دیا، لیکن ان کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پر نہ کر سکا۔ اگر بایزید کی طاقت ختم نہ ہوتی تو بلقان کا علاقہ ڈیڑھ سو سال پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا ہوتا۔ سرائے کی مملکت کی تباہی بھی اسلامی دنیا کے لیے اچھی ثابت نہ ہوئی۔ سرائے کی طاقتور مملکت کے ختم ہونے سے موسکو کی نئی طاقت کے ابھرنے کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ تیمور نے رُوس میں توقتمش کے خلاف اور ایشیائے کوچک اور مصر میں عثمانی مملکت اور مملوک مملکت کے خلاف جو لشکر کشی کی اگرچہ ہم اس کا الزام تیمور پر نہیں رکھ سکتے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے صلح وصفائی سے مسئلہ کو حل کرنے کی پوری کوشش کی تھی، لیکن ان لشکر کشیوں کے نتیجے میں دنیائے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی تاریخ میں تیمور کا دَور ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس دَور میں دنیا کو فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ پہنچا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ تیمور کو مناسب اسلامی تربیت نہیں ملی تھی اور اس کی نشوونما تورۂ چنگیزی کی حدود میں اور نیم وحشی منگول معاشرے میں ہوئی تھی۔

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس علاقے میں تیمور نے اپنی مستقل حکومت قائم کی، وہاں اس نے قیام امن، عدل وانصاف، خوشحالی اور ترقی کے سلسلے میں قابل قدر کوششیں کیں۔ برباد شدہ شہروں کو دوبارہ تعمیر کیا اور تجارت کو فروغ دیا۔

سمرقند

دارالسلطنت سمرقند پر اس نے خاص توجہ دی۔ ہیرلڈ لیمب نے لکھا ہے کہ جس وقت سمرقند

پر تیمور کا تسلط ہوا تھا وہاں سوائے کچی اینٹوں اور لکڑی کے مکانوں کے اور کچھ نہ تھا مگر یہی کچی اینٹوں اور لکڑی کا شہر تیمور کے ہاتھوں میں آ کر ایشیا کا رومہ بن گیا۔ تیمور ہر مفتوحہ علاقے سے صناعوں، دستکاروں، فن کاروں، عالموں اور ادیبوں کو پکڑ پکڑ کر سمرقند لے آیا اور اپنے دارالحکومت کو نہ صرف شاندار عمارتوں کا شہر بنا دیا بلکہ علم وادب کا مرکز بھی بنا دیا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کی اولاد نے اس کی ان ہی آخر الذکر روایات کو اپنایا جس کی بدولت وسط ایشیا کے تیموری دَور کو تاریخ میں ایک ممتاز مقام مل گیا۔

تیمور نے سمرقند کی شہر پناہ درست کی۔ شہر کے دروازوں سے وسط شہر کے بازار راس الطاق تک چوڑی چوڑی سڑکیں تیار کروائیں۔ جن کا فرش سنگین تھا۔ جنوب کے پہاڑ پر مکانات تھے ان کو گرا کر قلعہ تعمیر کیا۔ شہر سے دریا تک سڑکیں بنوا دیں۔ باغوں کے گرد دیواریں بنوائیں۔ جا بجا پانی کے پختہ تالاب تیار کرائے۔ عمارتیں اب تک خاکی رنگ کی ہوتی تھیں لیکن اب در و دیوار، بُرج اور گنبد فیروزی رنگ کے ہو گئے اور اس لاجوردی رنگ کی وجہ سے سمرقند کو گوک کند یعنی نیلا شہر کہنے لگے۔ تیمور نے شہر میں ایک چڑیا گھر بھی قائم کیا جس میں جانور قدرتی حالت میں پھرتے تھے۔ تیمور کے زمانے میں صرف اَرک کے علاقے میں ڈیڑھ لاکھ آبادی تھی یہ علاقہ قلعہ اور اس سے متصل آبادی پر مشتمل تھا۔

تیمور کے انتقال کے ایک سو برس بعد جب بابر نے سمرقند دیکھا تھا تو وہ اپنی پرانی دل کشی کسی قدر کھو چکا تھا اور رو بہ زوال تھا۔ اس کے باوجود بابر نے اپنی تزک میں اس کا جو حال لکھا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''یہ سمرقند جو ہمیں اللہ کی طرف سے عطا ہوا اپنی خوبیوں اور لطائف کے اعتبار سے عالم میں انتخاب ہے۔ یہ شہر حضرت تیمور کا پایۂ تخت تھا۔ اس سے پہلے کسی بڑے تاجدار نے اسے یہ شرف نہ بخشا تھا۔ سمرقند میں انگور، خربوزہ، سیب، انار اور دوسرے قسم کے پھل ہوتے ہیں، خصوصیت سے انگور اور سیب تو بہت مشہور ہیں۔ سردیوں میں بڑے زور کی سردی پڑتی ہے مگر کابل جیسی برفباری نہیں ہوتی۔ آب و ہوا خوب ہے لیکن گرمیاں جیسی کابل میں مزے دار گزرتی ہیں ایسی نہیں گزرتیں۔

امیر تیمور نے سمرقند کو خوب رونق بخشی تھی۔ بہت سی عمارتیں بنوائیں اور باغات لگوائے۔ سمرقند کی عمارات میں سب سے شاندار امیر تیمور کا محل ہے جو ارک سرائے کے نام سے مشہور ہے۔ محل کے بعد یہاں کی جامع مسجد اول درجے کی ہے۔ اس کے پیش طاق پر لکھی ہوئی آیت کریمہ "اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ" اس قدر جلی حروف میں ہے کہ ایک کوس سے پڑھی جاتی ہے۔ امیر تیمور کے بنائے ہوئے دو باغ بھی سمرقند کے عجائبات میں سے ہیں۔ امیر تیمور کے وارثوں میں سے محمد سلطان مرزا، الغ بیگ مرزا اور دوسروں نے بھی کئی عمارات بنوائیں، جن میں خانقاہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا گنبد اتنا بڑا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ خانقاہ سے ملحقہ مدرسہ میں گو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اس کا حمام تو پورے خراسان اور ماوراء النہر میں اپنی مثال آپ ہے۔ مدرسہ کے جنوب میں مسجد منقطع بھی اپنی خصوصیت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ لکڑی کے ٹکڑے خوبصورتی سے کاٹ کاٹ کر اس کی دیواریں اور چھتیں سجائی گئی ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں ایک بڑی رصدگاہ ہے جہاں الغ بیگ نے زیج گورگانی مرتب کی۔ سمرقند کی قابل ذکر عمارتوں میں چہل ستون کی عمارت بھی ہے۔ اس عمارت سے متصل ایک وسیع باغیچہ ہے جس میں ایک عجیب وغریب بارہ دری بنی ہے جس کا نام چینی خانہ ہے۔ سمرقند کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ یہاں پر پیشے اور صنعت کے بازار الگ الگ ہیں۔ سمرقند میں بہت نفیس کاغذ تیار ہوتا ہے جس کی ساری دنیا میں مانگ ہے۔ سمرقند کے مرغزار بھی اپنی سرسبزی اور شادابی کی وجہ سے اپنی نظیر آپ ہیں"

(۲) تیمور کے جانشین

شاہ رُخ (۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ تا ۱۴۴۷ء/۸۵۰ھ)

تیمور نے اپنی سلطنت کو اس زمانے کی رسم کے مطابق اولاد میں تقسیم کر دیا تھا۔ نصف فتوحات سے دست بردار ہو جانے کی وجہ سے تیموری سلطنت پہلے ہی نصف رہ گئی تھی، اب اس

تقسیم نے اس کے مزید ٹکڑے کر دیئے۔ آذر بائیجان، عراق اور ملحقہ علاقے میران شاہ کو ملے اور خراسان اس کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ رُخ کو، سمرقند اور ماوراء النہر خلیل کو ملا جسے امراء نے تیمور کا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن تیمور کی وفات کے بعد تیمور کی اولاد میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں کامیابی شاہ رُخ ۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ تا ۱۴۴۷ء/۸۵۰ھ کو حاصل ہوئی۔ اس نے ۱۴۰۶ء/ ۸۰۹ھ میں مازندران اس کے اگلے سال سیستان اور ۱۴۰۹ء/۸۱۱ھ میں ماوراء النہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ میں شاہ رُخ نے فارس ۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ میں کرمان بھی فتح کر لیا۔ میران شاہ نے پہلے ہی یعنی ۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ میں شاہ رُخ کی اطاعت کر لی تھی۔ اس طرح شاہ رُخ نے اپنے باپ کی وفات کے بارہ سال بعد تیموری سلطنت کی حدود کو پھر بحال کر دیا۔ شاہ رُخ سے وسط ایشیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دَور لشکر کشی کا نہیں بلکہ امن و خوشحالی، تعمیر و ترقی اور علوم و فنون کے فروغ کا دَور ہے۔ شاہ رخ اپنے باپ سے بالکل مختلف طبیعت لے کر آیا تھا۔ وہ ظلم و جبر کی بجائے رحم، محبت، عدل اور نیکی کو پسند کرتا تھا۔ وہ متقی اور عبادت گزار حکمران تھا۔ شاہ رُخ اپنی فطرت کی نیکی اور شرافت کے باوجود کمزور حکمران نہیں تھا۔ اس نے سلطنت کی وحدت اور سالمیت کی پوری قوت سے حفاظت کی اور بغاوتوں کو پوری قوت سے کچل دیا۔ اس کے لیے اس کو تین مرتبہ تبریز اور تین مرتبہ شیراز تک جانا پڑا۔

شاہ رُخ نے علم و ادب اور فنون لطیفہ کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں فارسی کی کئی یادگار کتابیں لکھی گئیں۔ صرف اس کے دربار میں فنون لطیفہ یعنی عمارت سازی، مصوری اور موسیقی کے چار سو باکمال لوگ موجود رہتے تھے۔ اس کو عمارتیں اور باغات بنانے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے عہد میں کثرت سے مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور مسافر خانے تعمیر ہوئے اور ان کے اخراجات کے لیے اوقاف قائم کیے گئے۔ اس کے علم دوست بیٹے الغ بیگ نے جو سمرقند کا گورنر تھا شہر سمرقند میں ۸۲۴ھ میں ایک عالی شان مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی۔ سمرقند کی مشہور رصدگاہ بھی جس میں فلکیاتی تجربے کیے جاتے تھے اسی دور میں تعمیر ہوئی۔

شاہ رُخ کا دوسرا بیٹا بائے سفر (۱۳۹۳ء تا ۱۴۳۳ء) مصوری اور کتابوں کی تزئین و آرائش کا ماہر تھا۔ بہترین خطاط تھا۔ اس کے کتب خانے میں چالیس خطاط کتابوں کی نقلیں کرنے پر مقرر رہتے تھے۔

قوام الدین شیرازی اپنے دور کا سب سے بڑا ماہر فن تعمیر تھا۔ ہرات اور مشہد کی شاندار عمارتیں اس کی مہارت فن کو ثابت کرنے کے لیے آج بھی موجود ہیں۔ شاہ رُخ کے وزیروں میں خواجہ غیاث الدین کا نام قابل ذکر ہے جس نے تیس سال وزارت کی اور خراسان اور عراق میں رفاہِ عام کی بکثرت عمارتیں تعمیر کیں۔

شاہ رُخ نے ہرات میں ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔

الغ بیگ (۱۴۴۷ء/۸۵۰ھ تا ۱۴۴۹ء/۸۵۲ھ)

شاہ رُخ کے انتقال کے بعد اس کا نیک دل اور علم دوست لڑکا الغ بیگ تخت نشین ہوا۔ الغ بیگ ہُنر پروری اور عدل گستری میں ممتاز تھا۔ وہ ۸۱۴ھ میں ماوراء النہر کا صوبے دار ہو کر سمرقند آیا تھا اور اس نے مختصر عرصہ میں اپنے صوبے کو آباد اور معمور کر دیا۔ الغ بیگ قرآن کو ساتوں قرأت کے ساتھ پڑھ سکتا تھا۔ اپنے زمانے کے بیشتر علوم سے واقف تھا لیکن ریاضی اور علم فلکیات میں بے مثل تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں جو یادگاریں تعمیر کیں ان میں سمرقند کی رصدگاہ بھی شامل ہے۔ یہ رصدگاہ دو ماہرین فلکیات غیاث الدین جمشید اور معین الدین کاشی کی مدد سے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کے دَورِ عروج کی آخری بڑی رصدگاہ تھی جس میں اہم تجربے کیے گئے۔

الغ بیگ اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود ایک کامیاب حکمران ثابت نہ ہو سکا۔ وہ بغاوتوں اور سازشوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کو تخت پر بیٹھے تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کے نالائق لڑکے عبداللطیف نے بغاوت کر کے اس کو قتل کر دیا۔

الغ بیگ کے قتل نے تیموری سلطنت کو ایک بار پھر انتشار کی نذر کر دیا۔ خود عبداللطیف چھ ماہ بعد مارا گیا، لیکن ایک دوسرے تیموری شہزادے ابوسعید مرزا نے جو میران شاہ کے لڑکے محمد مرزا کا بیٹا تھا جلد ہی حالات کو سنبھال لیا۔

ابوسعید (۱۴۵۲ء/۸۵۵ھ تا ۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ)

سلطان ابوسعید وسط ایشیا میں آخری طاقتور تیموری حکمران تھا۔ اس نے ۱۴۵۸ء/۸۶۳ھ تک خراسان، ماوراء النہر، موجودہ افغانستان، آذربائیجان اور شمالی ایران پر اپنی حکومت مضبوطی سے قائم کر لی۔ ۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ میں سلطان ابوسعید قرہ باغ (آرمینیہ) کے پاس آق قویونلو

حکمراں اوزون حسن کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک جنگ میں گرفتار ہوگیا اور اوزون حسن نے اس کو قتل کرادیا۔

مورخین نے ابوسعید کے تدبر، انتظامی صلاحیت اور نیک سیرتی کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ اپنا وقت علماء اور مشائخ کی صحبت میں گذارتا تھا۔

ابوسعید کے بعد تیموری سلطنت اور سکڑ گئی اور اب وہ خراسان، افغانستان اور ماوراء النہر تک محدود ہوگئی۔ اور اس محدود علاقے میں بھی تین آزاد حکومتیں قائم تھیں۔ سمرقند میں ابوسعید کا لڑکا سلطان احمد اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ سے ۱۴۹۴ء/۸۹۹ھ تک حکومت کی۔ اس کا دَور پُرامن تھا۔ ذاتی طور پر سلطان احمد خوش اخلاق تھا۔ اس کے دربار میں علماء وفضلاء جمع رہتے تھے اور اس نے سمرقند میں عالی شان عمارتیں بنوائیں، لیکن سلطان احمد پورے ماوراء النہر پر بھی حکمراں نہیں تھا۔ فرغانہ میں اس کا دوسرا بھائی عمر شیخ مرزا حکمران تھا جو ہندوستان کی تیموری سلطنت کے بانی بابر کا باپ تھا۔ ہرات اور خراسان پر تیمور کے بیٹے عمر شیخ مرزا کے ایک پوتے حسین بائیقرا نے قبضہ کرلیا تھا۔

حسین بائیقرا (۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ تا ۱۵۰۶ء/۹۱۱ھ)

سلطان حسین بائیقرا جس وقت ہرات کے تخت پر بیٹھا اس وقت خراسان کے علاوہ سارا ایران تیموریوں کے ہاتھ سے نکل کر آق قویونلو کے ہاتھ میں جاچکا تھا۔ اور سلطان احمد کے بعد ماوراء النہر بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا جو آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ اس دَور میں صرف حسین بائیقرا کی مملکت ایسی تھی جس میں امن اور استحکام پایا جاتا تھا۔ سلطان حسین بائیقرا کی سلطنت زیادہ بڑی نہیں تھی پھر بھی موجودہ افغانستان، خراسان اور مازندران اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ حسین بائیقرا کی اصل عظمت سلطنت کی وسعت یا مضبوطی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی رعایا پروری، رفاہ عام کے کاموں اور علوم وفنون کی سرپرستی کی وجہ سے ہے۔ وہ وسط ایشیا میں تیموری خاندان کا آخری ممتاز حکمران تھا اور سوائے شاہ رُخ کے کسی تیموری حکمران کا دَور اُس کے دور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آخر وقت میں اگر وہ اپنے کردار کو عیش پرستی سے داغدار نہ کرلیتا تو تاریخ میں اس کا مقام اور بلند ہوتا۔

اس دور کی مشہور فارسی تاریخ روضۃ الصفا کے مصنف کے مطابق حسین بائیقرا شریعت کی تقویت میں بقدر امکان کوشش کرتا تھا اور بدعت اور ضلالت کے استیصال کی کوشش کرتا تھا۔ سادات علماء اور شعراء کی طرف سے کبھی غفلت نہیں کرتا تھا۔ ان کو انعامات دیتا تھا۔ ہفتہ میں دو بار پیر اور جمعرات کو علماء اور قاضیوں کی مجلس طلب کرتا تھا اور تمام معاملات ان کے مشوروں اور فیصلوں کے مطابق طے کرتا تھا۔ صحبت درویشاں اور مجالس وعظ میں بہت جاتا تھا۔ مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور مسافر خانے بنانے کی طرف انتہائی مائل تھا اور ان کے لیے مستقل اوقاف قائم کر رکھے تھے۔ یہ اوقاف اپنے مال سے خرید کر وقف کرتا تھا۔ محل اور عمارتیں بنانے کا شوق تھا، اسی طرح باغ، درخت اور پھول لگانے سے دلچسپی تھی۔

ہرات

سلطان حسین بائیقرا کے زمانے میں ہرات دنیا کا ایک عظیم الشان شہر بن گیا تھا۔ ہرات کی آبادی کا اندازہ تیمور کے زمانے میں ڈھائی لاکھ تھا۔ اس کے بعد شاہ رخ کے دور میں شہر میں مزید توسیع ہوئی شاندار عمارتیں اور باغ بنائے گئے۔ حسین بائیقرا کے ۳۶ سالہ دور میں شہر کو جو ترقی ہوئی اس کے متعلق بابر نے تزک میں لکھا ہے کہ:

"ساری دنیا میں ہرات کی طرح کوئی دوسرا شہر نہیں تھا۔ سلطان حسین مرزا کے زمانے میں اس کی خوبصورتی اور رعنائی میں دس گنا بلکہ بیس گنا اضافہ ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مجھے ہرات دیکھنے کی بڑی تمنا تھی"

چنانچہ بابر نے ہرات کی اچھی طرح سیر کی اس نے اپنی کتاب میں شہر کی جن قابل ذکر عمارتوں کا ذکر کیا ہے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ ان میں مسجدیں، محل، مدرسے، مقبرے، کاغذ سازی کے کارخانے، پُل، باغ، مچھلیوں کے تالاب، ذخیرہ آب، بُرج، خانقاہیں، شفاخانے اور حمام شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تیموری دَور میں ہرات میں متعدد مدرسے، تین ہزار حمام اور دس ہزار دوکانیں تھیں۔ ہوسکتا ہے یہ اعداد و شمار غلط یا مبالغہ آمیز ہوں، لیکن ان سے شہر کی وسعت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب تیمور کے مصنف ہیرلڈ لیمب نے ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کے بعد

لکھا ہے کہ اس زمانے میں لندن اور پیرس کی آبادی ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور پیرس میں مدرسے تھے، حمام نہیں تھے۔ اسی طرح تزک بابری کے انگریزی مترجم نے لکھا ہے کہ پندرھویں صدی کے آخر میں یورپ کا شائستہ ترین دربار بھی اپنی شان وشوکت میں ہرات کے دربار کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن ہرات کی عظمت اس کی شاندار عمارتوں اور آبادی کی کثرت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ شاہ رُخ اور حسین بائیقرا کے زمانہ میں یہ شہر علوم وفنون کا ایک عظیم مرکز بن گیا تھا۔ حسین بائیقرا کے آخری دور میں شیبانی خاں کی قیادت میں ازبک پورے ماوراء النہر پر قابض ہو چکے تھے اور شیبانی خاں نے دریائے جیحوں کے شمال میں واقع تمام تیموری ریاستوں کو ختم کر دیا تھا۔ اب وہ ہرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حسین بائیقرا اس سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں ۱۱۔ ذی الحجہ مطابق ۱۵۰۶ء/۹۱۱ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ حسین بائیقرا کے لڑکے بدیع الزمان نے دوسرے تیموری شہزادوں کے تعاون سے مرو کے قریب شیبانی خاں کو روکنے کی کوشش کی لیکن شکست کھائی۔ (۱۵۰۶ء/۹۱۱ھ) اس کے بعد اگلے سال مئی ۱۵۰۷ء/ ۹۱۳ھ میں ہرات پر شیبانی خاں کا قبضہ ہو گیا۔ وسط ایشیا میں تیموری اقتدار ختم ہو گیا اور ازبکوں کے دور کا آغاز ہوا۔ بدیع الزمان ایران ہوتا ہوا استنبول چلا گیا جہاں ۱۵۱۷ء/۱۹۲۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ بدیع الزمان کا بیٹا محمد زمان باپ کے مرنے کے بعد قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان چلا آیا جہاں اس نے پرتگیزوں کی مدد سے گجرات کا بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی اور ۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ میں فوت ہو گیا، لیکن سلطان ابوسعید کا پوتا اور فرغانہ کے حکمران عمر شیخ کا بیٹا بابر خوش قسمت ثابت ہوا۔ وسط ایشیا سے بے دخل ہونے کے بعد اس نے پہلے کابل میں اور اس کے بعد دہلی میں ایک نئی تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی شان وشوکت نے آگے چل کر سمرقند و ہرات کی تیموری سلطنت کو بھی گہنا دیا۔

علوم وفنون

تیموری دور علم وادب اور فنون لطیفہ کی ترقی کے لحاظ سے تاریخ کا ایک اہم دور ہے، لیکن ایل خانی دَور کی طرح اس دَور میں بھی جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ علوم حکمت یعنی ریاضی،

طب، کیمیا، سائنس، جغرافیہ اور اس قسم کے دوسرے علوم کی طرف توجہ کم ہوگئی۔ خوارزمی، فارابی، ابن سینا، البیرونی اور عمر خیام جیسی کوئی شخصیت اس دور میں نظر نہیں آتی۔ دینی علوم میں چند نمایاں نام نظر آتے ہیں لیکن ان میں بھی اس خطے کے بخاری، مسلم، ترمذی، سرخسی اور زمخشری کے ہم پلہ لوگ نظر نہیں آتے۔ اگرچہ زیچ الغ بیگ اسی زمانہ میں مرتب ہوئی اور سمرقند کی یہ رصدگاہ جہاں قرون وسطیٰ کی اسلامی تاریخ میں آخری اہم فلکیاتی تجربے کیے گئے اسی دور میں قائم کی گئی اور علوم حکمت پر کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن ایل خانی دور کی طرح تیموری دور میں بھی اہم ترین کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں۔ شاہ رُخ کے زمانے میں شرف الدین یزدی نے تیمور کے حالات میں ظفر نامہ لکھا۔ حافظ ابرو نے زبدۃ التواریخ لکھی جو ۱۴۲۶ء تک کے حالات پر مشتمل ایک ضخیم عالمی تاریخ ہے اور عبدالرزاق سمرقندی (۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ تا ۱۴۸۲ء/۸۸۷ھ) نے ''مطلع السعدین'' لکھی جو ایل خانی حکمران ابوسعید کے زمانے سے تیموری حکمران ابوسعید کے زمانے تک کی ایک پر اثر معلومات تاریخ ہے۔ حافظ ابرو نے جغرافیہ پر بھی ایک کتاب لکھی۔ تیمور اور شاہ رخ کے زمانے کے علماء میں جلال الدین دوانی (۱۴۲۷ء/۸۳۰ھ تا ۱۵۰۲/ ۹۰۸ھ) اور فیروز آبادی (۱۳۲۶ء/۷۲۷ھ تا ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ دوانی ایک فلسفی اور عالم دین تھے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب 'اخلاق جلالی' ہے جو آج بھی دینی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ فیروز آبادی عربی کی مشہور لغت 'قاموس' کے مرتب ہیں جو عربی کی بہترین اور مستند لغات میں شمار کی جاتی ہے۔ شاہ رُخ کے دور کے ایک اور ممتاز عالم سید شریف جرجانی (۱۳۳۹ء/۷۳۹ھ تا ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ) تھے۔ انہوں نے عربی اور فارسی میں منطق اور علم کلام پر مفید کتابیں لکھیں۔ وہ شیراز کے رہنے والے تھے۔ اس دور میں علم کلام اور فلسفہ کے ایک اور ماہر عضد الدین ایجی متوفی (۱۳۵۵ء/۷۵۶ھ) تھے۔ اس دور کی ایک اور عظیم شخصیت خواجہ محمد نقشبند (۱۳۱۷ء/۷۱۷ھ تا ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ) کی ہے جو تصوف کے مشہور نقشبندی سلسلے کے بانی ہیں۔ وہ بخارا کے رہنے والے تھے۔

حسین بایقرا کے زمانے کے مورخین میں روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند متوفی ۱۴۹۸ء/ ۹۰۴ھ اور حبیب السیر کے مصنف خواند میر متوفی ۱۵۳۵ء/ ۹۴۲ھ سب سے ممتاز ہیں۔ روضۃ الصفا اور 'حبیب السیر' کا شمار فارسی کی سب سے اچھی تاریخوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح

کی تاریخ عالم ہیں لیکن ان کا سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے تیموری سلاطین کے حالات اور ایران کی تاریخ لکھی ہے۔ حبیب السیر کے مصنف خواندمیر ہرات پر شاہ اسمٰعیل کے قبضے کے بعد کچھ مدت کے لیے ایران چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے کتاب حبیب السیر مکمل کی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان آ گئے اور بابر اور ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور دہلی میں انتقال کیا۔

حسین بائیقرا کے دور کی ایک اور اہم تصنیف 'تذکرہ دولت شاہ سمرقندی' ہے جو ۱۴۸۷ء/ ۸۹۲ھ میں مکمل ہوا اور فارسی زبان میں شاعروں کا بہترین تذکرہ سمجھا جاتا ہے۔

علی شیر نوائی

تیموری دور کا کوئی علمی و ادبی تذکرہ علی شیر نوائی اور مولانا جامی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا جو بلا شک و شبہ اس دَور کی عظیم ترین علمی اور ادبی شخصیتیں ہیں اور جنہوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ ان دونوں کا حسین بائیقرا کے دور سے تعلق ہے۔ علی شیر نوائی ہرات میں ۱۴۴۰ء/ ۸۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۲۔ جمادی الثانی مطابق ۳۔ جنوری ۱۵۰۱ء/ ۹۰۶ھ کو وفات پائی۔ ان کی زندگی کا کچھ حصہ سمرقند اور استرآباد میں بھی گزرا' جہاں وہ کئی سال حسین بائیقرا کے زمانے میں والی رہے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ حسین بائیقرا کے ہم جماعت رہے تھے۔ بائیقرا نے بادشاہ بننے کے بعد اپنی اس دوستی کو آخر تک برقرار رکھا۔ علی شیر نوائی ایک مدت تک حسین بائیقرا کے مہر بردار بھی رہے، لیکن بعض حاسدوں کی سازشوں کو دیکھ کر خود ہی اس عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ علی شیر نہ صرف ترکی زبان کے ایک عظیم شاعر اور ادیب تھے بلکہ وہ اپنے زمانے میں عالموں، شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے سرپرست بھی تھے۔ وہ ۲۹ کتابوں کے مصنف تھے جو زیادہ تر چغتائی ترکی میں ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''محاکمۃ اللغتین'' یعنی دو زبانوں کے درمیان محاکمہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ترکی زبان ایک ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی سے کسی طرح کمتر نہیں۔ ان کی ایک اور کتاب 'مجالس النفائس' اپنے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ علی شیر نوائی ترکی میں 'نوائی' تخلص کرتے تھے اور ان کا شمار ترکی کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ چغتائی ترکی کے وہ بلا شک و شبہ سب سے بڑے شاعر

تھے۔ انہوں نے ترکی زبان میں چار دیوان اور پانچ مثنویاں مرتب کیں۔ مصنف ہونے کے علاوہ نوائی مصور، نغمہ ساز اور موسیقار بھی تھے۔

نوائی صرف ایک امیر تھے لیکن وہ عالموں، شاعروں اور فن کاروں کی سرپرستی میں بادشاہ وقت سے بھی کچھ آگے تھے۔ اس زمانے کے تقریباً تمام باکمال لوگ ان سے وابستہ تھے۔ وہ تیموری دَور کے سب سے بڑے فارسی شاعر اور بزرگ جامی کے دوست اور سرپرست تھے اور جامی نے اپنی کئی کتابیں نوائی کے نام معنون کیں۔ مشہور مورخ میر خواند اور خواند میر کی ان کے دربار میں تربیت ہوئی۔ مصوروں میں بہزاد اور شاہ مظفر اور موسیقاروں میں گل محمد، شیخی نامی، اور حسین عودی کی انہوں نے سرپرستی کی۔ یہ سب اپنے زمانے کے ممتاز ترین فن کار تھے۔

رفاہ عام اور فلاح و بہبود کے کاموں سے نوائی کو خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں خراسان میں تین سو ستر مسجدیں، مدرسے، سرائے، شفاخانے اور خانقاہیں یا تو تعمیر کرائیں یا ان کی تجدید کی۔ صرف ہرات میں انہوں نے بارہ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں جن میں جامع قدسیہ، مدرسہ اخلاصیہ اور ایک شفاخانہ شامل ہیں۔

جامی

حسین بایقرا کے زمانہ کی دوسری عظیم ادبی شخصیت عبدالرحمن جامی (۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء تا ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) کی ہے۔ جامی بہت بڑے مصنف اور شاعر تھے انہوں نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ ایران میں وہ فارسی کے آخری بڑے شاعر تھے، اس کے بعد فارسی کے بڑے شاعر ایران میں نہیں بلکہ برصغیر پاکستان و ہند میں ہوئے، لیکن وہ بھی جامی کے مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ ان کی شاعری نے ایران و ترکی کے شاعروں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی کتاب ''نفخات الانس'' جس میں اولیاء اللہ کے حالات لکھے گئے ہیں بڑی مقبول کتاب ہے۔ ان کی ایک اور اہم کتاب بہارستان ہے جو سعدی کی گلستان کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

فنون لطیفہ

تیموری دَور تک مسلمانوں نے مصوری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ وہ خوشنویسی اور نقاشی میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس کو انہوں نے ایک فن کی شکل دے دی تھی جس کے

نمونے ہر دَور کی مسجدوں، مدرسوں اور شاہی محلوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام میں جاندار چیزوں کی تصویریں بنانا منع ہے، کیونکہ اس طرح بت پرستی سے مشابہت ہوتی ہے جس کا اسلام دشمن ہے۔ لیکن غیر اسلامی اثرات کے تحت مسلمانوں میں آہستہ آہستہ مصوری کا رواج بھی ہو گیا۔ شاید مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب بت پرستی کا خطرہ نہیں رہا اس لیے جاندار چیزوں کی تصویریں بنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ تیموری دَور میں اس فن کی طرف باقاعدہ توجہ دی گئی۔ چین سے مصور بلائے گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو اس کی تربیت دی۔ ان مسلمان شاگردوں نے جلد ہی اس فن میں کمال حاصل کر لیا۔ تیموری دَور کے مصوروں میں بہزاد سب سے زیادہ مشہور ہے جو جدید دَور سے قبل ایران کے سب سے بڑے مصور سمجھے جاتے تھے۔ اس دَور کے ایک دوسرے بڑے مصور شاہ مظفر ہیں۔ ان دونوں نے نوائی کے دربار میں تربیت حاصل کی تھی۔

فن تعمیر نے بھی اس دَور میں بہت ترقی کی اور شاید ترکستان اور ایران میں تیموری دَور سے قبل اتنی شاندار عمارتیں اتنی کثیر تعداد میں کسی ایک دَور میں تعمیر نہیں کی گئیں، جتنی تیموری دَور میں تعمیر ہوئیں۔ سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ گور امیر، بخارا میں الغ بیگ کا مدرسہ، مشہد میں شاہ رُخ کی بیوی گوہر شاد کی مسجد اور ہرات میں مقبرہ شاہ رُخ اور گوہر شاد بیگم فن تعمیر کے اعلیٰ شاہکار ہیں۔ تیموری دَور کے سب سے بڑے مہندس اور ماہر فن تعمیر استاد قوام الدین تھے۔ شاہ رُخ کے دَور کی بیشتر عمارتیں ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ رُخ، الغ بیگ اور حسین بائیقرا کے دَورِ حکومت میں تمدنی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ علم و ادب نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ تیموری حکمرانوں، شہزادوں، امیروں اور وزیروں کی کوششوں سے دارالحکومت ہرات دنیا کا ایک عظیم شہر اور ایک علمی مرکز بن گیا۔ اس دور میں جس کثرت سے اور جس پایہ کے علماء، حکماء، ادیب، شاعر اور فنکار ہرات میں پائے جاتے تھے اس کی مثال پندرھویں صدی میں قاہرہ کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔

تبریز

تیموری دَور کا بیان ختم کرنے سے پہلے آذربائیجان کے شہر تبریز کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر سمرقند اور ہرات دارالحکومت تھے اور علم و ادب کے مرکز، تو شہر تبریز تیموری سلطنت کا

تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ تبریز نے یہ مرکزیت ایل خانیوں کے زمانے ہی میں حاصل کر لی تھی۔ تیموری دَور میں اس کی یہ حیثیت بڑی حد تک قائم رہی۔ تبریز آبادی اور وسعت میں سمرقند اور ہرات سے بڑا تھا۔ یہ اس وقت دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ اسلامی دنیا میں سوائے قاہرہ کے اور کوئی شہر وسعت میں تبریز کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو تبریز کی آبادی تین چار لاکھ سے زیادہ نہیں لیکن ایل خانی اور تیموری دَور میں اس کی آبادی بارہ لاکھ سے زیادہ تھی۔ یورپ کے تاجر اور سیاح جب اس شہر کو دیکھتے تھے تو حیران ہوتے تھے۔

اس زمانہ کا ایک یورپی سیاح لکھتا ہے کہ:

''تمام دنیا میں سب سے بہتر شہر تجارت کے لیے تبریز ہے۔ ہر چیز یہاں کثرت سے ملتی ہے اور ہر چیز یہاں کی ایسی عجیب ہے کہ جب تک کوئی اپنی آنکھ سے نہ دیکھے' سننے کا یقین نہیں آ سکتا۔ یہ شہر جس قدر رقم اپنے بادشاہ کو دیتا ہے وہ اس رقم سے زیادہ ہے جو فرانس کا ملک اپنے بادشاہ کو ادا کرتا ہے''

تیمور کے زمانہ میں اندلس کی عیسائی ریاست قشتالیہ کا سفیر یہاں آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

''شہر کے گلی کوچوں میں نہریں ہیں۔ راستے اور سڑکیں باقاعدہ اور پاک وصاف ہیں۔ بڑی عالیشان عمارتیں ہیں۔ ہر امیر آدمی کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے سے بہتر اور زیادہ خوشنما عمارت بنائے۔ شہر کے بازاروں اور کوچوں میں بہت سے حوض ہیں جن میں فوارے چھوٹتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں ان حوضوں میں برف کے ٹکڑے ڈالے جاتے ہیں اور حوض کی مینڈ پر پیتل اور تانبے کے کوزے رکھے ہوتے ہیں جس کا جی چاہے آئے اور برف کا پانی پیئے۔

یہاں کی مسجدیں بڑی شاندار اور خوشنما ہیں۔ حمام اس قدر اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ دنیا میں کہیں دوسری جگہ نہ ہوں گے''۔

وسط ایشیاء کے تیموری سلاطین

(۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ تا ۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ)

(۱) تیمور	۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ تا ۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ
(۲) شاہ رخ	۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ تا ۱۴۴۷ء/۸۵۰ھ
(۳) الغ بیگ	۱۴۴۷/ ۸۵۰ھ تا ۱۴۴۹ء/۸۵۳ھ
(۴) عبداللطیف	۱۴۴۹ء/۸۵۳ھ تا ۱۴۵۰ء/۸۵۴ھ
(۵) مرزا عبداللہ	۱۴۵۰ء/۸۵۴ھ تا ۱۴۵۲ء/۸۵۵ھ
(۶) ابوسعید	۱۴۵۲/۸۵۵ھ تا ۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ
(۷) سلطان احمد	۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ تا ۱۴۹۳ء/۸۹۹ھ
(۸) حسین بائیقرا	۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ تا ۱۵۰۶ء/۹۱۱ھ

۱۵۰۷ء / ۹۱۳ھ میں ہرات پر شیبانی خاں کے قبضہ کے بعد وسط ایشیا میں تیموری اقتدار ختم ہو گیا۔

اہم واقعات

۱۳۳۶ء/۷۳۶ھ (۲۵۔شعبان مطابق ۸۔اپریل) تیمور کی پیدائش۔

۱۳۶۶ء/۷۷۱ھ بلخ میں تیمور کی تخت نشینی (ماہ رمضان)

۱۳۷۴ء/۷۷۶ھ کاشغر کی فتح۔

۱۳۷۹ء/۷۸۱ھ خوارزم کی فتح۔

۱۳۸۱ء/۷۸۳ھ ہرات پر قبضہ۔

۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ قندھار اور سیستان پر قبضہ۔اگلے سال مازندران پر قبضہ۔

۱۳۸۹ء/۷۹۷ھ اصفہان کی فتح اور شہریوں کا قتل عام۔

۱۳۹۱ء/۷۹۳ھ (۱۸۔ اپریل) توقتمش کو تیمور نے والگا کی وادی میں شکست دی۔

۱۳۹۳ء/۷۹۶ھ بغداد کی فتح۔

۱۳۹۳ء/۷۹۶ھ تکریت کا قلعہ تسخیر کیا۔

۱۳۹۵ء/۷۹۷ھ (۱۵۔ اپریل) تیمور نے توقتمش کو دریائے تیرک (قفقاز) کے کنارے دوسری شکست دی اور اس کے بعد ''سرائے'' کا شہر جلا کر خاک کر دیا۔

۱۳۹۸ء/۸۰۱ھ (۷۔ ربیع الآخر ماہ دسمبر) دہلی کے قریب محمود تغلق کو شکست دی۔ اسی دن شہر میں داخل ہو کر شہریوں کا قتل عام کیا۔ جنگ سے پہلے ایک لاکھ قیدی قتل کر دیے تھے۔

۱۴۰۰ء/۸۰۳ھ سیورس، حلب اور دمشق فتح۔ دمشق کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

۱۴۰۱ء/۸۰۳ھ بغداد میں قتل عام۔

۱۴۰۲ء/۸۰۴ھ (۲۱۔ جولائی) جنگ انگورہ میں بایزید یلدرم کو شکست دی۔

۱۴۰۵ء/۸۰۷ھ (۱۷۔ شعبان ۱۸۔ فروری) تیمور کا انتقال۔

۱۴۹۷ء/۹۰۲ھ بابر کا سمرقند پر پہلی مرتبہ قبضہ۔

۱۵۰۰ء/۹۰۵ھ بابر کا سمرقند پر دوسری مرتبہ قبضہ۔

۱۵۰۶ء/۹۱۱ھ (۱۱۔ ذی الحجہ۔ مئی) حسین بائیقرا کا انتقال۔

۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ (ماہ مئی) شیبانی خان کا ہرات میں داخلہ اور تیموری حکومت کا خاتمہ۔

۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ بابر کا سمرقند پر تیسری مرتبہ قبضہ۔

باب ۶

مصر کے غلام بادشاہ

(۱۲۵۰ء/۶۴۷ھ تا ۱۵۱۷ء/۹۲۲ھ)

اسلامی تاریخ کی یہ ایک بہت بڑی خصوصیت ہے کہ مسلمانوں نے غلاموں کو کبھی ذلت اور حقارت سے نہیں دیکھا اور ان کے ساتھ ویسا انسانیت سوز سلوک کبھی نہیں کیا جیسا رومیوں کے زمانے سے لے کر پچھلی صدی تک مغربی ملکوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں غلاموں کو برابر کا درجہ دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلامی دنیا میں غلاموں کو ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی اور وہ دینی اور دنیوی ترقی کے بلند سے بلند مرتبے پر پہنچے۔ باب سوم میں ہم نیک نام اتابک حکمرانوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اصل میں سلجوقیوں کے غلام تھے۔ اب ہم یہاں غلاموں کے ایک دوسرے سلسلے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے ڈھائی سو سال تک مصر و شام پر شان و شوکت سے حکومت کی۔ تاریخ کا یہ بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ اگر ایک طرف مصر و شام میں غلاموں کی حکومت شروع ہوئی تو دوسری طرف ہندوستان میں بھی غلام خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ (ملاحظہ کیجیے باب ۱۱)

(۱) بحری مملوک

(۱۲۵۰ء/۶۴۷ھ تا ۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ)

مصر و شام کے غلام بادشاہوں کو مملوک کہا جاتا ہے کیونکہ عربی میں مملوک غلام کو کہتے ہیں۔ یہ دو خاندانوں میں تقسیم تھے۔ ایک خاندان بحری مملوکوں کا تھا جنہوں نے ۶۴۷ھ سے ۷۸۴ھ تک حکومت کی اور دوسرا خاندان برجی مملوکوں کا تھا جنہوں نے ۷۸۴ھ سے ۹۲۲ھ تک حکومت کی۔ بحری مملوک نسلاً زیادہ تر ترک اور منگول تھے۔ یہ ملک صالح ایوبی کے غلام تھے اور چونکہ ان کے دریائے نیل کے کنارے آباد کیا گیا تھا اس لیے ان کو بحری مملوک کہا جاتا ہے۔ برجی مملوک زیادہ تر قفقاز کے رہنے والے سرکیشی غلام تھے۔ یہ بحری مملوکوں کے بادشاہ منصور

قلاؤوں کے حفاظتی دستے سے تعلق رکھتے تھے اور قلعوں میں تعینات تھے اس لیے ان کو برجی مملوک کہا جاتا ہے۔

ملک صالح کے انتقال کے بعد ایک ترک غلام تمرالدین ایبک نے سلطان کے جانشین تورون شاہ کو قتل کر دیا۔ لیکن ملک صالح کی بیوی شجرۃ الدرانی (۸۰) دن تک حکومت کرتی رہی اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا اور جب تمرالدین ایبک کو امراء نے بادشاہ منتخب کر لیا تو شجرۃ الدر نے اس سے شادی کر لی۔ یہی ایبک مصر میں غلام خاندان کا بانی ہے۔ پاکستان و ہند کے غلام بادشاہوں اور مصر کے غلام بادشاہوں کے درمیان کئی باتوں میں جو مشابہت پائی جاتی ہے ان میں سے ایک دلچسپ مشابہت یہ بھی ہے کہ دونوں ملکوں کے غلام خاندان کے بانیوں کا نام ایبک تھا اور دونوں خاندانوں میں ایک ایک عورت نے حکومت کی۔ شجرۃ الدر نے مصر میں اور رضیہ سلطانہ نے دہلی میں۔

مملوکوں کی حکومت میں باپ کے بعد بیٹا جانشین نہیں ہوتا تھا، بلکہ جو غلام سردار طاقتور ہوتا تھا وہی حکومت پر قبضہ کر لیتا تھا۔ کوئی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ہر بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت لڑائی ضرور ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو ہر سال ایک نیا سردار بادشاہ بن جاتا تھا، چنانچہ بحری مملوکوں کی ایک سو بتیس (۱۳۲) سال کی مختصر مدت میں چوبیس (۲۴) بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ ان میں چار بادشاہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مجموعی طور پر ۸۴ سال حکومت کی اور مصر کو ایک مستحکم حکومت دی۔ ان ہی میں ایک ملک صالح کا غلام بیبرس ہے۔ جس نے بادشاہ ہونے کے بعد ملک الظاہر کا خطاب اختیار کیا۔

ملک الظاہر بیبرس

بیبرس مملوکوں کا پہلا نامور حکمران ہے۔ اس نے ۱۲۶۰ء سے ۱۲۷۷ء تک سترہ سال مصر وشام پر حکومت کی۔ وہ ہلاکو خاں اور دہلی کے غیاث الدین بلبن کا ہمعصر تھا۔ بغداد کو تباہ کرنے کے بعد جب ہلاکو کی فوجیں شام کی طرف بڑھیں تو بیبرس اور ایک دوسرے مملوک سردار سیف الدین قطز نے مل کر ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ میں عین جالوت کے مقام پر ان کو فیصلہ کن شکست دی اور شام سے منگول فوجوں کو نکال باہر کیا۔ بیبرس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مصر وشام کو منگولوں کی تباہ

کاریوں سے بچایا۔ ورنہ ان ملکوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو ایران، عراق اور ترکستان کا ہوا۔ بیبرس نے نہ صرف یہ کہ شام پر منگولوں کے حملوں کو پسپا کیا بلکہ خود ان کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ اس نے مصری سلطنت کی شمالی سرحد ایشیائے کوچک کے وسطی علاقوں تک پہنچا دی۔

بیبرس کا دوسرا بڑا کارنامہ شام کے ساحل پر قابض یورپی حکومتوں کا زور توڑنا ہے۔ یہ حکومتیں پہلی صلیبی جنگ کے زمانے سے شام کے ساحلی شہروں پر قابض تھیں۔ نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے اگرچہ اندرون ملک اور فلسطین سے فرنگیوں کو نکال دیا تھا، لیکن ساحلی شہروں پر ان کا اقتدار عرصے تک قائم رہا۔ ان کو بحری راستے سے یورپ سے برابر مدد پہنچتی رہتی تھی۔ یہ حکومتیں مصر و شام کے خلاف منگولوں سے اتحاد کر لیتی تھیں اور اس طرح مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دب گئے تھے۔ بیبرس نے ان یورپی ریاستوں میں سے انطاکیہ کی طاقتور ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کئی اور ساحلی شہر بھی فتح کیے اور ان یورپی حکومتوں کا زور توڑ دیا۔

بیبرس نے اپنی سلطنت کو جنوب میں سوڈان کی طرف بھی وسعت دی اور نوبہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا جو ایوبی سلاطین کے زمانے سے مصری حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اپنی ان فتوحات اور کارناموں کی وجہ سے بیبرس کا نام مصر و شام میں صلاح الدین ایوبی کی طرح مشہور ہے اور وہ مصری عوام کا بڑا مقبول ہیرو ہے۔

بیبرس صرف ایک فاتح نہیں تھا بلکہ سمجھ دار اور عادل حکمران بھی تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں کئی اہم کام انجام دیئے گئے۔ ان میں سے ایک خلافت کے سلسلے کی بحالی ہے۔ بغداد میں مستعصم باللہ عباسی کی شہادت کے بعد اسلامی دنیا تین سال تک بغیر خلافت کے رہی۔ اتفاق سے ظاہر باللہ عباسی کا ایک لڑکا ابوالقاسم احمد منگولوں کی قید سے چھوٹ کر ۱۲۶۲ء/۶۵۹ھ میں مصر آ گیا۔ بیبرس اس کو عزت و احترام کے ساتھ قاہرہ لایا اور اس زمانے کے مشہور عالم عزیز الدین عبدالسلام (۱۱۸۲ء/۵۷۸ھ تا ۱۲۶۲ء/۶۶۰ھ) کی موجودگی میں اس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی اور مصر میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔ اس طرح عباسی خلافت اب بغداد سے قاہرہ منتقل ہو گئی۔ اگرچہ مصر کے یہ عباسی خلیفہ صرف نام کے ہوتے تھے اور اصل اقتدار مملوک بادشاہوں کے پاس ہوتا تھا، لیکن اس طرح کم از کم ایک اسلامی شعار کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

بیبرس اسلامی تعلیمات کا خود بھی پابند تھا اور اپنی سلطنت میں اس نے اسلامی احکام پر عمل کرانے کی بھی پوری کوشش کی۔ اس کے عہد میں عدالت میں بڑے سے بڑے آدمی پر مقدمہ چلایا جاسکتا تھا۔ کئی مرتبہ خود بیبرس پر بھی لوگوں نے مقدمے دائر کیے اور اس کو عدالت میں آنا پڑا۔ بیبرس نے شراب بنانے اور اس کی خرید و فروخت پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ حج سے پہلے مصر سے غلاف کعبہ کو مکہ معظّمہ لے جانے کی رسم کا آغاز جسے محمل کہا جاتا ہے، بیبرس ہی کے زمانے سے ہوا اور وہ پہلا حکمران ہے جس نے چاروں مذاہب فقہ یعنی مالکی، حنفی، شافعی، اور حنبلی کو سرکاری طور پر تسلیم کیا اور مصر و شام میں چار فقہ سے تعلق رکھنے والے قاضیوں کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے صرف شافعی قاضی مقرر کیے جاتے تھے، کیونکہ مصر میں اکثریت فقہ شافعی پر عمل کرنے والوں کی ہے۔

بیبرس نے رفاہِ عام کے کام بھی کیے۔ نہریں، پل اور مدرسے تعمیر کرائے۔ وہ اپنے تعمیر کیے ہوئے ظاہریہ کتب خانہ (دمشق) کے احاطہ میں دفن ہے۔

منصور قلاوون

دوسرا امتاز مملوک حکمران منصور قلاؤون (۱۲۷۹ء/۶۷۸ھ تا ۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ) ہے جو بیبرس کے دو سال بعد تخت نشین ہوا۔ وہ بھی بیبرس کی طرح ملک صالح کا غلام تھا اور بیبرس کے مقابلے میں زیادہ قیمت دے کر خریدا گیا تھا۔ اس کا تعلق دشت قبچاق سے تھا۔

قلاؤون کے عہد میں ایل خانی حکمرانوں اباقاخاں اور ارغون نے یورپ کے عیسائیوں کو مصر کے خلاف ایک نئی صلیبی جنگ شروع کرنے اور بیت المقدس کو فتح کرنے کی ترغیب دی۔ اباقاخاں نے عیسائیوں کے تعاون سے شام پر حملہ بھی کیا، لیکن قلاوون نے حمص کے پاس ۱۲۸۰ء/۶۷۸ھ میں اباقاخاں کو شکست دے کر اس منصوبے کو ناکام بنادیا۔

یورپی نوآبادیوں کے خلاف بیبرس کی طرح قلاؤون نے بھی مہم جاری رکھی۔ اور اس نے لطاکیہ (Latakia) اور طرابلس کو یورپی فوجوں سے چھین لیا۔ قلاؤون کے بعد اس کے لڑکے اشرف خلیل نے عکہ، تائر، صیدا، حیفہ اور بیبرس کے باقی شہروں کو بھی فتح کرلیا اور اس طرح ساحل شام سے یورپی مسیحوں کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔

قلاؤون نے قاہرہ میں ''بیمارستان منصوریہ'' کے نام سے ایک ایسا عظیم الشان شفاخانہ بنایا

جو اپنی مثال آپ تھا۔ قلاؤون ایک مرتبہ دمشق میں بیمار ہوا۔ وہاں اس کو نور الدین زنگی کے بنائے ہوئے شفا خانے میں داخلہ ملا۔ قلاؤون اس شفا خانہ کو دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے عہد کیا کہ جب وہ اچھا ہوگا تو دار الحکومت قاہرہ میں ایسا ہی ایک شفا خانہ قائم کرے گا۔ چنانچہ اچھا ہونے کے بعد اس نے اپنا عہد پورا کیا۔ اس شفا خانہ میں ہر بیماری کے علیٰحدہ علیٰحدہ حصے تھے۔ اس کے علاوہ تجربہ خانے، حمام، باورچی خانے اور گودام بھی تھے۔ ایک بڑے ہال میں جو طبی ساز و سامان سے آراستہ تھا طبی تعلیم دی جاتی تھی۔ گویا یہ محض شفا خانہ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل طبیہ کالج تھا۔ شفا خانہ کا خرچ دس لاکھ درہم سالانہ تھا اور کام کے لیے مرد اور عورتیں دونوں ملازم تھیں۔

ملک الناصر محمد

ملک اشرف خلیل کے بعد چار پانچ سال بدستور بدامنی رہی اور مصر کے تخت پر کئی مملوک سرداروں نے قبضہ کیا اور پھر بے دخل ہوئے۔ بالآخر اس خانہ جنگی میں منصور قلاؤون کا لڑکا محمد کامیاب ہوا۔ وہ تین مرتبہ تخت پر بیٹھا۔ لیکن اگر اس ایک سال کی مدت کو نکال دیا جائے جب کہ ۱۳۰۸ء/۷۰۸ھ میں ایک دوسرے سردار بیبرس جاشنگیر نے اس کو بے دخل کر دیا تھا، تو محمد نے ۱۲۹۸ء/۶۹۸ھ سے ۱۳۴۱ء/۷۴۱ھ تک پورے ۴۲ سال مسلسل حکومت کی۔ مصر کے مملوک حکمرانوں میں اس کا دور سب سے طویل اور سب سے شاندار ہے۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے ملک الناصر کا خطاب اختیار کیا۔ ایل خانی بادشاہوں میں غازان خان، الجائیتو خدابندہ اور ابوسعید اس کے ہمعصر تھے اور دہلی کے بادشاہوں میں علاء الدین خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق اس کے ہم زمانہ تھے۔

ملک الناصر محمد کے عہد میں ایل خانی منگولوں نے جو اب مسلمان ہو چکے تھے، دو مرتبہ شام پر حملہ کیا۔ یہ دونوں حملے غازان خاں نے کیے تھے۔ پہلے حملے میں ۱۲۹۹ء/۶۹۹ھ سب منگول دمشق تک آ گئے تھے۔ دوسرے حملے میں بھی وہ دمشق تک پہنچ گئے تھے لیکن اس مرتبہ دمشق کے جنوب میں مرج الصفر کی جنگ میں ۲۵۔ رمضان ۷۰۲ھ/۱۳۰۳ء کو سلطان ناصر محمد نے منگولوں کو شکست فاش دی اور پھر انہوں نے کبھی شام کا رخ نہیں کیا۔ اس جنگ میں مشہور عالم دین اور مصلح ابن تیمیہؒ نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ ملک ناصر کے عہد میں نوبہ کی تسخیر بھی مکمل ہوئی۔ جس کا

آغاز بیبرس کے دور میں ہوا تھا۔

ملک ناصر محمد نے اپنی سیاست میں بیرونی ملکوں سے تعلقات کو اہمیت دی، چنانچہ اس کے دَور میں جس قدر ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے اُس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ پوپ، شاہ فرانس، اسپین کے شاہ ارغون اور ہندوستان کے تغلق خاندان سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ ان تعلقات کی وجہ سے تجارت کو فروغ ہوا۔ ناصر محمد نے ٹیکسوں میں بھی کمی کی۔ زمین کی پیمائش کرائی، نہریں کھدوائیں، سڑکیں بنوائیں اور بکر بھیڑوں کی نسل کشی کی۔ ان اصلاحات کی وجہ سے مصر اس کے دور میں اپنی خوشحالی کے عروج پر پہنچ گیا۔

فن تعمیر نے بھی اس زمانے میں بہت ترقی کی۔ ناصر محمد کو عمارتیں بنوانے سے بہت دلچسپی تھی اور اس نے قاہرہ کو ایک حسین شہر بنا دیا۔ اس نے جو مسجدیں بنوائیں ان کی تعداد تیس بتائی جاتی ہے۔ خانقاہوں، سبیلوں، مدرسوں اور حماموں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اس کا تعمیر کردہ مدرسہ ناصریہ اور قاہرہ کی جامع مسجد اس دَور کے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کی تقلید امراء اور والیوں نے بھی کی اور انہوں نے حلب اور دمشق کو بہترین عمارتوں سے آراستہ کیا۔

اس کے اصلاحی کاموں میں قابل ذکر شراب پر پابندی ہے۔ شراب غیر اسلامی ملکوں کی طرح مسلمان ملکوں میں کبھی عام نہیں ہوئی، لیکن عباسیوں کے زوال کے بعد امراء اور رؤسا کا ایک طبقہ اس کا عادی ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے اسلامی ذہن رکھنے والے حکمران اس ام الخبائث کو عام ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ملک الناصر محمد بھی ایسے ہی حکمرانوں میں سے تھا۔

(۲) برجی مملوک

(۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ تا ۱۵۱۷ء/۹۲۲ھ)

سلطان برقوق

ملک الناصر کے بعد مصر و شام ایک بار پھر انتشار اور بدامنی کا شکار ہوگئے۔ اگلے ۴۳ سال

کی مختصر مدت میں تیرہ مرتبہ تخت بدلے گئے۔ اس مدت میں صرف اشرف شعبان ایسا خوش قسمت تھا جس نے چودہ سال حکومت کی۔ بہر حال ۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ میں ملک الظاہر برقوق کی تخت نشینی کے بعد حالات بہتر ہو گئے۔ سلطان برقوق (۱۳۸۲ء تا ۱۳۹۸ء) برجی مملوکوں کی حکومت کا بانی ہے۔ برجی سلاطین بحری مملوکوں کی طرح مہذب اور شائستہ نہیں تھے۔ یہ باہم برسر پیکار رہتے تھے اور ہر وقت خونریزی پر مائل، لیکن ان کی حکومت بحری مملوکوں سے کم مستحکم نہیں تھی۔ ان میں آٹھ حکمران ایسے تھے جنہوں نے سات سال سے ۲۹ سال تک حکومت کی اور مجموعی طور پر ان آٹھ حکمرانوں نے ایک سو سولہ سال حکومت کی۔ گویا برجی مملوکوں کی حکومت کے ۱۳۸ سالہ دور میں صرف بائیس سال ہنگاموں اور بدامنی کے ہیں جس کے دوران پندرہ حکمران تخت پر بیٹھے اور ایک سو سولہ سال مصر میں مستحکم حکومت رہی۔ گویا ان کے استحکام کی مدت سلطنت روما کے عہد عروج کے اس زمانے سے زیادہ ہے جب کہ شہنشاہ کالی گولا سے نروا تک (۳۷ء تا ۹۸ء) اکستھ سال کی مدت میں دس حکمران روم کے تخت پر بیٹھے۔

تیمور کا حملہ

برقوق کے بیٹے اور جانشین ملک الناصر فرج کے زمانے میں شام کو ایک بار پھر بیرونی حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حملہ امیر تیمور کا تھا اور سلطان برقوق کی غلط پالیسی کی وجہ سے مصر کو اس حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ برقوق نے بغداد کے حکمران احمد جلائر کو جو تیمور کا باغی تھا اپنے پاس پناہ دے کر اور سلطان بایزید سے مل کر تیمور کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بیٹے نے تیمور کے سفیروں و قتل کر کے تیمور کو برانگیختہ کر دیا، چنانچہ تیمور نے انتقامی کارروائی کے طور پر ۱۴۰۱ء/ ۸۰۳ھ میں سارے شام کو روند ڈالا اور دمشق میں نہ صرف قتل عام کیا بلکہ شہر کو نذرِ آتش بھی کر دیا۔ دمشق کو غازان خاں نے بھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا تیمور نے پہنچایا۔

برجی مملوکوں میں اگرچہ کئی حکمرانوں نے طویل مدت تک حکومت کی لیکن ان میں ایک بھی بیبرس، قلاؤون یا ملک الناصر محمد کے پایہ کا نہیں ہوا۔ اس دور کا واحد فوجی کارنامہ قبرص کی فتح ہے۔ اس جزیرہ کے عیسائی مسلمانوں کے لیے ایک مصیبت بن گئے تھے اور شام کے ساحل کو اپنے بحری حملوں کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ ۱۴۲۶ء میں امیر برسبائے نے قبرص کو فتح کر کے اس

خطرے کو دُور کر دیا۔

قحط اور طاعون

برجی مملوکوں کا دَور مصر کی تاریخ کا تاریک ترین دَور سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مسلسل قحط پڑے، کئی مرتبہ طاعون کی وبا پھیلی جس نے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں۔ ۱۴۲۲ء میں اسیر برسبائے کے زمانے میں شمار ہوا تو مصر میں دو ہزار ایک سو ستر بستیاں اور گاؤں نکلے جب کہ چوتھی صدی ہجری میں ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ قحط اور طاعون کی بدولت مصر کی آبادی ایک تہائی رہ گئی تھی۔ برجی مملوکوں کے دَور کے آخری زمانے میں اہل یورپ نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کر لیا۔ اس دریافت نے مصر کی معیشت پر بہت برا اثر ڈالا۔ اب تک مصر یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک اہم تجارتی راستے پر واقع تھا بحری راستے کی دریافت کے بعد یہ تجارتی راستہ بند ہو گیا۔

برجی حکمران تنگ نظر بھی تھے۔ بارُود کی ایجاد کے بعد پندرھویں صدی میں بندوقوں اور توپوں کا استعمال وسیع پیمانے پر ہونے لگا تھا۔ لیکن برجی حکمرانوں نے اس ایجاد سے فائدہ نہیں اٹھایا اور آتشیں اسلحہ کے استعمال کو جوانمردی کے خلاف قرار دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود شاندار عمارتیں بنانے سے برجی مملوکوں کو بھی دلچسپی تھی۔ اس دَور میں قاہرہ میں جو یادگار عمارتیں تعمیر کی گئیں ان میں برقوق کی مسجد اور مدرسہ اور قایت بے کا مدرسہ قابل ذکر ہیں۔

مصر پر عثمانی ترکوں کا قبضہ

پندرھویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ایشیا میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا جس نے تیموریوں کی جگہ لے لی۔ یہ عثمانی ترک تھے۔ بایزید اول نے اگرچہ جنگ انقرہ میں تیمور سے شکست کھائی تھی اور عثمانی مملکت تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن بایزید کے جانشینوں نے جلد ہی سنبھالا لیا اور پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ ابھرے۔ محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر کے عثمانی سلطنت کو دنیا کی ایک طاقتور حکومت میں تبدیل کر دیا۔ ابھرتی ہوئی عثمانی طاقت کا زور توڑنے کے لیے ایران کے صفوی حکمران اسمٰعیل صفوی اور مملوک حکمران ملک قانصوہ غوری (۱۵۰۰ء/ ۹۰۶ھ تا ۱۵۱۶ء/ ۹۲۲ھ) نے متحدہ محاذ بنانا چاہا۔ لیکن عثمانی سلطان سلیم اول نے اس

منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ چالدران کی جنگ میں اسمٰعیل صفوی کو شکست دینے کے بعد سلیم نے شام کا رُخ کیا۔ ۲۴۔ اگست ۱۵۱۶ء کو حلب کے پاس مرج دابق کی جنگ میں سلیم نے قانصوہ غوری کو بھی شکست دی اور قانصوہ غوری جنگ میں کام آیا۔ طومان بے نے جس کو مملوکوں نے نیا حکمران منتخب کیا سلیم کی پیش قدمی کو روکنا چاہا لیکن قاہرہ کے پاس ادانیہ کی جنگ میں ۲۲۔ جنوری ۹۲۲ھ / ۱۵۱۷ء کو اس نے بھی شکست کھائی اور گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ مملوکوں کی حکومت ختم ہو گئی اور مصر و شام عثمانی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ سلطان سلیم عباسی خلیفہ متوکل ثالث کو ۱۵۱۸ء / ۹۲۳ھ میں مصر سے واپسی پر اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ اس طرح خلافت بھی مصر سے ترکی منتقل ہو گئی۔

مملوک سلاطین کے کارنامے

مصر و شام میں مملوکوں کا دَور اسلامی تاریخ کا بہت اہم دَور ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ منگولوں کے حملوں کی روک تھام ہے۔ شام کو تو وہ منگولوں کی قتل و غارت سے زیادہ نہیں بچا سکے، لیکن مصر کا انہوں نے پوری کامیابی سے دفاع کیا۔ شام کے ساحل سے بچے کھچے صلیبیوں کا اخراج ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ اس طرح انہوں نے اس خطے کو کم از کم چھ سو سال تک بیرونی سازشوں اور اثرات سے محفوظ کر دیا۔

مملوک سلاطین میں کئی حکمران جیسے ملک الظاہر بیبرس، منصور قلاوون اور ملک الناصر محمد ہیں صاحب علم اور شائستہ حکمران تھے، لیکن ان کی اکثریت اجڈ اور جاہل تھی خصوصاً برجی مملوک زیادہ اجڈ تھے۔ یہ مملوک دینی معاملات میں تو شریعت کی پابندی کرتے تھے لیکن ان کی ذاتی زندگیوں میں غیر اسلامی اثرات باقی تھے اور وہ ذاتی معاملات کے فیصلے تورۂ چنگیزی کے مطابق کرتے تھے۔

قاہرہ

مصری مملوک ذاتی طور پر کیسے ہی ہوں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دَور میں مصر و شام اپنی خوشحالی کے عروج پر پہنچ گئے۔ تجارت کو فروغ ہوا اور فن تعمیر نے بہت ترقی کی۔ اس زمانے میں کثرت سے ایسی مسجدیں، مدرسے، شفاخانے اور مقبرے تعمیر کیے گئے جو فن تعمیر کا شاہکار بھی ہیں۔ سلطان حسن ابن قلاوون کی مسجد اور مدرسہ اسلامی دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ قلاوون کا مقبرہ اور شفاخانہ، جامع موئید، جامع قابت بے، آق

سنقر کی نیلی مسجد اور خان خلیلی کا مسقف بازار اس دور کی اہم تعمیری یادگار ہیں۔

ان کے زمانے میں قاہرہ دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔ آج بھی قاہرہ کی سب سے بڑی دلکشی ان مملوک بادشاہوں کی عمارتوں کی وجہ سے ہے۔ سیاح ابن بطوطہ ملک الناصر کے زمانے میں قاہرہ آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر میں سقوں کی تعداد بارہ ہزار ہے، تیس ہزار دکانیں ہیں اور کشتیوں کی تعداد ۳۶ ہزار ہے۔ اس زمانے کے ایک جرمن سیاح نے لکھا ہے کہ قاہرہ میں بارہ ہزار سڑکیں ہیں اور ہر سڑک پر بارہ ہزار مکانات ہیں۔ یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز بلکہ غلط ہیں، لیکن ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاہرہ اتنا بڑا شہر تھا جو لوگوں کو مبہوت کر دیتا تھا اور یورپ کے لوگ جنہوں نے اتنے بڑے شہر نہیں دیکھے تھے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے تھے۔

سلطان ناصر کے بعد مصر میں ایک بڑی سخت وبا پھیلی تھی۔ اس وبا میں قاہرہ میں نو لاکھ افراد موت کا شکار ہو گئے۔ اتنے آدمیوں کے مرنے کے باوجود سو سال بعد ایک عرب مصنف لیو افریقی لکھتا ہے کہ:

''قاہرہ ایک عظیم الشان اور حیرت انگیز شہر ہے ساری دنیا میں ایسا شہر نہیں مل سکتا جو قاہرہ کی شان و شوکت کا مقابلہ کرے''

علم و ادب

تیموری دور جس طرح وسط ایشیا میں علم و ادب کی ترقی کا آخری دور تھا اسی طرح مصر و شام میں مملوک دور حکومت علم و ادب کی ترقی کا آخری دور تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس لحاظ سے پوری اسلامی دنیا میں مصر اس زمانہ میں سب سے آگے نکل گیا تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں مصر و شام میں امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ جیسے بڑے بڑے مصنف اور بلند پایہ اہل علم کثرت سے پیدا ہوئے اس کی مثال ان دو صدیوں میں پوری اسلامی دنیا میں نہیں ملتی اور بعد میں بھی سوائے برکوچک پاکستان و ہند کے کسی دوسرے خطہ میں نہیں ملے گی۔

اس دور کے مصنفوں میں سب سے ممتاز شخصیت تقی الدین ابن تیمیہ کی ہے۔

ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ تا ۱۳۲۸ء/۷۲۸ھ)

تقی الدین ابن تیمیہؒ شمالی شام کے شہر حران میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ منگولوں کے

شام پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ابھی ابن تیمیہؒ پانچ سال ہی کے تھے کہ منگولوں نے حملہ کیا اور ان کے والد کو گھر والوں کے ساتھ دمشق میں پناہ لینی پڑی۔ ابن تیمیہؒ نے دمشق ہی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ نہایت ذہین تھے اور ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اس لیے بیس سال ہی کی عمر میں انہوں نے تمام علوم حاصل کر لیے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے نامور عالم جن مسئلوں کو حل نہیں کر سکتے تھے وہ ان کو حل کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

ابن تیمیہ نے تلوار اور قلم دونوں سے اپنی زندگی میں کام لیا۔ منگولوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بھی لوگوں کو تیار کیا اور حکومت کو بھی اس پر آمادہ کیا، بلکہ انہوں نے خود جنگ میں شرکت کی اور دمشق کے قریب منگولوں کو شکست دی۔

لیکن ابن تیمیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دینی علوم کی تجدید کی اور اسلامی عقائد کا پرزور دفاع کیا۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فلسفہ، منطق اور تصوف وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور مسلمانوں کو ان غیر اسلامی خیالات سے بچایا جو مسلمانوں میں پھیلتے جا رہے تھے۔ انہوں نے تقلید کے خلاف آواز اٹھائی، آزادیٔ فکر کی حمایت کی اور علم کی بنیاد کو منطق کے بجائے تجربہ پر قائم کرنے پر زور دیا۔

ابن تیمیہؒ کی اصلاحات اور خیالات کی وجہ سے بہت سے علماء ان کے خلاف ہو گئے اور حکومت پر دباؤ ڈال کر ان کو قید کرا دیا۔ اس طرح وہ دمشق قاہرہ اور اسکندریہ میں تین مرتبہ قید کیے گئے اور ان کی زندگی کے کئی سال قید ہی میں گزرے، لیکن وہ جس بات کو سچ سمجھتے تھے وہ برابر کہتے رہے۔ وہ قید خانے میں بھی کتابیں لکھتے رہے۔

ابن تیمیہؒ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جب کسی مسئلے پر اپنی رائے دیتے تھے تو پہلے خوب پڑھ لیتے تھے اور اس پر اچھی طرح غور کر لیتے تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بعض اوقات ایک آیت کے لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے بعد میں اللہ سے دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عطا ہو۔ میں عرض کرتا اے آدمؑ و ابراہیمؑ کے معلم میری تعلیم فرما، میں سنسان اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا۔ اپنی پیشانی خاک پر ملتا اور کہتا "اے ابراہیمؑ کو تعلیم دینے والے مجھے سمجھ عطا فرمایا"

ابن تیمیہؒ کے دل میں لوگوں کی اصلاح کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ کسی اچھے کام

کے لیے حکومت کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ خود میدان عمل میں کود پڑتے تھے۔ اگر وہ دیکھتے تھے کہ برائیوں کی روک تھام میں حکومت ہمت سے کام نہیں لے رہی تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر خود اس برائی کا خاتمہ کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک کارنامہ شہر دمشق میں شراب بند کرانا ہے۔ مملوکوں کے زمانہ میں اس شہر کے بہت سے مسلمانوں میں شراب پینے کا رواج ہو چلا تھا۔ ابن تیمیہ نے جب دیکھا کہ حکومت اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا رہی تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے شہر میں شراب بند کرانے کی مہم شروع کر دی اور آخر کار لوگوں کو اس لعنت سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گئے ابن تیمیہؒ کا قید کی حالت ہی میں انتقال ہوا، لیکن وہ عوام میں اتنے مقبول ہو گئے کہ جب ۲۲۔ ذیقعد کو دمشق میں ان کا انتقال ہوا تو دو لاکھ مرد اور پندرہ ہزار عورتیں ان کے جنازے کے ساتھ تھیں۔

ابن تیمیہ بلا شک وشبہ اس دور کی سب سے بڑی علمی شخصیت ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد کئی سو ہے۔ صرف تفسیر قرآن سے متعلق کتابوں کی تعداد تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی حسب ذیل تین کتابیں بہت اہم ہیں۔

(۱) الجواب الصحیح: یہ عیسائیت کی رد میں ہے۔

(۲) منہاج السنۃ: اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کا دفاع کیا گیا ہے۔

(۳) الرد علی المنطقیین: اس میں فلسفہ اور منطق کے بجائے قرآن وسنت کے طریقے کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ارسطو کی منطق اور اس کے اصولوں کی پہلی مرتبہ تفصیل سے تردید کی گئی ہے۔

ابنِ قیمؒ

ابن تیمیہؒ کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ ۱۲۹۲ء/۶۹۱ھ تا ۱۳۵۰ء/۷۵۱ھ) بھی اسلامی افکار کی تاریخ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سب سے اہم اعلام الموقعین اور زاد المعاد ہیں۔ زاد المعاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غزالی کی احیاء العلوم کے بعد شاید کوئی دوسری ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی بلکہ کتاب وسنت سے مطابقت کے لحاظ سے اسے احیاء العلوم پر ترجیح حاصل ہے۔

اس دَور کے دوسرے علماء میں محدث ابن حجر (۱۳۷۲ء/۷۷۳ھ تا ۱۴۴۹ء/۸۵۲ھ) ہیں، جن کی فتح الباری، صحیح بخاری کی سب سے اچھی شرح سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی فنِ حدیث، اسماء الرجال اور تاریخ کے موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی ہیں، جو آج تک کارآمد اور مفید ہیں۔ محی الدین نووی (۱۲۳۳ء/۶۳۱ھ تا ۱۲۷۷ء/۶۷۶ھ) جن کی المنہاج، صحیح مسلم کی سب سے اچھی شرح سمجھی جاتی ہے، شمس الدین ذہبی (۱۲۷۴ء/۶۷۳ھ تا ۱۳۴۸/ ۷۴۸ھ) جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدث اور ادیانِ حدیث کو پرکھنے کے فن علم الرجال کے ماہر تھے، اور جلال الدین سیوطی ۱۴۴۵ء/۸۴۹ھ تا ۱۵۰۵ء/۹۱۱ھ) جن کو بعض علماء مجدد قرار دیتے ہیں اس دَور کے دوسرے مشہور علماء میں سے ہیں۔

اس دَور میں فن تاریخ میں بھی کئی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ ابوالفدا (۱۳۳۱ء/۶۷۲ھ تا ۱۳۳۱ء/۷۳۳ھ) اس دور کے سب سے بڑے مورخ اور جغرافیہ دان ہیں۔ انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ دونوں پر اہم کتابیں لکھیں۔ وہ زمین کے گول ہونے کے قائل تھے۔ دوسرے بڑے مورخوں میں ابن کثیر (۱۳۰۱ء/۷۰۱ھ تا ۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ) کا نام بہت اہم ہے ان کی تاریخ البدایہ والنہایہ بڑی مفصل اور مستند اسلامی تاریخ ہے۔ اس میں ہر دور کے علماء اور دوسرے مشہور لوگوں کے حالات بھی ہیں۔ ابن کثیر کی قرآن کی تفسیر بھی بہت مشہور ہے۔ اُردو میں بھی اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔ یہ تفسیر حدیث پر مبنی ہے۔

مقریزی (۱۳۶۴ء/۷۶۵ھ تا ۱۴۴۲ء/۸۴۵ھ) جن کی کتاب الخطط مصر سے متعلق معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے اور مصنف ابوالمحاسن تغری بردی (۱۴۰۹ء/۸۱۲ھ تا ۱۴۶۹ء/۸۷۴ھ) جن کی کتاب نجوم الظاہرہ فتح اسلام سے ۱۴۵۳ء تک مصر کی مفصل تاریخ ہے، اس دور کے دوسرے بڑے مورخ ہیں۔

اس دور کے مصنفوں میں صلاح الدین خلیل صفدی (۱۲۹۶ء/۶۹۷ھ تا ۱۳۶۲ء/ ۷۶۴ھ) کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ وہ شاید دنیا کے سب سے بڑے سوانح نگار ہیں۔ ان کی کتاب 'الوافی' تیس جلدوں میں ہے اور ان میں سے جو جلدیں محفوظ رہ گئی ہیں صرف ان میں چودہ ہزار مشہور لوگوں کے حالات ہیں۔ شاید دنیا میں کسی ایک شخص نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے حالات نہیں لکھے۔

ابن نفیس (۱۲۱۰ء/۶۰۷ھ تا ۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ) اس دور کے سب سے بڑے طبیب تھے۔ وہ کئی اہم طبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ گردش خون کا نظریہ جس سے یورپ والے سولھویں صدی کے وسط میں واقف ہوئے ابن نفیس نے تین سو سال پہلے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا مکان اور کتب خانہ قاہرہ کے بیمارستان منصوریہ کو وقف کر دیا تھا۔

بدرالدین عینی (۱۳۶۰ء/۷۶۲ھ تا ۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ) اور سخاوی ۱۴۲۷ء/۸۳۱ھ تا ۱۴۹۷ء/۹۰۲ھ) اس دور کے دوسرے عظیم علماء ہیں۔ سخاوی آخری بڑے محدث تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے بعد علم حدیث ختم ہو گیا۔

ابن ماجد

اس زمانے کی ایک اور عظیم ہستی شہاب الدین احمد ابن ماجد کی ہے۔ یہ اپنے دور کے عظیم ترین جہاز رانوں میں سے ہوا ہے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ بحر ہند اور اس سے ملے ہوئے طوفانی سمندروں کا برسوں سفر کیا بلکہ وہ جہاز سازی اور جہاز رانی کے علم کا بھی ماہر تھا اور ان علوم پر وہ کم و بیش تیس کتابوں کا مصنف ہے۔ ان کتابوں میں سب سے اہم ''الفوائد فی اصول علم البحر و القواعد'' ہے۔ علم جہاز رانی میں ابن ماجد کے بعد پھر کسی مسلمان نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ پرتگالی جہاز ران واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں ابن ماجد سے مشرقی افریقہ کے شہر مالندی میں ملا تھا اور ابن ماجد نے ہی واسکوڈی گاما کو ہندوستان تک جانے کا راستہ بتایا تھا۔ احمد بن ماجد کے جہاز رانی کے آلے واسکوڈی گاما کے آلوں سے زیادہ اچھے تھے۔

[سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد مصر کی تاریخ کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۳۴(۳)]

بحری مملوک سلاطین

(۱۲۵۰ء/۶۴۷ھ تا ۱۳۸۲ء/۷۸۴ھ)

(۱) عزالدین ایبک	۱۲۵۰ء/۶۴۷ھ تا ۱۲۵۷ء/۶۵۵ھ
(۲) نورالدین علی	۱۲۵۷ء/۶۵۵ھ تا ۱۲۵۹ء/۶۵۷ھ

(۳) سیف الدین قُطز	۱۲۵۹ء/۶۵۷ھ تا ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ
(۴) ملک الظاہر بیبرس	۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ تا ۱۲۷۷ء/۶۷۶ھ
(۵) محمد سعید برکہ خاں	۱۲۷۷ء/۶۷۶ھ تا ۱۲۷۹ء/۶۷۸ھ
(۶) سلامش بن بیبرس	۱۲۷۹ء/۶۷۸ھ
(۷) سیف الدین قلاؤون	۱۲۷۹ء/۶۷۸ھ تا ۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ
(۸) ملک اشرف خلیل	۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ تا ۱۲۹۳ء/۶۹۳ھ
(۹) ملک الظاہر بیدرا	۱۲۹۳ء/۶۹۳ھ
(۱۰) ملک الناصر محمد بن قلاؤون	۱۲۹۳ء/۶۹۳ھ تا ۱۲۹۴ء/۶۹۴ھ
(۱۱) ملک العادل کتبوغا	۱۲۹۴ء/۶۹۴ھ تا ۱۲۹۶ء/۶۹۶ھ
(۱۲) منصور لاچین	۱۲۹۶ء/۶۹۶ھ تا ۱۲۹۸ء/۶۹۸ھ
(۱۳) ملک الناصر محمد (دوسری مرتبہ)	۱۲۹۸ء/۶۹۸ھ تا ۱۳۰۸ء/۷۰۹۸ھ
(۱۴) بیبرس جاشنگیر	۱۳۰۸ء/۷۰۸ھ تا ۱۳۰۹ء/۷۰۹ھ
(۱۵) ملک الناصر محمد (تیسری مرتبہ)	۱۳۰۹ء/۷۰۹ھ تا ۱۳۴۱ء/۷۴۱ھ
(۱۶) منصور ابوبکر	۱۳۴۰ء/۷۴۱ھ تا ۱۳۴۱ء/۷۴۲ھ
(۱۷) علاء الدین کُجُک	۱۳۴۱ء/۷۴۲ھ تا ۱۳۴۲ء/۷۴۲ھ
(۱۸) ناصر شہاب الدین احمد	۱۳۴۲ء/۷۴۲ھ تا ۱۳۴۲ء/۷۴۳ھ
(۱۹) ملک الصالح اسمٰعیل	۱۳۴۲ء/۷۴۳ھ تا ۱۳۴۵ء/۷۴۶ھ
(۲۰) زین الدین شعبان	۱۳۴۵ء/۷۴۶ھ تا ۱۳۴۶ء/۷۴۷ھ
(۲۱) مظفر الدین	۱۳۴۶ء/۷۴۷ھ تا ۱۳۴۷ء/۷۴۸ھ
(۲۲) ناصر حسن بن محمد	۱۳۴۷ء/۷۴۸ھ تا ۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ
(۲۳) صالح صلاح الدین بن محمد	۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ تا ۱۳۵۴ء/۷۵۵ھ
(۲۴) ناصر حسن بن محمد (دوسری مرتبہ)	۱۳۵۴ء/۷۵۵ھ تا ۱۳۶۱/۷۶۲ھ
(۲۵) منصور محمد	۱۳۶۱ء/۷۶۲ھ تا ۱۳۶۳ء/۷۶۴ھ
(۲۶) اشرف شعبان	۱۳۶۳ء/۷۶۴ھ تا ۱۳۷۶ء/۷۷۸ھ

(٢٧) منصور علی بن شعبان	١٣٧٦ء/٧٧٨ھ تا ١٣٨١ء/٧٨٣ھ
(٢٨) صالح حاجی بن شعبان	١٣٨١ء/٧٨٣ھ تا ١٣٨٢ء/٧٨٤ھ

برجی مملوک سلاطین

(١٣٨٢ء/٧٨٤ھ تا ١٥١٧ء/٩٢٢ھ)

(١) ملک الظاہر برقوق	١٣٨٢ء/٧٨٤ھ تا ١٣٩٨ء/٨٠١ھ
(٢) ملک الناصر فرج برقوق	١٣٩٨ء/٨٠١ھ تا ١٤٠٥ء/٨٠٨ھ
(٣) منصور عزالدین بن عبدالعزیز	١٤٠٥ء/٨٠٨ھ
(٤) ملک الناصر فرج (دوسری مرتبہ)	١٤٠٦ء/٨٠٩ھ تا ١٤١٢ء/٨١٦ھ
(٥) شیخ محمودی	١٤١٢ء/٨١٦ھ تا ١٤٢١ء/٨٢٤ھ
(٦) مظفر احمد	١٤٢١ء/٨٢٤ھ تا ١٤٢١ء/٨٢٤ھ
(٧) ملک الظاہر ططر	١٤٢١ء/٨٢٤ھ
(٨) صالح محمد بن ططر	١٤٢١ء/٨٢٤ھ تا ١٤٢٢ء/٨٢٥ھ
(٩) ملک الاشرف برس بائی	١٤٢٢ء/٨٢٥ھ تا ١٤٣٨ء/٨٤١ھ
(١٠) عزیز یوسف بن برس بائے	١٤٣٨ء/٨٤١ھ تا ١٤٣٨ء/٨٤٢ھ
(١١) ملک الظاہر چقمق	١٤٣٨ء/٨٤٢ھ تا ١٤٥٣ء/٨٥٧ھ
(١٢) منصور عثمان بن چقمق	١٤٥٣ء/٨٥٧ھ
(١٣) ملک الاشرف اینال	١٤٥٣ء/٨٥٧ھ تا ١٤٦٠/٨٦٥ھ
(١٤) احمد بن اینال	١٤٦٠ء/٨٦٥ھ تا ١٤٦١ء/٨٦٥ھ
(١٥) ملک الظاہر خوش قدم	١٤٦١ء/٨٦٥ھ تا ١٤٦٧ء/٨٧٢ھ
(١٦) ملک الظاہر بلبائے	١٤٦٧ء/٨٧٢ھ
(١٧) ملک الظاہر تمر بغا	١٤٦٧ء/٨٧٢ھ تا ١٤٦٨ء/٨٧٢ھ
(١٨) ملک الاشرف قایت بائے	١٤٦٨ء/٨٧٢ھ تا ١٤٩٥ء/٩٠١ھ

(۱۹) ناصر محمد بن قایت بائے	۱۴۹۵ء/۹۰۱ھ تا ۱۴۹۸ء/۹۰۴ھ
(۲۰) قانصوہ	۱۴۹۸ء/۹۰۴ھ تا ۱۴۹۹ء/۹۰۵ھ
(۲۱) جان بلاط	۱۴۹۹ء/۹۰۵ھ تا ۱۵۰۰ء/۹۰۶ھ
(۲۲) ملک قانصوہ غوری	۱۵۰۰ء/۹۰۶ھ تا ۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ
(۲۳) طومان بے	۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ تا ۱۵۱۷ء/۹۲۲ھ

خلفائے عباسیہ (مصر)

(۱) ابوالقاسم احمد مستنصر باللہ	۱۲۶۲ء/۶۵۹ھ تا ۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ
(۲) ابوالعباس احمد حاکم بامر اللہ	۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ تا ۱۳۰۱ء/۷۰۱ھ
(۳) ابوالربیع سلیمان مستکفی باللہ	۱۳۰۱ء/۷۰۱ھ تا ۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ
(۴) ابواسحق ابراہیم واثق باللہ	۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۳۴۰ء/۷۴۱ھ
(۵) ابوالعباس احمد حاکم بامر اللہ ثانی	۱۳۴۰ء/۷۴۱ھ تا ۱۳۴۷ء/۷۴۸ھ
(۶) ابوبکر معتضد باللہ	۱۳۴۷ء/۷۴۸ھ تا ۱۳۶۲ء/۷۶۳ھ
(۷) ابوعبداللہ محمد متوکل علی اللہ اول	۱۳۶۲ء/۷۶۳ھ تا ۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ
(۸) ابوحفص عمر واثق باللہ	۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ تا ۱۳۸۶ء/۷۸۸ھ
(۹) زکریا مستعصم باللہ	۱۳۸۶ء/۷۸۸ھ تا ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ
(۱۰) متوکل علی اللہ (دوسری مرتبہ)	۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ تا ۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ
(۱۱) ابوالفضل عباس مستعین باللہ	۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ تا ۱۴۱۴ء/۸۱۶ھ
(۱۲) ابوالفتح داؤد معتضد باللہ	۱۴۱۴ء/۸۱۶ھ تا ۱۴۴۱ء/۸۴۵ھ
(۱۳) ابوالربیع سلیمان مستعین باللہ	۱۴۴۱ء/۸۴۵ھ تا ۱۴۵۰ء/۸۵۴ھ
(۱۴) ابوالبقا حمزہ قائم بامر اللہ	۱۴۵۰ء/۸۵۴ھ تا ۱۴۵۵ء/۸۵۹ھ
(۱۵) ابوالمحاسن یوسف مستنجد باللہ ثانی	۱۴۵۵ء/۸۵۹ھ تا ۱۴۷۹ء/۸۸۴ھ

(۱۶) عبدالعزیز متوکل علی اللہ ۱۴۷۹ء/۸۸۴ھ تا ۱۴۹۷ء/۹۰۳ھ

(۱۷) یعقوب مستمسک باللہ ۱۴۹۷ء/۹۰۳ھ تا ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ

(۱۸) محمد متوکل علی اللہ ثالث ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ تا ۱۵۱۸ء/۹۲۳ھ

محرم ۱۵۱۸ء/۹۲۳ھ میں مصر پر سلیم عثمانی کے قبضے کے بعد عباسی خلافت ختم ہوگئی۔

اہم واقعات

۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ (۲۵۔رمضان) عین جالوت کی جنگ میں مملوکوں نے ہلاکو خاں کی فوج کو شکست دی۔

۱۲۶۲ء/۶۵۹ھ خلافت کی بغداد سے قاہرہ منتقلی۔ مستنصر باللہ کا خلیفہ مقرر ہونا۔

۱۲۸۰ء/۶۷۸ھ منصور قلاؤون نے حمص کے پاس اباقا خاں کو شکست دی۔

۱۲۹۹ء/۶۹۹ھ غازان خاں نے دمشق فتح کیا۔ ابن تیمیہ نے غازان خاں سے ملاقات کی اور مسلمانوں سے جنگ کرنے پر اس کو تنبیہ کی۔

۱۳۰۳ء/۷۰۲ھ (۲۵۔رمضان) مرج الصفر کی جنگ میں ناصر نے منگولوں کو شکست دی۔ ابن تیمیہ نے بھی جنگ میں شرکت کی۔

۱۴۰۱ء/۸۰۳ھ تیمور کا شام فتح کرنا اور دمشق کو جلانا۔ ابن خلدون کی دمشق میں تیمور سے ملاقات۔

۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ (۲۴۔اگست) حلب کے پاس سلیم عثمانی نے مرج دابق کی جنگ میں مملوکوں کو شکست دی۔

۱۵۱۷ء/۹۲۲ھ قاہرہ کے پاس ردانیہ کی جنگ میں مملوکوں کی شکست۔

۱۵۱۸ء/۹۲۳ھ سلیم عثمانی آخری عباسی خلیفہ متوکل سوم کو استنبول لے گیا۔

باب ۷

شمالی افریقہ موحدین کے بعد

(۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ تا ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ)

موحدین کو جب زوال ہوا تو اُن کی وسیع سلطنت جو سارے شمالی افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی حسب ذیل تین ریاستوں میں تقسیم ہوگئی:

(۱) بنو حفص ۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ تا ۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ

(۲) بنو عبد الواد[1] ۱۲۳۹ء/۶۳۷ھ تا ۱۵۵۴ء/۹۶۲ھ

(۳) بنو مرین ۱۲۶۹ء/۶۶۷ھ تا ۱۴۷۰ء/۸۷۵ھ

اندلس میں بنو احمر نے جو حکومت قائم کی وہ ان کے علاوہ تھی اور اس کا حال اس کتاب کی پہلی جلد میں بیان کیا جا چکا ہے۔

(۱) بنو حفص

(۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ تا ۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ)

بنو حفص کا مورث اعلیٰ شیخ ابو حفص عمر بن یحیٰی تحریک موحدین کے بانی ابن تومرت کے ساتھیوں میں تھا۔ اس کے بیٹے ابو محمد عبد الواحد نے ۱۲۰۷ء/۶۰۳ھ تا ۱۲۲۱ء/۶۱۸ھ افریقیہ یعنی موجودہ تونس کے والی کی حیثیت سے حکومت کی۔ ۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ میں اس کے پوتے ابو زکریا یحیٰی کو افریقیہ کا والی مقرر کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موحدین کا زوال شروع ہوگیا

---

(۱) بنو عبد الواد کی حکومت جن کو بنو زیان بھی کہا جاتا ہے، موجودہ الجزائر کے مغربی حصے میں تھی اور تلمسان کا خوبصورت اور خوش آب و ہوا شہر ان کا دار الحکومت تھا۔ بنو عبد الواد کی تونس کے بنو حفص اور مراکش کے بنو مرین سے لڑائیاں رہتی تھیں اور وہ کبھی بنو حفص کی اطاعت قبول کر لیتے تھے اور کبھی بنو مرین کی۔ ان لڑائیوں کے باوجود انہوں نے تلمسان شہر کو بہت ترقی دی۔ علم و ادب کی سرپرستی کی، مدرسے اور مسجدیں بنائیں۔ اس زمانہ میں یہ شہر اندلس سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا اور ان باصلاحیت مہاجرین کی وجہ سے زراعت، صنعت و حرفت، فنون لطیفہ اور موسیقی کو ترقی ہوئی۔ ابن خلدون نے اپنا مشہور عالم "مقدمہ تاریخ" اسی زمانے میں تلمسان کے قریب لکھا۔

تھا، اس لیے ابوزکریا یحییٰ نے دوسال بعد ۱۲۲۹ء/۶۲۷ھ میں آزادی کا اعلان کر دیا اور امیر کا لقب اختیار کیا۔ یہی ابوزکریا یحییٰ (۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ تا ۱۲۴۹ء/۶۴۷ھ) بنوحفص کی آزاد مملکت کا بانی ہے۔ بنوحفص کا دارالحکومت شہر تونس تھا۔ اور ان کی حکومت شہر طرابلس سے الجزائر کے وسطی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور کبھی کبھی تلمسان کا شہر بھی ان کی حکومت کے تحت آجاتا تھا۔

دولت حفصیہ تین سو سال کی مدت میں دو مرتبہ عروج و زوال کے مرحلوں سے گزری ہے۔ عروج کا پہلا دور ۶۲۷ھ سے ۶۹۴ھ تک اور دوسرا دور ۷۷۲ھ سے ۸۹۳ھ تک کے زمانے پر مشتمل ہے۔

پہلے دَور میں ابوزکریا یحییٰ جو بانیٔ خاندان تھا اور اس کا لڑکا ابوعبداللہ محمد قابل حکمران ہوئے ہیں۔ ابوعبداللہ محمد نے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا اور ۱۲۵۳ء/۶۵۰ھ میں مستنصر باللہ (۱۲۴۹ء/ ۶۴۷ھ تا ۱۲۷۷ء/۶۷۵ھ) کا لقب اختیار کیا۔ اس کے دَور میں حفصی سلطنت کی حدود مشرق میں طرابلس تک پہنچ گئیں۔ علم فقہ اور فن تعمیر کو فروغ ہوا، اور یورپ کے ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ مستنصر کے بعد چند سال بدامنی رہی، لیکن اس کے بعد پانچویں حکمران ابوحفص عمر اول (۱۲۸۴ء/ ۶۸۳ھ تا ۱۲۹۵ء/۶۹۴ھ) نے پھر مستحکم حکومت قائم کر لی۔

ابوحفص عمر اول متقی اور امن پسند حکمراں تھا۔ اس کے زمانے میں اکثر مساجد اور مدارس تعمیر ہوئے۔

ابوحفص عمر اوّل کے بعد تونس طویل عرصے تک خانہ جنگی اور بدامنی میں مبتلا رہا۔ آخر میں سولھویں سلطان ابوالعباس احمد (۱۳۷۰ء/ ۷۷۲ھ تا ۱۳۹۴ء/ ۷۹۶ھ) نے گرتی ہوئی سلطنت کو ایک بار پھر سنبھالا۔ بغاوتوں کو فرو کیا اور امن قائم کیا۔ اور اس طرح بنوحفص کے دوسرے دَور کا آغاز ہوا۔ ابوالعباس احمد کے لڑکے ابوفارس (۱۳۹۴ء/۷۹۶ھ تا ۱۴۳۴ء/ ۸۳۷ھ) نے سلطنت کو طرابلس سے الجزائر تک وسعت دے کر سابقہ حدود پر قائم کر دیا۔ آخر میں تلمسان کے بنوعبدالواد کو بھی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ ابوفارس منصف مزاج، دیندار اور ہر دلعزیز حکمران تھا۔ اس نے خلاف شرع محاصل منسوخ کر دیئے اور جہاد کے لیے رضا کارانہ نظام کی تشکیل کی۔

ابوعمرو عثمان (۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۸۸ء/ ۸۹۳ھ) بنوحفص کا آخری طاقتور اور قابل حکمران تھا۔ وہ پاکباز اور عادل تھا۔ اس نے آب رسانی کے نظام کو ترقی دی۔ تونس میں امن

دامان کا وہ طویل صد سالہ دَور جو ابو فارس کی تخت نشینی سے شروع ہوا تھا، ابو عمرو عثمان کے بعد ختم ہوگیا۔ بنوحفص کے دورِ زوال میں اسپین کی حکومت نے جو مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے کے بعد ایک بڑی عالمی طاقت بن گئی تھی ۱۵۱۰ء کے بعد سے افریقہ کے معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا اور الجزائر اور تونس کے کئی حصوں پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۳۴ء کے بعد بنوحفص کو اپنا باجگذار بنا لیا، لیکن اس اقتدار کو مشرق سے آنے والے عثمانی ترکوں نے چیلنج کر دیا۔ ایک طویل مدت تک ترکوں اور ہسپانویوں کے درمیان لڑائیاں جاری رہیں، جس میں آخرکار ترک کامیاب ہوگئے۔ ۱۵۵۳ء میں ترک امیر البحر خیر الدین پاشا نے الجزائر فتح کر لیا اور ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں ایک دوسرے امیر البحر اولوج پاشا نے تونس کو فتح کر کے اس کو سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ بنا دیا۔

تونس

بنوحفص کا دَور تونس کی ترقی اور خوشحالی کا دَور ہے۔ اُن کے زمانے میں تونس میں شاندار عمارتیں اور رفاہِ عام کے ادارے تعمیر کیے گئے جن میں شمالی افریقہ کا قدیم مدرسہ جامع زیتونیہ بھی شامل ہے۔ اب تک افریقیہ Afrikia کا سب سے بڑا سیاسی، تمدنی اور علمی مرکز قیروان تھا، لیکن بنوحفص کے زمانے میں شہر تونس نے قیروان کی جگہ لے لی۔ بنوحفص کا دَور تونس کی قدیم تاریخ کا آخری شاندار دَور تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مصر و شام میں مملوکوں کا دَور اور وسط ایشیا میں تیموریوں کا دَور اسلامی تاریخ کے آخری شاندار دَور تھے۔ اس کے بعد تونس کا سیاسی، تمدنی اور علمی زوال شروع ہوگیا۔ عظیم مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲ء/۷۳۲ھ تا ۱۴۰۶ء/۸۰۸ھ) جن کے حالات آگے پیش کیے جا رہے ہیں، تونس ہی میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی تاریخ تلمسان میں لکھی تھی۔

(۲) بنومرین

مرینی خاندان کا بربر قبیلے زناتہ سے تعلق تھا، لیکن موحدین کا زوال ہونے کے بعد ۱۲۱۶ء میں مرینی سردار عبدالحق (۱۱۹۵ء/۵۹۱ھ تا ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ) نے موحدین کے خلاف بغاوت کر دی۔ پچاس سال تک بنی مرین اور موحدین کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں اور بنومرین

آہستہ آہستہ مراکش میں موحدین کے علاقوں پر قابض ہوتے رہے۔ ۱۲۴۵ء میں انہوں نے مکناس اور فاس کے اہم شہروں پر بھی قبضہ کرلیا۔ ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ میں جب عبدالحق کا چوتھا بیٹا ابو یوسف یعقوب تخت نشین ہوا تو شہر مراکش کو چھوڑ کر سارا ملک مراکش بنو مرین کے قبضے میں آچکا تھا۔ یعقوب نے ۱۲۶۹ء/۶۶۷ھ میں مراکش پر بھی قبضہ کرلیا اور خاندان موحدین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

امیر یعقوب

یعقوب (۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ تا ۱۲۸۶ء/۶۸۵ھ) پہلا مرینی حکمران ہے جو پورے مراکش پر قابض تھا۔ یعقوب بڑا قابل، رعایا پرور اور عادل حکمران تھا۔ شمالی افریقہ کی پوری تاریخ میں سوائے عبدالمومن اور یعقوب المنصور کے اور کوئی بادشاہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کی عادت اور سیرت یعقوب المنصور سے بہت ملتی جلتی تھی۔ یعقوب نے اپنی حکومت میں جس کثرت سے شفاخانے اور محتاج خانے بنائے اتنے شمالی افریقہ میں ابھی تک کسی نے نہیں بنائے تھے۔ اس نے اندھوں، کوڑھیوں اور معذوروں کے ماہانہ وظیفے مقرر کر دیئے اور فاس میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔

امیر یعقوب نے علماء اور نیک لوگوں کو اپنا مصاحب بنایا اور وہ تمام کام ان کے مشورہ سے کرتا تھا۔ یعقوب رعایا پرور حکمران تھا ہی، لیکن وہ بڑا اچھا سپہ سالار بھی تھا۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ موحدین کے بعد اندلس کی اسلامی حکومت کو زوال ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی حکومت صرف شہر غرناطہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔ امیر یعقوب کے زمانہ میں اس چھوٹی سی حکومت کو عیسائی حکومت سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس نے کئی مرتبہ امیر یعقوب سے مدد لی۔ یعقوب نے ۱۲۶۱ء/۶۵۹ھ تا ۱۲۷۵ء/۶۷۴ھ اور ۱۲۷۷ء/۶۷۶ھ میں اندلس پر کامیاب حملے کیے اور عیسائیوں کو ہر مرتبہ شکست دے کر قرطبہ اور اشبیلیہ تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ اس کے بعد ۱۲۸۴ء میں یعقوب اسپین کے بادشاہ کی مدد کے لیے آیا اور میڈرڈ اور طلیطلہ فتح کیے۔ اور الفانسو کو تخت پر بٹھایا۔ یعقوب نے واپس ہونے سے پہلے عیسائی حکومت سے یہ شرطیں منوالیں۔

۱۔اندلس کے مسلمانوں سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

۲۔اندلس میں جس قدر عربی کتابیں ہیں وہ مراکش بھیج دی جائیں۔ان شرائط کے مطابق جب یہ کتابیں آ گئیں تو یعقوب نے ان کو فاس کے مدرسے میں بھیج دیا۔

یعقوب مصر کے بادشاہ بیبرس کا ہمعصر تھا،لیکن اس سے زیادہ عالم رعایا پرور اور عادل حکمران تھا۔اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ ساری دنیا میں سب سے اچھا بادشاہ تھا۔اس کے بعد پھر کوئی مسلمان حکمران اسپین پر حملہ آور نہیں ہوا۔

یعقوب کے بعد اس کا لڑکا یوسف (۱۲۸۶ء/۶۸۵ھ تا ۱۳۰۷ء/۷۰۶ھ) تخت نشین ہوا۔اس نے وہران (Oran) الجزائر اور بجایہ پر قبضہ کر کے بنو مرین کی سلطنت مشرق میں بنوحفص کے علاقوں تک پھیلا دی۔اس کا دور امن وخوشحالی کا دور تھا۔پرتگال،تونس اور مصر نے یوسف سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور اس کے دربار میں سفارتیں اور تحفے بھیجے۔

یوسف کے انتقال کے ساتھ بنو مرین کا عہد زرین ختم ہو گیا۔آخری دور میں سلطان ابوالحسن علی (۱۳۳۱ء/۷۳۱ھ تا ۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ) کے زمانے میں بنو مرین نے ایک بار پھر سنبھالا لیا، تلمسان پر قبضہ کر لیا اور تونس بھی فتح کر لیا۔لیکن یہ فتوحات عارضی ثابت ہوئیں۔ابوالحسن کے بعد اس کا لڑکا سلطان ابوالعنان (۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ تا ۱۳۵۸ء/۷۵۹ھ) تخت نشین ہوا۔ابو العنان نے ۱۳۵۷ء میں تونس فتح کر کے ایک بار پھر سلطنت کی حدود بڑھا دیں،لیکن اگلے سال سلطان کے انتقال کے بعد نہ صرف تمام مقبوضہ علاقے بنو مرین کے ہاتھ سے نکل گئے بلکہ مراکش بھی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ابوالعنان بنو مرین کا آخری طاقتور حکمران تھا۔اس کے بعد ملک بدامنی،ہنگاموں اور انتشار کی لپیٹ میں آ گیا۔۱۴۷۰ء/۸۷۵ھ میں بنو مرین کی ایک دوسری شاخ بنو وطاس نے بنو مرین کی اس حکومت کا جو امیر عبدالحق کی اولاد میں چلی آ رہی تھی خاتمہ کر دیا۔ابن بطوطہ نے اپنا سفرنامہ اسی بادشاہ کے زمانہ میں لکھا۔

بنو وطاس

وطاسی حکومت کا بانی شیخ محمد وطاسی متوفی ۱۵۰۰ء/۹۱۰ھ ہے۔

بنی مرین کے آخری دور میں مراکش پر اسپین اور پرتگال والوں کے حملے شروع ہو گئے

تھے۔ اب تک صورت یہ تھی کہ اگر چہ اسپین کے بڑے حصے سے مسلمان نکالے جا چکے تھے، لیکن اسپین اور پرتگال کی مسیحی حکومتیں مراکش پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں، بلکہ اس کے برخلاف یعقوب المنصور مرینی کے زمانے تک مراکش کے مسلمان اسپین پر حملہ آور ہوتے رہے تھے۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ بنو مرین کے زوال اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر ۱۴۱۵ء میں پرتگال نے سبتہ فتح کر لیا۔ ۱۴۶۵ء/۸۶۹ھ میں طنجہ پر اور ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء میں جبل طارق پر اسپین نے قبضہ کر لیا۔ شیخ محمد وطاسی کے لڑکے محمد برتقالی نے مسیحی یلغار کو روکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوا اور ۱۵۰۶ء اور ۱۵۰۷ء کے درمیان پرتگالیوں نے الجدیدہ، صافی، ازمور اور انمادیر کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح مراکش کا تمام ساحلی علاقہ پرتگال اور اسپین والوں کے قبضے میں آ گیا۔ اور وطاسی حکمران اس قبضہ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرناطہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہاں کے آخری حکمران ابو عبداللہ نے شیخ محمد وطاسی کے پاس پناہ لی۔

۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ میں مراکش کے بنی سعد نے وطاسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

بنو مرین کے دور میں تمدن

بنی مرین کا دورِ حکومت یعقوب المنصور اور یوسف کے دَور سے قطع نظر سیاسی حیثیت سے زیادہ روشن اور تابناک نہیں، ثقافتی اور تمدنی ترقی کے نقطۂ نظر سے یہ دَور تاریخ مراکش کا ایک شاندار باب ہے۔ اندلس سے آنے والے مہاجرین اگر چہ پورے شمالی افریقہ میں پھیل گئے تھے لیکن ان کی سب سے بڑی تعداد مغرب اقصیٰ یا موجودہ مراکش میں آباد ہوئی۔ یہ اندلسی مسلمان دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ہر قسم کے صناع، فنکار، کاریگر، ادیب اور شاعر موجود تھے۔ ان کے آنے سے شمالی افریقہ کی ثقافتی زندگی کو بالعموم اور مراکش کی ثقافتی زندگی کو بالخصوص بڑی تقویت ملی۔ مرینی دربار علماء اور ادیبوں کا مرکز بن گیا اور اندلسی صناعوں اور کاریگروں کی مدد سے مرینی سلاطین نے شاندار محلات اور رفاہی ادارے تعمیر کیے۔

بنی مرین کے دورِ حکومت میں کثرت سے مسجدیں، مدرسے، کتب خانے، باغات، حمام اور مسقف بازار تعمیر کیے گئے جو اپنی شان و شوکت میں محلوں سے کم نہیں تھے۔ ایک مرتبہ جب سلطان

ابوالعنان کے سامنے فاس کے مدرسے کے اخراجات پیش کیے گئے تو اس نے فی البدیہہ ایک شعر کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ ''حسن چاہے کسی قیمت پر خریدا جائے وہ کبھی گراں نہیں ہوتا اور جس چیز سے انسان کو مسرت حاصل ہو اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی''۔ آج بھی مراکش کے تمام شہروں میں ''بوعنانیہ'' مدرسے ملیں گے۔ یہ سب سلطان ابوالعنان کی علم دوستی کی یادگار ہیں۔

بنو مرین کا دارالحکومت فاس تھا۔ سلطان یعقوب المنصور نے ۱۲۷۶ء میں اس کے پاس ہی فاس جدید کی بنیاد ڈالی۔ جلد ہی یہ شہر حسین اور شاندار عمارتوں، باغوں، مدرسوں اور مسجدوں کا شہر بن گیا۔ فاس کی جامع قزوین کو جو شمالی افریقہ کا قدیم ترین مدرسہ ہے اس دور میں مزید توسیع دی گئی۔ اور اندلس سے آنے والی کتابیں سلطان یعقوب المنصور نے اسی مدرسہ کے کتب خانہ کو دے دیں۔

بنو حفص اور بنی مرین کی دونوں شاخوں یعنی آل عبدالحق اور بنو وطاس کے خاتمہ پر شمالی افریقہ میں اسلامی تاریخ کا وہ عبوری دور ختم ہوگیا جو موحدین کے زوال کے بعد شروع ہوا تھا۔ مشرق میں یہ دور تباہی بغداد کے بعد شروع ہوا اور تقریباً اسی زمانے (یعنی سولھویں صدی کے آغاز) میں ختم ہوا، جب وسط ایشیا اور مصر میں تیموریوں اور مملوکوں کا دور ختم ہوا۔ شمالی افریقہ کی تاریخ کے اس دور میں بادشاہوں کے علاوہ بڑے بڑے قابل لوگ گزرے ہیں۔ ان میں سے ہم صرف ایک مؤرخ اور ایک سیاح کا یہاں تذکرہ کریں گے۔

ابن بطوطہ

سیاح کا نام ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء/۷۰۳ھ تا ۱۳۷۷ء/۷۷۹ھ) ہے۔ ابن بطوطہ مراکش کے شہر طنجہ کا رہنے والا تھا۔ اسلامی تاریخ میں بہت سیاح گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض جیسے مقدسی، ابن حوقل، مسعودی اور ابن جبیر بہت بڑے سیاح ہوئے ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی ابن بطوطہ کے برابر بڑا سیاح نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن بطوطہ نہ صرف یہ کہ سب سے بڑا مسلمان سیاح تھا بلکہ موجودہ زمانہ سے پہلے وہ دنیا کا سب سے بڑا سیاح تھا۔ اس نے دنیا کے جتنے بڑے حصے کی سیر کی، اس وقت تک کسی نے بھی سیر نہیں کی تھی۔

ابن بطوطہ ۲۔ رجب ۷۲۵ھ مطابق ۱۴۔ جون ۱۳۲۵ء کو اکیس سال کی عمر میں حج کے

ارادے سے اپنے وطن طنجہ (مراکش) سے روانہ ہوا۔ اس کے ماں باپ دونوں زندہ تھے، اس لیے اتنے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے خیال سے اُن کی جدائی شاق گزری، مگر سفر کے شوق میں اس نے اس جدائی کو گوارا کرلیا اور وہ اپنے لمبے سفر پر جو ۲۸ سال میں ختم ہونے والا تھا خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ تلمسان، الجزائر، تیونس، اور طرابلس ہوتا ہوا ۵۔ اپریل ۱۳۲۶ء کو وہ مصر کی مشہور بندرگاہ اسکندریہ پہنچ گیا۔ ابن بطوطہ نے کوئی چھ ماہ تک مصر اور شام کی سیر کی اور ہر قابل دید چیز دیکھی۔ اس کے بعد اس نے نومبر ۱۳۲۶ء میں مدینے کی زیارت کی اور مکہ پہنچ کر حج کیا۔ مکہ سے وہ عراق اور ایران کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے بصرہ اور کوفہ کی سیر کی اور کربلا میں امام حسینؓ کے مزار کی زیارت کی۔ ابن بطوطہ نے بغداد کی ویرانی کا افسوس کے ساتھ ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مغربی حصہ کھنڈر ہو چکا ہے، مدرسے ویران پڑے ہیں اور شہر کا مشہور شفا خانہ بھی ویران تھا۔

۱۳۳۰ء میں ابن بطوطہ نے پھر حج کیا اور یمن کی سیر کی۔ یمن سے وہ مشرقی افریقہ گیا اور وہاں سواکن، سوڈان، ربلع مقدشو (صومالیہ) ممباسہ (کینیا) اور کلوا (ٹانگانیکا) کی سیر کی۔ واپسی میں اس نے حضرموت، عمان اور بحرین کی سیر کی اور ۱۳۳۲ء میں وہ پھر حج کے لیے گیا۔ اب وہ مصر اور شام کے راستے ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بروصہ بھی گیا جہاں عثمانی خاندان کا دوسرا بادشاہ ''اورخاں'' حکمران تھا۔ یہاں سے وہ روس کے علاقے جزیرہ نما کریمیا گیا جو سیر اوردہ کے حکمران سلطان ازبک (۱۳۱۲۔ ۱۳۴۰) کے قبضے میں تھا۔ سیر اوردہ کے دارالحکومت شہر سرائے میں اس نے سلطان محمد ازبک سے ملاقات کی یہاں سے وہ شمال میں بلغار کے سرد علاقے کی سیر کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اپنے سفرنامے میں اس نے بلغار کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''رمضان کا مہینہ تھا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد صرف مغرب اور عشاء کی نماز پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد صبح ہوجاتی تھی اور فجر کی اذان ہوجاتی تھی''

ابن بطوطہ نے یہاں سے اور بھی شمال میں سائبیریا کے تاریک علاقوں میں جانے کا ارادہ کیا، لیکن پھر یہ ارادہ ترک کردیا۔

بلغار کی سیر کے زمانے میں وہ قسطنطنیہ بھی گیا اس کے بعد وہ شہر سرائے سے روانہ ہوکر

چالیس دن میں دشت قپچاق کو طے کر کے خوارزم پہنچا۔ یہاں اُس نے سمرقند، بخارا، نیشاپور اور دوسرے مشہور شہروں کی سیر کی اس کے بعد وہ غزنی سے ہوتا ہوا محرم ۷۳۴ھ مطابق ستمبر ۱۳۳۳ء میں سندھ کے راستے مغربی پاکستان میں داخل ہوا۔ دریائے سندھ کو پار کرتے وقت اس نے پہلی مرتبہ ''گینڈا'' دیکھا۔ یہ جانور پہلے مغربی پاکستان میں پایا جاتا تھا، لیکن اب ناپید ہو گیا ہے۔

سندھ کی گرمی نے ابن بطوطہ کو بہت پریشان کیا۔ وہ کپڑے بھگو کر جسم کے چاروں طرف لپیٹ لیتا تھا جب اسے چین ملتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ سندھ میں دودھ اور مچھلی کی کثرت ہے۔

اس نے مغربی پاکستان میں لاہری بندر، بھکر، ملتان اور اجودہن کی سیر کی۔ دریائے سندھ کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ دنیا کے سب سے بڑے دریاؤں میں سے ہے اور جس طرح دریائے نیل سے مصر میں زراعت ہوتی ہے اس طرح اس دریا سے پاکستان میں زراعت ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ ہانسی ہوتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ دہلی میں سلطان محمد تغلق نے ابن بطوطہ کو قاضی بنا دیا۔ وہ تقریباً آٹھ سال ہندوستان میں رہا اور قنوج، گوالیار، اجین، دولت آباد، کھمبائت، کالی کٹ اور دوسرے شہروں کی سیر کی۔

ابن بطوطہ نے دہلی کی عمارتوں، دربار کے طور طریقوں اور عید منانے کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے:

ہندوستان کی سیر کے زمانہ میں ایک مرتبہ اس کے قافلہ کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ ابن بطوطہ کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ کئی دن بھوکا پیاسا رہا اور بڑی مشکل سے جان بچی۔

دسمبر ۱۳۴۱ء میں سلطان محمد تغلق نے ابن بطوطہ کو سفیر بنا کر چین روانہ کیا، لیکن کالی کٹ کی بندرگاہ پر ایسا طوفان آیا کہ اس کا تمام سامان برباد ہو گیا، لیکن ابن بطوطہ طوفان سے ڈرنے والا کب تھا وہ جہاز میں بیٹھ کر مالدیپ اور لنکا گیا۔ یہاں سے وہ بحری جہاز کے ذریعے مشرقی پاکستان آیا اور سنادگاؤں اور سلہٹ کی سیر کی مشرقی پاکستان کے متعلق اس نے لکھا ہے:

''بہت وسیع اور شاداب ملک ہے اور چیزیں جتنی سستی ہیں دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں''

مشرقی پاکستان سے ابن بطوطہ سماترا ہوتا ہوا چین گیا اور پورے ملک کی خوب سیر کی۔ مشرق میں یہ آخری ملک تھا جس کی اس نے سیر کی۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن واپس ہوا۔ واپسی پر وہ کئی سال مصر و شام میں رہا اور کئی حج کیے۔ اس زمانے میں اس کو اپنی ماں کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ خبر سن کر وہ اپنے گھر روانہ ہو گیا اور طنجہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پیاری ماں کی قبر پر گیا اور فاتحہ پڑھی۔

ابن بطوطہ نے اگرچہ دنیا کے بڑے حصے کی سیر کرلی تھی اور ساری مہذب دنیا دیکھ لی تھی لیکن سیر و سیاحت کا شوق اب بھی ختم نہیں ہوا تھا، چنانچہ اب وہ اندلس کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں اُس نے مالقہ، غرناطہ اور ان شہروں کی سیر کی جو اب تک اسلامی مملکت میں شامل تھے۔ یہاں سے جب وہ واپس آیا تو صحرائے اعظم کو پار کرکے ان ملکوں کی سیر کرنے کا شوق ہوا جہاں اب تک مردم خور انسان آباد تھے، لیکن وہاں مسلمانوں کے پہنچ جانے سے آہستہ آہستہ تہذیب کی روشنی پھیلتی جارہی تھی۔

ابن بطوطہ فاس مراکش اور سجلماسہ ہوتا ہوا چار ماہ کا زادِ سفر لے کر ایک قافلے کے ساتھ دنیا کے سب سے بڑے صحرا میں داخل ہوگیا۔ (محرم ۷۵۳ھ مطابق ۱۷۔فروری ۱۳۵۲ء) صحرائے اعظم کو پار کرکے وہ مغربی سوڈان کے شہر مالی پہنچا اور وہاں کے بادشاہ سے ملاقات کی۔ مالی کی سلطنت میں اس نے ٹمبکٹو اور دوسرے شہروں کی سیر کی۔ مردم خور حبشیوں کو دیکھا اور ان کا دلچسپ حال لکھا۔

صحرائے اعظم سے واپسی پر اس نے مراکش کے سلطان ابوالعنان مرینی کے حکم سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ قرونِ وسطیٰ کے اس سب سے بڑے سیاح کا ۱۳۷۸ء میں طنجہ میں انتقال ہوا۔ اس کی قبر اب تک وہاں موجود ہے۔

ابن بطوطہ کے سفر شروع کرنے کے تیس سال پہلے اٹلی کے ایک شخص مارکوپولو (۱۲۵۴ء۔۱۳۲۴ء) نے دنیا کے بہت بڑے حصے کی سیاحت ختم کی تھی، جس کی وجہ سے مارکوپولو قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا سب سے بڑا سیاح کہا جاتا ہے لیکن ابن بطوطہ سیر و سیاحت کے معاملے میں مارکوپولو سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ان دونوں میں جو فرق ہے اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے:

۱۔ مارکوپولو صحیح معنوں میں سیاح نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ اور دادا کے ساتھ چین میں ملازمت کے سلسلے میں گیا تھا اور اس کا زیادہ وقت چین ہی میں گزرا۔ اس کے برخلاف ابن بطوطہ صحیح معنوں میں ایک سیاح تھا۔ اسے سیر و سیاحت سے دلی لگاؤ تھا اور وہ دنیا کی سیر ہی کرنے کے ارادے سے اپنے وطن سے نکلا تھا۔

۲۔ مارکوپولو ایک معمولی صلاحیت اور قابلیت کا انسان تھا لیکن ابن بطوطہ ایک بڑا عالم اور ادیب تھا۔

۳۔ مارکوپولو جن ملکوں سے گزرا، ابن بطوطہ نے سوائے صحرائے گوبی کے ان سب ملکوں

کی اچھی طرح سیر کی۔ اس کے علاوہ اس نے بلغار، قسطنطنیہ شمالی افریقہ اندلس اور صحرائے اعظم کی بھی سیر کی جن کی مارکوپو نے سیر نہیں کی۔

۴۔ مارکوپولو اپنے وطن سے ۲۴ سال غیر حاضر رہا اور اس مدت میں سے ۱۳ سال چین میں گزارے۔ ابن بطوطہ نے ۲۸ سال تک سیر کی اور ہر ملک میں کئی کئی مہینے اور بعض میں کئی کئی سال رہا۔

ابن خلدون (۱۳۳۲ء/۷۳۲ھ تا ۱۴۰۶ء/۸۰۸ھ)

عبدالرحمن بن خلدون بنوحفص کے دَور میں تونس میں پیدا ہوئے۔ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ تونس، فاس، غرناطہ اور شمالی افریقہ کے شہروں میں گزرا۔ ۱۳۸۲ء میں وہ مصر چلے گئے جہاں مملوک سلطان برقوق نے ان کو قاہرہ کا قاضی بنادیا اور وہیں ۲۵۔ رمضان مطابق ۱۶۔ مارچ ۱۴۰۶ء/ ۸۰۸ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ ابن خلدون نے اندلس، مراکش، تونس اور مصر کی سیاست میں عملی حصہ لیا۔ تیمور کے حملہ شام کے دوران مصر کی طرف سے سفیر کے فرائض انجام دیئے اور دمشق میں تیمور سے ملاقات کی۔ (۱۴۰۱ء)

ابن خلدون ''کتاب العبر'' کے نام سے ایک بہت بڑی تاریخ کے مصنف ہیں جو حضرت آدم سے لے کر اپنے زمانہ تک دنیا کے بڑے حصے کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کا وہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جو بربروں اور صحرائے اعظم کے جنوب میں آباد سیاہ فام باشندوں کی تاریخ سے متعلق ہے۔ لیکن ابن خلدون کی عظمت اس تاریخ سے زیادہ اس تاریخ کے مقدمہ کی وجہ سے ہے۔ یہ تاریخ اور اس کا مقدمہ تونس، اور تلمسان میں لکھا گیا تھا۔ مقدمہ کئی سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ابن خلدون نے پہلی مرتبہ اس بات سے بحث کی ہے کہ قومیں ترقی اور تنزل کیوں کرتی ہیں اور یہ کہ موسم، جغرافیہ اور ماحول کا لوگوں کے اخلاق و عادات پر کس طرح اثر پڑتا ہے۔ یہ مقدمہ نہایت فکر انگیز کتاب ہے۔ اُس وقت تک دنیا میں کسی مفکر نے تاریخ کو اس قدر فلسفیانہ اور علمی انداز سے نہیں دیکھا تھا جس انداز سے ابن خلدون نے مقدمہ میں دیکھا ہے۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ابن خلدون کو فلسفۂ تاریخ اور عمرانیات کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے مقدمہ کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ (تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب ۲۵)

بنوحفص (تونس)

(۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء تا ۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء)

(۱) ابوزکریا یحییٰ اوّل	۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء تا ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء
(۲) ابوعبداللہ محمد مستنصر	۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء تا ۶۷۵ھ/۱۲۷۷ء
(۳) ابوزکریا یحییٰ دوم الواثق	۶۷۵ھ/۱۲۷۷ء تا ۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء
(۴) ابواسحٰق ابراہیم اول	۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء تا ۶۸۲ھ/۱۲۸۳ء
(۵) ابوحفص عمر اول	۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء تا ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء
(۶) ابوعبداللہ محمد دوم	۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء تا ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء
(۷) ابویحییٰ ابوبکر الشہید	۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء
(۸) ابوالبقا خالد	۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء تا ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء
(۹) ابویحییٰ زکریا اول	۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء تا ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء
(۱۰) ابودربہ	۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء تا ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء
(۱۱) ابویحییٰ ابوبکر	۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء تا ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء
(۱۲) ابوحفص عمر دوم	۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء تا ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء
(۱۳) ابوالعباس احمد	۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء،(۱۳۴۸ء/۷۴۸ھ تا ۱۳۵۰ء/۷۵۰ھ
(۱۴) ابواسحاق ابراہیم دوم	۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء تا ۷۷۰ھ/۱۳۶۹ھ
نبومرین کا تونس پر دوبارہ قبضہ	۱۳۵۲ء/۷۵۳ھ تا ۱۳۵۸ء/۷۵۹ھ
(۱۵) ابوالبقا خالد دوم	۷۷۰ھ/۱۳۶۹ء تا ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء
(۱۶) ابوالعباس احمد دوم	۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء تا ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء
(۱۷) ابوالفارس عبدالعزیز	۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء تا ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء

(۱۸) ابوعبداللہ محمد چہارم مستنصر	۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء تا ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء
(۱۹) ابوعمرو عثمان	۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء تا ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء
(۲۰) ابوزکریا یحییٰ سوم	۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء تا ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء
(۲۱) عبدالمومن	۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء تا ۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء
(۲۲) ابویحییٰ زکریا دوم	۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء تا ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء
(۲۳) ابوعبداللہ محمد پنجم	۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء تا ۹۳۲ء/۱۵۲۶ء
(۲۴) مولائے حسن	۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء تا ۹۵۰ھ/۱۵۴۲ء

(مولائے حسن کو ۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ میں خیر الدین باربروسہ نے نکال دیا تھا لیکن ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۵ھ میں چارلس پنجم کی مدد سے واپس آ گیا)

(۲۵) سلطان احمد	۹۵۰ھ/۱۵۴۲ تا ۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء

ترکوں نے ۱۵۶۹ء/۹۷۶ھ کو شہر تونس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں ترکوں نے آسٹریا کے ڈان جان کو حلق الوادی سے نکال کر تونس پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا اور بنوحفص کا خاتمہ کر دیا۔

سلاطین بنومرین

(۱۱۹۵ء/۵۹۱ھ تا ۱۴۷۰ء/۸۷۵ھ)

(۱) عبدالحق	۱۱۹۵ء/۵۹۱ھ تا ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ
(۲) عثمان اول	۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ تا ۱۲۳۹ء/۶۳۷ھ
(۳) محمد اول	۱۲۳۹ء/۶۳۷ھ تا ۱۲۴۴ء/۶۴۲ھ
(۴) ابویحییٰ ابوبکر	۱۲۴۴ء/۶۴۲ھ تا ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ
(۵) ابویوسف یعقوب	۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ تا ۱۲۸۶ء/۶۸۵ھ
(۶) ابویعقوب یوسف	۱۲۸۶ء/۶۸۵ھ تا ۱۳۰۶ء/۷۰۶ھ

(۷) ابوثابت امیر	۱۳۰۶ء/۷۰۶ھ تا ۱۳۰۸ء/۷۰۸ھ
(۸) ابوالربیع سلیمان	۱۳۰۸ء/۷۰۸ھ تا ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ
(۹) ابوسعید عثمان دوم	۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ تا ۱۳۳۱ء/۷۳۱ھ
(۱۰) ابوالحسن	۱۳۳۱ء/۷۳۱ھ تا ۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ
(۱۱) ابوعنان	۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ تا ۱۳۵۸ء/۷۵۹ھ
(۱۲) سعید	۷۵۹ء۱۳۵۸ھ تا ۱۳۵۹ء/۷۶۲ھ
(۱۳) ابوسلیم ابراہیم	۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ تا ۱۳۶۱ء/۷۶۳ھ
(۱۴) ابوعمر تاشفین	۱۳۶۱ء/۷۶۲ھ تا ۱۳۶۱ء/۷۶۳ھ
(۱۵) ابوزیان محمد دوم	۱۳۶۱ء/۷۶۳ھ تا ۱۳۶۶ء/۷۶۸ھ
(۱۶) عبدالعزیز	۱۳۶۶ء/۷۶۸ھ تا ۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ
(۱۷) محمد سوم	۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ تا ۱۳۷۴ء/۷۷۶ھ
(۱۸) ابوالعباس احمد	۱۳۷۲ء/۷۷۴ھ تا ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ
(۱۹) مستنصر	۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ تا ۱۳۸۶ء/۷۸۸ھ
(۲۰) محمد چہارم	۱۳۸۶ء/۷۸۸ھ تا ۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ
(۲۱) ابوالعباس احمد (دوبارہ)	۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ تا ۱۳۹۳ء/۷۹۶ھ
(۲۲) ابوفارس	۱۳۹۳ء/۷۹۶ھ تا ۱۴۰۸ء/۸۱۱ھ
(۲۳) ابوسعید	۱۴۰۸ء/۸۱۱ھ تا ۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ
(۲۴) سعید	۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ تا ۱۴۲۴ء/۸۲۷ھ
(۲۵) عبداللہ	۱۴۲۴ء/۸۲۷ھ تا ۱۴۷۰ء/۸۷۵ھ

عبداللہ کے جانشین شریف سے ۱۴۷۰ء/۸۷۵ھ میں وطاسی خاندان نے حکومت لے لی، وطاسیوں کو ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ میں سعدی شرفاء نے ختم کردیا۔

باب ۸

کالے لوگوں کا دیس : ارضِ سودان

(۱) لمتونہ اور مرابطین

افریقہ کے نقشے پر اگر ہم نظر ڈالیں تو شمالی افریقہ کے ملکوں مراکش، الجزائر، تونس اور لیبیا کے جنوب میں ایک بہت بڑا ریگستان نظر آئے گا جس کو صحرائے اعظم کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے اور بحر اوقیانوس سے بحیرۂ احمر تک پھیلا ہوا ہے۔ بارش اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے یہ سارا علاقہ غیر آباد ہے۔ ہاں کہیں کہیں نخلستان پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ صحرائے اعظم کے باشندے عام طور پر بربر نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے ہیں۔ ٹمبکٹو کا قدیم شہر جنوب میں صحرائے اعظم کی حد ہے۔ ٹمبکٹو جو افریقہ کے تیسرے سب سے بڑے دریا نائیجیریا کے کنارے آباد ہے ایک زمانے میں اسلامی تہذیب اور علم و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ اس کے جنوب میں جو ملک واقع ہیں وہ ریگستانی نہیں ہیں۔ ان ملکوں کی زمینیں بڑی زرخیز ہیں اور یہاں بڑے بڑے جنگل پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بربر نہیں بلکہ سیاح فام یعنی زنگی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عہد قدیم میں اسی وجہ سے عرب اس خطہ کو سودان یعنی کالے رنگ والوں کی سرزمین کہا کرتے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے ان ملکوں کے باشندے کافر اور مظاہر پرست تھے بعض قبیلوں میں مردم خوری بھی عام تھی۔

عبداللہ بن یٰسین

صحرائے اعظم کے بربر باشندے چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) تک عام طور پر مسلمان ہو چکے تھے۔ چنانچہ مشہور سیاح ابن حوقل جب چوتھی صدی ہجری کے وسط میں صحرائے اعظم پار کر کے بربروں کے قبیلے لمتونہ کے دارالحکومت اودغست گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے تمام مقامی باشندے مسلمان ہیں اور عرب تاجر بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک اور مورخ یعقوب حموی نے لکھا ہے کہ "اودغست اور گردونواح کے باشندے چوتھی صدی کے شروع میں مسلمان ہوئے

تھے۔ اس سے پہلے وہ کافر تھے، سورج کی پرستش کرتے تھے اور خون اور مردہ کھاتے تھے، لیکن اب یہ لوگ قرآن اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور مسجدوں میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔

لمتونہ قبیلے کے ان ہی بربروں نے پانچویں صدی ہجری میں صحرائے اعظم کے جنوب میں سیاہ فام باشندوں میں اسلام پھیلایا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بربروں میں مرابطین کی مشہور اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ ایک مرابطی مبلغ اور سردار عبداللہ بن یٰسین نے جو خاندان مرابطین کے بانی یوسف بن تاشفین کے چچا تھے، ۱۰۴۲ء میں دریائے سینیگال کے ایک جزیرہ میں ایک رباط یا خانقاہ بنائی۔ اسی خانقاہ سے وہ مبلغوں کی جماعتیں اندرون ملک بھیجتے تھے اور سیاہ فام باشندوں میں اسلام کی اشاعت کرتے تھے۔ سب سے پہلے سینیگال کے ممتاز قبیلے تکرور نے اسلام قبول کیا۔

اس زمانے میں دریائے نائیجر کی وسطی وادی میں جسے اب مالی کہا جاتا ہے سیاہ فام باشندوں کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم تھی جس کو غانہ کہا جاتا تھا، چونکہ یہاں کے باشندے کافر تھے اس لیے مسلمان اس کو غانۃ الکفار بھی کہتے تھے۔ یہ وہی غانہ ہے جسے پاکستانی اخبارات گھانہ لکھتے ہیں۔ غانہ والوں نے دسویں صدی عیسوی میں لمتونہ بربروں کے صدر مقام اودغست پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ عبداللہ بن یٰسین نے طاقت حاصل کرنے کے بعد تکرور قبیلے کی مدد سے ۱۰۵۴ء میں اودغست کو غانہ والوں سے واپس لے لیا۔ ۱۰۵۷ء میں عبداللہ بن یٰسین مغرب اقصیٰ میں ایک جنگ میں شہید ہو گئے۔ ان کے نامکمل کام کو ایک دوسرے مرابطی سردار امیر ابوبکر (۱۰۶۲ء تا ۱۰۸۷ء) نے انجام دیا اور ۱۰۷۶ء میں غانہ کے دارالحکومت کُمبی کو فتح کر کے غانہ کی کافر سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ کُمبی کا شہر موجودہ ٹمبکٹو کے جنوب مغرب میں تین سو میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

مرابطین تو جلد ہی اپنے مفتوحہ علاقوں سے واپس چلے گئے لیکن انہوں نے اس مختصر مدت میں جس تبلیغی مہم کی بنیاد ڈال دی وہ بڑی کامیاب ثابت ہوئی اور گیارھویں صدی کے اختتام تک سینیگال سے جھیل چاڈ تک تمام سیاہ فام باشندوں میں اسلام پھیل گیا۔ ان ہی میں نائیجر کی وسطی وادی میں سونگھائی اور مالی کے قبائل شامل تھے۔ ایک سو سال کی مدت میں اس خطے میں اسلام کو جو فروغ ہوا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۰ء میں جب دریائے نائیجر کے کنارے واقع شہر جنہ کے بادشاہ نے اسلام قبول کیا تو اس خوشی میں ایک زبردست جشن کیا گیا تھا، جس میں مالی کے چار ہزار دو سو علماء نے شرکت کی تھی۔

(۲) سلطنت مالی

(۱۲۳۰ء تا ۱۵۴۵ء)

غانہ کے زوال کے بعد ان علاقوں میں جو کبھی غانہ کی سلطنت میں شامل تھے متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یہ ریاستیں فی الحقیقت غانہ کی باجگذار تھیں اور اب غانہ کے زوال کے بعد خود مختار ہوگئی تھیں۔ ان ہی میں ایک مالی کی مملکت تھی۔ مالی کا علاقہ دریائے نائیجر کی بالائی اور وسطی وادی پر مشتمل تھا اور اس ریاست کی حدود دریا کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ مالی کی قدیم حدود تقریباً وہی تھیں جو اب جمہوریہ مالی کی ہیں۔

مالی کا حکمران خاندان تحریک مرابطین کے ابتدائی دور میں یعنی گیارھویں صدی کے وسط میں مسلمان ہو چکا تھا۔ پہلے مسلمان حکمران کا نام 'برمندان' تھا۔ مالی کا حکمران خاندان مغربی افریقہ کے سب سے بڑے قبیلے مندنگو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کا پہلا بڑا حکمران ماری جاطہ (۱۲۳۰ء تا ۱۲۵۵ء) ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کی حدود مغرب میں سینیگال تک وسیع کردی تھیں۔ اب تک مالی کا صدر مقام شہر 'جریبہ' تھا، لیکن ماری جاطہ نے 'نیانی' کو جو جریبہ کے قریب ہی تھا دارالسلطنت قرار دیا اور آخر تک یہی دارالحکومت رہا۔ بعد میں اسی شہر نے مالی کے نام سے شہرت پائی۔

منسا موسیٰ

مالی کا سب سے مشہور اور نیک نام حکمران منسا موسیٰ (۱۳۰۷ء تا ۱۳۳۲ء) ہے۔ اس کے عہد میں مالی کی سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ ٹمبکٹو اور گاو کے مشہور شہر فتح ہوئے اور سلطنت کی حدود مشرق میں گاو سے مغرب میں بحر اوقیانوس تک اور شمال میں تفازہ کی نمک کی کانوں سے جنوب میں ساحلی جنگلوں تک پھیل گئیں۔

منسا موسیٰ کو سب سے زیادہ شہرت اس کے سفر حج کی وجہ سے ہوئی جو اس نے ۱۳۲۴ء/ ۷۲۴ھ میں کیا تھا۔ یہ سفر اتنا پر شکوہ تھا کہ اس کی وجہ سے منسا موسیٰ کی شہرت نہ صرف اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیل گئی بلکہ تاجروں کے ذریعے یورپ تک اس کا نام پہنچ گیا۔ اس سفر میں منسا موسیٰ نے اس کثرت سے سونا خرچ کیا تھا کہ مصر میں سونے کی قیمتیں کئی سال تک گری رہیں۔

منسا موسیٰ مکہ معظمہ سے ایک اندلسی معمار ابواسحٰق ابراہیم الساحلی کو اپنے ساتھ لایا جس نے بادشاہ کے حکم سے گاؤ اور ٹمبکٹو میں پختہ اینٹوں کی دو خوبصورت مسجدیں اور ٹمبکٹو میں ایک محل تعمیر کیا۔ مالی کے علاقے میں اس وقت تک پختہ اینٹوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔

منسا موسیٰ کے زمانے میں مالی کے پہلی مرتبہ بیرونی ملکوں سے تعلقات قائم ہوئے۔[1] چنانچہ مراکش کے مرینی سلطان ابوالحسن سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ منسا موسیٰ درویش صفت اور نیک سیرت حکمران تھا۔ اس کے عدل وانصاف کے متعدد قصے تاریخوں میں درج ہیں۔

منسا موسیٰ کے بعد مالی کی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ ایک ایک کر کے تمام علاقے ہاتھ سے نکل گئے اور ۱۵۴۵ء میں شہر گاؤ کے صونغائی حکمران نے مالی کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

ابن بطوطہ اور مالی

مالی کی سلطنت کے عہد عروج کے عام حالات معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس سب سے بڑا ذریعہ ابن بطوطہ کا سفر نامہ ہے۔ ابن بطوطہ ۱۳۵۲ء میں مالی آیا تھا۔ اس وقت منسا موسیٰ کے بھائی سلیمان بن ابوبکر کی حکومت تھی۔ ابن بطوطہ نے مالی کی مملکت میں ایک سال سے زیادہ قیام کیا اور اس دوران میں دارالحکومت مالی کے علاوہ گاؤ، تکدا اور ٹمبکٹو کی بھی سیر کی۔ ابن بطوطہ نے مالی کی خوشحالی اور امن وامان کی تعریف کی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ:

> ''وہ منصف ہیں اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ظلم سے نفرت کرتے ہیں۔ سلطان معمولی سے جرم کو بھی معاف نہیں کرتا۔ ملک میں مکمل امن وامان ہے۔ باشندوں اور سیاحوں کو ڈاکوؤں وغیرہ سے کسی قسم کا ڈر نہیں۔ یہ لوگ سفید نسل کے لوگوں کی جائداد کبھی ضبط نہیں کرتے اور مرنے پر وارثوں کو دے دیتے ہیں۔ لوگ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور باجماعت ادا کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ مسجدوں میں نماز کے لیے اتنا اژدہام ہوتا ہے کہ اگر دیر ہو جائے تو اندر جگہ نہیں مل سکتی''

ابن بطوطہ نے سوڈانی باشندوں کی بعض معاشرتی خرابیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ملازم

---

(۱) تعلقات کا یہ سلسلہ منسا موسیٰ کے بعد بھی جاری رہا۔ ماری جاطہ ثانی (۱۳۵۹ء تا ۱۳۷۴ء) نے ۷۶۲ھ میں مرینی حکمران ابا سالم کو جو تحائف بھیجے، ان میں ایک زرافہ بھی تھا، جس کو دیکھنے کے لیے فاس میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ۱۴۸۳ء اور ۱۵۳۴ء میں پرتگال سے بھی دو سفارتیں مالی آئیں۔ یہ یورپ کے کسی ملک کی پہلی سفارتیں تھیں۔

عورتیں، لونڈیاں اور کمسن بچیاں ہر ایک کے سامنے بالکل ننگی پھرتی ہیں حتیٰ کہ بادشاہ کی بچیاں بھی ننگی پھرتی ہیں۔ دربار میں بادشاہ کے احترام میں سر پر خاک اور دھول ڈالنے کا رواج ہے اور لوگ کتے اور گدھے کا گوشت کھا لیتے ہیں''

(۳) سلطنت صونغائی

(۱۳۳۵ء تا ۱۵۹۱ء)

مالی کے زوال کے بعد پندھویں صدی میں قبیلۂ صونغائی یا سونگھائی کو عروج حاصل ہوا۔ اس قبیلے کا مرکز گاؤ کا شہر تھا۔ یہ شہر دریائے نائیجر کے کنارے نائیجر کے دارالحکومت نیامی کے شمال مغرب میں موجودہ مالی کی حدود میں واقع ہے۔ عربی میں اس کو 'کوکو' لکھا جاتا ہے۔ منسا موسیٰ نے جب گاؤ فتح کیا تو وہ قبیلہ صونغائی کے دو شہزادوں علی کولین اور سلیمان نار کو اپنے ساتھ بطور یرغمال لے گیا تھا۔ منسا موسیٰ کے جانشین نے ان کو نقل و حرکت کی اجازت دے دی جس سے فائدہ اٹھا کر یہ شہزادے فرار ہو گئے اور ۱۳۳۵ء میں علی کولین نے گاؤ میں آزاد حکومت قائم کر لی۔

صونغائی کی یہ حکومت ۱۵۹۱ء تک قائم رہی۔ ایک سو سال تک صونغائی حکمران مالی کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کی حکومت گاؤ تک محدود رہی۔ اس کے بعد ان میں ایک طاقتور حکمران کا ظہور ہوا جس کا نام سُنّی علی (۱۴۶۴ء تا ۱۴۹۲ء) ہے۔ اس نے ۱۴۶۸ء میں ٹمبکٹو اور ۱۴۷۳ء میں جنّہ (Jenne) کا مشہور شہر فتح کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی۔

اسکیائے اعظم (۱۴۹۲ء تا ۱۵۲۸ء)

سُنّی علی کے بعد دربار صونغائی کا ایک سردار محمد توری جو سوننکے (Soninke) قبیلے سے تعلق رکھتا تھا تخت پر قابض ہو گیا۔ محمد توری نے اسکیا کا لقب اختیار کیا جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ تاریخ میں وہ اسکیا محمد اول یا اسکیائے اعظم (۱۴۹۲ء تا ۱۵۲۸ء) کے نام سے مشہور ہے۔

اسکیا محمد حکومت مستحکم ہونے کے بعد ۱۴۹۶ء میں حج کے لیے روانہ ہوا۔ پانچ سو سوار، ایک ہزار پیادے اور سفر خرچ کے لیے سونے کے تین لاکھ سکے اس کے ساتھ تھے۔ اس میں سے ایک تہائی رقم اس نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کار خیر پر صرف کی۔ واپسی میں اسکیائے نے مصر کے

عباسی خلیفہ متوکل سے ارض سوڈان کی حکومت کی سند حاصل کی اور کچھ مدت مشہور عالم جلال الدین سیوطی کی صحبت میں رہ کر ان سے تحصیل علم میں صرف کی۔

حج سے واپسی پر اسکیا محمد نے مغرب اور جنوب کی طرف سلطنت کو توسیع دی۔ مشرق میں اس نے گوبیر، کانو، زاریا اور کتسینا کی غیر مسلم ہاوسا ریاستوں کو فتح کیا جو اب نائیجریا کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے بعد اس نے شمال کے بربر قبیلے ترقہ یا توارغ کی طرف رخ کیا جو ہاوسا کی خوشحال بستیوں پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ خانہ بدوش بربروں کو صحرا کی طرف بھگا دیا گیا اور مملکت کے تحفظ کے لیے اگادس (Agades) کے سرحدی علاقے میں سونگھائی قبائل کو آباد کیا گیا۔

اسکیا محمد کی یہ سلطنت سیاہ فام باشندوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ اس کی حدود غانہ اور مالی کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع تھیں۔ اسکیا محمد کی سلطنت جنوب کے ساحلی جنگلوں کو چھوڑ کر اس تمام علاقے میں پھیلی ہوئی تھی جو کسی زمانے میں فرانسیسی مغربی افریقہ کہلاتی تھی اور جس کا رقبہ تقریباً اٹھارہ لاکھ مربع میل تھا۔ سلیمان قانونی، اسمٰعیل صفوی، حسین بایقرا، شیبانی خان اور سکندر لودھی اس کے ہمعصر تھے۔

اسکیا محمد صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا بلکہ ایک عظیم منتظم اور مدبر حکمران بھی تھا۔ اس نے حکومت میں پہلی مرتبہ سیاسی، انتظامی اور فوجی محکمے قائم کیے، مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا، پولیس قائم کی اور قاضی مقرر کیے۔ اس نے مستقل فوج قائم کی اور دریائے نائیجر میں استعمال کرنے کے لیے کشتیوں کا بیڑہ بنایا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسکیا محمد نے سفر حج کے دوران حجاز اور مصر میں حکومتوں کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اپنے ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر اس نے بلادِ سوڈان میں اصلاحات جاری کیں۔

اسکیا محمد نے بلادِ سوڈان میں ان غیر اسلامی اثرات کو ختم کرنے کے لیے جو مسلمان ہو جانے کے باوجود سوڈانی باشندوں میں رہ گئے تھے حتی المقدور کوشش کی۔ اس نے بدعتوں اور مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی کی، اشاعت اسلام کی کوشش کی اور رعایا پر سے محاصل کا بار ہلکا کیا۔ اسکیا محمد چونکہ خود عالم تھا اس لیے اس نے علماء کی کھل کر سرپرستی کی اور مغربی سوڈان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ علماء کو دربار میں ممتاز ترین مقام حاصل ہوا۔ مراکش کا ایک سیاح حسن الوزان فاسی جس نے اسکیا اعظم کے زمانے میں ۱۵۰۹ء میں دو مرتبہ مغربی سوڈان کا سفر کیا تھا لکھتا ہے کہ:

''اطبا، قاضیوں اور علماء کی کثرت ہے، بادشاہ ان کے اخراجات فیاضانہ طریقہ پر اٹھاتا ہے۔ بیرونی ملکوں سے جو کتابیں آتی ہیں وہ سوداگری کے دوسرے سامان کی نسبت زیادہ قیمت پاتی ہیں''

اسکیا محمد نہ صرف بلاد سوڈان کی تاریخ میں سب سے بڑا حکمران گذرا ہے بلکہ وہ تاریخ کے عظیم حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے معاصرین میں سے سوائے سلیمان اعظم کے شاید کوئی بھی عظمت میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مورخین نے بجا طور پر اس کو اسکیا اعظم کہا ہے

اسکیا اعظم کے بعد صونغائی کی سلطنت کو زوال ہوگیا۔ سولہویں صدی کے آخر میں مراکش کے حکمران منصور ذہبی نے سونے کے لالچ میں جس کے لیے مالی کا علاقہ صدیوں سے مشہور رہا ہے بلاد سوڈان پر لشکر کشی کی اور ۱۵۹۱ء میں ٹمبکٹو اور دارالحکومت گاو فتح کر کے اسکیا خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

تہذیب وتمدن

گاو کے عروج کا یہ زمانہ مغربی افریقہ کی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہم ترین دور ہے۔ اس دَور میں مغربی سوڈان میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا، علم وادب نے ترقی کی، بلکہ بلادِ سوڈان میں علم و ادب اور اسلامی تعلیمات کا احیاء ہوا۔ جس طرح سلطنت مالی کے عہد عروج کے عام حالات معلوم کرنے کے لیے ابن بطوطہ کا سفر نامہ ہمارا سب سے بڑا ذریعہ ہے اسی طرح مراکشی سیاح حسن الوزان فاسی کی کتاب اس زمانے کے حالات معلوم کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔ حسن الوزان نے جیسا کہ پیچھے بتایا جاچکا ہے اسکیائے اعظم کے عہد میں دو مرتبہ بلاد سوڈان کا سفر کیا تھا۔ حسن الوزان بلاد سوڈان کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''یہاں سونے کی کثرت ہے لیکن نمک کی بہت کمی ہے۔ گھوڑے بھی بہت کم ہوتے ہیں اور اچھی قسم کے گھوڑے باہر سے آتے ہیں۔ بادشاہ تاجروں کو گھوڑے کی قیمت فیاضانہ ادا کرتا ہے۔ سکہ سونے کا ہوتا ہے جس پر کوئی نشان یا تحریر نہیں ہوتی۔ کم قیمت کے لیے سیپی استعمال کی جاتی ہے''

ٹمبکٹو کے بارے میں لکھتا ہے:

''یہاں تاجروں اور صنعت کاروں کی بہت دوکانیں ہیں اور سوتی کپڑا بنا جاتا ہے۔ سوائے

ملازم عورتوں کے تمام عورتیں نقاب پہنتی ہیں۔ باشندے خصوصاً بیرونی لوگ بہت دولت مند ہیں۔ کنوؤں کی کثرت ہے۔ پانی میٹھا ہے۔ دریا کا پانی نہروں کے ذریعے شہر میں جگہ جگہ آتا ہے۔ مکئی، دودھ، مکھن اور مویشیوں کی کثرت ہے۔ باشندے خوش مزاج اور نرم طبیعت ہیں"

شہر مالی کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"یہاں کی آبادی چھ ہزار سے زیادہ گھروں پر مشتمل ہے۔ باشندے دولت مند ہیں۔ علماء کی کثرت ہے اور وہ مسجدوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بذلہ سنجی، تہذیب اور صنعت و حرفت میں باقی سوڈانی باشندوں سے بڑھے ہوئے ہیں"

دارالحکومت گاؤ کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"بغیر فصیل کے شہر ہے۔ سوائے بادشاہ اور درباریوں کے باقی لوگوں کے گھر معمولی ہیں۔ تاجر بہت دولت مند ہیں۔ غلاموں کا بازار پایا جاتا ہے۔ شمالی افریقہ اور یورپ کے کپڑے کی مانگ ہے۔ گرم مسالے بڑی قیمت پاتے ہیں اور سونا اس کثرت سے ہوتا ہے کہ جب لوگ بازار میں فروخت نہیں کر پاتے تو واپس لے جانا پڑتا ہے"

شہر جنّہ کے متعلق لکھا ہے کہ "یہاں چاول، مچھلی، روئی اور مویشی کی کثرت ہے"

احمد بابا

مالی یا مغربی سوڈان میں ٹمبکٹو اور جنّہ علم کے سب سے بڑے مرکز تھے۔ ٹمبکٹو میں علمی سیادت بربروں کو حاصل تھی اور جنّہ میں سیاہ فام مندنگو باشندوں کو۔ یہاں کے علماء اور مصنفوں میں احمد بابا (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۷ء) اور عبدالرحمن سعدی سب سے مشہور ہیں۔ احمد بابا ٹمبکٹو کے تھے اور نسلاً بربر تھے عبدالرحمن سعدی جنّہ کے تھے اور مندنگو نسل سے تھے۔ احمد بابا تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے ایک کتاب نیل الابتہاج چھپ چکی ہے اور شمالی افریقہ اور سوڈان کے علماء کے حالات میں ہے۔ اس زمانے میں مالی اور مغربی سوڈان میں علم کتنا عام ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ احمد بابا کے ذاتی کتب خانہ میں سولہ سو کتابیں تھیں اور ان کے بھائیوں کے پاس جو کتب خانے تھے وہ اس سے بھی بڑے تھے۔ احمد بابا کو

مراکشی حملہ کے دوران گرفتار کر کے مراکش پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں سے کئی سال جلاوطن رہنے کے بعد ۱۶۰۷ء میں پھر ٹمبکٹو واپس آئے۔ حملے کے دوران ان کا کتب خانہ تباہ ہو گیا جس کا ان کو ساری عمر افسوس رہا۔

عبدالرحمن سعدی (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۶ء) تاریخ سوڈان کے مصنف تھے جو ۱۶۵۵ء میں لکھی گئی۔ اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ایک الفتاش بھی ہے جسے ۱۵۱۹ء میں محمود الکعتی نے لکھنا شروع کیا تھا اور ان کے پوتے ابن المختار نے ۱۶۶۵ء میں مکمل کیا۔ یہ خاندان اسکیا کی تاریخ ہے۔ اسکیائے اعظم کے دور کے ایک اور مصنف محمد المغیلی (Elmaghili) ہیں۔ وہ شمالی افریقہ کے رہنے والے تھے اور شمالی نائیجیریا میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ حکمرانوں کے فرائض سے متعلق ایک کتاب کے مصنف تھے۔

سلطنت مالی

(۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء تا ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء)

(۱) ماری جاطہ	۱۲۳۰ء تا ۱۲۵۵ء
(۲) منساء اولیٰ	۱۲۵۵ء تا ۱۲۷۰ء
(۳) ابوبکر	۱۲۷۰ء تا ۱۲۸۵ء
(۴) ساکورا	۱۲۸۵ء تا ۱۳۰۰ء
(۵) ابوبکر	۱۳۰۰ء تا ۱۳۰۷ء
(۶) منسا موسیٰ	۱۳۰۷ء تا ۱۳۳۲ء
(۷) منسا مُغا	۷۰۷ھ/۱۳۳۲ء تا ۷۳۳ھ/۱۳۳۶ء
(۸) منسا سلیمان	۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء تا ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء
(۹) ماری جاطہ دوم	۱۳۵۹ء تا ۱۳۷۴ء
(۱۰) منسا موسیٰ دوم	۱۳۷۴ء تا ۱۳۸۷ء

مالی کے اس خاندان نے اگرچہ ۱۵۴۵ء تک حکومت کی، لیکن سلسلے وار نام صرف مذکورہ بالا حکمرانوں کے محفوظ ہیں۔

(۴) کانم کی سلطنت

ارض سوڈان کی تیسری بڑی مسلم سلطنت کانم کی تھی۔ یہ سلطنت اس علاقے میں قائم ہوئی تھی جس کو اب چاڈ کہا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت جھیل چاڈ کے کنارے واقع تھا۔ کانم کی سلطنت کا آغاز نویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ شروع کے نو حکمران مظاہر پرست تھے۔ اس کے بعد شاہی خاندان مسلمان ہو گیا۔ اس خاندان کے بادشاہ اگرچہ نسلاً بربر تھے لیکن وہ یمن کے حمیری خاندان سے ہونے کا دعوی کرتے تھے اور اپنا نسب یمن کے قبل از اسلام کے مشہور بادشاہ سیف بن ذی یزن سے ملاتے تھے۔

کانم کا پہلا مسلمان حکمران ہومے (Hume) یا اومے تھا جس نے ۱۰۸۵ء سے ۱۰۹۷ء تک حکومت کی۔ بارھویں صدی میں کانم کی فوجوں نے تونس کی مدد سے صحرائے اعظم کا بہت بڑا حصہ فتح کرلیا۔ تیرھویں صدی میں یہ سلطنت پورے عروج پر پہنچ گئی اور مشرق میں دریائے نیل سے لے کر مغرب میں دریائے نائیجر تک اور شمال میں فزان (لیبیا) سے لے کر جنوب میں سطح مرتفع آدماوا تک پھیل گئی۔ تیرھویں صدی کے وسط تک نہ صرف کانم کا حکمران طبقہ بڑی حد تک مسلمان ہو چکا تھا بلکہ کانم کے عام باشندوں میں بھی اسلام پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ۱۲۵۰ء کے قریب کانم کے مسلمانوں نے قاہرہ میں یک مدرسہ بھی قائم کرلیا تھا جہاں فقہ مالکی کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسے کی ارض سوڈان میں دُور دُور تک شہرت تھی اور سوڈانی مسلمان اس کی مالی کفالت کرتے تھے۔ ہومے کے لڑکے دونامہ (۱۰۹۷ء تا ۱۱۵۰ء) نے دو مرتبہ حج بھی کیا اور تیسرے حج کے دوران بحیرۂ قلزم میں غرق ہو گیا۔

کانم کے حکمران دوناما بن مسلما (۱۲۲۱ء تا ۱۲۵۹ء) کے زمانے میں کانم اور تونس کے درمیان سفارتی تعلق قائم ہوا اور دوناما نے حفصی سلطان مستنصر باللہ کو تحائف بھی بھیجے جن میں ایک زرافہ بھی شامل تھا۔

چودھویں صدی کے آخر میں کانم پر ایک غیر مسلم قبیلے بلالا کا قبضہ ہو گیا اور کانم کے شاہی خاندان کو اپنا دارالحکومت جیمی چھوڑنا پڑا۔ یہ غیر مسلم قبیلہ ستر برس تک کانم پر قابض رہا۔ اس کے بعد کانم کی سلطنت کا ایک نیا دَور شروع ہوا جس کا آگے تذکرہ آئے گا۔ اس نئے دَور میں کانم کی

سلطنت نے بورنو کے نام سے شہرت پائی۔ [تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔۳۵(۳)]

اہم واقعات

۱۰۴۲ء عبداللہ بن یٰسین نے دریائے سینیگال کے جزیرہ میں ''رباط'' تعمیر کی۔

۱۰۵۴ء عبداللہ بن یٰسین نے غانہ سے ''اودغست'' واپس لے لیا۔

۱۲۰۰ء شہر جنّہ (مالی) کے بادشاہ نے اسلام قبول کیا۔

۷۲۴ھ منسا موسیٰ کا تاریخی سفر حج۔

۱۴۹۶ء اسکیا اعظم نے حج کیا اور امام جلال الدین سیوطی سے درس لیا۔

باب ۹

مشرقی افریقہ

(۱) حبش اور زیلع

مشرقی افریقہ کے جس علاقے میں اسلام کے اثرات سب سے پہلے پہنچے وہ سرزمین حبش ہے جسے آج کل اتھیوپیا (Ethiopia) کہتے ہیں۔ یہاں اسلام کا پیغام عہد رسالت ہی میں پہنچ گیا تھا جب کہ حبشہ کا بادشاہ نجاشی اسلام لایا تھا اور کفار مکہ کے ستائے ہوئے مہاجرین نے اکسوم (Aksun) میں پناہ لی تھی جو اس زمانے میں حبش کا دارالحکومت تھا اور موجودہ حبش کے شمال مشرق میں اری ٹیریا کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ مسلمانوں کی پہلی نوآبادی اسی شہر اکسوم میں قائم ہوئی۔

اسلام کے ابتدائی دور میں حبش کی حدود مشرق میں ساحل سمندر تک وسیع تھیں اور اری ٹیریا کے علاوہ وہ علاقہ بھی جو اب شمالی صومالیہ کہلاتا ہے حبش ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ حبش کے ان ساحلی علاقوں میں عرب باشندے اسلام سے پہلے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور اسلام کے بعد غالباً یہی عرب باشندے تھے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور ان کے ذریعے حبش کے قدیم لوگوں میں اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی تک حبش کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد مسلمان ہو چکی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس صدی میں شمال مشرقی اور جنوبی حبش میں مسلمانوں کی سات ریاستیں قائم ہو چکی تھیں جو بڑی حد تک آزاد تھیں، مگر سلطان شُوا کی قیادت اور بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں۔ شُوا کی ریاست کے حکمران اپنے نسب عربوں کے قبیلے مخزوم سے ملاتے تھے۔ حبش کی مسلمان ریاستوں پر سلطان شُوا کی یہ بالادستی ۱۲۸۵ء میں ختم ہوگئی اور ایک دوسری مسلم ریاست ایفات (Ifat) کے حکمران علی بن ولاسیما نے شُوا کے آخری سلطان کو شکست دے کر مشرقی حبش میں ایفات کی بالادستی قائم کر دی۔

ایفات کا یہ نیا حکمران خاندان جس کی حکومت ۱۲۸۵ء سے ۱۴۴۵ء تک رہی حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیل ابن ابی طالب کی اولاد میں سے ہونے کا دعوے دار تھا۔ اس دور میں مسلمانوں اور حبش کے مسیحی حکمرانوں کے درمیان جو نجاشی کہلاتے تھے لڑائیوں کا ایک طویل

سلسلہ شروع ہوگیا، جس میں کبھی مسلمان کامیاب ہوتے تھے اور کبھی عیسائی۔ ایفات کے ان حکمرانوں میں سلطان سعد الدین متوفی ۱۴۱۵ء کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس سلطان نے اپنے دلیرانہ کارناموں کی وجہ سے ایسی ہر دلعزیزی حاصل کرلی تھی کہ حبشی مسلمانوں کی لوک کہانیوں میں اس کا نام آج بھی محبت اور پیار سے لیا جاتا ہے۔ ۱۴۴۵ء میں ایفات کے سلطان بادلے بن سعد الدین کی حبش کے نجاشی حکمران سے شکست کے بعد ایفات کا زوال شروع ہوگیا اور ایفات کی جگہ ایک دوسرے حکمران خاندان نے لے لی جو عدل کے حکمران کہلاتے ہیں۔

احمد جران (۱۵۲۵ء تا ۱۵۴۳ء)

عدل کا شہر پہلے ایفات ہی کا ایک حصہ تھا، بلکہ ایفات کا صدر مقام تھا، لیکن یہ شہر مسیحی حبش کے قریب ہونے کی وجہ سے عیسائیوں کے حملوں کی زد میں رہتا تھا۔ اس لیے عدل کی نئی حکومت نے ۱۵۲۰ء میں دارالحکومت عدل سے ہرار منتقل کر دیا جو زیادہ مشرق میں واقع ہے۔ عدل کی یہ حکومت جس کو مورخین نے سلطنت زیلع بھی لکھا ہے ۱۴۴۵ء سے ۱۵۷۷ء تک قائم رہی۔ اس زمانے میں بندرگاہ زیلع جو موجودہ جبوتی کے قریب واقع تھی، حبش کی بندرگاہ سمجھی جاتی تھی اور سلطنت زیلع کا ایک اہم تجارتی اور علمی مرکز تھی۔ زیلع میں اس دور میں کئی نامور عالم اور مصنف ہوئے ہیں جن کو زیلعی لکھا جاتا ہے۔

زیلع یا عدل کی اس سلطنت میں سب سے زیادہ شہرت احمد جران نے حاصل کی۔ احمد جران جو ۱۵۰۶ء کے قریب پیدا ہوا نسلاً صومالی تھا۔ صومالی باشندوں کا تعلق شمال مشرقی حامی نسل سے ہے جس کے رکن گالا اور دناقیل قبیلے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ان کا اصل وطن کونسا تھا۔ بہرحال یہ طے ہے کہ جنوبی عرب سے ہجرت کرکے آنے والے قبیلوں میں سب سے آخر میں صومالی سرزمین حبش میں آئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صومالی قبائل اس خطے میں تیرھویں صدی عیسوی میں حضرموت سے آئے تھے۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ صومالی باشندے یمن کے حمیریوں کے زمانے ہی میں ساحل حبش پر آباد ہوگئے تھے۔

سلطان احمد جران بن ابراہیم جب عدل کے تخت پر بیٹھا تو دارالحکومت ہرار منتقل ہو چکا تھا۔ عدل کے سلاطین اس وقت حبش کے باجگذار ہو چکے تھے، لیکن سلطان احمد جران نے حکومت

سنبھالنے کے بعد حبش کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ ۱۵۲۹ء میں احمد جران نے مسیحی حبش پر
زبردست فتح حاصل کی اور دو سال بعد شوا (shoa) بھی فتح کر لیا۔ اگلے چھ سال میں وہ موجودہ
حبش کے بیشتر حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے لیے حبش
کے نجاشی حکمران نے پرتگالیوں سے مدد مانگی۔ جنہوں نے راس امید کے راستے ہندوستان تک
پہنچنے کا بحری راستہ معلوم کرنے کے بعد بحر ہند اور بحیرۂ عرب میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ پرتگالی فوراً
نجاشی کی مدد کو پہنچ گئے اور ۱۵۴۱ء میں مشہور جہاز راں واسکوڈی گاما کے لڑکے کی قیادت میں ایک
فوج مصوع (massawa) کے پاس اُتار دی جو آج کل اری ٹیریا کی بندرگاہ ہے۔ پرتگالی فوج
بندوقوں اور آتشیں اسلحہ سے مسلح تھی۔ یہ ہتھیار چونکہ احمد جران کے پاس نہیں تھے۔ اس لئے اس
نے عثمانی ترکوں سے مدد طلب کی جو اس وقت یمن پر قابض ہو چکے تھے۔ ترکوں کی بندوق بند
فوج کی مدد سے احمد جران نے ۱۵۴۲ء میں پرتگالیوں کو شکست فاش دی اور واسکوڈی گاما کا لڑکا
جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد ترک فوج واپس چلی گئی۔ ترکوں کی واپسی سے نجاشی نے فائدہ
اٹھایا اور احمد جران کی مملکت پر پھر حملہ کر دیا۔ ۱۵۴۳ء میں جھیل تانا کے کنارے جنگ زائیترا
میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور احمد جران شہید ہو گیا۔

نور بن مجاہد

احمد جران کی شہادت سے حبش کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا لیکن وہ جلد ہی اس صدمے
سے سنبھل گئے۔ ۱۵۵۱ء میں ہرار کے حکمران نور بن مجاہد کو عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں
مسلمان مسیحی حبش پر دو طرف سے حملہ آور ہوئے۔ شمال سے ترک جنہوں نے ۱۵۵۷ء میں مصوع
پر قبضہ کر لیا اور جنوب سے نور ابن مجاہد۔ ترک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور ۱۵۸۹ء میں
ان کو مقبوضہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ لیکن نور ابن مجاہد نے ۱۵۵۹ء میں نجاشی کو شکست فاش دی۔ نجاشی
جنگ میں مارا گیا اور نور ابن مجاہد اس کے سر کو فتح کے طور پر ہرار لے گئے۔ نور ابن مجاہد کا ۱۵۶۷ء
میں انتقال ہو گیا۔ ان کا مزار آج بھی مسلمانانِ حبش کی ایک بڑی زیارت گاہ ہے۔
حبش میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں جاری تھیں کہ جنوب سے گالا قبائل
نے حملہ کر دیا۔ انہوں نے پہلے نور ابن مجاہد کو جو نجاشی پر فتح حاصل کر کے آ رہے تھے شکست دی

اور اس کے بعد مسیحی علاقوں کا رخ کیا اور چند سالوں میں گوجام اور جھیل تانا کے علاقوں تک پہنچ گئے۔ گالا قبائل کے ان حملوں سے عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو نقصان پہنچا۔ نجاشی کو دارالحکومت گونڈار منتقل کرنا پڑا جو زیادہ محفوظ مقام تھا۔ اسی طرح مسلم ریاست کا دارالحکومت بھی ۱۵۷۷ء میں ہرار سے جنوب کی طرف بمقام اوسا منتقل کر دیا گیا۔

اس کے بعد تقریباً دو سو سال تک حبش کے حالات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ محمد علی پاشا (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۹ء) اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں جب سوڈان پر مصر کا قبضہ ہو گیا تو مصری فوجوں کی جنوب کی طرف پیش قدمی کی وجہ سے نجاشی سے مصر اور سوڈان کا تصادم ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں نجاشی نے مصری فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد جب مہدی سوڈانی نے مصری تسلط کو ختم کر دیا تو سوڈان اور حبش میں تصادم ہو گیا اور مہدی کے درویشوں نے مغربی حبش پر گونڈار تک حملے شروع کر دیئے اور مارچ ۱۸۸۹ء میں ایک جنگ میں شہنشاہ حبش نجاشی مارا گیا۔ لیکن اس دوران میں خاص حبش میں مسلمانوں کی قوت کمزور پڑتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۱۸۸۷ء میں نجاشی کا ہرار پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اب حبش میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا اور موجودہ مملکت حبش جس کو انگریزی میں ایتھوپیا کہا جاتا ہے، وجود میں آئی۔

(۲) مشرقی سوڈان

آج کل جو ملک سوڈان کہلاتا ہے وہ اس وسیع و عریض سوڈان یا بلاد سودان کا مشرقی حصہ ہے جو بحر اوقیانوس سے بحیرۂ احمر تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے شمالی حصے صحرائے اعظم کا حصہ ہیں اور جنوبی حصے زرخیز زمینوں پر مشتمل ہیں۔ جس طرح مالی اور اس سے ملحقہ علاقوں کو مغربی سودان کہا جاتا ہے اسی طرح سوڈان کو مشرقی سوڈان بھی کہا جاتا ہے۔

موجودہ سوڈان کا نصف شمالی حصہ عہد قدیم میں نوبیہ کہلاتا تھا۔ مصر کی طرح نوبیہ کی خوشحالی بھی دریائے نیل اور اس کے معاونوں کی رہین منت ہے اور مصر کی طرح نوبیہ بھی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ نوبیہ کی قدیم تہذیب دراصل مصری تہذیب تھی اور اس کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ مصر کے اثرات شمالی سوڈان یا نوبیہ پر مصر کی سلطنت قدیم (۲۹۰۰ق۔م تا ۲۵۰۰ق۔م) کے زمانے ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد خود نوبیہ میں

۸۰۰ ق ۔م کے قریب ناپاتا (Napata) اور میرو (Meroe) کی سلطنتیں قائم ہوئیں جو ۳۰۰ء تک موجود تھیں ۔ ان سلطنتوں کے زمانے میں مصر پر بھی اہل نوبیہ کا قبضہ ہوگیا تھا اور اس کی شمالی حدود بحیرۂ روم تک پہنچ گئی تھیں ۔ خرطوم اور مصر کے درمیان حال ہی میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے ان قدیم تہذیبوں کے بکثرت آثار دریافت ہوئے ہیں جو اہراموں، عبادت گاہوں، محلوں اور مجسموں کی شکل میں ہیں ۔

ناپاتا اور میرو کے زوال کے بعد سوڈان میں عیسائیت کو فروغ ہوا ۔ اگرچہ سوڈانیوں نے چھٹی صدی عیسوی تک مسیحیت قبول نہیں کی تھی، لیکن اگلی چند صدیوں میں شمالی سوڈان کا بڑا حصہ مسیحی مذہب قبول کر چکا تھا ۔ سوڈان کی مسیحی ریاستوں میں ڈنگولا اور ایلوا کی حکومتیں قابل ذکر ہیں ۔ یہ سلطنتیں چودھویں صدی بلکہ اس کے بعد تک قائم رہیں ۔ اس کے بعد ان کے کھنڈروں پر اسلامی حکومتوں کی بنیادیں استوار ہوئیں ۔

اسلامی دَور

مسلمانوں اور اہل نوبیہ کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ خلافت راشدہ کے زمانے ہی میں شروع ہوگیا تھا، لیکن مسلمان اس زمانے میں نوبیہ پر قابض نہیں ہوسکے ۔ بعد کی صدیوں میں کئی مرتبہ نوبیہ کا شمالی حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا ۔ مصر کے ایوبی سلاطین اور مملوک سلاطین کے زمانے میں یہ خطہ بڑی حد تک مسلمانوں کے زیر اثر آ گیا تھا ۔

سوڈان میں اسلام کو حقیقی غلبہ مصر کے راستے نہیں بلکہ بحیرۂ احمر کے راستے سے حاصل ہوا ۔ آٹھویں صدی ہجری میں عرب قبائل بہت بڑی تعداد میں بحیرۂ احمر کے راستے مشرقی سوڈان میں داخل ہوئے اور نیل ارزق اور نیل ابیض کے درمیان سنار کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہوگئے ۔ رفتہ رفتہ ان عرب آبادکاروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ ان کے مقامی سیاہ فام باشندوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوگئے اور ایک وقت وہ آ گیا کہ سنار کے علاقے میں عربوں کی اکثریت ہوگئی اور یہاں کے تمام باشندے مسلمان ہوگئے ۔ پندرھویں صدی تک مسلمانوں کا اس تمام علاقے پر قبضہ ہوگیا جو بارہ درجے عرض البلد کے شمال میں ہے اور اب شمالی سوڈان کہلاتا ہے ۔

پندرھویں صدی میں سوڈان کے اس حصے میں دو طاقتور مسلمان حکومتیں وجود میں آ گئیں ۔

ان میں ایک سنار کے سلاطین فنج (fung) کی حکومت تھی اور دوسری سنار کے مغرب میں دارفور کے سلاطین کی حکومت۔ فنج حکمران طولان (۱۵۹۶ء تا ۱۶۰۳ء) کے زمانے میں جو اسلامی ہند کے شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا، سنار کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور بغداد اور قاہرہ تک سے اہل علم سنار پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ سنار کی تاریخی جامع مسجد جواب تک موجود ہے اسی عدنان کے پڑپوتے نے بنوائی تھی۔ فنج خاندان کے عہد حکومت میں پورا شمالی سوڈان اسلام قبول کر چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی میں فنج خاندان کو زوال ہو گیا اور اس کے بعد سوڈان انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں مصری خدیو پورے سوڈان پر قابض ہو گئے۔ اور شہر خرطوم کی بنیاد ڈالی جو اس وقت سوڈان کا دارالحکومت ہے۔

[تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب ۳۴(۳) اور باب ۳۵(۵)]

(۳) سلطنت زنج

(۹۷۵ء تا ۱۴۹۸ء)

افریقہ کے مشرقی ساحل سے مسلمانوں کا سیاسی تعلق پہلی صدی ہجری سے قائم ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۸۴ء/۶۵ھ میں جنوبی عرب میں حضر موت کے علاقے سے دو بھائی سلیمان اور سعید ایک بحری سفر پر روانہ ہوئے اور اس جگہ اترے جہاں اب زنجبار واقع ہے۔ ان بھائیوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ کئی بستیاں آباد کیں۔ اس کے بعد یمن اور حضر موت سے دو اور جماعتیں آئیں اور انہوں نے ممباسہ تک افریقہ کا سارا مشرقی ساحل فتح کر لیا۔

۹۷۵ء میں آبادکاروں کا ایک اور گروہ مشرقی افریقہ آیا لیکن یہ عرب نہیں بلکہ یہ ایرانی تھے اور جنوبی ایران سے آئے تھے۔ اس گروہ کے قائد حسن بن علی اور اس کے چھ بھائی تھے کہا جاتا ہے کہ ممباسہ، پمبا، جوہانسہ (جزائر قمر) اور کلوہ کے شہر انہی آبادکاروں نے آباد کیے تھے۔ ان ایرانیوں کی اولاد آج بھی مشرقی افریقہ میں موجود ہے اور شیرازی کہلاتی ہے۔

شیرازیوں نے مشرقی افریقہ میں جو سلطنت قائم کی وہ سلطنت زنج کہلاتی ہے۔ یہ سلطنت ۹۷۵ء سے ۱۴۹۸ء تک قائم رہی، اس کے بعد پرتگالیوں کے زیر اثر آ گئی۔ سلطنت زنج صحیح معنوں میں کوئی منظم اور مستحکم سلطنت نہیں تھی۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق تھا جو متعدد شہری ریاستوں

پر مشتمل تھا جن کے حکمران حسن بن علی کی اولاد میں سے تھے۔ ہر ریاست عملاً خود مختار تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ کلوا کی بالادستی تسلیم کر لیتی تھیں۔ ان ساحلی ریاستوں میں مقدیشو (صومالیہ)، ممباسہ (کینیا) زنجبار، پمبا، کلو (تنزانیہ)، موزمبیق، صوفالا اور جوہانہ (جزائر قمر) کی ریاستیں اہم تھیں۔

۱۴۹۸ء میں پرتگالی جہاز ران واسکوڈی گاما جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر مشرقی افریقہ کے شہر مالندی پہنچا جہاں کے سلطان نے اس کی مدد کی اور اس زمانے کے مشہور مصری جہاز راں اور فن جہاز رانی سے متعلق کتابوں کے مصنف احمد ابن ماجد کو اس کے ہمراہ کر دیا جس نے واسکوڈی گاما کو مالندی سے ہندوستان کے شہر کالی کٹ پہنچا دیا اور اس طرح یورپ سے ہندوستان تک بحری راستے کی دریافت کا سہرا واسکوڈی گاما کے سر بندھ گیا اور مشرق میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے ہم مغرب کے ہاتھوں مشرق کی لوٹ کھسوٹ کا دور کہہ سکتے ہیں۔

پرتگالیوں نے جلد ہی اپنی جارحانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے مشرقی افریقہ کی ریاستوں کو باجگذار بنانے کی کوشش کی۔ ان کا طریقہ تھا کہ جو شہر خراج نہ دے اس کو برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۵۰۲ء میں انہوں نے کلوا کو خراج دینے پر مجبور کیا اور تین سال بعد کلوا اور صوفالا پر براہ راست قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ۱۵۰۷ء میں موزمبیق کو اپنے مشرقی افریقی مقبوضات کا صدر مقام قرار دیا۔ ممباسہ نے پرتگالیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور دو سو سال تک ان سے مقابلہ جاری رکھا۔ اس دوران میں پرتگالیوں نے کئی مرتبہ ممباسہ کو تباہ کیا اور جلا دیا۔ اس شدید اور سخت مقابلے کی وجہ سے پرتگالی تاریخوں میں ممباسہ کا نام جزیرہ جنگ (Island of war) پڑ گیا۔

۱۵۸۷ء اور ۱۵۸۹ء کے درمیان عثمانی امیر البحر امیر علی یہاں کے مسلمانوں کی مدد کو آیا اور اس نے عارضی طور پر ممباسہ سے پرتگالیوں کو نکال دیا لیکن اس علاقے کے پرتگالیوں کے اقتدار کو ختم کرنے میں جو لوگ کامیاب ہوئے وہ عمان کے عرب تھے جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔

ابن بطوطہ نے ۱۳۳۱ء میں سلطنت زنج کے کئی شہروں کا سفر کیا تھا۔ اس کے سفرنامے سے ہمیں ان شہروں کی عام زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدیشو (صومالیہ) کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ:

"یہ بہت بڑا شہر ہے، یہاں ایک کپڑا بنا جاتا ہے جس کی نظیر نہیں اور مصر تک بھیجا جاتا ہے۔ یہاں کا سلطان شیخ کہلاتا ہے۔ لوگ پاجامے سے آشنا نہیں، اسکی جگہ لنگی باندھتے ہیں"

کلوا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''یہ ایک بڑا ساحلی شہر ہے، عمارتیں لکڑی کی ہیں اور چھتیں قبہ دار ہیں۔ دینداری کا غلبہ ہے اور لوگ اہل جہاد ہیں۔''[1]

ممباسہ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''یہاں کے لوگ دیندار اور نیک ہیں۔ غذا کیلا اور مچھلی ہے۔ مسجدیں لکڑی کی ہیں اور مستحکم بنی ہوئی ہیں''

پرتگالیوں کی آمد کے بعد سولہویں صدی میں ممباسہ کی سب سے اچھی کیفیت ایک پرتگالی سیاح (Duarte Barbosa) نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''یہ مسلمانوں کا شہر ہے جسے بمباسہ کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا اور خوبصورت ہے۔ پتھر کے اونچے اور خوبصورت مکانات ہیں جن پر قلعی کی ہوئی ہے۔ سڑکیں بہت اچھی ہیں۔ عورتیں ریشمی کپڑے اور سونے کے زیور سے لدی رہتی ہیں۔ بڑا تجارتی مرکز ہے۔ بندرگاہ میں ہمیشہ کئی جہاز لنگر انداز رہتے ہیں۔ ممباسہ میں ضرورت کا سامان کثرت سے ہے۔ بھیڑیں بہت اچھی ہوتی ہیں جن کی دُمیں موٹی موٹی ہوتی ہیں۔ گائے، بکریاں اور مُرغیاں کثرت سے ہیں۔ چاول اور باجرہ (millet) کثرت سے پیدا ہوتا ہے میٹھی اور کھٹی نارنگیوں کی افراط ہے۔ لیموں اور انار بھی اچھے ہوتے ہیں۔ انجیر اور ہر قسم کی سبزی پیدا ہوتی ہے اور پانی بہت اچھا ہے'' [تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب ۳۵(۴)]

(۱) سولھویں صدی کے آغاز میں جب پرتگالی یہاں آئے تو کلوا میں مسجدوں کی تعداد تین سو تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ ''کلوا'')

باب ۱۰

مشرق بعید

اشاعت اسلام کا دَور

تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے بعد اسلام کی توسیع اور اشاعت جس قدر تیرھویں اور چودھویں صدی میں ہوئی اتنی کسی اور زمانے میں نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں منگولوں نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کے اثرات سائبیریا سے روس اور وسط یورپ تک پھیلے، اسی زمانے میں افریقہ میں صحرائے اعظم اور اس کے جنوبی علاقوں میں اسلام پھیلا، یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا برصغیر پاکستان و ہند مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا اور پاکستان کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ اور یہی وہ صدیاں ہیں جن میں ملائیشیا اور انڈونیشیا کے وسیع و عریض خطہ میں اسلام پھیلا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کا زمانہ صرف اس لحاظ سے قابل ذکر نہیں کہ اس زمانے میں مسلمان سیاسی میدان میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئے اور ایشیا، یورپ اور افریقہ میں جتنے وسیع علاقے پر ان کا اقتدار ہو گیا اتنے وسیع علاقے پر نہ اس سے پہلے ان کا اقتدار قائم ہوا تھا اور نہ بعد میں قائم ہوا، بلکہ یہ دَور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس زمانے میں اسلام کی بھی اشاعت ہوئی اور جو ملک مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے ان کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا اور وہ آج بھی مسلمان ہیں۔ مغربی افریقہ، پاکستان، ملائیشیا اور انڈونیشیا اسلام کی ان شاندار پرامن فتوحات کی نمایاں مثالیں ہیں۔

جزیرہ نما ملایا براعظم ایشیا کا سب سے جنوبی کنارہ ہے۔ ملایا کے مغرب، جنوب اور مشرق میں سمندر پار جزیروں کی سرزمین ہے۔ ان جزیروں کی تعداد تین ہزار ہے۔ اگرچہ ان کی بیشتر تعداد چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے لیکن ان میں چار جزیرے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بڑے جزیروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان بڑے جزیروں کے نام جاوا، سماترا، کلیمنتان اور سلاویسی ہیں۔ جزیروں کی یہ سرزمین انڈونیشیا کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

ملایا اور انڈونیشیا اسلامی دنیا کے انتہائی مشرقی گوشے ہیں اور مشرقی پاکستان کی طرح یہ دونوں ملک بھی باقی اسلامی دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور اسلامی دنیا کے درمیان سمندر کے علاوہ بھارت، برما اور سیام کے ملک حائل ہیں۔

مشرق بعید کے اس خطہ میں ساترا اور جاوا کی تہذیب اور تاریخ بہت پرانی ہے۔ جس زمانہ میں ایران اور عراق میں سلجوقیوں کی عظیم الشان حکومت قائم تھی (بارھویں صدی عیسوی) اسی زمانہ میں انڈونیشیا میں ''سری وجے'' نامی حکومت پورے عروج پر تھی اور اس کا اثر ملایا تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ بودھوں کی حکومت تھی اور اس زمانہ میں انڈونیشیا کے باشندے یا تو بدھ مت کے پیرو تھے یا ہندو مذہب کے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں سری وجے کی سلطنت کے زوال کے بعد جاوا میں مجاپہت کی ہندو سلطنت قائم ہوئی جو ۱۲۹۲ء سے ۱۴۲۸ء تک قائم رہی اور وسعت میں سری وجے کے لگ بھگ تھی اسی سلطنت کے زمانے میں انڈونیشیا اور ملایا میں اسلام پھیلنا شروع ہوا جس طرح پاکستان میں اولیاء اللہ اور بزرگان دین نے اپنی تبلیغی کوششوں سے اسلام کی اشاعت کی اسی طرح ملایا اور انڈونیشیا میں بھی اسلام انہی بزرگوں کو بدولت پھیلا۔ یہ بزرگ یا تو عرب تھے یا بھارتی علاقے گجرات کے رہنے والے مسلمان تاجر۔

ان مبلغوں میں ایک ملک ابراہیم ہیں۔ انہوں نے ۱۳۹۹ء کے قریب جاوا میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ ملک ابراہیم گجرات کے ایک تاجر تھے اور مشرقی جاوا کے بندرگاہ گریسک کے ہندو راجہ نے ایک مرتبہ ان سے علاج کرایا اور جب وہ اچھا ہوگیا تو ان کے ہاتھ پر اس نے اسلام قبول کرلیا۔ ملک ابراہیم نے راجہ کا اسلامی نام رادن رحمت رکھا۔ ملک ابراہیم کا [illegible] انتقال ہوگیا۔ گریسک میں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔ ملک ابراہیم مولانا مغربی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ وہ اور رادن رحمت جاوا کے ان نو مشہور ولیوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو ''سونان'' کے لقب سے مشہور ہیں اور جنہوں نے اس جزیرہ میں اسلام پھیلایا۔ ان میں پہلے ولی ملک ابراہیم ہیں اور دوسرے رادن رحمت۔

جاوا میں پہلی مسجد دیماک کے مقام پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد سے تبلیغی جماعتیں جاوا کے مختلف حصوں میں بھیجی جاتی تھیں۔ جہاں لوگ مسلمان ہوجاتے وہاں مسجد اور مدرسہ قائم کرلیتے۔

تبلیغ کا یہ سلسلہ سولھویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ انڈونیشیا کے باشندوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی اور ملک میں تقریباً بیس مسلم ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ان ریاستوں کے حکمران جو سلطان کہلاتے تھے خود بھی تبلیغ اسلام کے کام سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور بعض حکمران تو ایسے تھے کہ انہوں نے تخت و تاج چھوڑ کر خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان نیک حکمرانوں میں مغربی جاوا کے علاقہ بانٹن کے سلطان پاتح ہلا کا نام بہت مشہور ہے۔ انہوں نے تخت و تاج چھوڑ کر ۱۵۵۲ء سے ۱۵۷۰ء کے دوران، اپنی وفات تک اٹھارہ سال مسلسل اسلام کی تبلیغ کی۔ چنانچہ ان کا شمار جاوا کے نو اولیاء میں ہوتا ہے پاتح ہلا کے لڑکے سلطان حسن الدین نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آخر میں خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس طرح ان حکمرانوں نے اسلام سے اپنی والہانہ محبت کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر اسلامی تاریخ میں کم ملے گی۔

انڈونیشیا میں سب سے پہلے اسلام ساترا کے شمالی حصوں میں پھیلا۔ ۱۲۹۲ء میں جب اطالوی سیاح مارکوپولو، سمدر پسائے سے گزرا تو یہاں کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اسلام پھیلتا گیا اور پندرھویں صدی میں ساترا کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

جاوا کے نو اولیا

ساترا کے بعد چودھویں صدی میں جاوا میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ جاوا میں جن نو بزرگوں نے اسلام کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا وہ یہ ہیں:

۱۔ ملک ابراہیم۔

۲۔ رادن رحمت: جن کا مزار سورابایا کے قریب نمپل کی پہاڑی پر ہے اور وہ سونان نمپل کے نام سے مشہور ہیں۔

۳۔ مخدوم ابراہیم جن کو سونان بونانگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ رادن رحمت کے لڑکے تھے۔

۴۔ رادن پاکو جو سونان گیری کے نام سے مشہور ہیں۔

۵۔ فتح اللہ، جو سونان گنگ جاتی بھی کہلاتے ہیں۔

۶۔ سونان قدس جن کا مزار سیمرانگ کے قریب ہے۔

۷۔ سونان موریا۔

۸۔ سونان درجات

۹۔ سونان کالی جاگا۔

سونان، انڈونیشن زبان میں ولی کو کہتے ہیں۔

جزیرہ کلمنتان (بورنیو) میں پندرھویں صدی کے آخر میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ پہلے ساحلی علاقے کے لوگ مسلمان ہوئے پھر اندرونی علاقوں میں اسلام پھیلا۔ یہاں کے راجاؤں نے بھی توسیع اسلام میں نمایاں حصہ لیا۔

اس کے بعد جزیرہ سلادیسی یا سیبیز میں اسلام پھیلا۔ پہلے مکاسراور برگی کے لوگ مسلمان ہوئے پھر منہاسہ کے۔ اس کے بعد مکاسراور سلاویسی کے مبلغوں نے آس پاس کے جزیروں میں اسلام پھیلا دیا۔

جزائر مالوکا میں اسلام کی اشاعت پندرھویں صدی میں ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام جزیروں میں اسلام پھیل گیا۔

جزیرہ نمائے ملایا میں اسلام چودھویں صدی میں پھیلا۔

سمدر پسائے

انڈونیشیا جدید دور سے پہلے کبھی ایک سیاسی وحدت نہیں تھا۔ سری وجے اور مجاپہت کی سلطنتیں بھی ان تمام علاقوں پر قابض نہیں تھیں جو آج انڈونیشیا میں شامل ہیں۔ اس لیے انڈونیشیا کی تاریخ ان متعدد حکومتوں کی تاریخ پر مشتمل ہے جو مختلف جزیروں اور علاقوں میں قائم ہوتی رہی ہیں۔ اسلام پھیل جانے کے بعد بھی یہی صورت برقرار رہی۔ ایک ایک جزیرہ میں کئی کئی حکومتیں ہوتی تھیں۔ ذیل میں ان میں سے چند اہم حکومتوں کی تاریخ پیش کی جاتی ہے۔

انڈونیشیا میں پہلی مسلم حکومت سماترا میں قائم ہوئی۔ سماترا کے شمالی صوبے آچیہ کے بادشاہ کو تیرھویں صدی کے آخر میں ایک مبلغ مولانا برہان الدین نے مسلمان کیا۔ علاقہ آچیہ کا صدر مقام چونکہ سمدر پسائے کا شہر تھا اس لیے یہاں کی حکومت سلطنت سمدر پسائے کہلاتی ہے۔ سمدر پسائے کے راجا، جاوا کی مجاپہت سلطنت کے باجگذار تھے۔ لیکن ۱۳۵۰ء میں سمدر پسائے نے مکمل

آزادی حاصل کرلی۔ سمدر پسائے کا پہلا مسلمان حکمران ملک الصالح ہے جس نے ۱۲۹۷ء میں وفات پائی۔ اس کو مولانا برہان الدین نے مسلمان کیا تھا اور ملک الصالح اس کا اسلامی نام تھا۔

ملک الصالح کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد (۱۲۹۷ء تا ۱۳۲۶ء) تخت نشین ہوا۔ وہ پہلا بادشاہ ہے جو سلطان کہلایا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے ملک الظاہر کا لقب اختیار کیا۔ بعد میں سمدر پسائے کے تمام بادشاہ اسی لقب کو اختیار کرتے رہے۔ سلطان محمد درویش صفت انسان تھا۔

سلطان محمد کے بعد اس کا لڑکا سلطان احمد (۱۳۲۶ء تا ۱۳۴۵ء) تخت نشین ہوا جو ملک الظاہر دوم کہلاتا ہے۔ اس کے دور میں مملکت سمدر پسائے میں اسلام خوب پھیلا۔ مدرسے قائم ہوئے اور علوم و فنون کی سرپرستی کی گئی۔

سمدر پسائے کا سب سے ممتاز حکمران سلطان احمد کا بیٹا زین العابدین (۱۳۴۵ء تا ۱۴۰۵ء) ہے جو ملک الظاہر سوم کہلاتا ہے۔ اس نے سلطنت مجاپہت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور سمدر پسائے کو ایک مکمل آزاد سلطنت بنا دیا۔ جزیرے کا نام سماترا بھی اسی حکمران کے زمانے میں پڑا۔ سلطان زین العابدین ملک الظاہر سوم کے زمانے میں تجارت کو فروغ ہوا اور ملک کو خوشحالی حاصل ہوئی۔ مراکشی سیاح ابن بطوطہ اسی سلطان کے زمانے میں چین جاتے وقت اور وہاں سے واپسی پر سمدر پسائے میں ٹھہرا تھا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ:

''شہر سمدر رسائے بہت بڑا ہے۔ اس کے گرد لکڑی کی فصیل اور لکڑی کے برج بنے ہوئے ہیں۔ بادشاہ ملک الظاہر عالم فاضل اور سخی ہے۔ شافعی فقہ پر عمل کرتا ہے، اہل علم سے نہایت درجہ محبت کرتا ہے اور اس کی مجلس میں ہمیشہ علم و فضل کا چرچا رہتا ہے۔ جہاد بھی اکثر کرتا رہتا ہے۔ باشندے شافعی ہیں، جہاد کے بہت شائق ہیں، کافروں پر غالب ہیں اور آس پاس کے کافر انکو جزیہ دیتے ہیں۔ بادشاہ بڑا متواضع ہے اور جمعہ کی نماز کے لیے پا پیادہ مسجد تک آتا ہے''

سلطان زین العابدین کے بعد سلطنت سمدر پسائے کو زوال ہو گیا اور ۱۴۳۵ء میں اس کی آزادی ختم ہو گئی۔ اب سمدر پسائے ملکا کی بڑھتی ہوئی نئی طاقت کے زیر اثر آ گیا۔

سلطنت مَلَکّا (۱۳۹۶ء تا ۱۵۱۱ء)

جاوا میں جب مجاپہت کی ہندو سلطنت کو زوال ہوا تو شاہی خاندان کے پندرہ سو افراد ملایا کے شہر ملکا میں آباد ہو گئے تھے جو ایک زمانے میں سلطنت مجاپہت کا ایک حصہ تھا۔ جزیرہ نما ملایا میں چودھویں صدی سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ملکا میں عرب اور مسلمان تاجروں کی بستی بھی موجود تھی۔ ان مسلمانوں کے زیر اثر شاہی خاندان کے بیشتر افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں شہزادہ پرامیشور بھی شامل تھا جو ملکا کی سلطنت کا بانی ہے۔ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام بدل کر اسکندر شاہ رکھا۔ اسکندر شاہ نے ۱۳۹۶ء سے ۱۴۱۴ء تک حکومت کی۔ اس کے دَور میں ملایا میں اسلام کے اثرات تیزی سے پھیل گئے۔ اسکندر شاہ نے سیام کے مقابلے میں جس کی فوجیں ملایا پر حملے کرتی رہتی تھیں چین کا تعاون حاصل کیا اور سیام کے حملوں کو پسپا کیا۔ اسکندر شاہ کے بعد اس کے جانشین بھی اسی پالیسی پر قائم رہے۔

اسکندر شاہ کے جانشین اور بیٹے محمد سکندر شاہ (۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۴ء) کے دَور میں بحری بیڑے کو تقویت دی گئی اور بادشاہ نے اپنے ولی عہد راجہ محمد شاہ کی شادی سمدر پسائے کی شہزادی سے کر کے دونوں مملکتوں کو متحد کر دیا۔

ملکا کے حکمران خاندان نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن وہ ابھی تک خود کو راجہ اور سری مہاراجہ کہلاتے تھے، جو سری وجے کے حکمرانوں کا لقب تھا۔ مظفر شاہ (۱۴۴۵ء تا ۱۴۵۸ء) ملکا کا پہلا بادشاہ ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

مظفر شاہ کے جانشین سلطان منصور شاہ (۱۴۵۸ء تا ۱۴۷۷ء) کا دَور سلطنت ملکا کا عہد زرین ہے۔ اس کے دَور میں ملکا کی سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ جزیرہ نمائے ملایا کو برما کی سرحد تک فتح کر لیا گیا۔ وسطی سماترا بھی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ ان فتوحات کے سلسلے میں منصور شاہ کے امیر البحر ہانگ تُواہ (Hangtuah) نے بڑی شہرت حاصل کی جس کو ملایا کے مسلمان خالد ثانی کہتے ہیں۔ منصور ایک قابل اور مدبر حکمران تھا اور اس کے دور میں نہ صرف ملایا کے بیشتر باشندوں نے اسلام قبول کر لیا بلکہ ملایا کے مبلغوں نے شمالی بورنیو میں بھی اسلام کی اشاعت کی۔

منصور شاہ کے زمانے میں ملکا بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔ منصور شاہ کے زمانے میں ملایا نے پوری طرح اسلامی رنگ اختیار کرلیا۔ حکومت کے لیے اسلامی قوانین مرتب کیے گئے اور ملائی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ راجہ پرمیشور کے زمانے میں مہا بھارت اور رامائن کے قصے ملک میں رائج تھے، اب ان کی بجائے تاریخ اسلام کے بہادروں کی داستانیں لکھی گئیں یا عربی سے ترجمہ کی گئیں۔ حکومت کا انتظام سلطان کے چار بڑے نائب اور آٹھ چھوٹے افسر انجام دیتے تھے۔ چاندی اور سونے کے سکے رائج تھے اور ماتحت حکومتوں سے سونے کی شکل میں خراج لیا جاتا تھا۔

منصور شاہ کا جانشین سلطان علاء الدین شاہ (۱۴۷۷ء تا ۱۴۸۸ء) ایک درویش صفت اور عالم فاضل حکمران تھا۔ آخر میں وہ سلطنت سے دست بردار ہو کر حج کے لیے مکہ معظمہ چلا گیا۔ اس کا جانشین سلطان محمود شاہ (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۱ء) کمزور اور ناکارہ حکمران ثابت ہوا۔ اس کے دور میں پرتگالیوں نے جو ۱۴۹۲ء میں ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کر چکے تھے جزائر شرق الہند تک چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ ان کے ایک جہاز ران البوقرق نے ۱۵۱۱ء میں ملکا پر قبضہ کر کے اپنی روایات کے مطابق شہر کو جلا کر راکھ کر دیا۔

محمود شاہ سماترا چلا گیا اور وہیں ۱۵۲۸ء میں مر گیا۔

(تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۲۶)

سلاطین ملکا

(۱۴۰۳ء تا ۱۵۱۱ء)

(۱) پرامیسورا سکندر شاہ	۱۴۰۳ء تا ۱۴۲۴ء
(۲) سری مہاراج ابن اسکندر شاہ	۱۴۲۴ء تا ۱۴۴۴ء
(۳) راجہ ابراہیم ابن سری مہاراج	۱۴۴۴ء تا ۱۴۴۶ء
(۴) راجہ قاسم مظفر شاہ	۱۴۴۶ء تا ۱۴۵۹ء
(۵) منصور شاہ ابن مظفر شاہ	۱۴۵۹ء تا ۱۴۷۷ء
(۶) علاء الدین رایات شاہ ابن منصور شاہ	۱۴۷۷ء تا ۱۴۸۸ء
(۷) محمود شاہ	۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۱ء

(مذکورہ بالا سنین ڈی۔ جی۔ ای ہال کی انگریزی کتاب ''جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ'' مطبوعہ لندن ۱۹۶۴ء پر مبنی ہیں)

باب ۱۱

دہلی کی سلطنت

(۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ تا ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ)

(۱) خاندان غلاماں (۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ تا ۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ)

جس زمانہ میں مصر و شام میں مملوکوں کی حکومت قائم ہوئی اس سے تقریباً پچاس سال پہلے پاکستان اور شمالی بھارت میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ مصری حکومت کی طرح یہ حکومت بھی غلاموں کی تھی۔ اس حکومت کا بانی شہاب الدین غوری کا ایک غلام قطب الدین ایبک تھا۔ مصر کی طرح دہلی کے غلام بادشاہ بھی نسلاً ترک تھے۔

قطبُ الدین ایبک

قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) کو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایبک ایک ترک غلام تھا۔ نیشاپور میں اس نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اس کی صورت شکل اچھی نہیں تھی اس لیے جب شہاب الدین غوری نے بہت سے غلام خریدے تو ایبک کو بدصورتی کی وجہ سے نہیں خریدا۔ ایبک نے اس پر سلطان سے کہا کہ آپ نے جہاں بہت سے غلام اپنے لیے خریدے ہیں، وہاں مجھ کو خدا کے لیے خرید لیجیے۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا اور قطب الدین ایبک کو بھی خرید لیا۔

قطب الدین ایبک نے اپنی قابلیت کے ذریعہ بہت جلد ترقی کی۔ خوارزم شاہ سے خراسان میں شہاب الدین غوری کی جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ایبک نے بڑی بہادری دکھائی۔ وہ ہندوستان کی لڑائیوں میں بھی سلطان کے ساتھ تھا۔ دہلی سے بنارس تک کا علاقہ اسی نے فتح کیا۔ ۱۱۹۲ء میں سلطان شہاب الدین نے اس کی قابلیت کی وجہ سے پاکستان اور بھارت میں اس کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اور جب سلطان کا انتقال ہوا تو ۱۲۰۶ء میں لاہور میں وہ ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔

قطب الدین ایبک نے بادشاہ کی حیثیت سے صرف چار سال حکومت کی لیکن اگر صوبہ داری کا زمانہ بھی شامل کرلیا جائے تو اس نے برکوچک میں تقریباً اٹھارہ سال حکومت کی۔ صوبہ داری کی حیثیت سے اس کا دارالحکومت دہلی تھا لیکن بادشاہ ہونے کے بعد وہ زیادہ تر لاہور میں رہا اور یہیں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر لاہور میں اب تک موجود ہے۔

قطب الدین ایبک ایک عادل بادشاہ تھا اس کی سخاوت کی وجہ سے لوگ اسے لکھ بخش کہتے تھے۔ اس نے دہلی میں "قوت اسلام" کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد بنائی جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ دہلی کا مشہور "قطب مینار" اسی مسجد کا مینار تھا۔ اس کی تعمیر قطب الدین کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی لیکن تکمیل اس کے جانشین التتمش کے زمانہ میں ہوئی۔

التتمش

قطب الدین ایبک کے بعد اس کا ایک غلام التتمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) اس کا جانشین ہوا۔ التتمش نے تقریباً ۲۶ سال حکومت کی۔ اس کے زمانہ میں جنوب کی طرف بھیلسہ اور اجین فتح ہوئے۔ التتمش ہی کا زمانہ تھا جب چنگیز خاں نے وسط ایشیا اور ایران پر حملہ کیا، لیکن یہ وحشی منگول دریائے سندھ کو پار کرکے پاکستان اور بھارت پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکے، کیونکہ التتمش نے یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرلی تھی۔

قطب الدین ایبک جس طرح ہندوستان کی اسلامی حکومت کا بانی ہے اسی طرح التتمش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس نئی اسلامی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کیں۔

التتمش بڑا نیک بادشاہ تھا۔ وہ علم وادب کا بھی سرپرست تھا۔ انصاف کا اس کو بڑا خیال رہتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ مظلوم پیلے رنگ کے کپڑے پہنا کریں تاکہ وہ ان کو دیکھ کر پہچان لے اور ان کے ساتھ انصاف کرے۔ اس کے علاوہ التتمش نے اپنے محل کے باہر دروازہ پر گھنٹیاں لٹکا رکھی تھیں تاکہ یہ مظلوم ان کو بجا کر بادشاہ کو بلاسکیں۔

التتمش کے بعد اس کی لڑکی رضیہ سلطانہ (۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء) نے تین سال تک حکومت کی۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت خودمختار ہوئی۔

رضیہ بڑی سمجھ دار اور لائق عورت تھی۔ سلطان التتمش کے انیس لڑکے تھے، لیکن وہ ان

میں صرف رضیہ سے خوش تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرد صرف رضیہ ہے۔ لیکن اسلام میں چونکہ عورت کی ذمہ داری گھر کا کام کاج ہے اور حکومت کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے اس لیے امراء نے اس کی حکومت کو ناپسند کیا اور اس کے خلاف ہو گئے۔ خود اس کے بھائی اس کے مقابلے پر آ گئے اور وہ ایک لڑائی میں ماری گئی۔

رضیہ کے بعد کئی سال ہنگامے رہے، جن کے دوران اس کے بھائی بہرام اور مسعود تخت نشین ہوئے۔ آخر کار امراء نے اس کے بھائی ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء) کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ ناصر الدین بڑا سیدھا اور نیک بادشاہ تھا۔ سلطنت کے خزانے کو رعایا کی امانت سمجھتا تھا اور خود قرآن مجید لکھ کر روزی کماتا تھا۔ وہ ایک عابد اور درویش قسم کا بادشاہ تھا اور حکومت کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھا۔ ناصر الدین کو خود اس بات کا احساس تھا۔ وہ چونکہ نیک دل تھا اور چاہتا تھا کہ حکومت میں کوئی خرابی نہ ہو اس لیے اس نے التتمش کے ایک غلام غیاث الدین بلبن کو جو پنجاب کا صوبہ دار رہ چکا تھا اپنا وزیر اعظم بنا کر سلطنت کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا اور خود اللہ اللہ کرنے لگا۔ ناصر الدین نے بلبن کو تاکید کر دی کہ ''تم کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے میری خدا کے سامنے رسوائی ہو''

غیاث الدین بلبن نے بیس سال تک ناصر الدین کے زمانہ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے حکومت کی اور جب سلطان کا انتقال ہو گیا تو امراء نے اس کو بادشاہ بنا لیا۔ بادشاہ کی حیثیت سے بلبن نے بیس سال اور حکومت کی۔

بلبن

بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء) غلام خاندان کا سب سے مشہور اور باعظمت حکمران ہوا ہے۔ بادشاہ بننے سے پہلے وہ شراب پیا کرتا تھا لیکن جب بادشاہ بن گیا تو اس نے شراب سے توبہ کر لی۔ نماز کا ایسا پابند ہوا کہ تہجد تک کی نماز قضا نہیں کرتا تھا۔ وہ علماء اور نیک لوگوں کی صحبت میں رہنے لگا۔

بلبن کے زمانہ میں ایران اور اس سے ملے ہوئے ملکوں میں منگولوں کا زور بڑھ گیا تھا بغداد کو تباہ کرنے کے بعد وہ مغرب میں شام اور مصر پر اور مشرق میں مغربی پاکستان پر مسلسل حملے کرنے لگے۔ بلبن نے ان حملوں کو روکنے کے لیے ایک طاقتور فوج تیار کی اور اس فوج کی مدد سے

اس نے منگولوں کو بار بار شکست دی۔ ملتان کے گورنر شیر خاں (۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۸ء) اور محمد سلطان (۱۲۶۸ء تا ۱۲۸۴ء) نے منگولوں کے حملے پسپا کرنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ محمد سلطان بلبن کا بیٹا تھا۔ جس طرح مصر کے مملوک حکمرانوں نے منگولوں سے مصر کو تباہ ہونے سے بچایا اسی طرح دہلی کے غلام بادشاہوں نے اور خاص کر بلبن نے پاکستان اور بھارت کو تباہ ہونے سے بچایا۔

بلبن کے زمانہ میں اسلامی دنیا کے اس حصہ کے لوگوں نے جن پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا تھا ہزاروں کی تعداد میں دہلی میں آ کر پناہ لی۔ صرف اس کے دربار میں پندرہ بادشاہ اور شہزادے پناہ گزیں تھے۔

بلبن ایک عادل اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اس کی حکومت میں بڑا امن و امان تھا اور کوئی سرکاری عہدے دار ڈر کے مارے رعایا پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ بدایوں کے گورنر نے ایک نوکر کو قتل کر دیا۔ مقتول کی بیوی نے بلبن کو اس کی اطلاع کر دی، بلبن نے گورنر کو اپنے پاس بلوا کر قتل کرا دیا اور اس کی نعش کو بدایوں کے دروازہ پر لٹکا دیا تاکہ اس کو دیکھ کر لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔

اسی طرح ایک سردار ہیبت خاں کو جو بادشاہ کا بڑا دوست تھا بلبن نے ایک غریب آدمی کو قتل کرنے کے جرم میں پانچ سو کوڑے لگوائے اور اس کے بعد اسے مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا اور ان کو اختیار دیا کہ ہوش میں آنے کے بعد اسے جس طرح چاہیں قتل کریں۔ آخر کار ہیبت خاں کے گھر والوں نے مقتول کی بیوی کو بیس ہزار روپے دے کر اس کی جان بچوائی۔ بلبن کی اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے بڑے سے بڑے عہدے دار بھی عوام پر ظلم نہیں کر سکتے تھے۔

بلبن بادشاہت اور حکومت کے بارے میں واضح تصورات رکھتا تھا۔ حسب نسب اور شریعت و سیاست سے متعلق اس کے بعض نظریات پر اعتراض کیے جا سکتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی بلبن شریعت کی بالادستی کا قائل تھا۔ ایک بادشاہ کے لیے رعایا کا اعتماد حاصل کرنا اس کی نظر میں بہت ضروری تھا۔ چنانچہ وہ رعایا کے حالات سے باخبر رہتا اور اپنے عہدے داروں پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ وہ جنوب کی طرف اپنی مملکت کو آسانی سے وسعت دے سکتا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ دوسروں کے ملک پر قبضہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنی مملکت کو مضبوط اور مستحکم بنایا جائے اور بادشاہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا جائے۔ اس نے امراء کے درمیان پھیلی ہوئی شراب خوری اور جوئے بازی کی بری عادتوں کا قلع قمع کیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ بلبن کے عہدے دار بھی بڑے دیانتدار، فیاض اور عادل تھے۔ ان میں علاء الدین کشلی خان، عماد الملک اور دہلی کے کوتوال فخر الدین خاص طور پر عدل و انصاف اور رعایا پروری میں مشہور تھے اور خیرات اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ اندرونی امن و امان، منگولوں کے حملوں سے ملک کا دفاع اور عدل و انصاف، بلبن کے ایسے کارنامے ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام برصغیر پاکستان و ہند کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ بلبن مصر کے سلطان بیبرس اور مراکش کے یعقوب مرینی کا ہمعصر تھا۔ وہ اپنی قابلیت، رعایا پروری اور عدل و انصاف میں ان میں سے کسی سے کم نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں حکمران اس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے حکمران تھے۔

بلبن کا سب سے قابل لڑکا محمد سلطان منگولوں کے مقابلے میں شہید ہو چکا تھا اور دوسرا لڑکا بغرا خاں بلبن کے انتقال کے بعد بنگال کا حاکم تھا، اس لیے بلبن کے بعد اس کا سترہ سالہ لڑکا کیقباد دہلی میں اس کا جانشین ہوا۔ لیکن کیقباد باپ کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکا اور جلد ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ جب ملک کے حالات بگڑنے لگے تو پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی (۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ تا ۱۲۹۶ء/۶۹۵ھ) نے تختِ دہلی پر قبضہ کر کے خلجی خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

(۲) خاندان خلجی

(۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ تا ۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ)

جلال الدین خلجی

خلجی خاندان بھی غلام خاندان کی طرح نسلاً ترک تھا، لیکن افغانستان میں عرصۂ دراز تک رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے ترکوں کی خصوصیات کھو چکا تھا اور پٹھانوں کے طور طریقے اختیار کر لیے تھے۔

جلال الدین خلجی نے کل سات سال حکومت کی۔ وہ بڑا نیک حکمران تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے وہ پنجاب کا صوبے دار تھا اور اگرچہ اس نے سرحدوں کے محافظ کی حیثیت سے منگولوں کے

حملوں کو روکنے میں بڑی شجاعت اور بہادری کا اظہار کیا تھا لیکن خونریزی سے اس کو فطرتاً نفرت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ:

"اگر بادشاہی قتل و غارت گری اور مخالفین کو قتل اور قید کرنے کا نام ہے تو میں ایسا بادشاہ نہیں۔ میں پیغمبر اسلام کی شریعت کے خلاف ایک کام بھی نہیں کر سکتا"

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے دَور میں ملک میں خوشحالی کا دَور دَورہ تھا اور کوئی مظلوم ایسا نہ تھا جس کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس نیک دل حکمران کو اس کے حریص اور جاہ پسند بھتیجے علاء الدین نے دھوکے سے قتل کر کے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

علاء الدین خلجی (۱۲۹۹ء تا ۱۳۱۹ء) حکمران بن گیا علاء الدین کے عہد میں دہلی کی اسلامی سلطنت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ ناصر الدین محمود اور بلبن کے عہد میں فتوحات رک گئیں تھیں اور حکومت کی پوری توجہ منگولوں کے حملوں کو روکنے پر تھی۔ علاء الدین کے زمانہ میں منگولوں کا حملہ بڑی حد تک دُور ہو گیا تھا، اس لیے اب علاء الدین نے فتوحات کی طرف توجہ کی۔ اس کی فوجوں نے سب سے پہلے مالوہ، گجرات اور راجپوتانہ کو فتح کیا اس کے بعد ایک نو مسلم سردار ملک کافور کی قیادت میں دریائے نربدا کو پار کر کے اس کی فوجیں دکن میں داخل ہو گئیں اور ۱۳۱۱ء تک راس کماری تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اس طرح سوائے کشمیر کے پورے پاکستان اور بھارت پر اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

علاء الدین اخلاق اور عادتوں میں التتمش یا بلبن کی طرح نہیں تھا۔ شراب پیتا تھا، ناچ رنگ کو پسند کرتا تھا۔ لوگوں کو ذرا ذرا سے جرم پر بڑی سخت سزائیں دیتا تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے سلطنت کا انتظام بہت اچھا کیا۔ اس لحاظ سے وہ نہ بلبن سے پیچھے تھا اور نہ التتمش سے۔ اس نے ہر چیز کے دام مقرر کر دیئے تھے اور کوئی شخص مقررہ قیمت سے زیادہ وصول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اس انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں ہر چیز سستی ہو گئی اور لوگ بادشاہ کو دعائیں دینے لگے۔

علاء الدین خلجی کے زمانے میں عوام و خواص کی اخلاقی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ بادشاہ اگرچہ خود شراب پیتا تھا لیکن شراب پر سلطنت میں مکمل پابندی تھی۔ شراب نوشی اور دوسرے جرائم

پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ادھر حکومت کی طرف سے سختی تھی اُدھر مشہور ولی اللہ حضرت نظام الدین اولیا اور ان کے ساتھی وعظ و نصیحت اور تربیت کے ذریعے اخلاقی اصلاح میں مصروف تھے۔ اس دوطرفہ اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے جوا، شراب اور سود خوری ترک کر دی اور جھوٹ بولنا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

علاء الدین ایک اَن پڑھ بادشاہ تھا لیکن اس کے باوجود حکومت اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو شاید وہ برصغیر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہوتا۔

علاء الدین خلجی کے زمانے میں اسلامی ہند میں اور خاص طور پر دہلی میں بزرگان دین، علماء، شعراء اور دوسرے باکمالوں کی جتنی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی اتنی دہلی کے کسی بادشاہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوئی۔ مورخ فرشتہ نے ۴۶ ایسے ممتاز علماء کے نام لکھے ہیں جو دہلی میں موجود تھے۔ اس دور کے بزرگان دین میں نظام الدین اولیاء (دہلی) شیخ رکن الدین (ملتان) اور شاعروں میں امیر خسرو اور میر حسن سنجری ممتاز ہیں۔ یہ دونوں آخر الذکر شاعر علاء الدین کے دربار سے وابستہ تھے۔ مورخ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس دور میں جس کثرت سے مسجدیں، تالاب، سرائیں، خانقاہیں اور قلعے تعمیر ہوئے اتنے کسی اور بادشاہ کے زمانے میں تعمیر نہیں ہوئے۔ علاء الدین نے مسجد قوت الاسلام کو توسیع دی، ستر ایکٹر پر مشتمل حوض علائی تعمیر کیا اور دہلی سے متصل نیا شہر میری کے نام سے تعمیر کیا۔ بادشاہ مسجد قوت الاسلام کے لیے قطب مینار سے بھی بلند مینار تعمیر کرانا چاہتا تھا لیکن یہ مینار نامکمل رہ گیا۔ اس کا ڈیڑھ فٹ اونچا کھنڈر اب بھی موجود ہے۔

علاء الدین کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ تا ۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ) اپنے باپ کا نااہل وارث ثابت ہوا۔ اس کے دور میں ایک ہندو نے جس کو مبارک شاہ نے خسرو خاں کا خطاب دیا تھا سارے اختیارات پر قبضہ کرلیا اور آخر میں مبارک شاہ کو بھی قتل کر دیا۔ ان حالات میں ملتان اور دیپال پور کے صوبے دار غازی ملک نے دہلی پر حملہ کر کے خسرو خاں کو شکست دی۔ خلجی خاندان کا چونکہ کوئی شہزادہ باقی نہ رہا تھا اور خسرو خاں نے سب کو قتل کرا دیا تھا اس لیے امراء نے غازی ملک کو بادشاہ منتخب کرلیا اور وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس طرح خلجی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی اور خاندان تغلق کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ خاندان بھی پچھلے حکمران خاندانوں کی طرح ترک نسل سے تھا۔

(۳) خاندان تغلق

(۱۳۲۱ء/۷۲۰ھ تا ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ)

غیاث الدین تغلق

غیاث الدین تغلق (۱۳۲۱ء تا ۱۳۲۵ء) نے صرف چار سال حکومت کی، لیکن اس چار سال میں اس نے ایسے بڑے بڑے کام کیے جو بہت سے بادشاہ پچاس سال میں بھی انجام نہیں دے سکے۔ غیاث الدین بادشاہ بننے سے پہلے دیپالپور اور ملتان کا صوبہ دار تھا۔ یہ سرحدی مقام تھے اور اس زمانہ میں منگولوں کے حملوں کو روکنے کی ذمہ داری ملتان کے صوبہ دار پر ہوا کرتی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے بھی اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں یہ فرض انجام دیا۔ اس نے ۲۹ لڑائیوں میں منگولوں کو شکست دی اور اس طرح مغربی پاکستان کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے وہ غازی ملک کہلاتا تھا۔

بادشاہ ہونے کے بعد غیاث الدین نے دکن اور جنوبی ہند کی ہندو ریاستوں کو جواب تک صرف باجگذار تھیں ختم کر کے ان کو سلطنت دہلی میں ضم کرلیا اور اس طرح مرکزی حکومت کو زیادہ مستحکم کردیا۔ غیاث الدین نے رعایا سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس نے حکم دیا کہ لوگوں سے محصول نرمی سے وصول کیا جائے۔ کسانوں پر سے محصول اتنا کم کردیا کہ وہ خوشحال ہوگئے۔ اس نے آبپاشی کے لیے بہت سی نہریں کھدوائیں اور باغات لگوائے۔ ویران اور بنجر زمینیں آباد ہوگئیں اور ملک کی پیداوار بڑھ گئی۔ ایک مورخ لکھتا ہے:

"اس کے عہد میں رہزن پاسباں بن گئے۔ انہوں نے کمانیں پھینک ڈالیں اور تلواروں کو توڑ کر آلات زراعت بنالیے"

غیاث الدین انعام و اکرام دینے میں اعتدال سے کام لیتا تھا اور صرف ان لوگوں کو انعام دیتا تھا جو واقعی اس کے مستحق ہوتے تھے۔ وہ دوسرے بادشاہوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر لاکھوں روپیہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ وہ تھوڑا دیتا تھا مگر بہت آدمیوں کو دیتا تھا اور بار بار دیتا تھا۔

غیاث الدین مذہب کا بڑا پابند تھا۔ نماز باجماعت پڑھتا تھا اور اس کے دربار میں کوئی

شخص شراب نہیں پی سکتا تھا۔ اس کے عہد میں رعایا جتنی خوش تھی اتنی کم بادشاہوں کے زمانہ میں خوش رہی ہوگی۔

محمد تغلق

غیاث الدین کا لڑکا محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) جو بادشاہ بننے سے پہلے جونا خاں اور اُلغ خاں کے خطابوں سے جانا جاتا تھا ایک انتہائی عالم فاضل اور ذہین بادشاہ تھا۔ بہترین خطاط تھا اور علم وادب کا سرپرست تھا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی دس سال امن وخوشحالی کے تھے اور اس زمانے میں سلطنت دہلی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ اسی زمانے میں محمد تغلق نے ۱۳۲۶ء میں دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا، لیکن جب لوگوں کی مشکلات دیکھیں تو دل سال بعد اس فیصلے کو منسوخ کر دیا اور ۱۳۳۷ء میں دہلی پھر دارالحکومت ہوگیا۔ ۱۳۳۰ء میں اس نے تانبے کا سکہ چلا کر نئی جدت کی، لیکن نقصان ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی منسوخ کرنا پڑا۔ ۱۳۲۸ء میں ایران کو ایل خانیوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے ایک بہت بڑی فوج جمع کی لیکن سلطان ابوسعید کے دَور میں، وہاں کے حالات بہتر ہو جانے کی وجہ سے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ۱۳۳۵ء کے بعد ملک بغاوتوں اور مسلسل قحط سالی کا شکار ہوگیا۔ سلطان نے زراعت کو ترقی دینے اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کی زبردست کوششیں کیں لیکن بادشاہ کی جلد بازی اور سخت مزاجی کی وجہ سے جو کبھی کبھی ظلم تک پہنچ جاتی تھیں حالات بگڑتے چلے گئے۔ محمد تغلق ایک جگہ کی بغاوت فرو کرتا تو دوسری جگہ بغاوت ہو جاتی۔ سب سے پہلے بنگال پر مرکزی اقتدار کمزور ہوا۔ ۱۳۳۵ء میں ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل ''معبر'' میں ایک آزاد مسلم حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۳۳۶ء میں جنوبی ہند میں وجے نگر میں ایک طاقتور ہندو حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۳۴۷ء میں دکن بھی دہلی کے اقتدار سے آزاد ہوگیا اور ایک شخص علاء الدین گنگو نے دولت آباد میں بہمنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ آخر میں محمد تغلق سندھ کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

محمد تغلق کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ متضاد شخصیت رکھتا تھا، بعض نے اس کو دیوانہ بھی کہا ہے، لیکن اب مورخین کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے وقت کا انتہائی ذہین، قابل اور رعایا پرور حکمران تھا۔ وہ اپنے زمانے سے آگے تھا۔ ہاں اس کی شخصیت میں بعض کمزوریاں تھیں۔ کچھ

تو ان کمزوریوں کی وجہ سے اور کچھ ناسازگار حالات کی وجہ سے وہ اپنے ہر مقصد میں ناکام رہا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اس کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور اس نے اس دَور کے حالات رسم و رواج اور درباری عادات اور رسوم کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

فیروز شاہ تغلق

محمد تغلق کے بعد اس کا چچا زاد بھائی فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) تخت نشین ہوا۔ فیروز شاہ تغلق خونریزی کو ناپسند کرتا تھا اس لیے اس نے سلطنت کے ان صوبوں کو جو محمد تغلق کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے دوبارہ سلطنت دہلی میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بنگال کو سلطنت دہلی کا مطیع بنانے کے لیے جو لڑائی لڑی گئی اس میں ایک لاکھ اسی ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کا فیروز شاہ کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ وہ لاشوں کو دیکھ دیکھ کر بہت رویا اور اس نے آئندہ سلطنت کی توسیع کے لیے خونریزی کرنے سے توبہ کر لی۔ اس کی وجہ سے مورخین فیروز شاہ کو ایک کمزور حکمران قرار دیتے ہیں۔ دکن اور جنوبی ہند کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود فیروز شاہ ایک ایسی وسیع سلطنت کا حکمران تھا جو بنگال سے درۂ خیبر اور سندھ تک اور کوہ ہمالیہ سے دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ سلطنت کے اس حصے میں جو اس کے پاس ہے عوام کو زیادہ سے زیادہ راحت اور آرام پہنچائے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے عوام کو جس طرح آرام پہنچایا اور رفاہ عام کے کام جس کثرت سے کیے ان کی مثال اس برصغیر کی تاریخ میں بہت کم نظر آئے گی اور دنیا کی تاریخ میں بھی چند ہی مثالیں ملیں گی۔

رفاہِ عام کے کام

فیروز شاہ نے اپنی سلطنت میں تیس نہریں نکالیں۔ چالیس مسجدیں اور بیس خانقاہیں بنوائیں۔ تیس بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔ ایک سو سرائیں تعمیر کروائیں۔ آبپاشی کے لیے تیس بڑے بڑے تالاب بنوائے۔ سو شفا خانے بنوائے جن میں مفت علاج ہوتا تھا۔ سو حمام تعمیر کرائے اور دریاؤں اور نہروں وغیرہ پر ڈیڑھ سو پل تعمیر کرائے۔

رفاہ عام کے ان کاموں کے علاوہ فیروز شاہ نے دو سو کے قریب شہر اور بستیاں تعمیر کرائیں۔

جونپور، فیروز پور اور ہوشیار پور کے شہر اس کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں اور آج تک موجود ہیں۔

بادشاہ کو زراعت اور باغ لگوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے صرف دہلی کے آس پاس بارہ سو باغ لگوائے۔ نہروں کی وجہ سے ایسے ریگستان جن میں جانوروں کو پانی نصیب نہ ہوتا تھا وہاں ہزاروں کھیت بن گئے اور باغات لگ گئے۔

فیروز شاہ بڑا ہی عمدہ بادشاہ تھا۔ اس نے رفاہ عام کے کاموں کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے اچھے اچھے کام کیے۔ اس نے اپنی سلطنت میں تمام عالموں، غریبوں کے وظیفے مقرر کر دیئے۔ اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی سلطنت میں کوئی شخص بے کار نہ رہے، اس لیے وہ ہر شخص کی ملازمت کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

فیروز شاہ نے وہ تمام ناجائز محصول جو اس سے پہلے کے بادشاہ نے لگا دیئے تھے، اُٹھا لیے۔ اس نے مجرموں کو ایسی ظالمانہ سزائیں دینا بند کر دیں جو شرع کے خلاف تھیں۔ وہ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال نہیں کرتا تھا اور ریشمی کپڑے نہیں پہنتا تھا اس لیے کہ اسلام میں مردوں کے لیے ان کا استعمال ناجائز ہے۔ اس نے اپنے محل میں آرائش کے لیے تصویروں کی بجائے مناظر وغیرہ کی تصویریں لگوائیں۔

اس نیک بادشاہ نے ملک پر ۳۸ سال حکومت کی۔ اس کے زمانہ میں ملک بڑا خوشحال ہو گیا تھا اور ارزانی کا یہ حال تھا کہ دو آنے میں ایک من گیہوں اور ایک آنہ میں ایک من جو ملتا تھا۔ اس دور کی ارزانی دیکھ کر لوگ علاء الدین خلجی کا زمانہ بھول گئے۔

فیروز شاہ کے عہد کی یہی خوبیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے اس کے زمانہ میں غیر مسلم کثرت سے اسلام لائے۔

فیروز شاہ کے دَور میں اگر ہمیں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو وہ یہ کہ اس زمانے میں کتاب و سنت پر عمل کمزور ہو گیا تھا اور اسلام ایک رواجی مذہب بن گیا تھا۔ بدعتوں، پیر پرستی اور قبر پرستی کا زور ہو گیا تھا اور خود بادشاہ بھی ان کمزوریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اس دور میں شریعت اسلامی کا سب سے بڑا نمائندہ ایک سردار تاتار خاں تھا۔ اس نے بادشاہ کو بھی پابند شریعت رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے انتقال کے بعد بادشاہ پر سے یہ دباؤ ختم ہو گیا۔

تیمور کا حملہ

فیروز تغلق کے انتقال کے بعد ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ چھ سال کی مدت میں تین افراد تخت پر بیٹھے اور اتارے گئے۔ چوتھا حکمران محمود تغلق اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔ چھ سال کی خانہ جنگی نے سلطنت کی بنیادیں ہلا دی تھیں اس لیے جب ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی طاقت نہیں تھی۔ تیمور نے دہلی کی فوج کو شکست دینے کے بعد دہلی فتح کر لیا۔ اصفہان اور بغداد کی طرح یہاں بھی قتل عام کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دنیا کا یہ عظیم الشان شہر جو فیروز تغلق کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ کئی شاندار عمارتیں جن میں غیاث الدین کا بنایا ہوا عظیم قلعہ بھی شامل تھا آج صرف کھنڈر کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تیمور کے حملے نے سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی اور ملک کے مختلف حصوں میں صوبے داروں نے اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔

محمود تغلق کچھ مدت خضر خاں سے لڑتا رہا جس کو تیمور پنجاب کا صوبے دار مقرر کر کے گیا تھا اور جو خود کو ہندوستان میں تیمور کا اور اس کے جانشین شاہ رخ کا نمائندہ تصور کرتا تھا۔ ۱۴۱۲ء میں محمود تغلق کا انتقال ہو گیا اور ۱۴۱۴ء میں خضر خاں نے دہلی پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت سیدوں کی حکومت کہلاتی ہے کیونکہ خضر خاں آلِ رسولؐ سے ہونے کا دعوے دار تھا۔ یہ حکومت ۱۴۵۱ء تک قائم رہی اور اس میں کل چار حکمران ہوئے۔ خضر خاں کے قبضہ میں دہلی اور نواحی علاقے کے علاوہ پنجاب بھی تھا، لیکن اس کے بعد یہ علاقے بھی ہاتھ سے نکل گئے اور آخری سید حکمران علاء الدین عالم شاہ صرف دہلی کا بادشاہ تھا۔ ۱۴۵۱ء میں ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت قائم کر دی۔

سلطنت دہلی

(۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ تا ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ)

خاندان غلامان

(۱) قطب الدین ایبک	۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ تا ۱۲۱۰ء/۶۰۷ھ
(۲) آرام شاہ	۱۲۱۰ء/۶۰۷ھ تا ۱۲۱۱ء/۶۰۷ھ
(۳) التتمش	۱۲۱۱ء/۶۰۷ھ تا ۱۲۳۶ء/۶۳۳ھ
(۴) رکن الدین	۱۲۳۶ء/۶۳۳ھ تا ۱۲۳۶ء/۶۳۴ھ
(۵) رضیہ	۱۲۳۶ء/۶۳۴ھ تا ۱۲۴۰ء/۶۳۷ھ
(۶) معزالدین بہرام	۱۲۴۰ء/۶۳۷ھ تا ۱۲۴۲ء/۶۳۹ھ
(۷) علاء الدین مسعود	۱۲۴۲ء/۶۳۹ھ تا ۱۲۴۶ء/۶۴۴ھ
(۸) ناصرالدین محمود	۱۲۴۶ء/۶۴۴ھ تا ۱۲۶۶ء/۶۶۴ھ
(۹) غیاث الدین بلبن	۱۲۶۶ء/۶۶۴ھ تا ۱۲۸۷ء/۶۸۶ھ
(۱۰) معزالدین کیقباد	۱۲۸۷ء/۶۸۶ھ تا ۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ

خاندانی خلجی

(۱۱) جلال الدین	۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ تا ۱۲۹۶ء/۶۹۵ھ
(۱۲) علاء الدین	۱۲۹۶ء/۶۹۵ھ تا ۱۳۱۶ء/۷۱۵ھ
(۱۳) شہاب الدین	۱۳۱۶ء/۷۱۵ھ تا ۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ
(۱۴) قطب الدین مبارک	۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ تا ۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ

خاندان تغلق

(۱۵) غیاث الدین	۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ تا ۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ

(۱۶) محمد تغلق	۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ تا ۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ
(۱۷) فیروز شاہ	۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ تا ۱۳۸۸ء/۷۹۰ھ
(۱۸) غیاث الدین دوم	۱۳۸۸ء/۷۹۰ھ تا ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ
(۱۹) ابوبکر	۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ تا ۱۳۹۰ء/۷۹۵ھ
(۲۰) ناصرالدین محمد	۱۳۹۰ء/۷۹۲ھ تا ۱۳۹۴ء/۷۹۵ھ
(۲۱) محمود شاہ	۱۳۹۴ء/۷۹۵ھ تا ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ

مطالعے کے لیے اہم واقعات باب۔ ۱۳ کے آخر میں ملاحظہ کیجیے۔

باب ۱۴

کفر کی سرزمین میں اسلامی تہذیب

دہلی کی سلطنت دوسو سال سے زیادہ قائم رہی اور تقریباً ایک سواسی سال اس کو عروج رہا۔ پاکستان اور بھارت کی تاریخ میں اب تک ایسی کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی جو اس سلطنت دہلی کے برابر بڑی ہو اور اتنی مدت تک قائم رہی ہو۔ مسلمانوں سے پہلے جب ہندوؤں کی حکومت قائم تھی تو اُن کی سب سے بڑی حکومت راجہ اشوک کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی۔ یہ موریا سلطنت کے نام سے مشہور رہے۔ یہ سلطنت رقبہ میں دہلی کی سلطنت کے برابر تھی، لیکن موریا سلطنت کو ستر اسّی سال بعد ہی زوال ہو گیا۔ اس لیے یہ فخر مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ برکوچک کی سب سے بڑی اور سب سے پائیدار حکومت انہوں نے قائم کی۔

دہلی

سلاطین دہلی کے زمانہ میں ملک کو بڑی ترقی دی گئی۔ فیروز پور، جونپور اور کئی نئے شہر بسائے گئے۔ پاکستان میں ملتان، اوچہ، دیپال پور اور لاہور کے شہروں کو عروج ہوا۔ دہلی جو پہلے معمولی سی بستی تھی ملک کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ یہاں قوت الاسلام اور جہاں پناہ دو بڑی جامع مسجدیں تھیں۔ حوض شمسی اور حوض خاص نام کے دو بڑے تالاب تھے۔ ان میں سے ایک تالاب دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا تھا۔ شہر کے لوگ ان تالابوں کا پانی پیتے تھے اور ان کے کنارے سیر و تفریح کیا کرتے تھے غیاث الدین تغلق نے یہاں ایک قلعہ بنایا تھا جو اس زمانے میں سب سے بڑا قلعہ تھا۔ بعد میں اس قلعہ کو تیمور نے تباہ کر دیا، اب اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ دہلی کا وہ حصہ جو فیروز شاہ نے آباد کیا تھا فیروز آباد کہلاتا تھا۔ یہ اپنی عمارتوں اور خوبصورتی کی وجہ سے تمام شہر سے بڑھا ہوا تھا۔ شہر کی آبادی دس میل تک مسلسل چلی گئی تھی۔

شہر میں ایک ہزار مدرسے تھے جن میں مدرسہ فیروز شاہی اتنا بڑا اور خوبصورت تھا کہ اس زمانہ کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ ''جو کوئی باہر سے اس مدرسہ میں آتا یہی سمجھتا کہ جنت میں آ گیا ہوں'' دہلی کی ایک اور قابل دید چیز وہاں کا گھڑیال تھا۔ اندلس کے حالات میں طلیطلہ کی پن

گھڑیوں کا حال پڑھ چکے ہیں ایک ایسا ہی گھڑیال فیروز شاہ نے فیروز آباد میں بنوایا تھا۔ اس گھڑیال سے نمازوں کا وقت، روزہ کھولنے کا وقت، سایہ کا حال اور رات اور دن کے گھنٹے کا حال معلوم ہوتا تھا۔ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں آ کر اس کو دیکھا کرتے تھے۔

صرف فیروز آباد میں آٹھ ایسی مسجدیں تھیں جن میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔

ابن بطوطہ نے جو محمد تغلق کے زمانے میں دہلی آیا تھا شہر کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''یہ عظیم الشان شہر عمارتوں کی خوبصورتی اور مضبوطی کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ سارے مشرق میں کوئی شہر اس کے ہم پلہ نہیں۔ بڑا وسیع شہر ہے اور سب آباد ہے۔ اصل میں یہ چار شہروں پر مشتمل ہے۔ ایک ہندوؤں کے زمانے کا شہر ہے، دوسرا سیری ہے جسے دارالخلافہ بھی کہتے ہیں، علاء الدین خلجی اسی شہر میں رہتا تھا۔ تیسرا تغلق آباد ہے جسے غیاث الدین تغلق نے آباد کیا تھا اور چوتھا شہر جہاں پناہ ہے جس میں محمد شاہ تغلق رہتا ہے۔ بادشاہ کا ارادہ تھا کہ چاروں شہروں کے گرد فصیل بنا دے اور بنانی شروع بھی کر دی تھی لیکن خرچ زیادہ دیکھ کر ادھوری چھوڑ دی۔

دہلی کی فصیل ایسی مضبوط ہے کہ دنیا بھر میں اس کی نظیر نہیں۔ اس کا عرض گیارہ ہاتھ ہے۔ فصیل کے اوپر کئی سوار اور پیادے تمام شہر کے گرد گھوم سکتے ہیں۔ فصیل کے نیچے کا حصہ پتھر کا بنا ہوا ہے اور اوپر کا حصہ پختہ اینٹوں کا۔ برج تعداد میں بہت ہیں اور قریب قریب ہیں۔ شہر کے کل اٹھائیس دروازے ہیں۔ فصیل کے اندر کوٹھریاں اور مکانات بنے ہوئے ہیں جن میں چوکیدار اور دروازوں کے محافظ رہتے ہیں۔ منجنیق اور لڑائی کا دوسرا سامان بھی ان کوٹھریوں میں رکھا جاتا ہے۔ شہر کی طرف ان گوداموں میں روشندان ہیں جن سے روشنی آتی ہے۔ فصیل کے اندر غلے کے گودام بھی ہیں جن میں غلہ سالہا سال تک محفوظ رہتا ہے یہاں تک کہ رنگ بھی نہیں بدلتا''

ابن بطوطہ نے دہلی کی عمارتوں کے سلسلے میں قطب مینار کا حال بھی لکھا ہے جس کی اس کے خیال میں اسلامی دنیا میں مثال نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مینار سرخ پتھروں سے بنا ہوا ہے اور پتھروں پر نقش کندہ ہیں اور سب سے اوپر کی منزل پر جو چھتری ہے وہ خالص سنگ مرمر کی ہے۔

یہ حال محمد تغلق کی دہلی کا تھا۔ بعد میں فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں یہ شہر اور وسیع اور زیادہ آباد ہو گیا تھا۔ ابن بطوطہ نے سلطنت دہلی کے دوسرے شہروں کے بارے میں بھی مفید معلومات

فراہم کی ہے۔مثال کے طور پر:

سندھ میں لاہری بندر خوبصورت اور دولت مند شہر ہے۔ بڑی بندرگاہ ہے۔ یمن اور ایران کے تاجر کثرت سے آباد ہیں۔ دریائے سندھ قریب ہی سمندر میں گرتا ہے۔

بھکر بہت خوبصورت شہر ہے۔ہانسی ایک خوبصورت اور مضبوط شہر ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں ہیں اور فصیل بہت اونچی ہے۔قنوج بہت بڑا شہر ہے۔قلعہ بڑا مضبوط ہے، فصیل اونچی ہے۔شکر کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ یہاں سے شکر دہلی بھیجی جاتی ہے۔ چندیری ایک بڑا شہر ہے اور بازاروں میں بہت بھیڑ رہتی ہے۔دھار مالوہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں سے دہلی تک سڑک پر سنگ میل لگے ہوئے ہیں جن پر فاصلہ بھی لکھا ہوا ہے۔ اُجین ایک خوبصورت شہر ہے اور عمارتیں بلند ہیں۔دولت آباد بہت بڑا شہر ہے۔دہلی کا مقابلہ کرتا ہے۔اس شہر کے ہندو جواہرات کی تجارت کرتے ہیں اور بہت مالدار ہیں۔کھمبایت بندرگاہ ہے۔ دوسرے شہروں کی نسبت مضبوط اور خوبصورت بنا ہوا ہے۔عمارات اور مسجدیں بہت اچھی ہیں۔ باشندوں کی اکثریت پر دیسی سوداگروں پر مشتمل ہے جو عالی شان محل اور بڑی بڑی مسجدیں بنواتے ہیں۔کالی کٹ بہت بڑی بندرگاہ ہے۔چین، جاوا، سری لنکا، یمن اور ایران کے سوداگر بلکہ ساری دنیا کے تاجر یہاں آتے ہیں۔یہ دنیا کی بڑی بندرگاہوں میں سے ہے۔

سڑکیں

سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں کے درمیان سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ دہلی سے دولت آباد تک جو سڑک بنی تھی وہ سب سے شاندار تھی۔اس سڑک کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔سیاح ابن بطوطہ اس سڑک سے گذرا تھا۔وہ لکھتا ہے'' کہ اگر مسافر اس پر چلتا تو یہ معلوم ہوتا کہ ہم باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ ہر میل پر ڈاک کی چوکیاں تھیں۔ ہر چوکی پر ضرورت کا سامان اتنا ملتا تھا کہ مسافر یہ سمجھتا تھا کہ اس چالیس دن کے سفر میں سڑک پر نہیں بلکہ بازاروں میں پھر رہا ہوں۔ ہر منزل پر بادشاہ کے اترنے کے لیے ایک مکان بنا ہوا ہے اور مسافروں کے لیے ایک سائبان ہے۔مفلس مسافروں کے لیے زادِ راہ کی ضرورت نہیں ان کو سب چیزیں مفت ملتی تھیں۔

ڈاک دو قسم کی تھی ایک گھوڑے کی جس کی چوکیاں چار چار میل پر تھیں اور دوسری پیدل قاصدوں کی جس کی دو میل میں تین چوکیاں ہوتی تھیں۔ ہر چوکی پر ہرکارے تیار رہتے ہیں۔ان

کے پاس دو گز لمبا ایک ڈنڈا ہوتا ہے جس کے سرے پر تانبے کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں۔ ہرکارہ پوری قوت سے دوڑتا ہے اور اس کے گھنگھرو کی آواز سن کر دوسری چوکی کا ہرکارہ تیار ہو جاتا ہے اور اس سے ڈاک لے کر فوزا روانہ ہو جاتا ہے۔

سلطنت دہلی کا زمانہ فتوحات اور سلطنت کو مضبوط بنانے اور منگولوں کے حملے روکنے کا زمانہ تھا۔ نیا نیا ملک تھا اس لیے مسلمانوں کی ساری توجہ سلطنت کی مضبوطی، حفاظت اور اسلام کی تبلیغ پر رہی۔ اس لیے اس زمانہ میں بڑے بڑے مصنف پیدا نہیں ہوئے لیکن اس زمانہ میں کئی اولیاء اللہ گزرے ہیں جو عالم دین بھی تھے اور جنہوں نے اسلام کی اس ملک میں تبلیغ کی۔

بزرگانِ دین

ان میں سب سے پہلے بزرگ معین الدین چشتی (۱۱۴۱ء/ ۵۳۷ھ تا ۱۲۳۵ء/ ۶۳۳ھ) ہیں۔ آپ بجستان میں پیدا ہوئے تھے۔ نیشاپور، ہرات، سمرقند، تبریز، اصفہان اور بغداد وغیرہ کی سیاحت کرنے کے بعد وہاں سے ملتان آئے، جہاں ہندوستانی زبان سیکھی۔ معین الدین، اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری کے زمانہ میں ۵۶۱ھ میں اجمیر آبسے اور یہیں سلطان التمش کے زمانہ میں انتقال کیا۔ حضرت معین الدین چشتی نے مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کی اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان بھی کیا۔

اس زمانہ کے دوسرے بزرگ بابا فرید گنج شکر (۱۱۷۴ء/ ۵۶۹ھ تا ۱۲۶۵ء/ ۶۶۴ھ) میں۔ بابا فرید ملتان کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم و تربیت پانے کے بعد انہوں نے اجودھن میں جو اب پاک پٹن کہلاتا ہے رہائش اختیار کی یہاں کے لوگ درشت مزاج اور بداعتقاد تھے، لیکن بابا فرید کی تعلیمات سے ٹھیک ہو گئے۔ ان کی کوششوں سے پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے مسلمان ہو گئے۔ بابا فرید، شیخ معین الدین اجمیری کے خلیفہ تھے۔

تیسرے بڑے بزرگ خواجہ نظام الدین ہیں جو نظام الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ۱۲۳۸ء/ ۶۳۴ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے وہ بابا فرید کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے دہلی کو مرکز بنایا اور یہاں سے مسلمانوں کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ ان کا ۱۳۲۵ء/ ۷۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

ان کی کوششوں سے مسلمان عبادت اور نیک کاموں کی طرف مائل ہو گئے اور جن لوگوں کو جوا، شراب، سود خوری کی عادت ہو گئی تھی انہوں نے اس عادت کو ترک کر دیا۔ اسی طرح جھوٹ

بولنا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

نظام الدین اولیاء نے اپنے خلفاء تمام ملک میں بھیجے جہاں وہ گئے انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح کی اور اسلام کی اشاعت میں حصہ لیا۔

ان تین کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں اس زمانے میں اور بھی کئی بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ مثلاً دہلی میں قطب الدین بختیار کاکی (۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ تا ۱۲۳۵ء/ ۶۳۳ھ) ملتان میں بہاء الدین زکریا (۱۱۸۲ء/۵۷۸ھ تا ۱۲۶۷ء/۶۶۶ھ) اور شیخ رکن الدین متوفی ۱۳۳۴ء/۷۳۵ھ، اوچھ میں مخدوم جہانیاں (۱۳۰۸ء/۷۰۷ھ تا ۱۳۸۴ء/ ۷۸۵ھ)، بہار میں شرف الدین یحییٰ منیری (۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ تا ۱۳۸۰ء/۷۸۲ھ)، بنگال میں شیخ جلال سلہٹی متوفی ۱۳۴۰ء/۷۴۱ھ اور نور قطب عالم متوفی ۱۴۱۰ء/ ۸۱۳ھ اور دکن میں حضرت گیسودراز (گلبرگہ) ۱۳۲۱ء/۷۲۱ھ تا ۱۴۲۲ء/۸۲۵ھ۔

ان بزرگوں کا بادشاہوں پر بڑا اثر تھا۔ التمش، ناصر الدین محمود، بلبن اور فیروز شاہ ان کی ہدایت سنتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ عدل وانصاف اور رعایا پروری کی طرف مائل ہوتے تھے۔

یہ بزرگ کتنی بے باکی سے بادشاہوں کو نصیحت کرتے تھے اس کا اندازہ سید نور الدین مبارک غزنوی کے اس وعظ سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے التمش کے سامنے دیا تھا۔ سید نور الدین، شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز تھے اور وہ ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ایک وعظ میں انہوں نے بادشاہ کے فرائض بتانے کے بعد کہا:

''اگر بادشاہ روزانہ ہزار رکعتیں پڑھتا رہے، تمام عمر روزے رکھتا رہے، گناہوں سے بچتا رہے، خزانہ کو راہِ حق میں خرچ کرتا رہے مگر وہ دین کی حمایت نہ کرے، شریعت کے احکام جاری نہ کرے۔ ملک میں نیک کاموں کی حوصلہ افزائی اور برے کاموں کی روک تھام نہ کرے اور عدل وانصاف سے کام نہ لے تو اس کی جگہ دوزخ کے سوا کہیں نہیں ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر بادشاہ ان باتوں پر عمل کرے تو خواہ ذاتی طور پر اس میں خرابیاں موجود ہوں لیکن ایسی کا حشر دینداروں اور اولیاء کے ساتھ ہوگا''

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہوں کو راہ راست پر رکھنے میں اور ان کو حکومت کے فرائض یاد دلانے میں ان دینی رہنماؤں اور مصلحین کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی وجہ سے سلطنت دہلی اپنے زمانہ میں دنیا کی

ایک مثالی حکومت بن گئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ کے مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ:

''ان مشائخ کی وجہ سے اللہ کی رحمت و فضل کا نزول رہتا اور خلق خدا سیدھی راہ سے ہٹنے نہ پاتی........... امراء اور دولتمند خیرات اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے پر رشک کرتے۔ اگر ایک امیر کے متعلق یہ خبر مشہور ہوتی کہ اس کے دستر خوان پر ہر روز پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں تو دوسرا امیر ایک ہزار بھوکے آدمیوں کو اپنے دستر خوان پر بٹھاتا۔ اگر ایک دو سو بیواؤں کو وظیفے دیتا تو دوسرا چار سو کو۔ اگر ایک چار سو روپے خیرات کرتا تو دوسرا اس سے بھی بڑھنے کی کوشش کرتا۔ ان کا ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا یہ جذبہ صرف نیک کاموں کے لیے تھا'' ان بزرگوں کو کوششوں سے پاکستان میں اسلام پھیلا اور پاکستان کے حقیقی بانی یہی بزرگ تھے۔

علم وادب

سلطنت دہلی کے زمانے میں علوم دینی، تاریخ، شعر اور ادب نے بھی فروغ پایا۔ اگرچہ علم و ادب کے میدان میں امیر خسرو کے علاوہ دوسرے عالم اور ادیب اتنے بلند پایہ نہیں تھے جتنے بلند پایہ عالم تباہی بغداد سے قبل اسلامی دنیا میں ہوئے تھے، لیکن پھر بھی کئی عالم اور ادیب علم و فضل کے میدان میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان میں بعض ترکستان اور خراسان سے آئے تھے اور بعض یہیں پیدا ہوئے۔ اس دور میں دینی کتابیں عام طور پر عربی میں لکھی جاتی تھیں اور ادب، تاریخ اور شاعری کی زبان فارسی تھی۔ اس دور کے علماء میں امام رضی الدین صفانی (۱۱۸۲ء/۵۷۷ھ تا ۱۲۵۲ء/۶۵۰ھ) کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے پھر عرب چلے گئے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ ان کی مرتب کردہ حدیثوں کا مجموعہ ''مشارق الانوار'' صدیوں تک اسلامی دنیا کے دینی مدرسوں میں پڑھایا جاتا رہا۔ امام صفانی نے بغداد میں وفات پائی اور مکہ معظّمہ میں دفن کیے گئے۔

اس دَور کی علمی تاریخ میں خان اعظم تاتار خاں کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ محمد تغلق اور فیروز شاہ کے زمانے کے ممتاز ترین سپہ سالار اور حاکم تھے۔ فیروز شاہ کے زمانے میں بادشاہ کے بعد سب سے اہم شخصیت ان ہی کی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے۔ انہوں نے خود تو کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کی ہدایت اور نگرانی میں دو ایسی ضخیم کتابیں مرتب کی گئیں جو اسلامی ہند کی علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایک تفسیر تاتارخانی ہے اور دوسری فتاویٰ تاتارخانی

ہے۔ ان میں سے ہر کتاب کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس دور میں تاریخ کے موضوع پر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں قاضی منہاج الدین کی طبقات ناصری اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی بہت مشہور اور اہم ہیں۔ یہ دونوں فارسی میں ہیں۔ قاضی منہاج الدین جو قاضی منہاج سراج کے نام سے مشہور ہیں، ایلتتمش اور ناصر الدین محمود کے زمانے میں تھے اور انہوں نے اپنی کتاب کا نام ناصر الدین کے نام پر طبقات ناصری رکھا۔ یہ ایک عالمی تاریخ ہے لیکن اس کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جو خاندان غوری اور خاندان غلامان کی تاریخ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ ضیاء الدین برنی کا تعلق تغلق دور سے ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی سلطان فیروز شاہ کی حکومت کے چھٹے سال میں مکمل کی۔ یہ بلبن سے فیروز شاہ کے ابتدائی عہد تک کی تاریخ ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کو ہم دنیا کی بہترین تاریخوں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ بقول ایک مصنف کے اس کتاب میں تاریخ نگاری فقط وقائع نویسی نہیں رہی بلکہ تخلیقی فن کے مرتبے پر پہنچ گئی ہے۔ (شیخ محمد اکرام: آب کوثر) تاریخ فیروز شاہی کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

اس دور کی کتابوں میں فخر مدبر کی ''آداب الحرب'' اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں نظام حکومت اور فنون جنگ اور آلات جنگ سے بحث کی گئی ہے اور اس موضوع پر فارسی زبان کی بہترین کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ فخر مدبر سلطان ایلتتمش کے دَور میں تھے۔ انہوں نے ایک تاریخ بھی لکھی ہے جو تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کہلاتی ہے۔

فیروز شاہ تغلق کی کتاب ''فتوحات فیروز شاہی'' اس دور کی ایک اہم تصنیف ہے جس سے فیروز شاہ کے سیاسی نظریات معلوم ہوتے ہیں اور جس میں اس نے اپنی اصلاحات کا دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

اس دور کے ادیبوں میں محمد عوفی (۱۱۷۱ء تا ۱۲۴۲ء) کا نام سرفہرست ہے۔ وہ فارسی شعراء کے ایک تذکرے ''لباب الالباب'' کے مصنف ہیں۔ یہ فارسی شعراء کا قدیم ترین اور نہایت اہم تذکرہ ہے۔ محمد عوفی کی دوسری اہم کتاب ''جوامع الحکایات'' ہے۔ یہ کتاب ادبی نوعیت کی تاریخی کہانیوں پر مشتمل ہے اور فارسی کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

اس دور کے ایک اور ممتاز مصنف ضیا نخشبی متوفی ۱۳۵۰ء میں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ایک تصوف کے موضوع پر ''سلک السلوک'' ہے اور دوسری ''طوطی نامہ'' ہے۔ یہ

کتاب سنسکرت سے ترجمہ کی گئی تھی۔ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اس کا ترکی جرمن اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ اُردو میں اس کا ترجمہ 'طوطا کہانی' کے نام سے ہوا۔

امیر حسن سنجری (۶۵۱ھ/۱۲۵۷ء تا ۷۳۸ھ/۱۳۳۶ء) سلطنت دہلی کے زمانے کے شاعروں میں امیر خسرو کے بعد سب سے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری سے زیادہ مقبول ان کی کتاب 'فوائد الفواد' ہوئی۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مستند مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں امیر خسرو کہا کرتے تھے کہ کاش حسن میری ساری تصانیف لے لے اور ان کے بدلے یہ کتاب مجھ کو دے دے۔

فیروز شاہ کے زمانے میں سنسکرت سے بھی فارسی میں کئی کتابوں کے ترجے کیے گئے اور علم طب میں ایک اہم کتاب طب فیروز شاہی لکھی گئی۔ آخر میں ہم اس دَور کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ امیر خسرو تھے۔

امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ تا ۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ)

امیر خسرو ایک جامع الکمالات شخصیت تھے۔ نظم ونثر میں انہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھیں۔ وہ فارسی کے صف اول کے شاعر شمار ہوتے ہیں اور خمسہ نظامی کا جواب ان سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ ان پانچ مثنویوں کے نام (۱) مطلع الانوار، (۲) شیریں وخسرو، (۳) مجنوں ولیلیٰ، (۴) آئینہ سکندری اور (۵) ہشت بہشت ہیں۔ بعض مثنویوں میں جیسے قرآن السعدین، مفتاح الفتوح، نہ سپہر اور تغلق نامہ ہیں امیر خسرو نے اپنے دور کے تاریخی واقعات بھی نظم کیے ہیں اور ان میں اس زمانہ کی معاشرت سے متعلق مفید معلومات ملتی ہیں۔ نثر میں خزائن الفتوح ایک تاریخی کتاب ہے۔ ''افضل الفوائد میں نظام الدین اولیاء کے ملفوظات جمع کیے ہیں اور اعجاز خسروی فارسی زبان کی، انشاء سے متعلق ہے۔

امیر خسرو موسیقی کے بھی ماہر تھے اور کہا جاتا ہے کہ ستار کی موجودہ شکل ان ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ امیر خسرو فارسی کے علاوہ عربی، ترکی سنسکرت اور ہندی بھی جانتے تھے۔ لیکن ہندی میں ان دوہوں اور پہیلیوں کے علاوہ جو ان سے منسوب ہیں اور کوئی کلام موجود نہیں۔ ان کا بلبن اور علاء الدین خلجی کے دربار سے تعلق تھا۔

باب ۱۳

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب بھی کسی خطے میں بڑی سلطنت کو زوال ہوا تو اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے لے لی۔ جب بغداد میں عباسی خلافت کو زوال ہوا تو اس وسیع خطے میں جو خلافت عباسی میں شامل تھے کئی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ اسی طرح جب اندلس میں اموی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ملک کئی کئی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہوگیا۔ یہی حال پاکستان اور بھارت کا ہوا۔ جب دہلی کی عظیم الشان مرکزی سلطنت کمزور پڑگئی تو جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم ہوگئیں، لیکن برکوچک پاکستان و بھارت چونکہ بہت بڑا خطہ ہے، اس لیے یہاں جو آزاد حکومتیں قائم ہوئیں وہ اندلس کی حکومتوں کے برابر چھوٹی نہیں تھیں۔ ان میں دکن کی بہمنی سلطنت تو اپنی وسعت میں اندلس کی اموی حکومت سے کم نہیں تھی۔ بنگال اور گجرات کی حکومتیں بھی تقریباً بہمنی سلطنت کے برابر تھیں۔

(۱) کشمیر

(۱۳۳۹ء/۷۴۰ھ تا ۱۵۸۶ء/۹۹۵ھ)

ان حکومتوں میں سب سے پہلے ہم کشمیر کا ذکر کریں گے۔ کشمیر دہلی کی سلطنت میں کبھی شامل نہیں ہوا۔ یہاں سینکڑوں سال سے ہندوؤں کی حکومت تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کی ابتداء چودھویں صدی کے شروع میں ہوئی۔ اس وقت دہلی میں محمد بن تغلق حکمران تھا۔ اس مسلم حکومت کا بانی ایک شخص شہ میر ہوا ہے۔ شہ میر نے جس کا لقب شمس الدین تھا ۱۳۳۹ء سے ۱۳۴۲ء تک کل تین سال حکومت کی۔ بعد میں جس طرح پاکستان اور بھارت میں مسلمان بزرگوں کی کوشش سے اسلام پھیلا اسی طرح کشمیر میں بھی سید علی ہمدانی (۱۳۱۴ء تا ۱۳۸۴ء) اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے اسلام پھیلا۔ عوام نے ہزاروں کی تعداد میں اسلام قبول کرلیا اور اس طرح وادیٔ کشمیر کے بیشتر لوگ اسلام لے آئے اور یہ علاقہ اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گیا۔

زین العابدین

کشمیر کے بادشاہوں میں زین العابدین (۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء تا ۸۷۴ھ/۱۴۸۰ء) سب سے مشہور اور نیک نام ہوا ہے۔ وہ ہرات کے تیموری حکمران شاہ رُخ ۱۴۰۴ء تا ۱۴۴۷ء) اور ترکی کے عثمانی حکمران محمد فاتح ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) کا ہمعصر تھا۔ زین العابدین نے غیاث الدین تغلق اور فیروز تغلق کی طرح کسانوں کا محصول بہت کم کر دیا تھا اور وادی کشمیر میں کئی نہریں نکالیں جن کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہو گیا اور ملک میں خوشحالی پھیل گئی۔

زین العابدین جب شہزادہ تھا تو وہ تیمور کے زمانہ میں سمرقند گیا تھا۔ سمرقند اس زمانہ میں صنعت وحرفت اور علم وادب کا مرکز تھا۔ اس لیے زین العابدین نے بادشاہ بننے کے بعد اپنے دارالحکومت کو سمرقند کی طرح ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس نے سمرقند سے بہت سے کاریگر بلوائے جنہوں نے کشمیر میں قالین بانی، کاغذ سازی اور دوسری صنعتیں شروع کیں۔

کشمیر آج کل اپنے پھلوں اور خاص طور پر سیب اور ناشپاتیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ زین العابدین سے پہلے یہ پھل کشمیر میں نہیں ہوتے تھے۔ اس بادشاہ نے پھلوں کے بیج خراسان اور ماوراء النہر سے منگوائے اور کشمیر میں ان کی کاشت کی۔ اس لیے آج کشمیر اپنے جن پھل اور پھلوں کی وجہ سے مشہور ہے وہ زین العابدین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

زین العابدین بڑا دیندار اور غیر متعصب بادشاہ تھا۔ اس نے ہندوؤں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ پچھلے بادشاہوں نے ان کے کئی مندر تڑوا دیئے تھے زین العابدین نے ان کو پھر سے بنوا دیا اور کشمیر سے جو ہندو ظلم کی وجہ سے باہر چلے گئے تھے ان کو واپس کشمیر بلا لیا۔

زین العابدین فارسی، عربی اور سنسکرت بھی جانتا تھا۔ اس کے زمانہ میں عربی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا اور کشمیری زبان میں پہلی مرتبہ کتابیں لکھی گئیں۔ سری نگر کی جامع مسجد زین العابدین ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دریائے جہلم پر کئی پل بنوا دیئے اور کشمیر میں سڑکیں اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ زین العابدین کشمیر میں بڈھ شاہ کے نام سے مشہور ہے اور اس کے اچھے کاموں کی وجہ سے آج بھی لوگ اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔

کشمیر کی آزاد اسلامی حکومت تقریباً ڈھائی سو سال قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۵۸۷ء میں

کشمیر پر دہلی کے مغل بادشاہ اکبر نے جس کا حال آگے آئے گا قبضہ کرلیا۔ اس طرح یہ علاقہ دہلی کی مغل سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

کشمیر کے مسلمان سلاطین

(۱) خاندان شہ میر (۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء تا ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء)

(۱) سلطان شمس الدین	۱۳۳۹ء تا ۱۳۴۲ء
(۲) سلطان جمشید	۱۳۴۲ء تا ۱۳۴۳ء
(۳) سلطان علاء الدین	۱۳۴۳ء تا ۱۳۵۴ء
(۴) سلطان شہاب الدین	۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء
(۵) سلطان قطب الدین	۱۳۷۳ء تا ۱۳۸۹ء
(۶) سلطان سکندر بت شکن	۱۳۸۹ء تا ۱۴۱۳ء
(۷) سلطان علی شاہ	۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۰ء
(۸) سلطان زین العابدین	۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء
(۹) سلطان حیدر شاہ	۱۴۷۰ء تا ۱۴۷۲ء
(۱۰) شاہی شاہ حسن	۱۴۷۲ء تا ۱۴۸۴ء
(۱۱) سلطان محمد شاہ اول	۱۴۸۴ء تا ۱۴۸۶ء
(۱۲) فتح شاہ (بار اول)	۱۴۸۶ء تا ۱۴۹۳ء
(۱۳) محمد شاہ (بار دوم)	۱۴۹۳ء تا ۱۵۰۵ء
(۱۴) فتح شاہ (بار دوم)	۱۵۰۵ء تا ۱۵۱۴ء
(۱۵) محمد شاہ (بار سوم)	۱۵۱۴ء تا ۱۵۱۵ء
(۱۶) فتح شاہ (بار سوم)	۱۵۱۵ء تا ۱۵۱۷ء
(۱۷) محمد شاہ (بار چہارم)	۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۸ء
(۱۸) ابراہیم شاہ اول	۱۵۲۸ء تا ۱۵۲۹ء

(۱۹) نازک شاہ ۱۵۲۹ء تا ۱۵۳۰ء

(۲۰) محمد شاہ (بار پنجم) ۱۵۳۰ء تا ۱۵۳۷ء

محمد شاہ کے زمانہ میں کاشغر کے شہزادہ مرزا حیدر دوغلات نے جو بابر کا خالہ زاد بھائی تھا لداخ کی طرف سے ۱۵۳۲ء میں درۂ زوجیلا کے راستے کشمیر پر حملہ کیا۔

(۲۱) سلطان شمس الدین ۱۵۳۷ء تا ۱۵۴۰ء

۱۵۴۰ء میں مرزا حیدر دوغلات نے ہمایوں کی طرف سے جب کہ وہ ہندوستان سے فرار ہو رہا تھا کشمیر پر قبضہ کر کے شہ میر خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۱۵۵۱ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ مرزا حیدر دوغلات کا دور کشمیر کا اہم دور ہے۔ وہ خطاطی، مصوری اور موسیقی میں ماہر تھا۔ ترکی زبان کا شاعر تھا اور ''تاریخ رشیدی'' کا مصنف جو کاشغر کے منگول حکمرانوں کی تاریخ ہے۔

(۲) چک خاندان کے حکمران

(۱۵۶۳ء تا ۱۵۸۷ء)

(۱) سلطان حسین شاہ ۱۵۶۳ء تا ۱۵۷۶ء

(۲) سلطان علی شاہ ۱۵۷۰ء تا ۱۵۷۸ء

(۳) سلطان یوسف شاہ ۱۵۷۸ء تا ۱۹۸۶ء

(۴) سلطان یعقوب شاہ ۱۵۸۶ء تا ۱۵۸۷ء

یوسف شاہ شہنشاہ اکبر کی مدد سے ۱۵۸۰ء میں کشمیر کے تخت پر دوبارہ قابض ہوا تھا لیکن جب اس نے اکبر کے حکم سے سرتابی کی تو اکبر نے کشمیر پر ۱۵۸۷ء/۹۹۵ھ میں قبضہ کر لیا۔

[سلاطین کشمیر کے جلوس اور وفات کی تاریخوں اور سالوں میں اختلاف ہے۔ مذکورہ بالا سنہ محب الحسن کی کتاب ''کشمیر سلاطین کے عہد میں'' سے لیے گئے ہیں۔]

(۲) دکن کی بہمنی حکومت

(۱۳۴۷ء/۷۴۸ھ تا ۱۵۲۷ء/۹۳۴ھ)

ہم پڑھ چکے ہیں کہ دکن اور جنوبی ہند کا علاقہ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں فتح ہوا تھا، لیکن

دکن کی فتح کے چالیس سال بعد محمد تغلق کے زمانہ میں یہ علاقہ دہلی کی سلطنت سے علیحدہ ہو گیا اور یہاں دو آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں ایک دکن کی بہمنی سلطنت اور دوسری جنوبی ہند کی وجے نگر۔ ان میں وجے نگر کی حکومت ہندوؤں کی تھی لیکن بہمنی سلطنت مسلمانوں کی تھی۔ بہمنی سلطنت کا بانی ایک شخص علاء الدین حسن گنگو (۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۸ء) تھا۔

دہلی کے زوال کے بعد جو آزاد حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سب سے پہلی اور سب سے طاقتور حکومت یہی تھی۔ بہمنی سلطنت کا دارالحکومت پہلے گلبرگہ تھا پھر بیدر ہو گیا۔

اس خاندان میں کئی قابل حکمران ہوئے ہیں۔ ان میں ایک محمد شاہ اول (۱۳۵۹ء تا ۱۳۷۴ء) تھا۔ محمد شاہ اپنے باپ کے بعد تخت پر بیٹھا۔ وہ بڑا قابل اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اس زمانہ میں وجیانگر کے نام سے جنوبی ہند میں بڑی طاقتور حکومت تھی۔ یہ ہندوؤں کی ریاست تھی اور دہلی کی سلطنت کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں وجیانگر کے راجہ نے بہمنی سلطنت پر حملہ کر کے ایک سرحدی مقام پر آٹھ سو مسلمانوں کو جن میں عورت مرد سب شامل تھے قتل کر دیا جب بادشاہ کو یہ خبر ملی تو اس نے وجیانگر پر حملہ کر دیا۔ اور انتقام کے جوش میں ہزاروں ہندو مرد عورتوں کو قتل کر ڈالا۔ محمد شاہ کا یہ فعل اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا، لیکن بادشاہ چونکہ دیندار تھا اس لیے بعد میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوا اور یہ عہد کر لیا کہ ''آئندہ میں سوائے لڑائی کے میدان کے کسی کو بھی قتل نہ کروں گا۔ نہ قیدی کو قتل کروں گا اور نہ عورتوں اور بچوں کو قتل کروں گا''

محمد شاہ شروع میں شراب پیتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک بزرگ شیخ زین العابدین تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے ہاتھ پر محض اس لیے بیعت نہیں کی کہ وہ شراب پیتا تھا۔ اس پر بادشاہ نے غصہ میں آ کر ان کو جلاوطن کر دیا۔ بعد میں بادشاہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوا اور شیخ زین الدین کو واپس بلا لیا، لیکن وہ اس شرط پر آنے پر راضی ہوئے کہ سلطان شریعت پر عمل کرے، شراب نہ پیے، سلطنت میں شراب خانے بند کر دے، علماء اور حاکموں کو حکم دیدے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کریں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ شیخ زین الدین خوش ہو کر واپس آ گئے۔

محمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنا سارا خزانہ جو چار سو من سونا اور سات سو من چاندی پر مشتمل تھا، اپنی ماں کے ہاتھ مکہ بھجوا دیا تھا تا کہ وہاں غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ مرا تو اس کے خزانہ میں اتنی دولت تھی کہ کسی بہمنی بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔

محمد شاہ اول کا ایک اور بڑا کام اپنے نام کا سکہ جاری کرنا ہے۔ اب تک دکن میں ہندوؤں کے سکے چلتے تھے۔ محمد شاہ پہلا بادشاہ ہے جس نے بہمنی سکے چلائے یوں سمجھو کہ اس معاملہ میں محمد شاہ بہمنی سلطنت کا عبدالملک تھا۔

محمود گاوان

بہمنی بادشاہ تو اور بھی اچھے اچھے ہوئے لیکن اس مختصر کتاب میں ان کا حال نہیں لکھا جا سکتا۔ ہاں ہم یہاں بہمنی سلطنت کے ایک وزیر محمود گاوان کا حال لکھتے ہیں جو محمد شاہ سوم (۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۲ء) کا وزیراعظم تھا۔ محمود گاواں کے زمانہ میں بہمنی سلطنت پورے عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے اراضی کی پیمائش کر کے منصفانہ محصول مقرر کیا۔ بدنظمی دُور کی اور فوجوں کو ترقی دی۔ اس کی زندگی سادہ تھی اور اہل علم کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کے کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ محمود گاوان نے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ بھی بنوایا جس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ محمود گاوان ریاضی اور طب میں ماہر تھا اور اس نے دو کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن اس اچھے وزیر کو بادشاہ نے حاسدوں کی باتوں میں آ کر قتل کرا دیا۔ محمود گاوان بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک وزیر رہا۔

اس کے بعد بہمنی سلطنت کو زوال ہو گیا اور وہ حسب ذیل حکومتوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۱) عادل شاہی بیجاپور	۱۴۹۰ء/۸۹۵ھ تا ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ
(۲) نظام شاہی احمد نگر	۱۴۹۰ء/۸۹۵ھ تا ۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ
(۳) قطب شاہی گولکنڈہ	۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تا ۱۶۸۷ء/۱۰۹۸ھ
(۴) برید شاہی بیدر	۱۴۸۷ء/۸۹۴ھ تا ۱۶۱۹ء/۱۰۱۸ھ
(۵) عماد شاہی برار	۱۴۹۰ء/۸۹۵ھ تا ۱۵۷۴ء/۹۸۰ھ

عماد شاہی حکومت ۱۵۷۴ء میں احمد نگر کی حکومت میں اور برید شاہی ۱۶۱۹ء میں بیجاپور کی حکومت میں شامل کر لی گئی۔ باقی تین حکومتیں مغل سلطنت میں شامل کر لی گئیں۔ (ملاحظہ کیجیے باب: ۲۰)

دکن کا تمدن

دکن کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے زمانے میں احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدر آباد اور برہان پور کے شہر قائم ہوئے اور دکن میں مسلم تہذیب کی بنیادیں اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ فن تعمیر

نے ترقی پائی، علم وادب کو فروغ ہوا۔ دکنی زبان کی شکل میں اردو ادب پہلی مرتبہ پیدا ہوا۔ حبش غلاموں نے برصغیر میں پہلی مرتبہ نمایاں سیاسی خدمات انجام دیں اور ان میں بعض ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کا نام برصغیر کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ان ریاستوں کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تالیکوٹہ کی جنگ ہے۔ محمد تغلق کے آخری زمانے میں ہندوؤں نے جنوبی ہند میں ایک آزاد ریاست قائم کرلی تھی جسے وجے نگر کی سلطنت کہا جاتا ہے۔ وجے نگر کی سلطنت وسعت، آبادی اور قوت میں بہمنی سلطنت کی ہم پلہ تھی۔ ان دونوں میں سرحدی معاملات پر ہمیشہ لڑائیاں رہتی تھیں جن میں عام طور پر بہمنی حکومت کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ لیکن جب بہمنی سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجے نگر کے سامنے بے بس ہوگئیں اور وجے نگر نے ان پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کردیا۔ وجے نگر کے راجہ رام راج نے علی عادل شاہ کی دعوت اور مدد سے ۱۵۵۹ء اور ۱۵۶۲ء میں دومرتبہ احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ ان محاصروں کے دوران ہندوؤں نے مسلمانوں پر جو ظلم کیے، مسجدوں کی بے حرمتی کی اور اپنے اتحادی بیجاپوریوں سے جس اہانت سے پیش آئے، اس کی وجہ سے دکن کے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوگیا اور گولکنڈہ کے حکمران ابراہیم قطب شاہ کی پہل پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ اور بیدر کی چار ریاستوں نے وجے نگر کے خلاف متحدہ کارروائی کی اور دریائے کرشنا کے کنارے تالیکوٹہ کے میدان میں جنوری ۱۵۶۵ء کو وجے نگر کی فوجوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ رام راجہ جنگ میں مارا گیا، وجے نگر کا شہر برباد کردیا گیا اور وجے نگر کی سلطنت ختم کردی گئی اور اس کے علاقے بیجاپور اور گولکنڈہ میں شامل کرلیے گئے۔

سلاطین بہمنیہ (گلبرگہ، بیدر)

(۱۳۴۷ء/۷۴۵ھ تا ۱۵۲۷ء/۹۳۴ھ)

(۱) علاء الدین حسن شاہ گنگو	۱۳۴۷ء/۷۴۵ھ تا ۱۳۵۸ء/۷۵۹ھ
(۲) محمد شاہ اول	۱۳۵۸ء/۷۵۹ھ تا ۱۳۷۵ء/۷۷۶ھ
(۳) مجاہد شاہ	۱۳۷۵ء/۷۷۶ھ تا ۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ
(۴) داؤد شاہ	۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ تا ۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ

(۵) محمود شاہ اول	۱۳۷۸ء/۷۸۰ھ تا ۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ
(۶) غیاث الدین	۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ تا ۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ
(۷) شمس الدین	۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ
(۸) فیروز شاہ	۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ تا ۱۴۲۲ء/۸۲۵ھ
(۹) احمد شاہ ولی	۱۴۲۲ء/۸۲۵ھ تا ۱۴۳۵ء/۸۳۸ھ
(۱۰) علاء الدین شاہ دوم	۱۴۳۵ء/۸۳۸ھ تا ۱۴۵۷ء/۸۳۸ھ
(۱۱) ہمایوں شاہ ظالم	۱۴۵۷ء/۸۶۲ھ تا ۱۴۶۱ء/۸۶۵ھ
(۱۲) نظام شاہ	۱۴۶۱ء/۸۶۵ھ تا ۱۴۶۳ء/۸۶۷ھ
(۱۳) محمد شاہ	۱۴۶۳ء/۸۶۷ھ تا ۱۴۸۲ء/۸۸۷ھ
(۱۴) محمود شاہ دوم	۱۴۸۲ء/۸۸۷ھ تا ۱۵۱۸ء/۹۲۴ھ
(۱۵) احمد شاہ دوم	۱۵۱۸ء/۹۲۴ھ تا ۱۵۲۰ء/۹۲۷ھ
(۱۶) علاء الدین شاہ سوم	۱۵۲۰ء/۹۲۷ھ تا ۱۵۲۲ء/۹۲۸ھ
(۱۷) ولی اللہ	۱۵۲۲ء/۹۲۸ھ تا ۱۵۲۵ء/۹۳۱ھ
(۱۸) کلیم اللہ	۱۵۲۵ء/۹۳۱ھ تا ۱۵۲۷ء/۹۳۴ھ

بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین

(۱۴۸۹ء/۸۹۵ھ تا ۱۶۸۵ء/۱۰۹۷ھ)

(۱) یوسف عادل شاہ	۱۴۸۹ء/۸۹۵ھ تا ۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ
(۲) اسمٰعیل عادل شاہ	۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ تا ۱۹۳۴ء/۹۴۱ھ
(۳) ابراہیم عادل شاہ	۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ تا ۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ
(۴) علی عادل شاہ اول	۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ تا ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ
(۵) ابراہیم عادل شاہ ثانی	۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ تا ۱۶۲۸ء/۱۳۰۸ھ
(۶) محمد عادل شاہ	۱۶۲۸ء/۱۰۳۸ھ تا ۱۶۵۶ء/۱۰۶۷ھ
(۷) علی عادل شاہ ثانی	۱۶۵۶ء/۱۰۶۷ھ تا ۱۶۷۱ء/۱۰۸۲ھ

(۸) سکندر عادل شاہ ۱۶۷۱ء/۱۰۸۲ھ تا ۱۶۸۵ء/۱۰۹۷ھ

نظام شاہی سلاطین

(۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ تا ۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ)

(۱) احمد نظام شاہ ۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ تا ۱۵۰۸ء/۹۱۴ھ

(۲) برہان نظام شاہ ۱۵۰۸ء/۹۱۴ھ تا ۱۵۵۳ء/۹۶۱ھ

(۳) حسین نظام شاہ ۱۵۵۳ء/۹۶۱ھ تا ۱۵۶۵ء/۹۷۲ھ

(۴) مرتضیٰ نظام شاہ ۱۵۶۵ء/۹۷۲ھ تا ۱۵۸۸ء/۹۹۶ھ

(۵) میراں حسین نظام شاہ ۱۵۸۸ء/۹۹۶ھ تا ۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ

(۶) اسمٰعیل نظام شاہ ۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ تا ۱۵۹۰ء/۹۹۹ھ

(۷) برہان نظام شاہ دوم ۱۵۹۰ء/۹۹۹ھ تا ۱۵۹۴ء/۱۰۰۳ھ

(۸) ابراہیم نظام شاہ ۱۵۹۴ء/۱۰۰۳ء تا ۱۵۹۵ء/۱۰۰۴ھ

(۹) بہادر نظام شاہ ۱۵۹۵ء/۱۰۰۴ھ تا ۱۵۹۶ء/۱۰۰۵ھ

(۱۰) احمد غاصب ۱۵۹۶ء/۱۰۰۵ھ تا ۱۶۰۳ء/۱۰۱۲ھ

(۱۱) مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۶۰۳ء/۱۰۱۲ھ تا ۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ

(۱۲) حسین نظام شاہ دوم ۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ تا ۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ

گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین

(۱۵۱۸ء/۹۲۴ھ تا ۱۶۸۶ء/۱۰۹۸ھ)

(۱) سلطان قلی قطب شاہ ۱۵۱۸ء/۹۲۴ھ تا ۱۵۴۳ء/۹۵۰ھ

(۲) جمشید قلی قطب شاہ ۱۵۴۳ء/۹۵۰ھ تا ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ

(۳) سبحان قلی قطب شاہ ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ

(۴) ابراہیم قلی قطب شاہ ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ تا ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ

(۵) محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ تا ۱۶۱۱ء/۱۰۲۰ھ

(۶) محمد قطب شاہ	۱۶۱۱ء/۱۰۲۰ھ تا ۱۶۲۵ء/۱۰۳۵ھ
(۷) عبداللہ قطب شاہ	۱۶۲۵ء/۱۰۳۵ھ تا ۱۶۷۲ء/۱۰۸۴ھ
(۸) ابوالحسن تاناشاہ	۱۶۷۲ء/۱۰۸۴ھ تا ۱۶۸۶ء/۱۰۹۸ھ

(۳) بنگال

(۱۳۳۸ء تا ۱۵۷۶ء)

بنگال محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۸ء میں سلطنت دہلی سے آزاد ہوگیا تھا۔شروع میں یہاں کے تین صوبے داروں نے تین حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ یہ حکومتیں مشرقی بنگال، شمالی بنگال اور مغربی بنگال پر مشتمل تھیں۔مشرقی بنگال کی حکومت کا بانی فخرالدین مبارک شاہ (۱۳۳۸ء/ ۷۳۹ھ تا ۱۳۵۰ء/۷۵۱ھ) تھا۔ابن بطوطہ اسی کے زمانے میں بنگال آیا تھااور مشرقی بنگال کے دارالحکومت سنارگاؤں اور سہلٹ تک گیا تھا۔سنارگاؤں ڈھاکہ کے قریب واقع تھا۔ابن بطوطہ نے بنگال کی زرخیزی اور ارزانی کی بہت تعریف کی ہے۔اور لکھا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک بنگال کے برابر سستانہیں۔فخرالدین مبارک شاہ کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ وہ بڑا فاضل بادشاہ ہےاور پردیسیوں اور صوفیوں سے محبت رکھتا ہے۔

الیاس شاہی خاندان (۱۳۴۳ء تا ۱۴۸۷ء)

۱۳۴۳ء میں شمس الدین الیاس شاہ نے شمالی اور مغربی بنگال کی حکومتوں کو متحد کردیا اور فخرالدین مبارک شاہ کے بعد مشرقی بنگال پر بھی قبضہ کرلیا۔الیاس شاہی خاندان نے جس کی بنیاد شمس الدین الیاس شاہ نے ڈالی تھی ۱۴۱۴ء تا ۱۴۴۲ء کے درمیان ایک مختصر سے وقفے کے سوا جب کہ ایک مقامی ہندو راجہ گنیش، اس کا نومسلم بیٹا جادو، سلطان جلال الدین کے نام سے تخت بنگال پر قابض ہوگئے تھے، ۱۴۸۷ء تک بنگال پر حکومت کی۔شمس الدین الیاس شاہ کے بیٹے سکندر شاہ کے زمانے میں فیروز تغلق نے دو مرتبہ بنگال پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔آخر میں فیروز اور سکندر میں تصفیہ ہوگیا جس کے تحت بنگال نے دہلی کی بالادستی اور دہلی کی حکومت نے بنگال کی خود مختار حیثیت تسلیم کرلی۔

الیاس شاہی خاندان میں سکندر کے بیٹے غیاث الدین اعظم شاہ (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۹ء) کو بنگال کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک عادل اور سرپرست علوم وفنون حکمران تھا۔ اس نے حافظ شیرازی کو بنگال بلانے کی کوشش کی تھی۔ الیاس شاہی خاندان کے حکمران رکن الدین باربک شاہ کو حبشیوں کو جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور اس کی فوج اور محل میں تقریباً آٹھ ہزار حبشی ملازم تھے۔ ان حبشیوں نے باربک شاہ کے جانشینوں کے زمانے میں اتنا زور پکڑا کہ ۱۴۸۷ء میں بنگال کی حکومت پر قبضہ کر کے الیاس شاہی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ حبشیوں کی یہ حکومت ۱۴۸۷ء سے ۱۴۹۲ء تک رہی۔ اس کے بعد ان کا ایک وزیر سید حسین حبشیوں کو بے دخل کر کے علاء الدین حسین شاہ کے نام سے بادشاہ ہو گیا اور حسین شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی جس کا دور بنگال کی تاریخ کا عہد زرین کہلاتا ہے۔

حسین شاہی خاندان (۱۴۹۳ء تا ۱۵۳۸ء)

علاء الدین حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) اور اس کے بیٹے نصرت شاہ (۱۵۱۹ء تا ۱۵۳۳ء) کا زمانہ بنگال کے سیاسی عروج اور تمدنی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں بہار، اڑیسہ اور آسام کا ایک حصہ بھی بنگال کی حکومت کے تحت آ گیا تھا۔ لکھنوتی جس کا دوسرا نام گور ہے بنگال کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر اور دوسرے مقامات پر مساجد اور دوسری شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جو بنگال کے طرز تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ علماء کی سرپرستی کی گئی اور رفاہِ عام کے کام انجام دیئے گئے۔

ایک چینی سیاح نے اس زمانے کے بنگال کے متعلق لکھا ہے کہ ''یہاں کی پیداوار وافر اور باشندے بے شمار ہیں۔ باشندے مسلمان ہیں اور اپنے معاملات میں راستباز اور فراخ دل ہیں'' نصرت شاہ کے حکم پر سنسکرت کی مشہور رزمیہ داستان 'مہابھارت' کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے زمانے میں بنگالی زبان میں پہلی مرتبہ کتابیں لکھی گئیں۔ حسین شاہ اور نصرت شاہ نے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، چنانچہ اس دور کا ایک ہندو شاعر لکھتا ہے کہ: ''نصرت شاہ کا باپ ایک عظیم بادشاہ تھا اور ملک پر ایک دوسرے رام کی طرح حکومت کرتا تھا''

۱۵۳۸ء میں بنگال پر شیر شاہ سوری نے قبضہ کر لیا۔ سوری خاندان کی یہ حکومت ۱۵۵۵ء/ ۹۶۲ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد کرائی پٹھان بنگال پر قابض ہو گئے جن سے ۱۵۷۶ء میں اکبر

نے بنگال چھین لیا اور اس کو دہلی کی تیموری سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔

سلاطین بنگال

(۱) الیاس شاہی خاندان (۱۳۴۲ء/۷۴۲ھ تا ۱۴۸۷ء/۸۹۲ھ)

(۱) حاجی شمس الدین الیاس شاہ ۱۳۴۲ء/۷۴۲ھ تا ۱۳۵۷ء/۷۵۹ھ

(۲) سکندر شاہ ۱۳۵۷ء/۷۵۹ھ تا ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ

(۳) غیاث الدین اعظم شاہ ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ تا ۱۴۰۹ء/۸۱۲ھ

(۴) سلطان السلاطین ۱۴۰۹ء/۸۱۲ھ تا ــــ

(۵) سلطان شمس الدین ــــ تا ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ

---

(۱) راجہ گنیش ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ

(۲) جادو (سلطان جلال الدین ابن گنیش) ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ تا ۱۴۳۱ء/۸۳۵ھ

(۳) شمس الدین احمد ابن جلال الدین ۱۴۳۱ء/۸۳۵ھ تا ۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ

---

(۶) ناصر الدین محمود شاہ ۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ تا ۱۴۶۰ء/۸۶۵ھ

(۷) رکن الدین باربک شاہ ۱۴۶۰ء/۸۶۵ھ تا ۱۴۷۴ء/۸۷۹ھ

(۸) شمس الدین فیروز ۱۴۷۴ء/۸۷۹ھ تا ۱۴۸۱ء/۸۸۶ھ

(۹) جلال الدین فتح ۱۴۸۱ء/۸۸۶ھ تا ۱۴۸۷ء/۸۹۲ھ

حبشیوں کی حکومت

(۱۴۸۷ء/۸۹۲ھ تا ۱۴۹۳ء/۸۹۸ھ)

(۲) حسین شاہی خاندان (۱۴۹۳ء/۸۹۸ھ تا ۱۵۳۸ء/۹۴۵ھ)

(۱) علاء الدین حسین شاہ ۱۴۹۳ء/۸۹۸ھ تا ۱۵۱۹ء/۹۲۵ھ

(۲) نصرت شاہ	۱۵۱۹ء/۵۹۲۵ھ تا ۱۵۳۲ء/۹۳۹ھ
(۳) علاء الدین فیروز	۱۵۳۲ء/۹۳۹ھ تا ۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ
(۴) غیاث الدین محمود	۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ تا ۱۵۳۸ء/۹۴۵ء

(۴) سندھ (۱۳۳۶ء تا ۱۵۹۱ء)

سندھ کا علاقہ عربوں ہی کے زمانہ میں اسلامی خلافت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ خلافت کے زوال کے بعد یہاں مقامی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں بعض مسلمان تھیں اور بعض غیر مسلم۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کے زمانہ میں سندھ غزنی کی حکومت کے زیر اثر رہا اور جب قطب الدین ایبک نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی تو سندھ لاہور کی مرکزی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا۔

ناصر الدین قباچہ

قطب الدین کے بعد ایک غلام ناصر الدین قباچہ نے جو سندھ کا صوبہ دار تھا یہاں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ قباچہ کی سلطنت ملتان اور اوچہ (بہاولپور) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اوچہ کا شہر اس کا دارالحکومت تھا۔ قباچہ (۱۲۱۰ء تا ۱۲۲۸ء) نے سترہ سال حکومت کی۔ وہ علم وادب کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ کے ایک مشہور مصنف عوفی نے اس کے وزیر کے نام پر جوامع الحکایات کے نام سے ایک دلچسپ کتاب فارسی زبان میں لکھی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس میں ایسے تاریخی واقعات قصے کہانیوں کی شکل میں جمع کردیئے گئے ہیں جو بہادری، سخاوت، بادشاہوں کی عقلمندی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ عوفی نے فارسی زبان کے شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔

اس زمانہ میں چچ نامہ کے نام سے سندھ کی ایک تاریخ لکھی گئی۔ سندھ کی یہ سب سے قدیم تاریخ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

قباچہ نے اوچہ میں ایک شاندار مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ میں اس زمانہ کے ایک مشہور عالم قاضی منہاج سراج تعلیم دیا کرتے تھے۔ قاضی منہاج بعد میں دلی چلے گئے اور وہاں ناصر الدین محمود کے زمانہ میں دلی کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی جس کا نام 'طبقات ناصری' ہے۔

قباچہ کی حکومت کو التتمش نے ختم کردیا۔ اس کے بعد سندھ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ جب سلطنت دہلی کو زوال ہوا تو سندھ میں پھر ایک بار آزاد حکومت قائم ہوگئی۔ یہ آزاد

حکومت جو سُمہ راجپوتوں کی تھی تقریباً ڈھائی سو سال (۱۳۳۶ء تا ۱۵۹۱ء تک قائم رہی۔ ٹھٹہ کا شہر سندھ کا دارالحکومت تھا۔ لیکن اب ملتان کا علاقہ سندھ کی حکومت کے تحت نہیں رہا۔ وہاں بھی ایک حکومت قائم ہوگئی تھی۔

سُمہ خاندان میں کئی اچھے بادشاہ ہوئے لیکن ان میں جام نظام الدین (۱۴۶۱ء تا ۱۵۱۹ء) سب سے مشہور اور نیک بادشاہ ہوا ہے۔ اس کو عدل وانصاف کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اور اس کے زمانہ میں رعایا امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ بڑا خلیق تھا۔ اس نے ملک کو رہزنوں سے پاک کیا۔ علماء، صلحاء، فقراء فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فوج مطمئن اور رعایا خوشحال تھی۔

جام نظام الدین کسی مسلمان علاقہ پر حملہ کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے عہد میں سنت نبوی کا رواج ایسا ہوا کہ حیرت ہوتی ہے۔ لوگ نماز باجماعت پڑھتے تھے، اگر کبھی جماعت قضا ہو جاتی تھی تو شرمندہ ہوتے تھے۔

وہ اکثر علمی مباحثوں میں مشغول رہتا تھا۔ علامہ دوانی نے جو ایران کے مشہور عالم تھے جام نظام الدین کی علمی سرپرستی کا حال سن کر شیراز سے سندھ آنا چاہا، جام نظام الدین نے زادِ راہ بھیجوایا مگر اس دوران میں مولانا جلال الدین دوانی کا انتقال ہوگیا۔ جام نظام الدین کے زمانے میں ایران سے کئی علماء سندھ آئے۔

جام نظام الدین کے بیٹے جام فیروز (۱۵۰۹ء/۹۱۵ھ تا ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ) کے دور میں قندھار کے حکمران شاہ بیگ ارغون نے جام فیروز کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کرلیا اور سُمہ خاندان کی حکومت ختم کردی۔ سُمہ حکمرانوں کا لقب جام تھا۔

سندھ پر خاندان ارغون کی حکومت ۱۵۲۰ء سے ۱۵۵۶ء تک رہی۔ اس کے بعد ترخان خاندان کی حکومت قائم ہوگئی جو ۱۵۹۱ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد سندھ پر اکبر کا قبضہ ہوگیا۔

سُمہ خاندان نے ۱۳۳۶ء/۷۳۷ھ سے ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ تک سندھ پر حکومت کی۔ اس دوران میں حسب ذیل تیرہ حکمران ہوئے جو سب جام کہلاتے تھے: جام عمر، جام جونا، جام بانبیہ، جام تماچی، جام صلاح الدین، جام علی شیر، جام کرن، جام فتح خان، جام تغلق، جام سکندر، جام سنجر، جام نظام الدین (۱۴۶۱ء/۸۶۶ھ تا ۱۵۰۹ء/۹۱۵ھ) اور جام فیروز (۱۵۰۹ء/۹۱۵ھ تا ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ)

فیروز تغلق جام جونا اور جام بانبیہ کو دہلی لے گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جام تماچی کو سندھ

میں والی مقرر کر دیا، لیکن فیروز کے انتقال کے بعد سندھ دہلی کے اثر سے آزاد ہو گیا۔

ارغون خاندان میں شاہ بیگ ارغون (۱۵۲۰ء تا ۱۵۲۴ء) اور مرزا حسین ارغون (۱۵۲۴ء تا ۱۵۵۶ء) صرف دو حکمران ہوئے۔

خاندان ترخان میں تین حکمران ہوئے: مرزا محمد عیسیٰ ترخان (۱۵۵۶ء تا ۱۵۶۷ء)، مرزا محمد باقی ترخان (۱۵۶۷ء تا ۱۵۸۵ء) اور مرزا جانی بیگ ترخان (۱۵۸۵ء تا ۱۵۹۱ء) اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں نے جانی بیگ کے زمانہ میں سندھ فتح کیا تھا۔

(۵) ملتان

(۱۴۳۸ء تا ۱۵۲۷ء)

مغربی پاکستان کی آزاد حکومتوں میں ایک ملتان کی حکومت بھی تھی۔ ملتان پاکستان میں مسلمانوں کا بہت پرانا مرکز ہے۔ سندھ کی طرح ملتان میں بھی محمد بن قاسم کے زمانہ ہی سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ سلاطین دہلی کے زمانہ میں اس شہر نے بڑا عروج حاصل کیا۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کی اور دوسری طرف غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی۔ ملتان کے بزرگوں میں حضرت بہاء الدین زکریا اور حضرت رکن عالم بہت مشہور ہیں۔ مشہور شاعر اور مصنف حضرت امیر خسرو بھی کئی سال اس شہر میں رہے۔ ملتان کی تعریف میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

ملتان ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ مے کنند

یعنی ہمارا ملتان عزت میں جنت کے برابر ہے۔ یہاں آہستہ پاؤں رکھو کہ یہاں زمین پر فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔

ملتان اس زمانہ میں بہت بڑی چھاؤنی بھی تھا۔ منگولوں کے حملوں کو یہاں سے روکا جاتا تھا۔ بلبن کا لڑکا سلطان محمد کئی سال تک یہاں حاکم رہا اور منگولوں کے حملوں کو روکتا رہا۔ یہ شہزادہ بڑا قابل اور نیک طبیعت تھا۔ وہ ملتان کو دہلی کی طرح علمی مرکز بنا دینا چاہتا تھا۔ امیر خسرو کو اسی نے ملتان بلایا تھا اور ایران سے شیخ سعدی کو بھی ملتان بلانا چاہتا تھا لیکن وہ بڑھاپے کی وجہ سے نہیں

آ سکے۔ یہ اچھا شہزادہ تھا جو پاکستان اور بھارت کو منگولوں کی غارتگری سے کئی سال تک بچاتا رہا اور جس نے عالموں اور ادیبوں کی سرپرستی کی، ایک جنگ میں منگول فوج کو شکست دینے کے بعد نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک دو ہزار منگولوں نے جو کہیں چھپے ہوئے تھے نکل کر حملہ کر دیا۔ محمد سلطان کے ایک تیر لگا اور وہ شہید ہو گیا۔ اسی وجہ سے اسے سلطان شہید بھی کہا جاتا ہے۔

ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ملتان کے صوبہ دار شیر خاں نے بھی منگولوں کے خلاف لڑائیوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے چالیس مرتبہ منگولوں کو شکست دی۔

ملتان کے حاکموں میں غیاث الدین تغلق بھی بہت مشہور ہے۔ وہ دہلی کا بادشاہ بننے سے پہلے جب ملتان کا صوبہ دار تھا تو اس نے منگولوں کے خلاف انتیس لڑائیاں لڑیں۔ اور سب میں کامیاب رہا۔ اس کے نام سے منگول اتنا ڈرتے تھے کہ مقابلہ پر نہیں آتے تھے اور غیاث الدین غزنی اور ہرات تک جا کر ان پر حملے کرتا تھا۔

حسین لنگاہ

دہلی کی سلطنت کے زوال کے بعد یہاں تقریباً نوے سال آزاد حکومت قائم رہی۔ اس حکومت کا سب سے مشہور حکمران شاہ حسین لنگاہ (۸۷۴ھ تا ۹۰۴ھ) ہوا ہے۔ اس نے تیس برس تک کامیابی سے حکومت کی۔ وہ اہل علم وفضل کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ کا ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ شاہ حسین نے ایک مرتبہ اپنا ایک سفیر اس لیے گجرات بھیجا کہ وہ وہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر آئے تاکہ ملتان میں بھی ویسی ہی عمارتیں بنائی جائیں۔ جب یہ سفیر واپس آیا تو اس نے کہا کہ ''احمد آباد کی عمارتوں کی تعریف میں زبان گونگی ہے اگر تمام مملکت ملتانی کا محصول ایک سال تک صرف کیا جائے تو شاید ہی وہاں جیسی عمارت تیار ہو۔ بادشاہ کو یہ سن کر بڑا رنج ہوا اور اس نے کہا:

''میں بادشاہ کہلاتا ہوں قیامت کے دن بادشاہوں کے ساتھ حشر ہوگا، لیکن بادشاہوں جیسے کام کرنے سے عاجز ہوں'' اس پر اس کے وزیر نے کہا ''افسوس کی کوئی بات نہیں۔ ہر ملک کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ گجرات کا ملک زرخیز ہے لیکن ملتان مردم خیز ہے اور یہاں کے بزرگ جہاں جاتے ہیں وہاں ان کی عزت ہوتی ہے'' وزیر نے اس سلسلہ میں بہاء الدین زکریا ملتانی اور

دوسرے بزرگوں کا نام بھی لیا۔

جب بادشاہ نے وزیر کی یہ باتیں سنیں تو اُس کا رنج دُور ہوگیا۔

حسین لنگاہ کے بعد ملتان کی حکومت کمزور ہوگئی اور ۱۵۲۷ء میں مغل حکمران بابر کا اس پر قبضہ ہوگیا۔ ملتان کی حکومت پہلی آزاد حکومت تھی جو دہلی کی مغل سلطنت میں شامل ہوئی۔

(۶) گجرات

(۱۳۹۶ء/۷۹۸ھ تا ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ)

گجرات میں مسلمان سب سے پہلے محمود غزنوی کے زمانہ میں داخل ہوئے اس کے بعد شہاب الدین غوری کے زمانہ میں کئی حملے کیے، لیکن فتح نہ کر سکے۔ گجرات کو سب سے پہلے ۱۲۹۷ء میں علاء الدین خلجی نے فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں شامل کیا۔ اس کے بعد ایک سو چار سال تک گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ تیمور کے حملہ کے بعد جب سلطنت دہلی کمزور ہوگئی تو ۱۴۰۱ء میں یہاں کے صوبہ دار نے ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت ایک سو سترہ سال قائم رہی۔

احمد آباد

گجرات بڑا زرخیز اور آباد صوبہ تھا۔ یہاں پونے دو سو سال کے عرصہ میں کئی بادشاہ ہوئے جنھوں نے ملک کو بڑی ترقی دی۔ ان میں ایک احمد شاہ (۱۴۱۱ء تا ۱۴۴۱ء) تھا۔ احمد آباد کا مشہور شہر اسی نے آباد کیا۔ اس زمانہ میں احمد آباد میں ۳۰۰ محلے تھے اور ہر محلہ میں ایک مسجد اور ایک بازار تھا۔ اس شہر کے بازار اتنے کشادہ تھے کہ دس گاڑیاں ایک ساتھ گزر سکتی تھیں۔ اور عمارتیں زیادہ تر اینٹوں اور چونے کی تھیں۔ جب شہر بن گیا تو بادشاہ نے شہر کے مکان اور دوکانیں لوگوں کو بغیر کسی معاوضہ کے دے دیں۔ احمد آباد اس وقت سے آج تک گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔

احمد شاہ نے گجرات کی حکومت کو بڑی وسعت دی۔ جونا گڑھ اور سورت فتح کیے۔ وہ جب کوئی علاقہ فتح کرتا تھا تو ہر شہر میں ایک مسجد ایک سرائے اور ایک مدرسہ تعمیر کرتا تھا۔

احمد شاہ کے عدل و انصاف کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے۔ اس کے داماد نے ایک آدمی کو بغیر کسی قصور کے قتل کر دیا، لیکن جب احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے داماد کو قتل کے جرم میں سولی دے دی۔ جب اس سے کہا گیا آپ خوبہا دے سکتے تھے تو اس نے کہا "اس طرح رعایا کے خون کو امراء اور شہزادے جائز سمجھ لیں گے۔ اپنے خزانوں سے خوبہا دیتے رہیں گے اور خون کرتے رہیں گے۔ شریعت کا منشاء یہ نہیں ہے"

محمود بیگڑہ

احمد شاہ اگرچہ بہت اچھا بادشاہ تھا لیکن گجرات کا سب سے مشہور بادشاہ محمود بیگڑہ (۱۴۵۸ء تا ۱۵۱۱ء) ہوا ہے۔ اس نے ۵۲ سال حکومت کی اور اپنے زمانہ حکومت میں گجرات کے ساحلوں سے بحری قزاقوں کا خاتمہ کر دیا اور کئی شہر آباد کیے محمود بیگڑہ نے بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ کسی پر ظلم نہ ہونے دیا۔ وہ اسلام کا پابند تھا۔ حیادار اتنا تھا کہ نامحرم عورتوں کے سامنے پاؤں بھی ڈھک لیتا تھا۔ وعدہ کا پابند تھا۔ اس کی شہرت یورپ تک ہو گئی تھی اور دہلی کے بادشاہ سکندر لودھی نے اس کو تحفے بھیجے۔

محمود بیگڑہ مسلمان حکومتوں سے لڑنا اچھا کام نہیں سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ جب مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کا انتقال ہوا تو امراء نے مالوہ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن محمود بیگڑہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ: "اسلام میں یہ جائز نہیں ہے کہ مسلمان مسلمان سے لڑیں اور ایک ہمسایہ ملک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر چڑھ دوڑے"

اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے کہا "ہماری ماں سندھ کی رہنے والی ہے اور ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے ننھیال پر حملہ آور ہوں"

محمود بیگڑہ نے مسافروں کے آرام کے لیے سرائیں، طلباء کے لیے مدرسے اور مسلمانوں کے لیے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کا دربار علماء فضلاء سے بھرا رہتا تھا۔

محمود بیگڑہ کشمیر کے زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۲ء)، سندھ کے جام نظام الدین (۱۴۶۰ء تا ۱۵۰۹ء)، بنگال کے حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) اور بہمنی سلطنت کے محمود گاوان (متوفی ۱۴۸۱ء) کا ہمعصر تھا، اور اپنی صلاحیت اور قابلیت میں کسی سے کم نہیں تھا۔ اسی زمانہ میں

دہلی میں سکندر لودھی اور قسطنطنیہ میں محمد فاتح اور ہرات میں سلطان حسین بائیقرا حکمران تھے۔

گجرات پر ۱۵۷۳ء میں مغلوں نے قبضہ کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

سلاطین گجرات

(۱) مظفر شاہ	۱۳۹۶ء/۷۹۸ھ تا ۱۴۱۱ء/۸۱۴ھ
(۲) احمد شاہ اول	۱۴۱۱ء/۸۱۴ھ تا ۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ
(۳) محمد شاہ اول	۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ تا ۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ
(۴) قطب الدین	۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ تا ۱۴۵۸ء/۶۶۳ھ
(۵) داؤد شاہ	۱۴۵۸ء/۶۶۳ھ تا ۱۴۵۸ء/۶۶۳ھ
(۶) محمود شاہ بیگڑہ	۱۴۵۸ء/۶۶۳ھ تا ۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ
(۷) مظفر شاہ ثانی	۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ تا ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ جمادی الاول
(۸) سکندر شاہ	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ
(۹) سلطان محمود شاہ دوم	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ
(۱۰) بہادر شاہ	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۵۳۷ء/۹۴۳ھ ۳۔رمضان
(۱۱) محمد شاہ ثانی	۱۵۳۷ء/۹۴۳ھ تا ۱۵۳۷ء/۹۴۳ھ
(۱۲) محمود شاہ سوم	۱۵۳۷ء/۹۴۳ھ تا ۱۵۵۴ء
(۱۳) احمد شاہ ثانی	۱۵۵۴ء تا ۱۵۶۲ء/۹۶۹ھ
(۱۴) مظفر شاہ ثالث	۱۵۶۲ء/۹۶۹ھ تا ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ

(۷) مالوہ

(۱۳۹۲ء/۷۹۴ھ تا ۱۵۳۱ء/۹۳۷ھ)

ہندوستان میں دریائے نربدا کے شمال، راجپوتانہ کے جنوب اور گجرات کے مغرب میں جو علاقہ ہے وہ مالوہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے اور بھوپال، اجین اور اندور یہاں کے مشہور شہر ہیں۔

مالوہ ۱۳۱۰ء میں علاء الدین خلجی کے زمانہ میں سلطنت دہلی میں شامل ہوا تھا۔ نوّے سال بعد ۱۴۰۱ء میں یہاں کے صوبہ دار نے آزاد حکومت قائم کر لی جو ۱۵۳۱ء تک قائم رہی۔ اس ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں مالوہ نے بڑی ترقی کی اور اس کا دارالحکومت مانڈو اپنی شان و شوکت میں برکو چک کے بہترین شہروں میں سے ہو گیا۔

محمود خلجی

مالوہ کے بادشاہوں میں محمود خلجی (۱۴۳۶ء تا ۱۴۶۹ء) بڑا نامور ہوا ہے۔ اس کے زمانہ میں مالوہ کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہوشنگ آباد، اجین، مانڈو اور چندیری اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ محمود خلجی بڑا اچھا سپہ سالار تھا اس نے اس کی کوشش کی کہ پورا ملک فتح کر لے۔ اس کوشش میں اس نے گجرات دکن اور دہلی تک حملے کیے۔ لیکن چونکہ یہ سب حکومتیں طاقتور تھیں اس لیے قابض نہ ہو سکا۔

محمود خلجی کی تمام عمر اگرچہ لڑائیوں میں کٹی لیکن اس کا عہد امن وامان اور خوشحالی میں بھی مالوہ کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ وہ خود بڑا مصنف اور رعایا پرور تھا۔ اس نے اہل علم کو بڑے بڑے معاوضے دے کر مالوہ بلایا اور جگہ جگہ مدرسے قائم کیے جن کی وجہ سے ایک مورخ نے لکھا ہے کہ مالوہ اس کے زمانہ میں شیراز اور سمرقند کا حریف ہو گیا۔ اس نے مالوہ میں لنگر خانے کھول رکھے تھے جن سے غریبوں کو کھانا ملتا تھا۔ اس کے عہد میں تین سو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ جن میں مانڈو کی جامع مسجد بڑی شاندار ہے۔ اس نے ایسا اچھا انتظام کیا کہ مملکت سے چوری کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر کبھی کسی تاجر کا مال چوری ہو جاتا تو تاجر کو فوراً اپنے خزانہ سے معاوضہ دلواتا، بعد میں اس علاقہ کے نگہبانوں سے جہاں مال چوری ہوتا وہ رقم وصول کر لیتا۔ آدمی تو آدمی اس کے عہد میں درندے بھی انسانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مالوہ کا علاقہ گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا ہے اور وہاں شیر، چیتے اور دوسرے درندوں کی کثرت ہے۔ ایک دن کسی درندہ نے ایک مسافر کو مار ڈالا۔ سلطان نے اس کی ماں کی شکایت پر جنگل کے درندوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانہ میں مالوہ سے درندے ختم کر دیئے گئے تھے۔

محمود خلجی نے ایک شفاخانہ بھی بنایا تھا جس میں ہر قسم کے امراض کے لیے الگ الگ مکان

تھے۔ شفاخانہ میں کئی باغ تھے اور ایک پاگل خانہ بھی تھا۔ محمود خلجی گجرات کے محمود بیگڑہ کا ہمعصر تھا۔ اس کے انتقال کے ۶۲ سال بعد ۱۵۳۱ء میں مالوہ پر گجرات کا قبضہ ہو گیا۔

سلاطین مالوہ

(۱۳۹۲ء/۷۹۴ھ تا ۱۵۳۱ء/۹۳۷ھ)

(۱) غوری خاندان (۱۳۹۲ء/۷۹۴ھ تا ۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ)

(۱) دلاور خاں غوری	۱۳۹۲ء/۷۹۴ھ تا ۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ
(۲) ہوشنگ شاہ	۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ تا ۱۴۳۵ء/۸۳۸ھ
(۳) محمد شاہ	۱۴۳۵ء/۸۳۸ھ تا ۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ
(۴) مسعود	۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ

(۲) خلجی خاندان

(۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ تا ۱۵۳۱ء/۹۳۷ھ)

(۱) محمود خلجی اول	۱۴۳۶ء/۸۳۹ھ تا ۱۴۶۹ء/۸۷۳ھ
(۲) غیاث الدین خلجی	۱۴۶۹ء/۸۷۳ھ تا ۱۵۰۰ء/۹۰۵ھ
(۳) ناصر الدین	۱۵۰۰ء/۹۰۵ھ تا ۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ
(۴) محمود ثانی	۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ تا ۱۵۳۱ء/۹۳۷ھ

۱۵۳۱ء/۹۳۷ھ میں مالوہ پر بہادر شاہ گجراتی کا قبضہ ہو گیا جو ۹۴۱ھ تک جاری رہا۔ اس کے بعد مالوہ نے چند سال کے بعد پھر خود مختاری حاصل کر لی۔ ۹۴۹ھ میں شیر شاہ نے مالوہ کو دہلی کی سوری سلطنت میں شامل کر لیا۔ سوریوں کے زوال کے بعد ۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ میں مالوہ کا سوری حاکم شجاع خاں خود مختار ہو گیا۔ اس کے لڑکے باز بہادر کے زمانے میں ۱۵۶۰ء/۹۶۸ھ میں اکبر نے مالوہ کو سلطنت تیموریہ میں شامل کر لیا۔

(۸) جونپور

(۱۳۹۴ء/۷۹۶ھ تا ۱۴۷۶ء/۸۸۱ھ)

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں جو شہر تعمیر کیے گئے ان میں جونپور نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس شہر کی بنیاد ۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ میں ڈالی گئی تھی۔ جونپور کی آزاد ریاست کا بانی ملک سرور (۱۳۹۴ء/۷۹۶ھ تا ۱۳۹۹ء/۸۰۲ھ) تھا جسے محمود تغلق نے اودھ سے بہار تک مشرقی صوبوں کا حاکم مقرر کیا تھا اور ملک الشرق کا خطاب دیا تھا۔ تیمور کے حملے کے بعد دوسرے صوبے داروں کی طرح اس نے بھی دہلی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ جونپور کی حکومت کو سلطنت شرقی بھی کہتے ہیں۔

سلاطین جونپور میں سب سے مشہور ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۲ء/۸۰۴ھ تا ۱۴۳۶ء/۸۴۰ھ) ہوا ہے۔ اس کے عہد میں جونپور کی ریاست دریائے جمنا کے کنارے سے بنگال کی حد تک پھیل گئی تھی۔ ابراہیم شرقی علم و ادب کا بھی بڑا سرپرست تھا۔ جب تیمور کے حملے کے بعد دہلی اجڑ گئی تو وہاں کے بہت سے علماء اور ادیبوں نے جونپور کا رخ کیا اور ابراہم شرقی نے ان کے وظیفے مقرر کیے۔ سلاطین شرقی کی علمی سرپرستی کی وجہ سے جونپور جلد بہت بڑا علمی مرکز بن گیا۔ اس کی یہ علمی مرکزیت تین سو سال تک قائم رہی اور تیموری شہنشاہ شاہجہاں جونپور کو شیراز ہند کہا کرتا تھا۔ مشہور حکمران شیر شاہ نے اسی شہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ شرقی سلطنت کے زمانے میں یہاں کے سب سے ممتاز عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۱۴۴۵ء تھے۔ ابراہیم شرقی ان کا بے حد ادب اور احترام کرتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

ابرہیم شرقی نے جونپور کو کئی خوبصورت عمارتوں سے بھی آراستہ کیا۔ ان میں اٹالا مسجد بہت مشہور ہے اور اسلامی ہند کی خوبصورت عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

حسین شاہ شرقی اس سلطنت کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں ۱۴۷۶ء میں بہلول لودھی نے جونپور پر قبضہ کر کے سلاطین شرقی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ حسین شاہ شرقی موسیقی کا ماہر تھا اور اس فن میں اس نے اضافے کیے ہیں۔

سلاطین شرقی (جونپور)

(۱۳۹۴ء/۷۹۶ھ تا ۱۴۷۶ء/۸۸۱ھ)

(۱) ملک سرور خواجہ جہاں	۱۳۹۴ء/۷۹۶ھ تا ۱۳۹۹ء/۸۰۲ھ
(۲) مبارک شاہ شرقی	۱۳۹۹ء/۸۰۲ھ تا ۱۴۰۲ء/۸۰۴ھ
(۳) ابراہیم شاہ شرقی	۱۴۰۲ء/۸۰۴ھ تا ۱۴۳۶ء/۸۴۰ھ
(۴) محمود شاہ شرقی	۱۴۳۶ء/۸۴۰ھ تا ۱۴۵۸ء/۸۶۲ھ
(۵) محمد شاہ شرقی	۱۴۵۸ء/۸۶۲ھ تا ۱۴۵۸ء/۸۶۲ھ
(۶) حسین شاہ شرقی	۱۴۵۸ء/۸۶۲ھ تا ۱۴۷۶ء/۸۸۱ھ

(۹) لودھی سلطنت

(۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ تا ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ)

ہم سلطنت دہلی کے حال میں پڑھ چکے ہیں کہ ۱۴۱۲ء میں سلطان محمود تغلق کے انتقال کے بعد دہلی میں کئی سال تک ہنگامے رہے اور سیدوں کا خاندان مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ لیکن ۱۴۵۱ء میں لاہور اور سرہند کے پٹھان صوبے دار بہلول لودھی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء) نے دہلی پر قبضہ کر کے ایک بار پھر مضبوط حکومت قائم کر دی۔ اس نے جونپور بھی فتح کرلیا جہاں ایک آزاد حکومت قائم ہوگئی تھی۔

دہلی کی یہ لودھی سلطنت اگرچہ جونپور سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن دہلی کی مرکزی حکومت کے مقابلہ میں بہت چھوٹی تھی۔ اس کی حیثیت ان سب مقامی حکومتوں کی طرح جن کا حال ہم نے ابھی پڑھا ہے صرف ایک صوبائی حکومت کی تھی۔

سکندر لودھی

لودھی خاندان میں سب سے زیادہ شہرت بہلول کے لڑکے سکندر لودھی (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کو حاصل ہے۔ آگرہ کے شہر کی بنیاد اس نے ڈالی ہے۔ اس زمانہ میں آگرہ کا نام سکندر

آباد تھا۔ شہر آباد ہو جانے کے بعد سکندر لودھی نے دہلی کی بجائے آگرہ ہی کو دار الحکومت بنا لیا۔

سکندر لودھی کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ وہ شاہی لباس میں تکلف پسند نہ کرتا تھا۔ سکندر لودھی ہر وقت انتظام مملکت اور رعایا کی خوشحالی میں مشغول رہتا تھا۔ جاڑے میں کپڑے اور شال غریبوں میں تقسیم کرتا اور محتاجوں کو کھانا کھلاتا۔ ہر چھ ماہ بعد محتاجوں اور مسکینوں کی فہرست اس کے سامنے پیش ہوتی تھی اور ان کے لیے حکومت کی طرف سے چھ ماہ کے لیے وظیفے دے دیئے جاتے تھے۔ اس طرح سکندر لودھی نے غربت اور افلاس کو دور کرنے کے لیے وہی طریقے اختیار کیے جو سلطنت دہلی کے تمام اچھے بادشاہوں نے کیے تھے۔

سکندر لودھی کی زندگی کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی طبیعت میں نیکی کا جذبہ پوری طرح موجود تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک موقع پر وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے جنگ کر رہا تھا کہ عین لڑائی کے وقت ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تیری فتح ہے۔ اس پر بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ چھڑا لیا اور کہا کہ ''جب لڑائی میں دونوں طرف مسلمان ہوں تو ایک طرف حکم لگانا نہیں چاہیے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جس چیز میں اسلام کی خیر ہو وہ کام ہو'' سکندر لودھی کا یہ واقعہ اسی قسم کا ہے جیسا کہ تم ملک شاہ سلجوقی کے حالات میں پڑھ چکے ہو۔

اس جگہ سکندر لودھی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ سکندر لودھی نے بادشاہ بننے سے پہلے ایک مرتبہ ایک جگہ کے ہندوؤں کا قتل عام کرنا چاہا اور ان کے مندر توڑنے چاہے، لیکن اس زمانہ کے ایک عالم میاں عبداللہ نے ایسا کرنے سے بادشاہ کو منع کیا۔ اس پر سکندر نے ناراض ہو کر کہا ''تو کافروں کی مدد کرتا ہے۔ اول میں تجھ کو قتل کروں گا پھر سارے ہندوؤں کو قتل کروں گا۔ اس پر عبداللہ نے کہا: ''سب کی جان خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بغیر حکم الٰہی مر نہیں سکتا۔ جب آپ نے مجھ سے مسئلہ پوچھا میں نے شرع کے مطابق جواب دیا۔ اگر شرعی احکام کا آپ کو پاس نہیں ہے تو پوچھنا بے کار تھا''

اس پر سکندر لودھی کا غصہ کم ہو گیا اور اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

تم بہمنی سلطنت کے حال میں پڑھ چکے ہو کہ ایک بزرگ شیخ زین الدین نے کس طرح محمد شاہ بہمنی کو بری باتوں سے بچایا اور شریعت پر عمل کرنے پر مجبور کیا۔ اب تم میاں عبداللہ کی باتوں پر غور کرو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ حق پسند علماء نے کس طرح حکومت کی اصلاح کا کام کیا اور بادشاہوں کو

بُری باتوں سے روکا۔

سکندر لودھی غصہ کا تیز تھا جس کی وجہ سے وہ اگرچہ کبھی کبھی ہندوؤں پر زیادتی کر جاتا تھا لیکن وہ وفادار ہندوؤں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا تھا۔

سلطان سکندر کے زمانہ میں ہندوؤں نے پہلی مرتبہ فارسی پڑھنا شروع کی اور اس نے ان ہندوؤں کو سرکاری ملازمتیں دیں۔ اس کے عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

سکندر کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم لودھی (۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء) تخت پر بیٹھا۔ یہ نااہل حکمران تھا۔ اس کو دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں کابل کے مغل حکمران بابر نے شکست دے کر ۱۵۲۶ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔

لودھی سلاطین (دہلی)

(۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ تا ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ)

(۱) بہلول لودھی	۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ تا ۱۴۸۹ء/۸۹۴ھ
(۲) سکندر لودھی	۱۴۸۹ء/۸۹۴ھ تا ۱۵۱۷ء/۹۲۳ھ
(۳) ابراہیم لودھی	۱۵۱۷ء/۹۲۳ھ تا ۱۹۲۶ء/۹۳۲ھ

(۱۰) برصغیر کا تمدن

دہلی کی سلطنت کمزور ہونے سے اگرچہ برکوچک پاکستان و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کو نقصان پہنچا لیکن جگہ جگہ آزاد حکومتوں کے قائم ہونے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب و تمدن برکوچک کے ہر حصہ تک پہنچ گیا۔ سری نگر، جونپور، ٹھٹھہ، احمد آباد، مانڈو، آگرہ، بیدر، بیجاپور اور احمد نگر کے نئے شہر وجود میں آئے۔ یہاں بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں اور یہ شہر علم و ادب اور صنعت وحرفت کا مرکز بن گئے۔

فن تعمیر نے بڑی ترقی کی۔ حیدر آباد میں 'چھار مینار' اور 'لکھ مسجد' بنائی گئی۔ بیدر میں محمود گاوان کا مدرسہ تعمیر ہوا جو ابھی تک موجود ہے۔ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کا مقبرہ بنا جس کا گنبد دنیا میں سب سے بڑا گنبد ہے، اور احمد آباد اور جونپور تو اپنی مسجدوں کی خوبصورتی میں تمام شہروں

پر بازی لے گئے۔ اس کے علاوہ ٹھٹھہ، مانڈو و لکھنوتی میں بھی اچھی عمارتیں بنیں۔

علم و ادب

اس دور کے بزرگانِ دین میں سید محمد گیسو دراز (۱۳۲۱ء/۷۲۱ھ تا ۱۴۲۲ء/۸۲۵ھ) کا نام اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ وہ ایک سو پچیس سے زیادہ کتابوں اور کتابچوں کے مصنف تھے۔ حضرت گیسو دراز دہلی پر تیمور کے حملے کے بعد گلبرگہ (دکن) چلے گئے تھے، جو بہمنی حکومت کا پہلا دار الحکومت تھا۔ یہاں فیروز شاہ بہمنی نے ان کا خیر مقدم کیا۔ آپ کی وفات گلبرگہ ہی میں ہوئی۔ سید گیسو دراز نے عربی، فارسی اور دکنی میں لکھا اور تصوف کی کئی مشہور کتابوں کی شرح لکھی۔ آپ کی ذات سے دکن میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔

گجرات میں علی بن احمد مہائمی (۱۳۷۴ء/۷۷۶ھ تا ۱۴۳۱ء/۸۳۵ھ) کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ویسے تو وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن ان کی لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر "تبصیر الرحمان" بہت اہم ہے اور ہندوستان میں لکھی ہوئی عربی کی بہترین تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔

گجرات کی ایک اور بڑی علمی شخصیت شاہ وجیہ الدین گجراتی (۱۵۰۵ء/۹۱۱ھ تا ۱۵۹۰ء/۹۹۸ھ) کی ہے جنہوں نے تین سو کے قریب کتابیں اور رسالے لکھے۔ لیکن بیشتر حاشیے اور شرحیں ہیں اور درسی نوعیت کے ہیں۔

گجرات کی دوسری بڑی شخصیت محمد طاہر پٹنی (۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ تا ۱۵۷۸ء/۹۸۷ھ) کی ہے۔ انہوں نے حدیث اور اسماء الرجال پر کتابیں لکھیں جن میں "مجمع بحار الانوار" سب سے مشہور ہے۔ یہ کتاب لغات حدیث کی مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے محمد طاہر پٹنی پوری دنیائے عرب میں جانے جاتے ہیں۔

جونپور کے علماء میں قاضی شہاب دولت آبادی متوفی ۱۴۴۵ء/۸۴۹ھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ پیدا دولت آباد میں ہوئے تھے، لیکن بیشتر زندگی جونپور میں گزری جہاں وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ سلطان ابراہیم شرقی ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان کو جونپور کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے فقہ، تفسیر اور علم کلام پر کتابیں لکھیں لیکن ان کو شہرت علم نحو کی تصانیف کی وجہ سے حاصل ہے۔ ان کے فتووں کا مجموعہ فتاوائے ابراہیم شاہی کہلاتا ہے۔

جونپور کی ایک اور اہم شخصیت ملا محمد جونپوری متوفی ۱۵۱۶ء/۹۱۰ھ کی ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے۔ پابند شریعت تھے اور مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلے میں انقلابی تصورات رکھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو علماء کی طرف سے ان کی شدید مخالفت ہوئی اور جگہ جگہ سے نکالے گئے۔ ان کا انتقال افغانستان کے شہر فراہ میں ہوا۔ اگر وہ مہدی ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تو وہ ایک بڑے مصلح ثابت ہوسکتے تھے۔ بعد میں ان کے پیروؤں نے ایک مستقل فرقہ کی شکل اختیار کرلی جو مہدوی فرقہ کہلاتا ہے۔ کل ہند مسلم لیگ کے مشہور رہنما بہادر یار جنگ مرحوم ملا محمد جونپوری کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔

برہانپور کے علی متقی متوفی ۱۴۸۰ء/۸۸۵ھ کا شمار اسلامی ہند کے ممتاز محدثوں میں ہوتا ہے۔ وہ حجاز چلے گئے تھے اور وہیں آباد ہوگئے۔ علی متقی تقریباً ایک سو کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کو شہرت "کنز العمال" کی وجہ سے حاصل ہے جو احادیث کا بے مثال مجموعہ ہے اور ایک خاص ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی بدولت علی متقی کو پوری اسلامی دنیا میں شہرت حاصل ہوگئی۔

دہلی کے علماء میں شیخ عبداللہ تلنبی متوفی ۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ رہنے والے تو ملتان کے تھے لیکن دہلی میں سکندر لودھی کے زمانے میں آباد ہوگئے تھے۔ وہ برصغیر پاکستان و ہند کے پہلے عالم ہیں جنہوں نے معقولات یعنی فلسفہ اور منطق پر پہلی مرتبہ لکھا۔ سکندر لودھی نے ان کو ملک العلماء کا خطاب دیا تھا۔ وہ بڑے بے باک اور حق گو عالم تھے۔ انہوں نے "ہردوار" کے ذمی ہندوؤں کو کس طرح قتل عام سے بچایا، اس کا تذکرہ ہم سکندر لودھی کے حالات میں پڑھ چکے ہیں۔

آخر میں اس دور کے سب سے بڑے مورخ ہندو شاہ فرشتہ (۱۵۵۲ء/۹۶۰ھ تا ۱۶۲۲ء/۱۰۳۱ھ) کا تذکرہ ضروری ہے۔ فرشتہ کا پورا نام ملا محمد قاسم ہندو شاہ ہے اور تخلص فرشتہ ہے۔ وہ اصلاً ایرانی ہیں اور بچپن ہی میں احمد نگر آ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ بیجاپور چلے گئے۔ اور وہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ملازمت کرلی۔ انہوں نے اپنی مشہور "تاریخ فرشتہ" ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حکم سے لکھی۔ یہ برصغیر کی بہترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں محمود غزنوی سے اکبر کی وفات تک شمالی ہند کی اور بہمنی حکومت کے قیام سے اپنے زمانہ تک تمام صوبائی

حکومتوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تاریخ کا وہ حصہ جو دکن سے متعلق ہے خاص طور پر اہم ہے اور اس میں بہت سے چشم دید واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ شروع میں ہندوؤں کے عقائد اور قبل از اسلام کی مختصر تاریخ بھی لکھی ہے۔ فرشتہ نے طب سے متعلق بھی 'اختیارات قاسمی' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مقامی زبانوں نے بھی اس زمانے میں ترقی کی۔ سلطان زین العابدین کے زمانے میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے کشمیری زبان میں اور حسین شاہ اور نصرت شاہ کے زمانے میں بنگالی زبان میں کتابیں لکھنا شروع کیں۔ اسی طرح دکن میں دکھنی زبان میں کتابیں لکھی گئیں۔ یہی وہ زبان ہے جس نے بعد میں اُردو کی شکل اختیار کی۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد چھوٹی حکومتوں کا یہ زمانہ ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک تقریباً دو سو سال رہا۔ اس کے بعد دہلی میں پھر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ حکومت جو سلطنت تیموریہ اور سلطنت مغلیہ کے نام سے مشہور ہے ماوراء النہر سے نکلے ہوئے ایک تیموری شہزادے جس کا نام بابر تھا نے قائم کی تھی۔ بعد میں بابر کے جانشینوں نے اس کو اتنا بڑھایا کہ مذکورہ بالا تمام چھوٹی چھوٹی حکومتیں اس کا ایک حصہ بن گئیں۔

[تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب ۔ ۱۹]

اہم واقعات

۱۲۰۶ء (۲۴/ جون) لاہور میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی۔

۱۲۳۱ء گوالیار کی فتح۔

۱۲۳۴ء مالوہ کی فتح۔

۱۲۸۶ء منگولوں نے لاہور تاراج کیا۔ ملتان کا حاکم سلطان محمد مقابلہ میں شہید ہوگیا اور منگول امیر خسرو کو پکڑ کر لے گئے۔

۱۲۹۶ء ایلچپور پر قبضہ اور دیو گیر (دکن) باجگذار بنایا گیا۔

۶۹۷ھ/ ۱۲۹۸ء گجرات کی فتح۔

۱۲۹۹ء منگولوں نے دہلی کا محاصرہ کیا۔

۱۳۰۱ء ۱۱۔ جولائی کو رنتھمبور (راجپوتانہ) فتح ہوا۔

۱۳۰۳ء چتوڑ فتح ہوا۔ منگولوں نے دوسری بار دہلی کا محاصرہ کیا۔

۱۳۰۵ء مالوہ کی دوبارہ فتح۔

۱۳۰۹ء ورنگل (تلنگانہ) فتح ہوا۔ راجہ نے علاء الدین کو کوہ نور ہیرا پیش کیا۔

۱۳۱۱ء ملک کافور نے مدورا اور راس کماری تک جنوبی ہند فتح کرلیا۔

۱۳۲۳ء ورنگل کی دوبارہ فتح۔ اڑیسہ باجگذار بنایا گیا۔

۱۳۲۶ء دولت آباد کو دارالسلطنت بنانے کا اعلان۔

۱۳۵۹ء جونپور آباد ہوا۔

۱۳۶۲ء کانگڑہ کی فتح۔

۹۹-۱۳۹۸ء تیمور کا ہندوستان پر حملہ۔

۱۴۲۵ء ورنگل کا بہمنی سلطنت سے الحاق۔

۱۴۸۱ء ۵۔ اپریل محمود گاوان کا قتل۔

۱۴۹۸ء واسکوڈی گاما کالی کٹ پہنچا (۱۹۔ مئی)

۱۵۰۰ء واسکوڈی گاما نے کالی کٹ کے مسلمان تاجروں کے جہاز جلا دیئے اور جامع مسجد کو آگ لگادی۔

۱۵۰۸ء چول کی بحری جنگ میں گجراتی اور مصری بیڑے نے پرتگالیوں کو شکست دی۔ لیکن اگلے سال پرتگالی غالب آگئے، اور محمود بیگڑہ نے دیو کی بندرگاہ ان کے سپرد کردی۔

۱۵۱۰ء پرتگالیوں نے بیجاپور سے بندرگاہ گوا چھین لیا۔ مسلمان آبادی قتل کردی گئی۔

۱۵۲۶ء (۲۔ اپریل) پانی پت کی پہلی جنگ، بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا۔

۱۵۶۵ء (جنوری) تالیکوٹہ کی جنگ میں دکن کے مسلمانوں نے وجے نگر کے راجہ کو شکست دے کر وجے نگر پر قبضہ کرلیا۔

باب ۱۴

تلوار کے دھنی عثمانی تُرک

(۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ تا ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ)

ابتدائی دور

جس زمانے میں پاکستان اور بھارت کے علاقے میں غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی حکومت کر رہے تھے اس زمانے میں ایشیائے کوچک میں، جسے اناطولیہ اور ترکی بھی کہا جاتا ہے، ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ یہ آلِ عثمان کی سلطنت تھی جسے سلطنت عثمانیہ اور دولت عثمانیہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے بانی کا نام عثمان خاں تھا۔ یہ سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں وسعت میں عربوں کی سلطنت کا مقابلہ کرتی تھی، اور پائیداری اور استحکام کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کی سب سے مستحکم اور پائیدار حکومت ثابت ہوئی۔

عثمانی نسلاً ترک تھے۔ ان کی حکومت قائم ہونے کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ جب ہلاکو خاں کے زمانے میں بغداد پر منگولوں نے قبضہ کرلیا، تو چند سال بعد ان کی ایک فوج ایشیائے کوچک پر قبضہ کرتی ہوئی شہر انقرہ کے قریب پہنچ گئی۔ یہاں قونیہ کے سلجوقی سلطان نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس وقت جب کہ دونوں میں لڑائی ہو رہی تھی خانہ بدوش ترکوں کی ایک جماعت جس کا سردار ارطغرل تھا یہاں سے گزرا۔ ارطغرل نے دیکھا کہ ایک فوج تعداد میں زیادہ ہے اور دوسری کم۔ ارطغرل کے پاس صرف ۴۴۴ سوار تھے، لیکن وہ کمزور فوج کی مدد کے لیے بڑھا اور اس زور سے حملہ کیا کہ طاقتور فوج کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ طاقتور فوج منگولوں کی تھی اور کم تعداد کمزور فوج سلجوقیوں کی تھی۔

عثمان خاں

ارطغرل کی اس بہادری اور مدد کے بدلہ میں سلطان علاء الدین سلجوقی نے اُسے ایک جاگیر دی۔ چند سال بعد ۱۲۸۸ء میں ارطغرل کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا عثمان خاں (۱۲۸۸ء تا

۱۳۲۶ء) اس کا جانشین ہوا۔ ۱۳۰۰ء میں قونیہ کی سلجوقی حکومت کو منگولوں نے ختم کر دیا اور سلطان علاء الدین جنگ میں مارا گیا۔ اب عثمان خاں نے ایک خود مختار حکومت قائم کرلی جو اس کے نام پر عثمانی سلطنت کہلائی۔

عثمان خاں کی جاگیر کی سرحد قسطنطنیہ کی بازنطینی سلطنت سے ملی ہوئی تھی۔ یہ وہی بازنطینی حکومت تھی جو عربوں کے زمانہ میں رومی سلطنت کے نام سے مشہور تھی اور جسے الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانہ میں سلجوقیوں نے اپنا باجگذر بنالیا تھا۔ اب یہ بازنطینی سلطنت بہت کمزور اور چھوٹی ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی عثمان خاں کی جاگیر کے مقابلہ میں بہت بڑی طاقت تھی۔ بازنطینی قلعہ دار عثمان خاں کی جاگیر پر حملے کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے عثمان خاں اور بازنطینی حکومت کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ عثمان خاں نے ان لڑائیوں میں بڑی بہادری اور قابلیت کا ثبوت دیا اور بہت سے علاقے فتح کرلیے جن میں بروصہ کا مشہور شہر بھی شامل تھا۔ بروصہ کی فتح کے بعد عثمان خاں کا انتقال ہوگیا۔

عثمان بڑا بہادر اور عقلمند حکمران تھا۔ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا، اس کی زندگی سادہ تھی۔ دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی۔ مال غنیمت کو یتیموں اور غریبوں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کردیا کرتا تھا۔ وہ فیاض، رحم دل اور مہمان نواز تھا۔ اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے ترک آج بھی اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ رواج ہوگیا کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو عثمان کی تلوار اس کی کمر سے باندھی جاتی تھی اور یہ دعا کی جاتی تھی کہ خدا اس میں بھی عثمان جیسی خوبیاں پیدا کرے۔

عثمان کا صدر مقام ''اس کی شہر'' تھا۔ اس کے بعد بروصہ عثمانیوں کا دارالحکومت ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ عثمان خاں نے ایک خواب دیکھا کہ.........

''ایک زبردست درخت اس کے پہلو سے نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا بہہ رہے تھے اور چار بڑے بڑے پہاڑ اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہوگیا۔ یہ شہر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو براعظم ملتے تھے اور ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

عثمان اس انگوٹھی کو پہننا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی"

عثمان کے اس خواب کو بہت اچھا سمجھا گیا اور بعد کے لوگوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ چار دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینیوب تھے اور چار پہاڑ کوہ طور، کوہ بلقان، کوہ قاف اور کوہ اطلس تھے۔ بعد میں عثمان کی اولاد کے زمانہ میں چونکہ سلطنت ان دریاؤں اور پہاڑوں تک پھیل گئی تھی اس لیے یہ خواب دراصل سلطنت عثمانیہ کی وسعت سے متعلق ایک پیشین گوئی تھی۔ شہر سے مطلب قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان فتح نہیں کر سکا اور وہ بعد میں فتح ہوا۔

عثمان کے بعد اس کی اولاد میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے جنھوں نے اس کے خواب کو سچا کر دکھایا۔ تاریخ اسلام میں کسی خاندان کی حکومت اتنے عرصے تک نہیں رہی جتنے عرصے تک آل عثمان کی حکومت رہی۔ اور نہ کسی خاندان میں آل عثمان کے برابر قابل حکمران ہوئے۔ ان بادشاہوں کی فہرست بہت لمبی ہے، اس لیے ہم اس مختصر تاریخ میں صرف چند مشہور بادشاہوں کا ذکر کریں گے۔

آرخاں

عثمان کے بعد اس کا لڑکا آرخاں (۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء) بادشاہ ہوا۔ اس کا عہد دو باتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ مشرقی یورپ میں قدم رکھا۔ بعد میں ترکوں نے یورپ میں جو فتوحات کیں گویا ان کا آغاز آرخاں ہی کے زمانہ میں ہوا۔ دوسری بات ینی چری یعنی نئی فوج کی تنظیم ہے۔ یہ فوج دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج کہی جاتی ہے۔ یہ پیدل فوج تھی اور اس کی فوجی تربیت اتنی اچھی تھی کہ دنیا کی کوئی فوج اس کے مقابلہ میں جم کر لڑ نہیں سکتی تھی۔ ترکوں نے جس قدر فتوحات کیں ان میں سب سے زیادہ ہاتھ اس فوج کا تھا۔ آرخاں ہی کے زمانہ میں عثمانیوں نے اپنا پہلا سکہ جاری کیا۔

ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک پتلا سمندر ہے جو درہ دانیال کہلاتا ہے۔ اس سمندر کے دوسری طرف یورپ کا حصہ ہے وہ "گیلی پولی" کہلاتا ہے۔ یہاں سے سمندر کو پار کرنا چونکہ آسان ہے اس لیے ہر حملہ آور یورپ سے ایشیا یا ایشیا سے یورپ جاتے وقت یہیں سے داخل ہوتا ہے۔ گیلی پولی آرخاں ہی کے زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد گیلی پولی سے ملے

ہوئے علاقہ پر بھی آرخاں کا قبضہ ہوگیا۔ آرخاں کا جب انتقال ہوا تو سلطنت عثمانیہ کا رقبہ عثمان خاں کے زمانہ سے تین گناہ زیادہ ہوگیا تھا۔

آرخاں بھی اپنے باپ کی طرح سادہ زندگی گذارتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں مسجدیں مدرسے اور رفاہ عام کی عمارتیں بنوائیں۔ دارالحکومت بروصہ میں ایک عالیشان مسجد اور ایک بڑا مدرسہ اور ایک شفاخانہ تعمیر کرایا۔ وہ پہلا عثمانی سلطان ہے جس نے علوم وفنون کی سرپرستی کی۔ بڑے بڑے علماء اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ وہ غریبوں کو روٹی اور سالن اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا تھا۔

مراد اوّل

آرخاں کے بعد اس کا لڑکا مراد اول (۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۹ء) تخت نشین ہوا۔ مراد بھی قابلیت میں اپنے باپ دادا کی طرح تھا۔ ملک گیری اور فتوحات میں تو وہ ان سے بھی آگے بڑھ گیا۔ یورپ میں بازنطینی علاقہ سے ملے ہوئے بلغاریہ، سرویا اور جوسینا کے علاقے تھے جہاں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں۔ ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ کو کوبا کے مقام پر مراد نے بلقان کی مسیحی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد مراد نے ان تمام حکومتوں کو یا تو فتح کرلیا یا مطیع بنالیا۔ مراد نے ایشیا میں بھی کئی علاقے فتح کیے۔ اس کے زمانہ میں عثمانی سلطنت کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل ہوگیا۔ یعنی آرخاں کے زمانہ سے پانچ گنا زیادہ۔

ترکوں کا سرخ ہلالی جھنڈا اسی زمانہ میں شروع ہوا۔

بایزید

مراد کے بعد اس کا لڑکا بایزید (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) حکمران ہوا۔ اس نے پہلی مرتبہ سلطان کا لقب اختیار کیا۔ بایزید اپنے باپ کی طرح فوجی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اس میں ایک بری عادت آ گئی تھی، اور وہ تھی شراب پینے کی۔ اس کو شراب کی عادت اس کی ایک عیسائی بیوی نے ڈال دی۔ بایزید پہلا عثمانی حکمران ہے جس نے شراب پی۔ ورنہ اس سے پہلے جو بادشاہ ہوئے ہیں یعنی عثمان خاں، آرخاں اور مراد خاں، ان میں سے کوئی شراب نہیں پیتا تھا۔

بایزید کو اگرچہ شراب کی لت لگ گئی تھی لیکن میدان جنگ میں وہ شیر کی طرح جاتا تھا اور اپنے تیز حملوں کی وجہ سے یلدرم یعنی بجلی کہلاتا تھا۔ ۱۳۹۶ء میں اس نے نکوپولس کے میدان جنگ

میں یورپ کی متحدہ فوجوں کو شکست دی اور سلطنت کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ اسی طرح اس نے مشرق میں ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ فتح کرلیا اور وہ اب یورپ میں آگے بڑھنے کے ارادے کر رہا تھا کہ بدقسمتی سے اس کے ملک پر سمرقند کے مشہور بادشاہ امیر تیمور نے جس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے حملہ کردیا۔ انگورا کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا بایزید کو شکست ہوئی اور وہ قید ہوگیا۔

بایزید کی شکست کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب عثمانی سلطنت ختم ہوجائے گی، لیکن اس کے لڑکے محمد اول نے (۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء) نے چند سال میں کھوئی ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کرلی۔ اس لحاظ سے ہم اسے سلطنت عثمانیہ کا دوسرا بانی کہہ سکتے ہیں۔ سلطان محمد اول بے حد کشادہ دل، منصف مزاج اور وعدہ کا پابند حکمران تھا۔ اس نے ادب کی سرپرستی کی اور اگرچہ اس کا دور بہت مختصر تھا لیکن عثمانیوں میں شعروشاعری کا مذاق اول اول اسی کے دور میں شروع ہوا۔ اس کو ترکی کی تاریخ میں محمد چلبی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چلبی ترکی میں عالم اور نیک لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بروصہ کی مسجد کے امام سلیمان چلبی متوفی ۱۴۲۲ء/۸۲۵ھ نے اپنی غیر فانی نظم مولد جو حضورؐ سے متعلق ہے۔ محمد اول کے دَور میں ۱۴۱۰ء/۸۱۲ھ میں لکھی۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ ۵½ سو سال بعد آج بھی ترکی میں مذہبی اجتماعات کے موقع پر ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔

مراد دوم

سلطان محمد اول کے بعد اس کا بڑا لڑکا مراد دوم (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء) اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ نوعمری کے باوجود مراد دوم ایک سمجھدار اور مضبوط حکمران ثابت ہوا۔ تیموری حملے کے بعد ایشیائے کوچک کی جو ریاستیں (گرمیان، قسطمونی، منتشا، صاردخان اور حمید) آزاد ہوگئی تھیں ان کو اس نے پھر مطیع کیا۔ یورپ میں اس نے ۱۴۳۰ء/۸۳۳ھ میں سالونیکا فتح کیا ۱۴۴۴ء/۸۴۸ھ میں مراد نے وارنا کے مقام پر اور ۱۴۴۸ء/۸۵۲ھ میں کسووا کے مقام پر یورپ کی متحدہ صلیبی فوجوں کو شکست فاش دی۔ ان جنگوں کے نتیجے میں سرویا اور بوسینیا کی ریاستیں پوری طرح مطیع کرلی گئیں اور یونان کا جنوبی حصہ جزیرہ نمائے موریا بھی باجگذار بنالیا گیا۔ مراد دوم عدل وانصاف اور شریفانہ اوصاف میں اپنے آباؤاجداد سے بھی آگے بڑھ گیا۔

اس کے دشمن بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔ وہ جب کوئی ملک فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں، کارواں سرائیں، شفا خانے اور مدرسے تعمیر کراتا۔ ہر سال ایک ہزار اشرفیاں سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار مکہ مدینہ اور بیت المقدس کے دینداروں کے لیے بھیجتا۔

(۲) محمد فاتح

مراد کے بعد اس کا لڑکا محمد فاتح (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) تخت نشین ہوا۔ محمد فاتح اپنے کارناموں میں سب سے بازی لے گیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ ترک فوجوں نے یونان، بلغاریہ، سرویا وغیرہ کے جن ملکوں کو فتح کیا تھا وہ سب قسطنطنیہ سے آگے ہیں۔ قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ ترکوں کو خراج دیتا تھا، لیکن شہر پر ابھی تک مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ قیصر روم کے اس دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کی مسلمانوں نے سب سے پہلے امیر معاویہ کے زمانہ میں کوشش کی تھی۔ اس کے بعد عربوں اور ترکوں نے اور بھی کئی مرتبہ حملے کیے تھے لیکن رومیوں کی بہادری یا آپس کے اختلاف کی وجہ سے ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ یہ فخر عثمانی سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھا تھا۔ محمد فاتح نے یہ شہر ۵۴ دن کے محاصرہ کے بعد ۲۰ جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۹۔ مئی ۱۴۵۳ء) کو فتح کر لیا اور اس طرح رومیوں کی گیارہ سو سال پرانی سلطنت ایران کی ساسانی سلطنت کی طرح ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس فتح کے بعد آنحضرتؐ کی وہ پیشین گوئی پوری ہو گئی جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ:

''خدا نے مجھے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی کنجیاں دے دی ہیں''

ایران کے اکاسرہ کی حکومت کا خلفائے راشدین ہی کے زمانہ میں خاتمہ ہو گیا تھا اور قیصر کی حکومت کا محمد فاتح نے خاتمہ کر دیا۔ اس فتح کی وجہ سے تاریخ میں اسے فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے علاوہ اور بھی فتوحات کیں۔ سرویا، بوسینا اور یونان جواب تک براہ راست ترکی حکومت کے تحت نہیں تھے، بلکہ خراج دیتے تھے محمد فاتح نے ان کو براہ راست ترکی حکومت کا صوبہ بنا لیا۔ ان کے علاوہ شمال میں کریمیا کا علاقہ اور مشرق میں طرابزون اور سنوپ کی حکومتوں کو بھی فتح کر لیا۔

بحری بیڑہ

محمد فاتح پہلا عثمانی حکمران ہے جس نے بحری قوت کو بڑی ترقی دی۔ سلطنت کے دونوں حصوں کے درمیان میں چونکہ سمندر تھا اس لیے بحری قوت کے بغیر سلطنت کو قائم رکھنا بڑا مشکل تھا۔ فوجوں کو مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف لانے کے لیے ترکوں کو ہمیشہ وینس اور جنیوا کی عیسائی حکومتوں کے سوداگروں سے جہاز حاصل کرنے پڑتے تھے۔ محمد فاتح نے اپنا بحری بیڑہ تیار کر کے اس کمی کو دُور کر دیا ترکوں کے بحری بیڑہ نے کئی جزیرے بھی فتح کیے۔ کریمیا کا دُور دراز علاقہ بحری فوج نے فتح کیا تھا۔

آخر میں محمد فاتح نے اٹلی پر حملہ کیا تھا۔ یہ حملہ بھی بحری فوج نے کیا تھا، جس کا سردار کریمیا کا فاتح احمد پاشا تھا۔ احمد پاشا نے اٹلی اور اوٹرانٹو فتح کر لیا لیکن اس عرصہ میں محمد فاتح کا انتقال ہو گیا اور یہ مہم ناکام ہو گئی۔

محمد فاتح پہلا عثمانی حکمران ہے جس کی شہرت دنیا میں دُور دُور تک پھیل گئی۔ اب تک جو حکمران ہوئے تھے ان کی سلطنت زیادہ وسیع نہیں تھی۔ عثمان خاں کے زمانہ میں تو سلطنت کا رقبہ صرف ساڑھے سات ہزار مربع میل تھا یعنی غرناطہ کی بنی احمر کی حکومت سے بھی نصف پس اتنا سمجھ لو جیسے ملتان کی حسین لنگاہ کی حکومت۔ آرخان کے زمانہ میں اس کی وسعت اندلس کی اموی سلطنت کے لگ بھگ ہو گئی تھی، لیکن محمد فاتح کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت شیر شاہ کی سلطنت کے برابر ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں پوری اسلامی دنیا اور یورپ میں اتنی بڑی حکومت کسی کی نہیں تھی۔ ایران کی صفوی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان اور ہند دہلی کے زوال کے بعد چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹے ہوئے تھے اور ماوراء النہر میں تیموری شہزادے آپس میں لڑائیوں میں مصروف تھے، صرف مصر و شام کی حکومت ایسی تھی جو عثمانی سلطنت کا کچھ مقابلہ کر سکتی تھی۔ محمد فاتح کشمیر کے زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) گجرات کے محمود بیگڑہ ۱۴۵۸ء تا ۱۵۱۱ء سندھ کے جام نظام الدین ۱۴۶۱ء تا ۱۵۰۹ء اور مالوہ کے محمود خلجی (۱۴۳۶ء تا ۱۴۶۹ء) کا ہمعصر تھا محمود گاوان (متوفی ۱۴۸۱ء) اس زمانہ میں بہمنی سلطنت کا وزیر اعظم تھا۔

قانون نامہ

محمد فاتح صرف اپنی فتوحات کی وجہ سے مشہور نہیں ہے، بلکہ انتظام سلطنت اور اپنی حیرت انگیز قابلیت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ سلطنت عثمانیہ کے لیے باقاعدہ قوانین مرتب کیے اور بعد میں موجودہ صدی تک اس کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل ہوتا رہا۔ بس یوں سمجھو کہ محمد فاتح عثمانی ترکوں کا شیر شاہ اور اکبر تھا، لیکن اس نے ایک قانون بڑا خراب بنایا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھے تو وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرادے۔ بادشاہت میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ باپ کے مرجانے کے بعد سلطنت کے لیے بھائیوں میں لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں اور جو طاقتور نکلتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے، اس طرح ہزاروں لوگوں کا ناحق خون ہوتا ہے۔ محمد فاتح نے اس خونریزی کو روکنے کے لیے یہ قانون بنایا۔ اس قانون کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ آئندہ سلطنت کی تاریخ میں شہزادوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں، لیکن ہم پھر بھی کہیں گے کہ محمد فاتح کا یہ قانون ظالمانہ تھا۔

محمد فاتح علوم وفنون کا بھی بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار سے تیس شاعروں کو وظیفے ملتے تھے۔ وہ خراسان میں مولانا جامی کو تحفے بھیجا کرتا تھا۔ اس نے سلطنت میں کثرت سے مسجدیں، شفاخانے اور مدرسے قائم کیے۔

محمد فاتح اگرچہ اپنی فتوحات انتظامی صلاحیتوں اور تدبر میں اپنے اجداد سے بازی لے گیا لیکن وہ اخلاق اور کردار میں آرخان، مراد اول یا مراد دوم کے ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ فطرتاً ظالم نہیں تھا، لیکن اس کی طبیعت میں درشتی اور تختی تھی۔ وہ اپنی مخالفت کو برداشت نہیں کرسکتا تھا، اور بڑے بڑے لوگوں کو بغیر کسی تحقیق کے قتل کر دیتا تھا۔ اگرچہ اس نے قانون نامہ مرتب کر کے حکومت کو قانون کا پابند بنایا لیکن اپنی ذات میں وہ ایک مستبد حکمران تھا۔ صلاح ومشورہ کو جو اس کے اجداد کا اصول تھا، ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتا تھا۔

محمد فاتح کے بعد اس کا لڑکا بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) تخت نشین ہوا۔ اس نے تیس سال حکومت کی۔ اس کے دور میں فتوحات کم ہوئیں اور کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہ ایک پرامن اور علم وادب کا سرپرست حکمران تھا۔

اہم واقعات

۱۳۰۰ء/۶۹۹ھ عثمان خاں کی مستقل حکومت کا آغاز۔

۱۳۲۶ء/۷۲۶ھ بروصہ اور نائکومیڈیا کی فتح۔

۱۳۳۰ء/۷۳۰ھ نائیبا کی فتح۔

۱۳۵۴ء/۷۵۵ھ گیلی پولی کی فتح۔ عثمانی ترکوں نے پہلی مرتبہ یورپ میں فاتحانہ قدم رکھا۔

۱۳۶۳ء/۷۶۴ھ فلپو پولس کی فتح۔

۷۸۳ھ مناستر کی فتح۔

۱۳۸۵ء/۷۸۷ھ صوفیہ (بلغاریہ) کی فتح۔

۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ (۱۵۔ جون) جنگ کسووا اول میں مراد اول نے صلیبی لشکر کو شکست دی۔

۱۳۹۳ء/۷۹۵ھ شمالی بلغاریہ پر ترکوں کا قبضہ۔

۹۴۔ ۱۳۹۳ء/۹۶۔ ۷۹۵ھ سبورس، ہمسون اور اماسیہ کی فتح۔

۱۳۹۶ء/۷۹۸ھ (۲۴۔ ستمبر) معرکہ نکوپولس۔ بایزید نے متحدہ مسیحی فوج کو شکست دی۔

۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ یونان کی فتح۔

۱۴۰۲ء/۸۰۴ھ ۲۰۔ جولائی جنگ انگورا۔ تیمور نے بایزید کو شکست دی۔

۱۴۳۰ء/۸۳۳ھ سالونیکا کی تسخیر

۱۴۴۰ء/۸۴۴ھ سرویا کی فتح۔

۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ بلغراد کا پہلا محاصرہ۔

۱۴۴۳ء/۸۴۷ھ نیش کی جنگ میں ترکوں کی شکست۔ سرویا ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۴۴۴ء/۸۴۸ھ ۲۶۔ رجب، ۱۰۔ نومبر جنگ وارنا اول میں ہنگری کی شکست۔ سرویا اور بوسینیا پر ترکوں کا قبضہ۔

۱۴۴۸ء/۸۵۲ھ ۱۸۔ شعبان ۱۷۔ اکتوبر ہنگری کو کسووا کی دوسری جنگ میں شکست۔

۱۴۵۳ء/۸۵۷ھ ۲۶۔ ربیع الاول کو قسطنطنیہ کے محاصرہ کا آغاز۔ ۲۰۔ جمادی الاول ۲۹۔ مئی کو شہر فتح۔

۱۴۵۶ء بلغراد کا ناکام محاصرہ۔

۱۴۶۱ء/۸۶۵ھ ترابزون فتح۔

۱۴۷۵ء/۸۸۰ھ کریمیا فتح۔ ولاچیا باجگذار۔

۱۴۷۳ء ارزنجان کے قریب اوتلک بیلی کی جنگ میں محمد فاتح نے اوزون حسن کو شکست دی۔

۱۴۷۸ء البانیہ فتح۔

۱۴۸۰ء/۸۸۵ھ رہوڈس کی ناکام مہم۔ اوٹرانٹو (اٹلی) کی فتح۔

۱۴۹۵ء/۹۰۰ھ روس کے پہلے سفیر کی استنبول میں آمد۔

۱۴۹۹ء/۹۰۵ھ کمال رئیس نے وینس کے بیڑے کو شکست دے کر لپانٹو پر قبضہ کرلیا۔

مسلمانوں کے عروج کا دُوسرا دَور

(۲)

۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تا ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ

[مسلمانوں کے عروج کے دوسرے دَور کے اس حصے میں تقریباً ۱۵۱۲ء سے ۱۷۰۷ء تک کے زمانے کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ افریقہ اور مشرق بعید کی تاریخ کے سلسلے میں مقررہ ادوار کی پابندی نہیں کی گئی ہے، بلکہ قاری کی سہولت کی خاطر واقعات کا تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ یہ دَور جس سے اگلے صفحات میں بحث کی گئی ہے مسلمانوں کے عروج کا آخری دَور ہے۔ سترھویں صدی آخری صدی ہے جس میں مسلمانوں کو یورپ اور غیر مسلم دنیا پر سیاسی برتری حاصل رہی۔ علمی اور تمدنی میدانوں میں اب یورپ نے پوری طرح برتری حاصل کر لی تھی اور سترھویں صدی کے نصف آخر سے سیاسی اور فوجی میدان میں غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اٹھارھویں صدی سے مسلمانوں کا پوری طرح زوال شروع ہو جاتا ہے۔]

باب ۱۵

عثمانی تُرک دُنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گئے

(۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تا ۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ)

بایزید ثانی کا دَورامن وامان میں گزر گیا۔اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کی حدود میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا،لیکن اس کے جانشینوں نے سلطنت عثمانیہ کو چند سال میں دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت بنا دیا۔بایزید ثانی کے بعد اس کا لڑکا سلیم اول (۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تا ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ) تخت نشین ہوا۔سلیم اول کا عہد عثمانی سلطنت کا ایک عہد آفریں دَور ہے،ایک نیا موڑ ہے۔عثمانی ترکوں کا رُخ اب تک یورپ کی طرف تھا،مشرق کی مسلمان حکومتوں سے ان کی بہت کم لڑائیاں ہوئیں۔لیکن سلیم نے یورپ کی بجائے مشرق کا رخ کیا۔

چالدران کی جنگ

اس زمانہ میں ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی حکومت تھی اور مصر و شام پر مملوک خاندان حکمران تھا۔مصر اور ایران کی ان حکومتوں نے عثمانی ترکوں کے خلاف معاہدہ کرلیا تھا اور بعض باغی عثمانی شہزادوں کو پناہ بھی دے رکھی تھی۔اس کے علاوہ ان میں اور عثمانی ترکوں میں کبھی کبھی سرحدی لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔اس قسم کے اسباب کی بنا پر سلیم نے ان دونوں حکومتوں کو ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا۔شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ جب تک عثمانی سلطنت کے پڑوس میں ایران اور مصر کی طاقتور حکومتیں مخالف رہیں گی،مسلمان یورپ کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکیں گے۔

سلیم نے سب سے پہلے اسمٰعیل صفوی کو چالدران کے میدان جنگ میں شکست دے کر ۱۵۱۴ء میں اس کے دارالحکومت تبریز پر قبضہ کرلیا۔سلیم چاہتا تھا کہ پورا ایران فتح کر کے صفوی حکومت کو ختم کردے،لیکن اس کی فوجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور سلیم کو واپس ہونا پڑا۔ایران کی مہم سے واپسی کے بعد سلیم نے مصر کا رُخ کیا۔

فتح مصر

۱۵۱۶ء میں حلب کے پاس مرج دابق کی جنگ میں مملوکوں کو شکست دے کر اس نے شام و فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ مصر کی طرف بڑھا۔ قاہرہ کے پاس ردانیہ کے مقام پر ۱۵۱۷ء میں دوسری بڑی جنگ ہوئی اور سلیم مملوکوں کو شکست دے کر قاہرہ میں داخل ہوگیا۔ حجاز پر چونکہ مصر کی بالادستی تھی اس لیے مصر پر عثمانی قبضہ ہو جانے کے بعد حجاز کے امیر نے مکہ اور مدینہ کی کنجیاں سلیم کو بھیج کر عثمانیوں کی اطاعت کرلی۔ مصر سے واپسی پر سلیم عباسی خلیفہ متوکل سوم کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ متوکل نے آنحضرت کے تبرکات یعنی علم، تلوار اور چادر مبارک جو خلفاء کے پاس بطور نشان خلافت چلے آتے تھے، سلیم کے حوالے کردیئے۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل استنبول میں ایک تقریب کے دوران خلافت کے حق سے سلیم کے حق میں دست بردار ہوگیا تھا۔ اس طرح خلافت عثمانی ترکوں کو منتقل ہوگئی۔

مصر سے واپسی کے بعد سلیم ایک نئی مہم کی تیاری کررہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

سلیم نے صرف آٹھ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے عثمانی سلطنت کا رقبہ دوگنا کردیا۔ اب عثمانی ترک بلاشک وشبہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن چکے تھے۔ سلیم ایک بڑا فاتح اور اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار تھا۔ اس کی انتظامی صلاحیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محمد فاتح اور سلیمان قانونی کے ساتھ اس کا شمار عثمانی سلاطین میں سب سے بڑے عثمانی سلاطین میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا اور ترکی اور فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ لیکن وہ مزاج کی سختی اور خونریزی کے معاملے میں محمد فاتح سے بھی بازی لے گیا تھا۔ اسی وجہ سے ترکی میں اس کو یاؤز (yavoz) یعنی مہیب اور درشت مزاج کہا جاتا ہے۔ قاہرہ اور دوسرے مقامات کے قتلِ عام اس کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔ اس نے اپنے کئی وزیروں کو ذرا ذرا سی بات پر قتل کرادیا۔ مشرقی ترکی میں کئی ہزار افراد اس کے حکم سے بغاوت کے الزام میں قتل کردیئے گئے۔ اس زمانے میں اندلس کے مسلمانوں پر عیسائی بہت ظلم ڈھارہے تھے۔ سلیم نے اس کے جواب میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی آبادی کا قتل عام کرنا چاہا، لیکن جس طرح سکندر لودھی کے سامنے ملا عبداللہ تلنبی نے آڑے آکر ہندوؤں کو قتل عام سے بچایا تھا اسی طرح یہاں بھی شیخ الاسلام علی جمالی نے یہ کہہ کر کہ ذمی آبادی کو

شرعاً قتل نہیں کیا جا سکتا، سلطان سلیم کو فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی وجہ سے نہ صرف لاکھوں بے قصور عیسائیوں کی جانیں بچ گئیں، بلکہ خود سلیم بھی ایک بڑے ظلم سے بچ گیا۔ یہ واقعہ شیخ الاسلام علی جمالی کی غیر معمولی جرأت اور ان کے کردار کی بلندی کا ثبوت بھی ہے۔ سلیم جو ذرا سی مخالفت پر وزیروں تک کو قتل کرا دیتا تھا اپنے فیصلے سے روکنا معمولی بات نہیں تھی۔ شیخ الاسلام نے یہ کام جان کو خطرے میں ڈال کر کیا۔ یہ واقعہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ سلیم کی نظر میں علماء کا کس قدر احترام تھا۔

(۲) سلیمان اعظم

فتوحات

سلیم اول کے بعد اس کا لڑکا سلیمان (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) ۲۶ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا۔ اس کے دور میں عثمانی سلطنت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ سلاطین عثمانیہ میں وہ سب سے بڑا اور سب سے باعظمت حکمران ہوا ہے۔ آل عثمان میں اس کا وہی مقام ہے جو سلجوقی سلطنت میں ملک شاہ کا اور دہلی کی تیموری سلطنت میں اورنگ زیب کا مقام ہے۔ اسے بجا طور پر سلیمان اعظم کہا جاتا ہے۔ یورپ والے اس کو ذی شان کے لقب سے یاد کرتے تھے، لیکن ترک اس کو سلیمان قانونی کہنا پسند کرتے ہیں۔

سلیمان نے ۱۵۲۱ء میں بلغراد کا شہر فتح کیا۔ اس کے اگلے سال جزیرہ رہوڈس کو مسیحی سورماؤں سے لے لیا۔ یہ دونوں مقام وہ تھے جن کو فتح کرنے میں محمد فاتح ناکام رہا تھا۔ ۱۵۲۶ء میں سلیمان نے مُہاچ کی جنگ میں ہنگری کی فوج کو شکست دے کر بوداپست پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے ۱۵۲۹ء میں آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کیا، لیکن بھاری توپیں نہ ہونے کی وجہ سے محاصرہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۳۲ء میں سلیمان کے فوجی دستوں نے آسٹریا اور جرمنی میں داخل ہو کر دُور دُور تک چھاپے مارے اور یورپ کی متحدہ قوت کو شکست دے کر جس کی قیادت یورپ کا سب سے بڑا حکمران چارلس پنجم کر رہا تھا، ۱۵۳۳ء میں آسٹریا کو صلح کرنے اور خراج دینے پر مجبور کر دیا۔

مشرق میں سلیمان نے ۱۵۳۴ء میں ایرانیوں سے بغداد چھین لیا اور عراق کو سلطنت عثمانیہ

کا مستقل صوبہ بنا دیا۔ ایران سے لڑائیوں کے دوران عثمانی فوجیں اصفہان تک پہنچ گئی تھیں اور آذربائیجان اور آرمینیہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۵۳۸ء میں یمن اور عدن پر عثمانی بالادستی قائم ہوئی اور طرابلس اور الجزائر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوئے۔ تونس پر امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے ۱۵۳۴ء میں قبضہ کر لیا تھا، لیکن چارلس پنجم نے پھر واپس لے لیا اور یہ علاقے سلیمان کے بعد سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوئے۔

خیر الدین باربروسہ (۱۴۸۳ء/۸۸۸ھ تا ۱۵۴۶ء/۹۵۳ھ)

سلیمان کے زمانے میں عثمانی ترکوں کی بحری قوت بھی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ عثمانی بحری بیڑے نے نہ صرف بحیرۂ ایجین کے جزیرے فتح کیے بلکہ اٹلی، فرانس اور اسپین کے ساحلوں تک چھاپے مارے۔ بحر ہند میں ترکوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل اور ہندوستان میں گجرات تک بحری مہمیں روانہ کیں۔ یہ مہمیں پرتگالیوں کے خلاف تھیں جو ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کرنے کے بعد افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں لوٹ مار اور غارت گری کرتے رہتے تھے۔ خیر الدین باربروسہ، پیالہ پاشا متوفی ۱۵۷۸ء/۹۸۵ھ، پیری رئیس متوفی ۱۵۵۲ء/۹۵۹ھ، طورغور متوفی ۱۵۶۵ء، سدی علی متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ اس دور کے مشہور جہاز ران اور امیر البحر تھے۔

خیر الدین باربروسہ ترکوں کا سب سے بڑا امیر البحر تھا۔ اس زمانہ میں بحیرۂ روم میں وینس جنیوا اور ہسپانیہ کی بحری قوت بہت بڑھی ہوئی تھی، لیکن خیر الدین پاشا نے ان ملکوں کے متحدہ بحری بیڑے کو ۱۵۳۸ء میں پریویسا کی مشہور بحری جنگ میں شکست دے دی۔ خیر الدین نے فرانس کے شہر طولون پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور اس نے ہسپانیہ کے ساحلی علاقوں کو کئی مرتبہ تاراج کیا اور وہاں سے ستر ہزار مظلوم مسلمانوں کو نکال کر شمالی افریقہ پہنچایا۔ الجزائر خیر الدین کی بدولت سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔

خیر الدین پاشا کی قبر دارالسلطنت استنبول کے پاس بحیرہ باسفورس کے کنارے پر ہے۔ اس کے انتقال کے بعد جب بھی کوئی بیڑا لڑائی پر جاتا تھا، تو قبر کے پاس سے سلامی دیتا ہوا گزرتا تھا۔

سلیمان اعظم کی فتوحات اس وجہ سے بھی بڑی اہم ہیں کہ اس نے ایک ایسے زمانے میں اپنی سلطنت کو وسعت دی کہ جب یورپ میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور وہاں بڑی بڑی اور طاقتور

حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ فرانس کا بادشاہ فرانسس انگلستان کی ملکہ الزبتھ اور ہسپانیہ کا حکمران چارلس پنجم اس زمانہ میں یورپ کے سب سے بڑے اور طاقتور حکمران سمجھے جاتے تھے۔ سلیمان نے ان سب کی موجودگی میں سلطنت کو وسعت دی۔ وہ وسط یورپ کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کرلیا تھا۔ ویانا کو تو سلیمان فتح نہ کرسکا لیکن آسٹریا کو خراج دینے پر مجبور کردیا۔ حالانکہ ہسپانیہ کا شہنشاہ چارلس پنجم خود مقابلہ پر موجود تھا۔

سلیمان کی قواعد دان فوجیں جدید ترین اسلحہ سے آراستہ تھیں اور اتنی طاقتور تھیں کہ سلیمان ان کے ذریعہ یورپ کا بہت بڑا حصہ فتح کرلیتا، لیکن ایران سے لڑائیوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا۔ جب کبھی وہ یورپ کا رخ کرتا تھا، ایرانی مشرق سے عثمانی سلطنت پر حملہ کردیتے تھے اور سلیمان کو اپنی مہم چھوڑ کر ایران کے مقابلہ پر آنا پڑتا تھا۔ یورپ کی حکومتوں نے ایران سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ اس کو عثمانی سلطنت کے خلاف اکساتی رہتی تھیں۔ آسٹریا کا ایک سفیر کہا کرتا تھا:

''ہماری مکمل تباہی اور عثمانی سلطنت کے درمیان ایران حائل ہے''

سلیمان اعظم جتنا اپنی فتوحات کی وجہ سے ممتاز ہے اتنا ہی اپنی انتظامی قابلیت اور نیک سیرتی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم اور اصلاح کی اور کئی نئے نئے قوانین بنائے۔ ان قوانین کی وجہ سے وہ ترکوں میں سلیمان قانونی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے جو زرعی اصلاحات کیں ان کی وجہ سے کسانوں کی حالت یورپ والوں کے لیے قابل رشک بن گئی تھی اور آسٹریا اور ہنگری کے کاشتکار ہزاروں کی تعداد میں اپنا ملک چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ میں آباد ہوگئے تھے۔

سلیمان اعظم فارسی اور ترکی کا شاعر بھی تھا۔ اور ایک روزنامچہ کا مصنف ہے۔ اس میں اہم اہم واقعات لکھتا رہتا تھا۔

کارنامے

سلیمان اعظم نے علم وادب اور شاعری کی عثمانی خاندان میں سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ فضولی اور باقی جو ترکی زبان کے درجہ اول کے شاعر ہیں اس کے دور سے تعلق رکھتے تھے۔

ابو سعود آفندی اور ابراہیم حلبی اس زمانہ کے مشہور عالم تھے جنہوں نے قوانین بنانے میں سلیمان کی بڑی مدد کی۔ اس کے عہد میں مدرسے اور کتب خانے کثرت سے قائم کیے گئے۔

علم وادب کی سرپرستی کی طرح سلیمان کے زمانہ میں عمارتیں بھی جس کثرت سے بنیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ماہر تعمیر سنان نے جو اس زمانہ کا سب سے بڑا ماہر تعمیر تھا۔ تین سو سے زیادہ عمارتیں بنائیں۔ ان میں مسجدیں، محل، باغ، سرائیں، پل، مدرسے اور شفاخانے سب شامل ہیں۔ یہ عمارتیں سلطنت کے تمام اہم شہروں میں بنائی گئیں۔ اس عہد کی سب سے خوبصورت تعمیر جامع سلیمانیہ ہے جو استنبول کی سب سے خوبصورت مسجد سمجھی جاتی ہے۔

سلیمان اعظم کو عدل وانصاف کا بڑا خیال تھا اور انصاف کے معاملہ میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس کے داماد فرہاد پاشا کا واقعہ سلیمان اعظم کی انصاف پسندی کا بہترین ثبوت ہے۔ فرہاد پاشا ایک صوبہ کا حاکم تھا۔ وہاں لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور ان سے رشوت لیتا تھا۔ بادشاہ کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے فرہاد پاشا کو فوراً معزول کر دیا۔ بعد میں فرہاد پاشا کی بیوی نے جو سلیمان اعظم کی بیٹی تھی بڑی التجاؤں کے بعد اس کو دوبارہ والی بنوا دیا لیکن جب فرہاد پاشا نے پھر وہی ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا تو سلیمان نے نہ صرف اس کو معزول کر دیا بلکہ قتل کرا دیا۔

لیکن ان تمام کارناموں اور خوبیوں کے باوجود سلیمان اعظم وہ بلند مقام حاصل نہ کر سکا جو خلفائے راشدین یا عمر بن عبدالعزیزؒ کا تھا۔ بلکہ ہم اسے نورالدین، صلاح الدین اور اورنگ زیب جیسی جلیل القدر ہستیوں کے مقابلہ میں بھی پیش نہیں کر سکتے۔

نورالدین، صلاح الدین اور اورنگ زیب ایسے کام نہیں کر سکتے تھے وہ ہر فیصلہ تحقیق کے بعد کرتے تھے۔ بیت المال میں سے مقررہ رقم لیتے تھے۔ ہاں سلیمان اس قسم کا اچھا بادشاہ تھا جیسے ہارون الرشید، مامون الرشید، ملک شاہ سلجوقی اور شاہجہاں وغیرہ تھے۔ وہ ایک بادشاہ تھا، جمہوری حکمران نہیں تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا تھا۔ ہر معاملہ کو عدالت میں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے لوگوں کے بہکانے سے شبہ میں آ کر اپنے ایک [illegible] سے تنگ آ کے وزیر اعظم ابراہیم کو قتل کرا دیا۔

سلیمان اعظم شیر شاہ اور اکبر جیسے حکمرانوں کا ہمعصر تھا لیکن اس کے باوجود اپنے زمانہ کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ شیر شاہ کی سلطنت چھوٹی تھی اور اس نے صرف چار سال حکومت کی۔

اکبر نے یقیناً ایک بڑی سلطنت قائم کی جو پائدار بھی تھی لیکن سلیمان کی زندگی میں اکبر کی حکومت کو پورا عروج نہیں ہونے پایا تھا۔ اس طرح سلیمان اپنی زندگی میں دنیا کا سب سے بڑا حکمران رہا۔

سلیمان اعظم کے دور کے حکام میں خسرو بیگ متوفی ۱۵۴۲ء/۹۴۸ھ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ۹۲۴ھ تا ۹۴۸ھ بوسینیا کے والی رہے۔ انہوں نے بوسینیا اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں تین سو سے زیادہ مسجدیں، مدرسے، حمام، مسقّف بازار تعمیر کرائے۔ نیکی اور کارخیر کی کثرت کی وجہ سے ترک ان کو ایک ولی تصور کرتے ہیں۔ بوسینیا کے شہر سراجیوو میں جس کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا ان کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔

(۳)

محمد پاشا صوقوللّی

سلیمان قانونی کے بعد آل عثمان میں کچھ مدت کے لیے قابل اور باصلاحیت بادشاہوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کا لڑکا سلیم دوم (۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء) حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا، لیکن خوش قسمتی سے اس کو ایک قابل وزیر مل گیا جس کا نام محمد پاشا صوقوللّی تھا۔ وہ سلیمان کے زمانے سے وزیر اعظم چلا آرہا تھا اور اس نے ۱۵۶۴ء سے ۱۵۷۸ء تک چودہ سال ایک حقیقی حکمران کی طرح حکومت کی۔ اس کے عہد میں ۱۵۷۰ء میں قبرص اور ۱۵۷۴ء میں تونس فتح ہوئے اور ۱۵۷۷ء میں جب پرتگالیوں نے مراکش پر حملہ کیا تو سلطان مراکش کی درخواست پر الجزائر کے عثمانی والی رمضان پاشا نے فاس پہنچ کر پرتگالیوں کو شکست دی اور مراکش کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

محمد پاشا صوقوللّی کے زمانے کا ایک افسوس ناک حادثہ لپانتو کی بحری جنگ ہے۔ اس جنگ میں یورپ کے متحدہ بیڑے نے جو قبرص کو ترکوں سے واپس لینے کے لیے آرہا تھا ۱۵۷۱ء میں ترکوں کا تقریباً پورا بحری بیڑہ تباہ کردیا۔ اس جنگ میں ترکوں کے دو سو جہاز یا تو تباہ ہوگئے یا پکڑ لیے گئے اور بیس ہزار ترک شہید ہوئے۔ اس شکست کے بعد جب وینس کا سفیر صوقوللّی پاشا سے ملا تو پاشا نے اس سے کہا کہ "تم نے ہمارا بیڑہ تباہ کر کے صرف ہماری ڈاڑھی کاٹ دی ہے جو پھر

اُگ آئے گی، لیکن ہم نے قبرص فتح کر کے تمہارا بازو کاٹ دیا ہے جو پھر جوڑا نہیں جا سکتا''

اس جنگ کے بعد صوقوللی پاشا نے اولوج علی رئیس کو قلیج علی پاشا کا نام دے کر نیا امیر البحر بنایا اور اس کو نیا بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر امیر البحر نے محمد پاشا سے کہا:

''پاشا ہماری سلطنت ایک ایسی سلطنت ہے کہ اگر وہ چاہے کہ بیڑے کے تمام استول چاندی کے، رسیاں ریشم کی اور بادبان اطلس وکمخواب کے بنا دیئے جائیں تو یہ بھی ممکن ہے''

چنانچہ چند ماہ کے اندر دو سو جہاز بن کر تیار ہو گئے اور بحیرۂ روم میں حسب سابق عثمانی بیڑے کی سیادت قائم ہو گئی۔ تونس کو لپانٹو کی جنگ کے بعد ہی قلیج علی رئیس نے فتح کیا۔ سماترا کے مسلمان حکمران کی درخواست پر پرتگالیوں کے خلاف ایک بحری مہم بھی اس حادثے کے بعد ہی بھیجی گئی۔[1] سلطنت عثمانیہ صحیح معنوں میں سلیمان قانونی کے زمانے میں نہیں بلکہ محمد پاشا صوقوللی کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔ محمد صوقوللی پاشا ۱۵۷۸ء میں درباری سازشوں کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا۔

مراد چہارم

محمد صوقوللی کے بعد سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ رشوت خوری اور بدعنوانیاں عام ہو گئیں۔ درباری سازشیں شروع ہو گئیں اور حکومت میں عورتوں کا عمل دخل بڑھ گیا۔ تقریباً ستر سال تک یہی حالت رہی۔ اس عرصہ میں سوائے مراد چہارم (۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء) کے اور کوئی قابل حکمران پیدا نہیں ہوا۔ مراد چہارم بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام اس کی ماں کے سپرد تھا جو والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے مراد کی نوعمری کے زمانہ میں بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ مراد نے تخت نشین ہونے کے آٹھ سال بعد سلطنت کا انتظام خود سنبھالا۔ مراد نے سلطنت کی حالت کو سنبھالا اور اصلاح کی لیکن وہ صرف آٹھ سال تک حکومت کر سکا۔ اس کے بعد پھر خرابیاں پیدا ہو گئیں، لیکن جلد ہی ایک شخص [illegible] پریلی (۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۱ء) نے گرتی حالت درست کر دی۔

[illegible] نی ایک معمولی شخص تھا اور سلطان کے مطبخ میں کام کرتا تھا۔ وہ بھی شیر شاہ اور المنصور

---

(۱) [illegible] حالات باب [illegible] میں ملاحظہ کیجیے۔

کی طرح حیرت انگیز قابلیت کا مالک تھا۔ اَن پڑھ تھا لیکن اس کے باوجود اتنی ترقی کی کہ دمشق اور طرابلس کا والی ہوگیا اور جب سلطنت عثمانیہ کی حالت بہت خراب ہوگئی، تو سلطان نے اس کو وزیر اعظم بنا کر سارے اختیارات دے دیئے۔ محمد کوپریلی پانچ سال وزیر رہا لیکن اس نے اس مختصر مدت میں ساری خرابیاں دُور کر دیں اور سلطنت میں نئی جان ڈال دی۔

احمد کوپریلی

محمد کوپریلی کے بعد اس کا لڑکا احمد کوپریلی (۱۶۶۱ء تا ۱۶۷۶ء) وزیر اعظم ہوا۔ جس وقت وہ وزیر اعظم ہوا اس کی عمر صرف ۲۹ سال کی تھی۔ باپ نے اس کو اپنی نگرانی میں انتظام سلطنت کی تعلیم دی تھی۔

احمد کوپریلی اپنے باپ سے بھی زیادہ قابل نکلا۔ اس کے عہد میں جو کارنامے انجام دیئے گئے، ان کی وجہ سے وہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر اعظم سمجھا جاتا ہے۔

احمد کوپریلی بڑا خوش اخلاق اور منکسر مزاج تھا۔ اس کی خوبیوں کی وجہ سے لوگ اس کے گرویدہ رہتے تھے۔ وہ شرعی احکام کی پابندی سختی سے کرتا تھا اور اس کی زندگی اسلامی زندگی کا ایک قابل تقلید نمونہ تھی۔ تم پیچھے کئی جگہ پڑھ چکے ہو کہ حکمران میں جو عادتیں ہوتی ہیں ان کا سلطنت کے عہدے داروں اور دوسرے لوگوں پر بڑا اثر پڑتا ہے اور وہ اپنے آپ کو حکمران کی طرح بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، یہی حال احمد کوپریلی کا تھا۔ اس کی خوبیوں کا سلطنت کے دوسرے وزیروں اور عہدے داروں پر بھی اثر پڑا اور انہوں نے اپنی اصلاح کی۔

احمد کوپریلی نے پندرہ سال وزارت کی۔ اس عرصہ میں اس کو کئی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ والے بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ اب وہ علم و فضل میں بھی مسلمانوں سے آگے بڑھ گئے تھے اور تہذیب و تمدن میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ روس، پولینڈ، فرانس، انگلستان اور آسٹریا میں بڑی طاقتور حکومتیں قائم ہوگئی تھیں اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے یورپ والے ایسے ایسے ہتھیار استعمال کرنے لگے تھے جو اب عثمانیوں اور دوسرے مسلمانوں کے پاس نہیں تھے۔ ان کی فوجوں کی تنظیم بھی اب عثمانی ترکوں سے بہتر ہوگئی تھی۔ عثمانی ترکوں نے سلیمان اعظم کے بعد سے جنگی لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی۔ وہ اب تک

وہی ہتھیار استعمال کرتے تھے جو سلیمان اعظم کے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔اس کی وجہ سے عثانی فوجوں کو یورپ کی فوجوں پر اب تک جو برتری حاصل تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

فتوحات

احمد کوپریلی کو پولینڈ، آسٹریا اور فرانس سے لڑائیاں لڑنی پڑیں اور ان لڑائیوں میں اس کو ان ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ احمد کوپریلی کو دو لڑائیاں ہارنی پڑیں۔ان میں ایک لڑائی سینٹ گوتھرڈ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔یہ مقام آسٹریا میں ہے اور یہاں ۱۶۶۴ء میں آسٹریا کی فوجوں سے جن کی مدد کے لیے فرانسیسی فوج آئی ہوئی تھی ترکوں کی جنگ ہوئی اور ترکوں کو کثرت تعداد کے باوجود شکست ہوئی لیکن ان شکستوں کا عثانی سلطنت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔احمد کوپریلی نے دو لڑائیاں ہارنے کے باوجود پولینڈ سے پوڈولیا کا صوبہ لے لیا اور آسٹریا سے بھی کئی اضلاع حاصل کر لیے، اور تاوان جنگ وصول کیا اور روس کے علاقہ یوکرائن پر عثانی سیادت قائم کر لی۔بحری کارروائیوں میں احمد کوپریلی کا سب سے بڑا کارنامہ جزیرۂ کریٹ کی فتح ہے۔اس جزیرہ پر ۱۶۶۹ء میں ترکوں کا قبضہ ہوا۔اس کے عہد میں جو فتوحات ہوئیں وہ عثانی سلطنت کی آخری فتوحات تھیں۔ان کے بعد عثانی سلطنت میں کسی علاقہ کا اضافہ نہیں ہوا۔

ان فتوحات کے علاوہ اندرون ملک میں احمد کوپریلی نے جو اصلاح کی اس کی وجہ سے اس کی عظمت اور بڑھ گئی۔اس نے ملک کے اندر امن وامان قائم کیا، محصول ہلکے کر دیے، عوام کو ظالم جاگیرداروں کے ظلم سے نجات دلائی۔سلطنت کا مالی انتظام اتنا اچھا کیا کہ خزانہ بھر گیا۔احمد کوپریلی اپنے باپ کے برخلاف بڑا رحم دل تھا۔اس نے یہ تمام اصلاحات بغیر کسی ظلم یا تشدد کے پورے انصاف کے ساتھ کیں۔اس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی۔عیسائیوں کے گرجوں کی تعمیر پر سے پابندیاں اٹھا دیں جس کی وجہ سے عیسائی اس سے خوش ہو گئے۔احمد کوپریلی عہد و پیماں کا بڑا پابند تھا۔علوم و فنون کا سرپرست تھا، جس کی وجہ سے ترک اس کو احمد فاضل بھی کہتے ہیں۔

۱۶۷۶ء میں یہ اچھا وزیر اعظم جو دہلی کے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا ہمعصر تھا، اس دنیا

سے چل بسا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۴۱ سال تھی۔ پندرہ سال کی مختصر مدت میں اس نے جو کارنامے انجام دیئے وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ویانا کا محاصرہ

احمد کوپریلی کے بعد ایک شخص قرہ مصطفیٰ وزیراعظم ہوا، لیکن اس شخص میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی۔ اس نے ۱۶۸۳ء میں ویانا کا محاصرہ کیا لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ یورپ کی حکومتیں ایسے موقع کا انتظار کر رہی تھیں کہ جس سے ترکوں کی کمزوری ظاہر ہو جائے۔ ویانا کے محاصرہ میں ناکامی سے یہ موقع ان کو مل گیا۔ چنانچہ روس آسٹریا وینس اور پولینڈ نے مل کر سلطنت عثمانیہ پر ہر طرف سے حملہ کر دیا۔ ترک کئی سال تک ان کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن بالآخر ان کو شکست ہوئی اور ۱۶۹۹ء میں کارلوٹز کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

معاہدہ کارلوٹز کے بعد ترکوں کے عروج کا زمانہ ختم ہو گیا۔

سلطنت عثمانیہ

(۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ تا ۱۹۲۴ء)

عہد عروج (۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ تا ۱۶۹۹ء/۱۱۱۰ھ)

(۱) عثمان خاں اول	۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ تا ۱۳۲۶ء/۷۲۶ھ
(۲) اُور خاں	۱۳۲۶ء/۷۲۶ھ تا ۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ
(۳) مراد اول	۱۳۵۹ء/۷۶۰ھ تا ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ
(۴) بایزید اول	۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ تا ۱۴۰۲ء/۸۰۵ھ
(۵) محمد اول	۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ تا ۱۴۲۱ء/۸۲۴ھ
(۶) مراد دوم	۱۴۲۱ء/۸۲۴ھ تا ۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ
(۷) محمد فاتح	۱۴۵۱ء/۸۵۵ھ تا ۱۴۸۱ء/۸۸۶ھ

(۸) بایزید دوم	۱۴۸۱ء/۸۸۶ھ تا ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ
(۹) سلیم اول	۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ تا ۱۵۲۰ء/۹۷۴ھ
(۱۰) سلیمان اعظم	۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ تا ۱۵۶۶ء/۹۷۴ھ
(۱۱) سلیم دوم	۱۵۶۶ء/۹۷۴ھ تا ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ
(۱۲) مراد سوم	۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ تا ۱۵۹۵ء/۱۰۰۴ھ
(۱۳) محمد سوم	۱۵۹۵ء/۱۰۰۴ھ تا ۱۰۱۲ء۱۶۰۳ھ
(۱۴) احمد اوّل	۱۶۰۳ء/۱۰۱۲ھ تا ۱۶۱۷ء/۱۰۲۶ھ
(۱۵) مصطفیٰ اول	۱۶۱۷ء/۱۰۲۶ھ تا ۱۶۱۸ء/۱۰۲۶ھ
(۱۶) عثمان دوم	۱۶۱۸ء/۱۰۲۶ھ تا ۱۶۲۳ء/۱۰۳۲ھ
(۱۷) مراد چہارم	۱۶۲۳ء/۱۰۳۲ھ تا ۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ
(۱۸) ابراہیم	۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ تا ۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ
(۱۹) محمد چہارم	۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ تا ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ
(۲۰) سلیمان دوم	۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ تا ۱۶۹۱ء/۱۱۰۳ھ
(۲۱) احمد دوم	۱۶۹۱ء/۱۱۰۳ھ تا ۱۶۹۵ء/۱۱۰۶ھ
(۲۲) مصطفیٰ دوم	۱۶۹۵ء/۱۱۰۶ھ تا ۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ

اہم واقعات

۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ ۲۔رجب ۲۴۔اگست کو سلیم نے اسمٰعیل صفوی کو چالدران کی جنگ میں شکست دی۔

۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ حلب کے پاس مرج دابق کی جنگ میں سلیم نے مملوکوں کو شکست دی۔

پھر ۲۹۔ذی الحجہ (۲۲۔جنوری) کو قاہرہ کے پاس ادانیہ کی جنگ میں شکست دی۔

۱۵۱۸ء/۹۲۳ھ عباسی خلافت کا خاتمہ اور خلافت کی عثمانیوں میں منتقلی۔

۱۵۲۱ء/۹۲۹ھ ۲۵۔رمضان ۲۹۔اگست کو بلغراد فتح۔ وینس باجگذار۔

۱۵۲۲ء/۹۲۹ھ پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد ایلاڈس فتح (۶۔صفر، ۲۵۔دسمبر)

۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ سلیمان نے موہاکز جنگ (۲۸۔اگست) میں شکست دے کر ہنگری پر قبضہ کرلیا۔

۱۵۲۹ء/۹۴۱ھ ویانا کا پہلا محاصرہ۔

۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ تبریز پر سلیمان کا قبضہ۔ ۳۱۔دسمبر کو بغداد فتح۔

۱۵۳۸ء/۹۴۵ھ عدن پر ترکوں کا قبضہ۔ پرویسیا کی بحری جنگ میں خیر الدین باربروسہ نے یورپ کے متحدہ بیڑے کو شکست دی۔ (ستمبر)

۱۵۴۷ء/۹۵۴ھ آسٹریا باجگذار۔

۱۵۶۰ء/۹۶۷ھ حربہ کی بحری جنگ میں پیالہ پاشا نے یوروپی بیڑہ کو شکست دی (۱۴۔مئی)

۱۵۶۵ء/۹۷۳ھ مالٹا پر ترکوں کا حملہ۔

۱۵۷۱ء قبرص پر ترکوں کا قبضہ۔ لپانٹو کی جنگ میں ترکی بحری بیڑہ تباہ (۱۷۔اکتوبر)

۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ تونس پر ترکوں کا قبضہ۔

۱۵۸۳ء داغستان کی فتح۔

۱۶۲۲ء ترکی میں پہلے برطانوی سفیر تامس رو کی آمد۔

۱۶۲۳ء بغداد پر ایران کا قبضہ۔

۱۶۳۵ء اریوان (آرمینیہ) پر ترکوں کا قبضہ۔

۱۶۳۸ء بغداد ایرانیوں سے واپس لے لیا گیا۔ (دسمبر)

۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ سینٹ گوتھرڈ کی جنگ میں آسٹریا نے ترکوں کو شکست دی۔ یہ ترکوں کی پہلی بڑی شکست تھی۔

۱۶۶۸ء/۱۰۸۹ھ کریٹ پر ترکوں کا قبضہ۔

۱۶۷۲ء پوڈولیا کی فتح۔

۱۶۸۳ء ویانا کا دوسرا محاصرہ۔

۱۶۸۷ء/۱۰۹۸ھ موہاکز کی دوسری جنگ (۱۲۔اگست) ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۶۹۶ء روس نے ازوف ترکوں سے چھین لیا۔

۱۶۹۷ء زنتا کی جنگ میں ترکوں کی شکست۔

۱۶۹۹ء/۱۱۱۰ھ (۲۴ رجب ۔ ۲۶ جنوری) معاہدہ کارلووٹز جس کے تحت ترکوں کو ہنگری اور بعض دوسرے علاقوں پر مسیحی قبضہ تسلیم کرنا پڑا۔

باب ۱۶

ملت اسلامیہ کا دل۔ استنبول

(۱) نظامِ حکومت

سلطنت عثمانیہ کی قوت اور پائیداری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا سیاسی، انتظامی اور فوجی نظام ٹھوس بنیادوں پر قائم تھا۔ اگرچہ اس زمانے کے دستور کے مطابق عثمانی سلطنت بھی موروثی بادشاہت تھی اور بادشاہ مختار مطلق ہوتا تھا، لیکن وہ قانون سلطنت کا پابند تھا۔ اس قانون کے تحت بادشاہ کے بعد وزیر اعظم کا مقام تھا، جس کو ترکی میں صدر اعظم کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد شیخ الاسلام کا عہدہ تھا جس کا تقرر بادشاہ، مملکت کے ممتاز ترین علماء میں سے کرتا تھا۔ شیخ الاسلام دینی امور کی نگرانی کے علاوہ اس بات کا بھی ذمہ دار تھا کہ قانون اور احکام، شریعت کے مطابق نافذ کیے جائیں، چنانچہ حکومت اہم اقدامات کے موقع پر شیخ الاسلام کی منظوری حاصل کرتی تھی، اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ اگر کوئی فیصلہ شیخ الاسلام کے فتوے کے خلاف ہوتا تھا تو اس پر عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ میں بادشاہ کے استبداد میں ایک حد تک کمی آ گئی تھی۔

قانون نامہ

قانون نامہ کی رو سے محمد فاتح کے بعد سب سے بڑا لڑکا تخت نشین ہوسکتا تھا اور وہ تخت پر بیٹھتے وقت اپنے تمام بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ لیکن سلطان احمد اول (۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء) کے زمانے میں یہ قانون بدل دیا گیا اور یہ طے پایا کہ خاندان کا سب سے سن رسیدہ شہزادہ بادشاہ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہو، دوسرے شہزادوں کو اس کی زندگی میں تخت حاصل کرنے کا حق نہ ہوگا۔ ان واضح قوانین کی وجہ سے ہمیں سلطنت عثمانیہ میں بادشاہ کے مرنے کے بعد شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی اور خونریزی کے وہ مناظر نظر نہیں آتے، جو دوسرے مسلم ملکوں کی تاریخ میں عام ہیں۔

محمد فاتح کے قانون نامہ کی رو سے سلطنت کی بنیاد چار ستونوں پر قائم تھی۔ (۱) وزرائے سلطنت۔ (۲) قضاۃ عسکر، یعنی فوج کے قاضی (۳) دفتر دار یعنی خازن۔ (۴) نشانچی۔ وزیروں

کی تعداد بالعموم سات ہوتی تھی، قاضی عسکر یعنی وزیر انصاف، دفتر دار، نشانچی (وزیر مالیات)، کپتان پاشا (امیر البحر)، ینی چری آغاز (وزیر جنگ)، اور رئیس الکتاب (چیف سکرٹری)، ساتواں وزیر صدر اعظم ہوتا تھا۔

مختلف مناصب پر فائز ہونے والے لوگوں کو باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ یہ تربیت عام طور پر قصر شاہی کے ایک حصے میں دی جاتی تھی جس کو ''اندرون'' کہا جاتا تھا۔ عہدے داروں کو ترقی کے لیے تدریجی مراحل طے کرنا پڑتے تھے۔ سلیمان قانونی کے زمانے تک بادشاہ براہ راست کسی شخص کو ترقی دے کر اعلیٰ عہدہ نہیں دے سکتا تھا، لیکن سلیمان کے بعد اس طریقہ پر عمل کمزور پڑ گیا اور یہ بات بھی زوالِ سلطنت کا باعث بنی۔

بادشاہ کو امورِ مملکت میں مشورے دینے کے لیے ایک مجلس قائم تھی جس کو ''دیوان'' کہا جاتا تھا۔ تمام وزیر اس مجلس کے رکن شمار ہوتے تھے۔ دیوان کا اجتماع بادشاہی محل توپ قاپی سرائے کے ایک کمرے میں ہوتا تھا، بعد میں اس کمرے کا نام بھی دیوان پڑ گیا۔ اجتماع چھٹی کے دنوں کے علاوہ روزانہ صبح سے سہ پہر تک ہوتا تھا۔ شروع میں دیوان کی صدارت بادشاہ کرتا تھا، لیکن بعد میں وزیر اعظم صدارت کرنے لگا اور بادشاہ نے مجلس میں آنا چھوڑ دیا اور وہ ایک جالی دار کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر مجلس کی کاروائیاں سننے لگا۔ سلیمان قانونی کے بعد یہ طریقہ بھی ختم ہو گیا اور بادشاہ نے مجلس میں آنا بالکل ترک کر دیا۔ قوجی بے نے دیوان سے بادشاہ کی اس بے تعلقی کو سلطنت کے اسبابِ زوال میں سے ایک سبب بتایا ہے۔

محمد فاتح کے بعد سے عبدالمجید کے دور تک عثمانی سلاطین توپ قاپو سرائے میں رہتے تھے۔ عبدالمجید ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ میں نو تعمیر دولمہ باغچے محل میں جو باسفورس کے کنارے ہے، منتقل ہو گیا۔ صدر اعظم جس مکان میں رہتا تھا، اس کو پہلے پاشا قاپوسی (پاشا کا دروازہ) کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کو باب عالی کہنے لگے اور یہ نام آخر وقت تک مروج رہا اور باب عالی کا مفہوم سلطنت عثمانیہ ہو گیا۔

انتظامِ مملکت

انتظامی لحاظ سے سلطنت عثمانیہ دو قسم کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ ایک وہ جو براہ راست عثمانی

سلطنت کے زیر انتظام ہوتے تھے اور دوسرے باجگذار علاقے۔ قرم (کریمیا) افلاق (ولاچیا)، بوغدان (مولڈاویا) ایردیل (ٹرانسلوانیا)، یمن اور حجاز باجگذار ریاستوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان باجگذار ریاستوں کے مقامی حاکموں کو عثمانی خطاب دیئے جاتے تھے اور بعض اوقات ان میں عثمانی نمائندہ بھی رہتا تھا۔ حجاز کے علاوہ یہ تمام باجگذار علاقے مرکزی حکومت کو خراج دیتے تھے۔ لیکن حجاز کے اخراجات سلطنت عثمانیہ خود پورے کرتی تھی۔ وہاں کے حاکم کو شریف کہا جاتا تھا اور اس کا تقرر خاندان رسالت میں سے ہوتا تھا۔ براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام ملکوں کے حاکم والی کہلاتے تھے۔ یوروپی مقبوضات پر مشتمل علاقہ رومیلی کہلاتا تھا اور اس کا والی ''بیگ لربے'' کہلاتا تھا اور اس کا صدر مقام عام طور پر ادرنہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کو اناطولیہ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کا والی بھی بیگ لربے کہلاتا تھا۔ اناطولیہ کے بیگ لربے کا صدر مقام تاہیہ تھا۔ قاضی عسکر بھی دو ہوتے تھے۔ ایک رومیلی کا اور دوسرا اناطولیہ کا۔ یہ دونوں اپنے اپنے علاقوں کی عدالتوں کے سربراہ ہوتے تھے۔

فوج اور بحریہ

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عثمانی دیوان یا کابینہ میں فوجوں کو بھی نمائندگی دی گئی تھی۔ ینی چری فوج کی نمائندگی ینی چری آغا اور بحری فوج کی نمائندگی کپتان پاشا یا امیر البحر کرتا تھا۔ ترکوں کی بری فوج دنیا کی سب سے طاقتور فوج تھی۔ یہ مختلف حصوں پر مشتمل تھی۔ سب سے اہم ینی چری کے پیدل دستے تھے جس کو دنیا کی پہلی مستقل فوج قرار دیا جاتا ہے۔ اس کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی اور وہ فوجی بارکوں میں رہتی تھی۔ اس کو باقاعدہ فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ شروع میں ینی چری فوج ان نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو عیسائیوں سے خراج کے طور پر لیے جاتے تھے اور پھر ان کی تربیت اسلامی ماحول میں ہوتی تھی۔ عیسائی آبادی کے بچوں کو فوج میں بھرتی کے اس طریقے کو دیوشرمہ کہا جاتا تھا۔ ینی چری کے فوجی ترقی کے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ سکتے تھے۔ شروع شروع میں سلطان خود بھی ینی چری سپاہی کی حیثیت رکھتا تھا اور صف میں کھڑا ہو کر باقاعدہ تنخواہ وصول کرنے جاتا تھا۔ عثمانی فوج کے دوسرے دستے سواروں، رضا کار سپاہ، آکنجی یا چھاپہ مار دستوں اور جاگیرداروں کی بے قاعدہ فوج پر مشتمل ہوتے تھے، جن کو وقت پڑنے پر طلب کر لیا جاتا تھا۔

ترکی بحریہ بھی اپنے زمانے کے طاقتور ترین بحریوں میں سے تھا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ترکی بیڑہ تین سو جہازوں پر مشتمل تھا۔ یہ جہاز اپنے قدو قامت اور خصوصیات کے لحاظ سے قالیون، قادرغہ، قالیند، باشتردہ اور چیکیتیری کہلاتے تھے۔ قالیون ان میں سب سے بڑا ہوتا تھا اور بادبان سے چلتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر توپیں نصب ہوتی تھیں اور ہر جہاز میں دو ہزار سپاہی اور ملاح ہوتے تھے۔ امیر البحر کو کپتان دریا یا کپتان پاشا کہا جاتا تھا اور اس سے چھوٹے امیر البحر کو ریس کہا جاتا تھا۔

یہ تھا نظام جو سلطنت عثمانیہ کی قوت اور پائیداری کا باعث تھا۔ اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں میں حکومتیں اپنے مستحکم نظام پر قائم نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلد ختم ہو جاتی تھیں، لیکن سلطنت عثمانیہ اپنے مستحکم نظام حکومت کی بدولت تقریباً چھ سو سال قائم رہی۔ مسلمانوں کی کوئی سلطنت اتنے طویل عرصے قائم نہیں رہی۔

ہر اسلامی ملک کی طرح سلطنت عثمانیہ میں غیر مسلم رعایا سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور ان سے صرف جزیہ لیا جاتا تھا۔ جزیہ کے معاوضہ میں ان کو جانی و مالی تحفظ حاصل تھا اور وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔

صنعت و حرفت کے معاملے میں سلطنت عثمانیہ خود کفیل تھی۔ یورپ سے سامان تعیش کے علاوہ کوئی چیز درآمد نہیں کی جاتی تھی۔ قالین سازی کی صنعت اور چینی کے ظروف کی صنعت سلطنت عثمانیہ کی قابل ذکر صنعتیں تھیں۔ اس دور میں مصوری کو بھی فروغ ہوا، لیکن فنون لطیفہ جس چیز میں ترکوں نے کمال حاصل کیا وہ فنِ خطاطی ہے۔ احمد شمس الدین قرہ حصاری (۱۴۶۸ء تا ۱۵۵۶ء) سلیمان قانونی کے دور کے سب سے بڑے خطاط تھے۔ سلیمانیہ اور دوسری عمارتوں پر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتبے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

(۲) دارالخلافہ استنبول

ہمارے عظیم شاعر اقبال نے استنبول کو جس کا پرانا نام قسطنطنیہ ہے، ملت اسلامیہ کا دل کہا ہے۔ استنبول کو آجکل ملت اسلامیہ کا دل کہنا صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن عثمانی ترکوں کے زمانہ میں یہ شہر یقیناً دنیائے اسلام کا دل تھا۔ اس شہر کو مسلمانوں نے کئی سو سال کی کوششوں کے بعد فتح کیا تھا اور

جب فتح ہوگیا تو تقریباً پانچ سو سال تک اسلامی دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت کا دارالحکومت بنا رہا۔ عثمانی ترکوں کے عروج کے زمانہ میں یورپ کی بڑی بڑی طاقتور حکومتیں اس کی عظمت کے آگے اپنے سر جھکاتی رہیں اور جب عثمانیوں کو زوال ہوا تو یہ ڈھائی سو سال تک یورپ کے حملوں کے خلاف اسلامی دنیا کی مدافعت کا سب سے بڑا مرکز بنا رہا۔

عثمان خاں کے زمانہ میں جب عثمانی ترکوں نے اپنی مختصر سی جاگیر کو بڑھا کر ایک ریاست کی شکل دے دی تو انہوں نے بروصہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ جو ایشیائے کوچک کے شمال مغربی گوشہ میں آباد ہے۔ ۱۳۶۱ء تک بروصہ ہی عثمانیوں کا دارالحکومت رہا۔ اس کے بعد ادرنہ (ایڈریا نوپل) جو یورپ میں واقع ہے، دارالحکومت بنا، لیکن بروصہ سے عثمانی سلاطین کی دلچسپی اس کے بعد بھی قائم رہی اور وہ اس خوبصورت شہر کو جو ایک سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں آباد ہے برابر ترقی دیتے رہے۔ یہاں انہوں نے مسجدیں بنائیں، مدرسے تعمیر کیے، شفاخانے قائم کیے اور مرنے کے بعد اسی شہر میں دفن ہوتے رہے۔ عثمانیوں کے اس دور کی بنائی ہوئی خوبصورت یادگاریں آج بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ بروصہ سے عثمانیوں کی یہ دلچسپی ۱۴۵۱ء تک قائم رہی۔ اس سال محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے اس کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اس وقت سے ۱۹۲۴ء تک یعنی پونے پانچ سو سال اس کی یہ حیثیت قائم رہی۔ اس زمانہ میں اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام شہر اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور استنبول آج بھی ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔

استنبول سمندر کی ایک کھاڑی کے کنارے جو "شاخ زرین" کہلاتی ہے بڑی خوبصورت جگہ آباد ہے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت موقع دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں۔ جب یہ شہر ترکوں کے قبضہ میں آگیا تو انہوں نے اس کو ہر طرح سے ترقی دی۔ مسجدیں، مدرسے، شفاخانے، سرائیں، محل اور ضرورت کی دوسری عمارتیں کثرت سے بنائیں۔ یہ عمارتیں ایسی خوبصورت ہیں کہ سیاحوں کا کہنا ہے کہ قدرت کے حسن اور انسان کی کاریگری کا جتنا اچھا ملاپ استنبول میں پایا جاتا ہے کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا۔ ایک پاکستانی سیاح نے اس شہر کی سیر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"یہاں لازوال قدرت اور انسان کی فنی مہارت نے مل جُل کر شہر کا رُوپ نکھارا ہے۔ یہاں قدرت کی فیاضی اور انسان کی کاریگری جیب و گریبان کی طرح ایک دوسرے کے

قریب ہیں۔ قدم قدم پر سبزہ کی گلکاریاں ایسا رنگ جما رہی ہیں کہ اس کی مثال بہت کم ملکوں میں ملے گی اور جب یادگار عمارتوں کا جائزہ لیا جائے، تب بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے شاہکار اور کس جگہ دیکھے جاسکتے ہیں''۔[1]

استنبول کی قابل دید تاریخی عمارتوں میں ایک ایا صوفیہ ہے۔ یہ مسلمانوں سے پہلے رومیوں کے عہد کی تعمیر ہے۔ پہلے اس کی حیثیت گرجا کی تھی۔ محمد فاتح نے شہر فتح کرنے کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا اور اس میں چار نوک دار مینار لگا کر اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا۔ یہ خوبصورت نوکدار مینار عثمانیوں کے طرز تعمیر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہیں۔ آج کل اس عمارت میں مسجد کی بجائے عجائب گھر ہے۔ محمد فاتح نے شہر میں مدرسے اور شفاخانے بھی قائم کیے اور دو بڑی مسجدیں تعمیر کیں جو جامع ایوب اور جامع فاتح کہلاتی ہیں۔ جامع ایوب مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ کی یاد میں تعمیر کی گئی تھی جو امیر معاویہؓ کے زمانہ میں قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران انتقال کر گئے تھے۔

سنان

سلیمان اعظم کے زمانہ میں استنبول اپنے عروج پر پہنچ گیا، لیکن شہر کو خوبصورت عمارتوں سے سجانے کا سہرا جس کے سر ہے وہ خواجہ سنان ۱۵۸۹ء/۸۹۵ھ تا ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ہیں۔ سنان بڑی صلاحیت کے انسان تھے۔ وہ ایک فوجی ہونے کے علاوہ ایک بے مثل انجینئر بھی تھے۔ سلیمان اعظم کے زمانہ میں انہوں نے بلغراد، رہوڈس اور ہنگری کی فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو میر تعمیر مقرر کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں تین سو سے زیادہ عمارتیں بنائیں جن کی تفصیل یہ ہے:

مسجدیں	۱۳۱	پل	۸
مدرسے	۵۵	مسقف نہریں	۷
دارالقرآن	۷	حمام	۳۳
شفاخانے	۳	محل	۳۴

(۱) یورپ نامہ حصہ اول از حکیم محمد سعید صفحہ ۱۶۹۔۱۷۰۔

کارواں سرائے	۱۳	خزانہ کی عمارتیں	۳
عام مطبخ	۱۶	مقبرے	۱۹

یہ عمارتیں اگرچہ پوری سلطنت میں بنائی گئی تھیں لیکن ان کی بڑی تعداد دارالسلطنت استنبول ہی میں تعمیر کی گئی۔ سنان کی بنائی ہوئی سب سے شاندار عمارت جامع سلیمانیہ ہے جو استنبول کی سب سے بڑی خوبصورت مسجد ہے اور عثمانی طرز تعمیر کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔ خواجہ سنان کو اس مسجد کی تعمیر پر بڑا فخر تھا۔ وہ کہتے تھے ''کہ اس مسجد کی تعمیر سے پہلے میری حیثیت ایک مبتدی کی تھی لیکن اس مسجد کو مکمل کرنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ مَیں نے اپنے فن میں کمال حاصل کرلیا ہے اور اب صحیح معنوں میں مجھے اعلیٰ معمار کہا جاسکتا ہے'' سنان کے شاگرد بھی بڑے لائق ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے اچھا شاگرد یوسف برکو چک پاکستان و ہند آ گیا تھا اور یہاں اس نے اکبر کے زمانہ میں لاہور، دہلی اور آگرہ میں شاندار عمارتیں بنائیں۔

استنبول کا بڑا بازار بھی سلیمان اعظم کے زمانہ کا ہے۔ اگرچہ اس بازار کی بنیاد محمد فاتح نے ڈالی تھی لیکن یہ اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ سلیمان اعظم کے عہد میں تعمیر ہوا۔ یہ پورے کا پورا بازار مسقّف ہے، یعنی کھلا ہوا نہیں ہے بلکہ اوپر چھت پڑی ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی پانچ ہزار دوکانیں ہیں جن میں معمولی معمولی چیزوں سے لے کر انتہائی قیمتی اور نایاب چیزیں مل سکتی ہیں۔ یہ اپنی قسم کا دنیا میں سب سے بڑا بازار ہے اور اپنی دلکشی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ جو سیاح بھی استنبول آتا ہے اس بازار کو ضرور دیکھتا ہے۔ بازار کا نام کپالی چارشی ہے۔

سلیمان کے بعد بھی شہر میں خوبصورت عمارتوں کا اضافہ ہوا۔ ان میں جامع سلطان احمد اور ینی جامع قابل ذکر ہیں۔ جامع سلطان احمد، خواجہ سنان کے ایک شاگرد محمد آغا کی بنائی ہوئی ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چار کی بجائے چھ مینار ہیں۔ اس مسجد میں چونکہ نیلے رنگ کے نقش ونگار کثرت سے ہیں اس لیے اُسے نیلی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ ینی جامع سلطان مراد چہارم کی والدہ کی بنوائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے والدہ جامع بھی کہلاتی ہے۔ اس مسجد کے صرف دو مینار ہیں لیکن گنبد بے شمار۔ مسجد اس خوبی سے بنائی گئی ہے کہ اگر نمازی مسجد کے آخری حصہ پر کھڑا ہو تب بھی اسے امام کی قرأت اسی طرح سنائی دے گی جس طرح پہلی صف میں کھڑے ہونے والوں کو سنائی دیتی ہے۔

استنبول کی خوبصورتی اور سلطنت عثمانیہ کی قوت اور شان وشوکت نے ترکوں کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ دنیا میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ دنیا کا کوئی شہر استنبول کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ سلطان اعظم نے اپنے امیر البحر سید علی کو پرتگالیوں کو نکالنے کے لیے خلیج فارس کے علاقہ میں بھیجا۔ پرتگالیوں کو شکست دینے کے بعد اس کے جہاز طوفان میں پھنس گئے اور وہ بڑی مشکل سے گجرات کے ساحل پر پہنچا۔ وہاں سے سید علی احمد آباد، آگرہ، دہلی، لاہور، کابل اور ایران ہوتا ہوا استنبول پہنچا۔ ایران میں وہاں کے بادشاہ طہماسپ صفوی سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ سید علی نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کی سیر کی ہے اس سے یہ پوچھا ''بتاؤ تمہیں کونسا شہر سب سے زیادہ پسند ہے'' سید علی کے لیے یہ بڑا مشکل سوال تھا اس لیے کہ ایران اور ترکی میں مستقل لڑائی چھڑی ہوئی تھی اور ایسی صورت میں استنبول کی تعریف کرنا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ لیکن سید علی نے اس کے باوجود نہایت بیباکی سے جواب دیا کہ:

''مجھے استنبول سب سے زیادہ پسند ہے''

''کیوں پسند ہے'' طہماسپ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ساری دنیا میں کوئی شہر استنبول کی طرح نہیں اور نہ ہی ترکوں کے ملک کی طرح کوئی دوسرا ملک ہے، نہ ترک فوج کی طرح کوئی فوج ہے اور نہ ہمارے بادشاہ کا مقابلہ کوئی دوسرا بادشاہ کر سکتا ہے'' محمد فاتح کے زمانے میں استنبول کی آبادی ایک لاکھ تھی لیکن سترھویں صدی میں شہر کی آبادی پندرہ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

(۳) علم وادب

استنبول کو صرف وسعت آبادی اور عمارتوں کی خوبصورتی کی وجہ سے امتیاز حاصل نہیں تھا، بلکہ یہ شہر سلطنت عثمانیہ میں علم وادب کا بھی سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں خاص طور پر اسلامی دنیا کی علمی زندگی میں اس کو وہی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جو اس سے پہلے کی دو صدیوں میں قاہرہ اور ہرات کو حاصل تھی۔ عثمانی سلاطین نے ہر بڑے شہر میں مدرسے تعمیر کیے۔ استنبول میں تو مدرسوں کی تعداد بے شمار تھی۔ جامع فاتح اور جامع سلیمانیہ کے ساتھ جو

مدرسے تعمیر کیے گئے تھے وہ اپنے وقت کی تعلیم کے اعلیٰ ترین ادارے تھے۔ عثمانی سلاطین کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی وہ بڑی مسجد تعمیر کرتے تھے تو اس کے ساتھ ہی شفا خانوں، مدرسوں اور کتب خانوں کے لیے عمارتیں بھی بناتے تھے اور عمارتوں کا یہ پورا مجموعہ کلیہ کہلاتا تھا۔ استنبول، ادرنہ اور رماسیہ میں یہ کلیے اب تک موجود ہیں۔ اور ادرنہ اور رماسیہ کے کلیے بایزید ثانی کے زمانے میں تعمیر کیے گئے تھے۔ اسلامی ہند میں بھی اس زمانے میں بکثرت بلند پایہ اہل علم پیدا ہوئے لیکن وہ دہلی، لاہور، آگرہ، جونپور اور دوسرے شہروں میں منتشر تھے۔ اس کے برخلاف سلطنت عثمانیہ کے اہل علم اور اہل حق حضرات کی اکثریت استنبول میں جمع ہوگئی تھی۔

غزنویوں اور سلجوقیوں کے زمانے سے ترکوں نے اسلامی دنیا کے بیشتر حصے میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، لیکن انہوں نے اب تک ہر جگہ عربی اور فارسی زبان کی سرپرستی کی۔ وسط ایشیا کے تیموری سلاطین کے دَور میں اگرچہ علی شیر نوائی اور بابر جیسے ترکی زبان کے بلند پایہ مصنف ہوئے ہیں، لیکن سرپرستی انہوں نے بھی فارسی ہی کی کی۔ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے زوال کے بعد جب مختلف ترک ریاستیں قائم ہوئیں تو ان میں سے ایک قرامان کی ریاست تھی۔ اس ریاست کے حکمران اوغلو محمد نے ۱۲۷۷ء میں پہلی مرتبہ ترکی کو سرکاری زبان کی حیثیت دی۔ اس کے بعد عثمانیوں کے دَور میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی اور پہلے بروصہ اور اس کے بعد ادرنہ اور استنبول ترکی زبان میں تصنیف و تالیف کے مرکز بن گئے اور یہاں ترکی زبان کے شاعروں اور نثر نویسوں کی سرپرستی کی گئی۔ ترکی کے ساتھ ساتھ سلطنت عثمانیہ میں عربی اور فارسی کا رواج بھی برقرار رہا۔ دینی اور علمی کتابیں زیادہ تر عربی میں، تاریخی، جغرافیائی اور ادبی کتابیں ترکی زبان میں لکھی جاتی تھیں اور شاعری ترکی اور فارسی دونوں میں کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور میں ترکی کے بیشتر بڑے مصنف تینوں زبانوں میں ماہر ہوتے تھے اور بعض تینوں زبانوں میں کتابیں بھی لکھتے تھے۔ سلطان سلیم اول ترکی کے علاوہ فارسی کا بھی اچھا شاعر تھا۔

ترک علماء میں غالباً پہلی ممتاز علمی شخصیت شمس الدین محمد فناری (۷۵۱ھ تا ۸۳۴ھ) کی ہے جو ملا فناری کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ترکی کے پہلے شیخ الاسلام ہیں۔ اس عہدے پر اُن کو سلطان مراد دوم نے مقرر کیا تھا۔ تفسیر، فقہ اور منطق پر انہوں نے عربی میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔

حاجی بیرم ولی (۱۳۵۲ء/۷۵۳ھ تا ۱۴۲۹ء/۸۳۳ھ) ملا فناری کے ہمعصر تھے۔ ملا فناری کا مرکز بروصہ تھا تو حاجی بیرم ولی کا انقرہ۔ وہ تصوف کے سلسلۂ بیرامیہ کے بانی ہیں اور ترکی کے ممتاز اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ محنت مزدوری کر کے روزی کماتے تھے اور جود و سخا کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے پوری زندگی شریعت کے مطابق گذاری لیکن ان کے بعد ان کے بعض مرید گمراہی کے راستے پر چلے گئے۔

مشہور عالم آق شمس الدین (۱۳۸۹ء تا ۱۴۵۸ء) حاجی بیرم کے مرید تھے۔ دینی علوم اور علم طب پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ استنبول کی فتح کے بعد حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر کی نشان دہی آق شمس الدین ہی نے کی تھی۔ ان کا شمار بھی ترکی کے اولیاء میں ہوتا ہے۔ خضر بیگ (۱۴۰۷ء/۸۱۰ھ تا ۱۴۵۸ء/۸۶۳ھ) ایک ممتاز عالم اور شاعر تھے اور ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ استنبول کے پہلے قاضی تھے۔

ملا خسرو متوفی ۱۴۸۰ء خضر بیگ کے بعد استنبول کے دوسرے قاضی اور شیخ الاسلام تھے۔ فقہ میں ان کی دو کتابیں 'درالحکام' اور 'مرقاۃ' بہت اہم ہیں اور بعد میں ان پر کثرت سے حاشیے لکھے گئے۔

کمال پاشازادہ

ابتدائی دور کے مصنفین میں سب سے اہم شخصیت کمال پاشازادہ (۱۴۶۸ء/۸۷۳ھ تا ۱۵۳۵ء/۱۹۴۱ھ) کی ہے جو ابن کمال کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ کمال پاشازادہ عربی، فارسی اور ترکی میں تقریباً تین سو کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ سلیمان قانونی کے زمانے میں وہ شیخ الاسلام ہو گئے تھے۔ وہ ایک جامع کمالات شخصیت تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور شاعری پر عبور تھا اور ان تمام موضوعات پر کتابیں لکھیں، لیکن جس کتاب نے ان کو ترکی ادب میں بلند مقام دیا وہ تاریخ آل عثمان ہے۔ یہ ۸۸۶ھ سے ۹۳۳ھ تک سلطنت عثمانیہ کی تاریخ ہے اور اتنی اہم ہے کہ اس کی وجہ سے کمال پاشازادہ کو عثمانی کلاسیکی دور کے پانچ سب سے بڑے مورخوں میں پہلا مورخ شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مصری مورخ تغری بردی کی تاریخ کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا۔ ادبی میدان میں ان کی تصنیف ''نگارستان'' قابل ذکر ہے۔ یہ

فارسی زبان میں ہے اور گلستان کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

ابراہیم حلبی متوفی ۱۵۴۹ء/۹۵۶ھ سلیمان قانونی کے دور کے ممتاز فقیہہ ہیں۔ سلیمان قانونی کے دور میں مجموعہ قوانین ان ہی نے مرتب کیا تھا۔ ان کی کتاب ملتقی البحر (عربی) سلطنت عثمانیہ میں حنفی مسلک کی مستند اور مقبول ترین کتاب تھی۔ ابراہیم حلبی مشہور مفکر ابن عربی کے خلاف تھے اور انہوں نے ان کے رد میں کتابیں لکھیں۔

ابوسعود

سلیمان قانونی کے دور کی سب سے ممتاز علمی شخصیت ابوسعود آفندی (۱۴۹۰ء/۸۹۶ھ تا ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ) کی ہے۔ وہ ۱۵۴۵ء/۹۵۲ھ سے اپنی وفات تک شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سلطنت عثمانیہ کے قوانین اور نظام کو شریعت اسلامی کے مطابق بنانا ہے۔ ان کے فتوے اس زمانے کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات معلوم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ابوسعود آفندی نے ترکی، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں لکھا۔ ان کی تفسیر قرآن ''ارشاد العقل السلیم'' ایک محققانہ تفسیر ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی شہر اور استنبول میں متعدد مسجدیں، مدرسے، پل، سبیلیں اور حمام بنوائے۔

پندرھویں صدی کی ایک قابل ذکر علمی شخصیت بدرالدین بن قاضی سماونہ (۱۳۵۸ء/۷۶۰ھ تا ۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ) کی ہے۔ وہ تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف تھے جن میں بیشتر علم فقہ پر اور چند تصوف میں ہیں۔ تصوف میں ان کی اہم ترین کتابیں ''واردات'' اور ''نورالقلوب'' ہیں۔ انہوں نے مشترکہ ملکیت کے نظریہ کی تبلیغ کی اور ابن عربی کے تصورات کو فروغ دیا۔ مفلوک الحال لوگ ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے اور ۱۴۱۶ء میں ترکی میں ایک بغاوت ہوئی جسے اشترا کی بغاوت کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بغاوت سے بدرالدین کا تعلق ثابت نہیں ہوسکا لیکن ان پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

حاجی خلیفہ

عثمانی ترکوں کی تاریخ میں سب سے عظیم اور جامع الکمالات شخصیت حاجی خلیفہ کی ہے۔ جن کو ترک کاتب چلپی (۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ تا ۱۶۵۷ء/۱۰۶۷ھ) کے نام سے یاد کرتے

ہیں۔ ان کا تعلق فوج سے تھا اور انہوں نے سولہویں صدی کی کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ وہ سلطان مراد چہارم کے زمانے میں بغداد کی فتح میں شریک تھے۔ اس کے بعد کاتب چلپی نے حج کیا اور سرکاری ملازمت چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے اور عربی اور ترکی میں بیس سے زیادہ ایسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھیں کہ ان کا نام علمی دنیا میں غیر فانی ہو گیا۔ جس کتاب کی بدولت ان کی شہرت اسلامی دنیا میں پھیلی وہ ''کشف الظنون'' ہے۔ یہ کتاب بیس سال میں مکمل ہوئی تھی اور اس میں ان تمام مصنفوں اور کتابوں کا حال لکھا ہے جو ابتدائے اسلام سے ان کے زمانے تک عربی، فارسی اور ترکی میں لکھی گئی تھیں۔ ''جہاں نما'' کے نام سے انہوں نے جغرافیہ کی بھی ایک کتاب لکھی جس میں یورپ کے علاوہ امریکہ کا حال بھی لکھا ہے، جس سے اس وقت تک اسلامی دنیا کے غیر ترک جغرافیہ دان واقف نہیں تھے۔ انہوں نے مغربی ماخذ سے بھی فائدہ اٹھایا اور اس کی مدد سے دنیا کا ایک اٹلس مرتب کیا اور یورپ کی تاریخ سے متعلق ایک مغربی مصنف جوہان کیرین (Johan Carion) کی کتاب کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ ان کی ایک اور اہم کتاب ''تحفۃ الکبار فی اسفار البحار'' ہے جس میں کاتب چلپی نے ترکوں کی بحری جنگوں کی تاریخ لکھی ہے۔ ایک کتاب ''دستور العمل'' سلطنت عثمانیہ کے مالیات سے متعلق ہے۔ ''میزان الحق'' دینی نقطۂ نظر سے بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت خضرؑ کی موجودگی، غنا، رقص، صلوٰۃ وسلام، ابن عربی کے نظریات اور اسی قسم کے دوسرے اختلافی مسائل پر اپنے خیالات بڑے متوازن انداز میں ظاہر کیے ہیں۔ حاجی خلیفہ کی دوسری کتابیں تفسیر قرآن، فقہ، تاریخ اور سوانح عمریوں سے متعلق ہیں۔ ان کی کتاب ''فذلکۃ التواریخ'' اسلامی تاریخ پر ایک اہم کتاب ہے جو تقریباً تیرہ سو ماخذ کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ بعد میں انہوں نے اس میں ترکی زبان میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا۔ یہ ضمیمہ ۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ سے ۱۶۵۵ء/۱۰۶۵ھ تک سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کا بہت اہم ماخذ ہے۔

ترکی کے پانچ عظیم ترین مؤرخوں میں سے کمال پاشازادہ کا حال پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔ دوسرے اور تیسرے عظیم مؤرخ خواجہ سعد الدین (۱۵۳۶ء/۹۴۳ھ تا ۱۵۹۹ء/۱۰۰۸ھ) اور علی چلپی بھی اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ سعد الدین کی ''تاج التواریخ'' عثمانیوں کے آغاز سے سلیم اوّل کی ۱۵۲۰ء میں وفات تک کی مستند ترین کتاب ہے۔ اس کا انداز ابوالفضل کی

طرح مرصع ہے۔

مصطفیٰ علی چلپی

مصطفیٰ علی چلپی (۱۵۴۱ء/۹۴۸ھ تا ۱۶۰۰ء/۱۰۰۸ھ) کو بعض مصنف سولھویں صدی کا سب سے بڑا مؤرخ قرار دیتے ہیں۔ان کی سب سے اہم تصنیف ''کنہہ الاخبار'' ہے۔ یہ ایک مفصل اسلامی تاریخ ہے، لیکن اس کا سب سے اہم حصہ ترکوں کی تاریخ سے متعلق ہے۔علی چلپی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے معاشرتی حالات پر بھی نظر ڈالی ہے اور ایک نقاد کا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، لیکن حق بیانی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ان کی ایک اور اہم کتاب ''مناقب ہنروان'' ہے جس میں تقریباً ایک سو خطاطوں، مصوروں اور جلد سازوں کے حالات لکھے ہیں۔ان کی تصنیف ''فصول الحال'' اسلامی دنیا کی مختصر تاریخ ہے اور ترکی زبان کی مقبول ترین تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

عثمانیوں کے عہد عروج کے مؤرخوں میں احمد بن مصطفیٰ تاش کو پروزادہ (۱۴۹۵ء/۹۰۱ھ تا ۱۵۶۱ء/۹۶۸ھ) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے اپنی عربی تصنیف ''شقائق النعمانیہ'' میں پانچ سو بائیس ترک علماء کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب ''موضوعات العلوم'' بھی عربی میں ہے اور آرٹ اور سائنس کی ایک قیمتی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ تاش کو پروزادہ کے صاحبزادے نے دونوں کتابوں کو بعد میں ترکی میں ترجمہ کردیا۔

منجم باشی متوفی ۱۷۰۲ء/۱۱۱۲ھ کی عربی تاریخ ''جامع الاول'' ایک عالمی تاریخ ہے۔اس کا آخری اور سب سے طویل حصہ ۱۶۷۸ء/۱۰۸۹ھ تک سلطنت عثمانیہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ منجم باشی کے ہمعصر شاعر ندیم نے ''صحائف الاطبار'' کے نام سے ترکی میں کیا۔

ایک اور مصنف قوجی بے کا نام اس لحاظ سے ترکی کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے ایک مختصر کتابچہ میں جو قوجی بے کا رسالہ کہلاتا ہے پہلی مرتبہ سلطنت عثمانیہ کے زوال سے بحث کی ہے۔یہ رسالہ اس نے سلطان مراد چہارم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

علوم حکمت اور جغرافیہ

علوم حکمت میں بھی ترکوں نے کئی اہم کتابیں لکھیں۔ اگرچہ یہ عربوں کے دور کی کتابوں

کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتیں لیکن اس بات کا ثبوت ہیں کہ ترکوں نے ان علوم کی طرف بھی کچھ نہ کچھ توجہ دی۔ ترک حکماء میں ایک قاضی زادہ رومی (۱۳۳۷ء تا ۱۴۱۲ء) ہیں۔ وہ ریاضی دان اور ہیئت دان تھے۔ علم ہیئت میں ان کی کتاب ''الملخص فی الہیئت'' اہم ہے۔ علی کوشجو متوفی ۱۴۷۴ء بھی ایک ممتاز ریاضی دان تھے اور ''رسالہ فی الہیئت'' کے مصنف تھے۔

ترکوں نے طب کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ عثمانی سلاطین اور وزراء اور امراء نے سلطنت کے ہر حصے میں شفا خانے قائم کیے۔ ان میں بعض شفاخانے طبی تعلیم کے مدرسوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ترک اطبا نے دماغی امراض اور موروثی بیماریوں سے متعلق نئی تحقیقات کیں، آنکھوں کی بیماریوں کے علاج میں بھی ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ترک اطبا میں غالباً سب سے اہم شخصیت حاجی پاشا متوفی ۱۴۱۷ء/۸۲۰ھ کی ہے۔ انہوں نے دینی کتب کے علاوہ عربی اور ترکی میں طب پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ یہ بات کہ علوم حکمت اور طب پر یہ اہم کتابیں چودھویں اور پندرھویں صدی میں لکھی گئیں، ظاہر کرتی ہے کہ یہ ان علوم پر توجہ عرب دور کے اثرات کا نتیجہ تھیں کیونکہ اس کے بعد ترکی میں باقی اسلامی دنیا کی طرح ان علوم پر کوئی اہم کتاب نہیں لکھی گئی۔

جغرافیہ اور جہاز رانی کے موضوع پر اسلامی دنیا میں آخری اہم کتابیں بھی اسی دور میں لکھی گئیں۔ سلیمان قانونی کے ایک جہاز ران پیری رئیس متوفی ۱۵۵۲ء نے ''بحریہ'' کے نام سے ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ذاتی معلومات کی بنا پر بحیرۂ ایجن اور بحیرۂ روم کے دھاروں، ساحلی علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر اترنے کے لیے مناسب جگہوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ پیری رئیس نے ایک نقشہ بھی مرتب کیا تھا جس میں امریکہ کے مشرقی ساحل اور یورپ اور افریقہ کا مغربی ساحل بتایا گیا ہے۔ اسی دور کے ایک دوسرے جہاز ران سید علی رئیس متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ نے بحر ہند میں جہاز رانوں کی رہنمائی کے لیے ''کتاب المحیط'' لکھی۔ اس میں اس نے پرانی عربی کتابوں سے مدد لینے کے علاوہ اپنے ذاتی مشاہدے بھی شامل کیے۔ اس کتاب میں امریکہ سے متعلق بھی ایک باب ہے۔ سیدی علی نے علم ہیئت پر بھی دو کتابیں لکھیں اور 'مراۃ الممالک' کے نام سے ایک مختصر سفر نامہ بھی لکھا، جس میں گجرات سے براہِ دہلی اور وسط ایشیا استنبول تک اپنے سفر کی دلچسپ روئیداد لکھی ہے۔

شاعری

عثمانی ترکی شاعری اپنے موضوع، شکل اور اسلوب کے لحاظ سے فارسی کی طرح ہے۔ ترک شاعروں نے غزل، مثنوی، قصائد، رباعی اور مرثیے سب پر طبع آزمائی کی ہے اور خوب لکھا ہے۔ ترک شاعر ادبی لحاظ سے ہندوستان اور ایران کے ہمعصر شعراء سے کسی طرح کم نہیں۔ اولین شعراء میں یونس امرہ متوفی ۱۳۲۰ء، احمدی متوفی ۱۴۱۳ء اور نسیمی متوفی ۱۴۱۸ء قابل ذکر ہیں۔ یہ سب صوفی شاعر تھے اور ترکی کے اولین عظیم شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے بعد عثمانی شاعری کا کلاسیکی دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے پانچ سب سے بڑے شاعر فضولی متوفی ۱۵۵۶ء باقی (۱۵۲۶ء تا ۱۶۰۰ء)، نفعی متوفی ۱۶۳۵ء، ندیم (۱۶۸۱ء تا ۱۷۳۰ء) اور شیخ غالب (۱۷۵۷ء تا ۱۷۹۹ء) ہیں۔ ان میں فضولی کو عام طور پر ترکی زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ فضولی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں اور غالب کی مثنوی حسن وعشق، اسلوب بیان اور ندرت خیال کے لحاظ سے ترکی زبان کا عظیم شاہکار ہیں۔ باقی کو ترکی کا سب سے بڑا غزل گو اور نفعی کو ترکی زبان کا سب سے بڑا طنز نگار سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے بلند پایہ شاعروں میں خیالی متوفی ۱۵۵۷ء کو روم کا حافظ کہا جاتا ہے اور نامی متوفی ۱۷۱۲ء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری جذبات سے زیادہ ذہن کو اپیل کرتی ہے۔ شیخی متوفی ۱۴۲۸ء احمد پاشا برمعالی متوفی ۱۴۹۷ء نجاتی متوفی ۱۵۰۹ء اور ذاتی متوفی ۱۵۴۶ء اس دور کے دوسرے اہم شاعر ہیں۔ فارسی شاعری کی پیروی میں ترکی میں بھی خمسے کثرت سے لکھے گئے۔ ترکی کے ان خمسہ نگاروں میں سب سے کامیاب یحییٰ تاشلی جالی متوفی ۱۵۷۲ء ہیں۔ وہ اگرچہ ایک فوجی تھے لیکن شاعری میں بھی دھاک بٹھا دی تھی۔ ان کی پانچ مثنویوں میں سے دو ''شاہ و گدا'' اور ''یوسف و زلیخا'' اپنی انفرادیت اور ندرت خیال کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

اولیاء چلپی

اس دور کے دوسرے صاحب کمال انسان اولیاء محمد چلپی (۱۶۱۱ء تا ۱۶۸۳ء) ہیں۔ وہ حاجی خلیفہ کے ہمعصر تھے اور عثمانی ترکوں کی روایات کے مطابق صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قلم بھی۔ خواجہ سنان اور حاجی خلیفہ کی طرح انہوں نے بھی جنگوں میں حصہ لیا اور فوجی

خدمات انجام دیں۔ کریٹ، ہنگری اور آسٹریا کی لڑائیوں میں شرکت کی۔

اولیائے چلپی نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی۔ اگر میدان جنگ نہیں تو دنیا جہاں کی سیر ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے چالیس سال سیر و سیاحت میں گذار دیئے اور ابن بطوطہ کی طرح موت نے ہی ان کی اس جہاں گردی کو ختم کیا۔ پہلے تو اولیاء نے عراق سے مصر تک اور ہنگری سے حجاز تک پوری سلطنت عثمانیہ کی سیر کی۔ اس کے بعد وہ ویانا (آسٹریا) کے راستہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اور جرمنی اور وسط یورپ کی سیر کرتے ہوئے فرانس کی بندرگاہ ڈنکرک تک گئے۔ اس کے بعد مشرق کا رُخ کیا اور سوئیڈن، پولینڈ اور رُوس ہوتے ہوئے ساڑھے تین سال کے سفر کے بعد کریمیا پہنچ گئے۔

اولیائے چلپی نے اپنے سفر کے تجربوں کو ایک سفر نامہ کی شکل میں لکھا ہے۔ یہ سفرنامہ ترکی زبان کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس سفر نامے میں اولیاء نے ہر ملک کے حالات، رسم و رواج اور دوسری دلچسپ باتیں ایسی خوبی سے لکھی ہیں کہ آنکھوں کے سامنے اس زمانہ کا ایک نقشہ سا کھینچ جاتا ہے۔

اولیائے چلپی مسلمانوں کے عہد عروج کے آخری بڑے سیاح ہوئے ہیں۔ سترھویں صدی میں استنبول کے حالات اور وہاں کے باشندوں کی زندگی کا حال اولیاء نے جس تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، ایسا کسی نے نہیں لکھا۔

سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں جو ممتاز علماء تھے ان میں سے ایک ابن حجر مکی متوفی ۱۵۶۵ء/۹۷۴ھ ہیں جو مکہ میں تھے اور بہت بڑے فقیہہ تھے۔ فقہ شافعی پر ان کی کتابیں بہت اہم ہیں۔ شام میں عبدالوہاب شعرانی متوفی ۱۵۶۵ء/۹۷۳ھ اپنے دور کے مشہور ولی تھے۔ تفسیر، فقہ تصوف، تاریخ، نحو اور طب پر بکثرت کتابیں لکھیں جو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ احمد المقری متوفی ۱۶۲۲ء/۱۰۴۱ھ شام کے ممتاز مؤرخ تھے۔ اندلس کی تاریخ، وہاں کی معاشرت، صنعت و حرفت اور علوم و فنون پر ان کی کتاب ''نفح الطیب'' ایک بلند پایہ تاریخ ہے جس کا اردو میں بھی بہت عمدہ خلاصہ شائع ہو چکا ہے۔ (تسلسل کے لیے دیکھیے باب۔ ۳۳)

باب ۱۷

اصفہان نصف جہان

(۱۵۰۰ء تا ۱۷۲۲ء)

(۱) دولت صفویہ

تیموریوں کے بعد ایران میں جس حکومت نے عروج حاصل کیا وہ دولت صفویہ کہلاتی ہے۔ اس حکومت کا بانی شاہ اسمٰعیل ایک بزرگ شیخ اسحٰق صفی الدین متوفی ۱۳۳۴ء کی اولاد میں سے تھا۔ چنانچہ ان ہی بزرگ کی نسبت سے یہ خاندان صفوی کہلاتا ہے۔ شیخ صفی الدین کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے تھے جو شیعی فرقہ اثناعشری کے ساتویں امام ہیں، لیکن اس دعوے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ خاندان دراصل ترکی النسل تھا۔ شیخ صفی الدین اور ان کے بیٹے صدر الدین سنی عقائد رکھتے تھے، لیکن ان کے پوتے خواجہ علی نے شیعی مذہب اختیار کرلیا۔ رسولؐ خدا کے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے شیخ صفی الدین کے گھرانے کا لوگوں میں بڑا احترام تھا۔ تیمور نے بایزید عثمانی پر فتح پانے کے بعد خواجہ علی (۱۳۹۲ء تا ۱۴۲۷ء) کو آذربیجان میں شہر اردبیل اور اس کے نواح کا علاقہ دے دیا تھا۔ بعد میں خواجہ علی کے پوتے شیخ جنید (۱۴۴۷ء تا ۱۴۵۶ء) اور پڑپوتے شیخ حیدر (۱۴۵۶ء تا ۱۴۸۸ء) نے گوشہ نشینی چھوڑ کر تلوار سنبھالی۔ یہ دونوں شاہ شروان سے جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔

شاہ اسمٰعیل

تیموریوں کے زوال کے بعد سولہویں صدی کے آغاز میں ایران تقریباً دس چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ان میں سب سے طاقتور حکومت آق قویونلو ترکمانوں کی تھی اور تبریز سے دیار بکر تک کا علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔ شاہ اسمٰعیل جس وقت تخت پر بیٹھا ہے تو اس کی عمر اپنے ہمعصر بابر کی طرح صرف تیرہ سال تھی، لیکن اس نے کم عمری کے باوجود حالات کا مقابلہ غیر معمولی ذہانت اور شجاعت سے کیا۔ باکو اور شروان کو فتح کرنے کے بعد شاہ اسمٰعیل نے ۱۴۹۹ء

میں تبریز پر قبضہ کرکے آق قویونلو حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

۱۵۰۸ء تک اسمٰعیل نے جنوب میں شیراز اور یزد تک، مشرق میں استرایار تک اور مغرب میں بغداد اور موصل تک اپنی سلطنت کی حدوں کو بڑھا دیا۔ ہرات میں تیموری حکمران حسین بائیقرا کے انتقال کے بعد شیبانی خاں ازبک ہرات اور خراسان پر قابض ہو گیا تھا۔ ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء میں مرو کے قریب طاہر آباد میں شیبانی خاں اور شاہ اسمٰعیل میں سخت جنگ ہوئی جس میں ازبکوں کو شکست ہوئی اور شیبانی خاں مارا گیا۔ ازبکوں کی شکست کے بعد خراسان بھی اسمٰعیل کے قبضے میں آ گیا۔ اب وہ ایران، عراق اور شروان کا بلا شرکت غیرے مالک تھا اور اس کی طاقت اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی۔

شاہ اسمٰعیل کو اس کی فتوحات نے غرور میں مبتلا کر دیا۔ اس نے ایک عثمانی شہزادہ مراد کو پناہ دی اور سلطان سلیم عثمانی کو تخت سے اتار کر شہزادہ مراد کو اس کی جگہ تخت پر بٹھانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شاہ اسمٰعیل کی اس ناعاقبت اندیشی نے اس کو سلطان سلیم سے ٹکرا دیا۔ ایران اور ترکی کی موجودہ سرحد پر ترکی کی حدود میں واقع ایک مقام چالداران کے پاس ۱۵۱۴ء / ۹۲۰ھ میں دونوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے بڑی شجاعت سے ترکوں کا مقابلہ کیا۔ ترکوں کی کثرت تعداد، توپ اور آتشیں اسلحہ اور سلطان سلیم کی برتر فوجی مہارت کے سامنے ایرانی بے بس ہو گئے، ان کو شکست فاش ہوئی، ۲۵/ ہزار ایرانی مارے گئے اور شاہ اسمٰعیل زخمی ہو کر فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ سلطان سلیم نے آگے بڑھ کر دار الحکومت تبریز پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلیم کی واپسی پر تبریز اور آذربائیجان تو صفوی سلطنت کو واپس مل گئے، لیکن دیار بکر اور مشرقی ایشیائے کوچک کے صوبے ہمیشہ کے لیے صفویوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اسمٰعیل صفوی سے ایران میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے ایران کا شیعی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل ایران کے بعض حصوں پر شیعہ خاندان کبھی کبھی حکمران رہے تھے، ایران کے بعض بادشاہ بھی ایسے ہوئے جو شیعہ عقائد رکھتے تھے جیسے غازان خاں اور اولجائیتو، لیکن ایران میں اکثریت سنی حکمران خاندانوں کی رہی تھی اور سرکاری مذہب بھی اہل سنت کا تھا، لیکن شاہ اسمٰعیل نے تبریز پر قبضہ کرنے کے بعد شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا اور اصحابِ رسولؐ پر تبرا کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تبریز کی دو تہائی آبادی سنی تھی اور شیعہ اقلیت میں تھے۔ خود

شیعی علماء نے اس اقدام کی مخالفت کی لیکن کچھ نوجوانی کا گرم خون اور کچھ عقیدہ کی محبت، شاہ اسمٰعیل نے ان مشوروں کو رد کر کے تلوار ہی کو سب سے بڑی مصلحت قرار دیا۔

شاہ اسمٰعیل صفوی نے صرف یہی نہیں کیا کہ شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا، بلکہ اس نے شیعیت کو پھیلانے میں تشدد اور بدترین تعصب کا ثبوت بھی دیا۔ لوگوں کو شیعیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، بکثرت علماء قتل کر دیئے گئے، جس کی وجہ سے ہزار ہا لوگوں نے ایران چھوڑ دیا۔

شاہ اسمٰعیل کی فوج قزلباش کہلاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمٰعیل کے باپ حیدر نے اپنے پیروؤں کے لیے سرخ رنگ کی ایک مخصوص ٹوپی مقرر کی تھی جس میں بارہ اماموں کی نسبت سے بارہ کنگورے ہوتے تھے۔ ٹوپی کا رنگ چونکہ سرخ ہوتا تھا اس لیے ترکی میں ان کو قزلباش یعنی سرخ ٹوپی والے کہا گیا۔

ایران کی زبان اگرچہ فارسی ہے، لیکن آذربائیجان کی اکثریت ترکی بولتی ہے چنانچہ شاہ اسمٰعیل کی زبان بھی ترکی تھی۔ وہ ترکی زبان کا شاعر بھی تھا اور خطائی تخلص کرتا تھا۔ اس کے اشعار میں تصوف کا رنگ اور اہل بیت کی محبت پائی جاتی ہے اور ترکی زبان کی صوفیانہ شاعری میں اس کو اہم مقام حاصل ہے۔ استنبول سے اس کا ترکی دیوان شائع ہو چکا ہے۔

طہماسپ (۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء)

اسمٰعیل صفوی کا لڑکا طہماسپ جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کا دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ ۱۵۲۵ء سے ۱۵۴۰ء تک خراسان ازبکوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہا اور اس مدت میں شیبانی خاں کے لڑکے جنید خاں نے چھ حملے کیے جن سے ہرات اور مشہد وغیرہ کو بہت نقصان پہنچا۔ مغرب میں عراق کو ترکوں نے ایرانیوں سے چھین لیا اور تبریز اور ہمدان پر ترک کئی برس تک قابض رہے۔ ان تمام حملوں کے باوجود یہ طہماسپ اور ایرانیوں کی صلاحیت کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے ناسازگار حالات کے باوجود باقی ایران میں امن وامان قائم رکھا اور جارجیا یا گرجستان کے عیسائیوں کے خلاف سات مہمیں بھیجیں اور گرجستان پر ایرانی قبضہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا۔

اس دور کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ انگلستان نے عثمانی ترکوں کے مقابلے میں ایران کا

تعاون حاصل کرنا چاہا اور شمالی راستہ سے ایران کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے چاہے۔ اس مقصد کے لیے جب ملکہ الزبتھ نے ایک انگریز کو خط دے کر طہماسپ کے پاس روانہ کیا تو بادشاہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ''ہم کافروں سے دوستی نہیں کرنا چاہتے''

یہ شاہ طہماسپ ہی کا زمانہ تھا کہ بابر کا لڑکا ہمایوں جسے شیر شاہ نے ہندوستان سے نکال دیا تھا، ۱۵۴۳ء میں ایران آیا اور طہماسپ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور فوجی امداد دی جس کی وجہ سے ہمایوں دوبارہ دہلی کی سلطنت کو بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔

تبریز پر عثمانی قبضہ ہو جانے کی وجہ سے طہماسپ نے قزوین کو دارالحکومت منتقل کردیا تھا۔ طہماسپ ان مسلمان حکمرانوں میں سے ہے جنہوں نے پچاس سال سے زیادہ حکومت کی۔ اس کی مدت حکومت باون (۵۲) سال سے زیادہ ہے۔

طہماسپ کے جانشینوں شاہ اسمٰعیل ثانی اور محمد خدابندہ کا دَور غیر اہم ہے اور ان میں سے کوئی طہماسپ جیسی صلاحیت کا مالک نہیں تھا۔ ان کے زمانے میں خراسان ازبکوں کے اور مغربی ایران عثمانیوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہا اور اندرون ملک بھی بدامنی رہی۔

(۲) عباس اعظم

(۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء)

عباس اعظم کا دَور خاندان صفویہ کا عہد زرین ہے۔ محمد خدابندہ کے بعد جب وہ ایران کے تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ ایران کے شمال مغربی حصوں پر عثمانی ترک قابض تھے اور مشرق میں خراسان ازبکوں کے قبضے میں تھا یا ان کی تاخت و تاراج کا ہدف بنا ہوا تھا۔ اندرون ملک بھی بدامنی تھی اور صوبوں کے امراء سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ عباس نے اس صورت حال کا بڑے تدبر اور ہوشیاری سے مقابلہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے ترکوں سے معاہدہ کرلیا اور آذربائیجان، گرجستان اور لرستان کا ایک حصہ ترکوں کے حوالے کردیا۔ شاہ اسمٰعیل کے زمانے سے ایران میں اصحاب کرام پر تبرّا بھیجنے کی جو قبیح رسم چلی آرہی تھی، اس کو بھی بند کرادیا اور اس طرح عثمانی ترکوں کو ایک حد تک مطمئن کردیا۔ مغربی سرحد سے مطمئن ہونے کے بعد شاہ عباس نے خراسان کی طرف توجہ کی۔ ازبکوں کا طاقتور حکمران عبداللہ خان ۱۵۹۸ء میں مرچکا تھا،

اس لیے شاہ عباس نے اسی سال آسانی سے ازبکوں کو خراسان سے نکال دیا اور صفوی سلطنت کی حدود ہرات اور مرو تک وسیع کر دیں۔

فتوحات

مشرقی سرحدوں کو مستحکم کرنے کے بعد شاہ عباس نے ترکوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں۔ اس نے ترکوں کی فوج ینی چری کے نمونے پر ایک فوج تیار کی جو "شاہ سورن" کہلاتی تھی اور گرجستان اور آرمینیہ کے نومسلموں پر مشتمل تھی۔ لیکن ایرانیوں کی سب سے بڑی کمزوری توپ خانہ کی عدم موجودگی تھی۔ اس وقت جب کہ ساری دنیا میں توپوں کا رواج ہو چکا تھا اور خود ایران کے مغرب میں عثمانی ترک اور مشرق میں دہلی کے مغل سلاطین توپیں استعمال کر رہے تھے، ایرانی فوج ابھی تک اس اہم جنگی ہتھیار سے محروم تھی۔ مغربی قومیں صلیبی جنگوں کے زمانے سے اس پالیسی پر عمل پیرا تھیں کہ مشرق وسطی کی طاقتور مسلمان حکومتوں کا زور توڑنے کے لیے دوسری مسلمان حکومتوں کا تعاون حاصل کریں۔ اس غرض سے انہوں نے مصر کے مملوکوں اور ترکی کے عثمانیوں کے خلاف منگولوں، باطنیوں اور آق قویونلو ترکوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور اب وہ عثمانی ترکوں کا زور توڑنے کے لیے ایران کی صفوی حکومت کا تعاون حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ طہماسپ کے زمانے میں ملکہ الزبتھ اس مقصد میں ناکام ہوگئی تھی، لیکن شاہ عباس کے دور میں ان کو اس مقصد کے حصول میں خاصی کامیابی ہوئی۔ ۱۵۹۹ء میں دو انگریز بھائی سرانیتھنی شرلے اور رابرٹ شرلے ترکوں کے خلاف مسیحی اتحاد، ایران سے مدد حاصل کرنے، اور ایران اور یورپ کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کرنے کے لیے آئے۔ شاہ عباس نے ان سے کوئی معاہدہ تو نہیں کیا، لیکن ایرانی فوج کو جدید طرز پر مسلح کرنے میں ان سے مدد لی۔ ان انگریزوں نے ایران میں توپ سازی کی صنعت شروع کی اور ایرانی فوجوں کو توپ خانہ سے مسلح کر دیا۔ جب ایرانی فوج جدید آتشی ہتھیاروں اور توپوں سے مسلح ہوگئی تو شاہ عباس نے ۱۶۰۲ء میں عین اس وقت جب کہ عثمانی ترک آسٹریا سے جنگ میں مصروف تھے حملہ کر دیا اور تبریز، شروان اور بغداد کے علاقے واپس لے لیے۔ ۱۶۲۲ء میں برطانوی بیڑے کی مدد سے شاہ عباس نے پرتگالیوں سے بندرگاہ ہرمز چھین لیا اور خلیج فارس کے ساحل پر ایک نئی بندرگاہ قائم کی جو آج تک بندرعباس

کہلاتی ہے۔ اسی سال شاہ عباس نے دہلی کی تیموری سلطنت سے قندھار چھین لیا۔

صفوی دور علمی لحاظ سے بنجر دور ہے، لیکن شاہ عباس کے زمانہ میں علم وادب کے میدان میں تھوڑی سی زندگی نظر آتی ہے۔ اس کے درباری علماء میں میر محمد باقر بن محمد داماد قابل ذکر ہیں۔ مطالعہ قدرت اور فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ بہاء الدین آملی اور صدر الدین شیرازی بھی جو ملا صدرا کے نام سے مشہور ہیں، اس دور کی اہم علمی اور ادبی شخصیتیں ہیں۔ ملا صدرا کی فلسفہ کی ضخیم کتاب ''اسفار اربعہ'' کا اردو میں چار جلدوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن فلسفہ کی ان کتابوں میں مغز کم اور پھوک زیادہ ہے۔

اصفہان

شاہ عباس کے زمانے میں فنون لطیفہ نے خاص طور پر فن تعمیر اور فن مصوری نے بہت ترقی کی۔ دار الحکومت اصفہان کو بڑی ترقی دی گئی اور شاندار عمارتیں بنائی گئیں۔ شروع میں صفویوں کا دار الحکومت تبریز تھا، لیکن وہ ہمیشہ عثمانی ترکوں کی زد میں رہتا تھا اس لیے عباس اعظم نے ایران کے بیچ میں اصفہان کو دار السلطنت بنایا۔ اصفہان کی آب وہوا بڑی صحت بخش ہے۔

عباس اعظم نے اس کو اتنی ترقی دی کہ لوگ اس کو اصفہان نصف جہان کہنے لگے۔ اس زمانہ میں اصفہان کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ یہ کوئی زیادہ آبادی نہیں تھی۔ بغداد، قرطبہ اور تبریز کا حال تم پڑھ چکے ہو وہ سب اصفہان سے زیادہ بڑے شہر تھے اور جس زمانہ میں اصفہان نصف جہان کہلاتا تھا اس زمانہ میں پاکستان اور بھارت بلکہ یورپ تک میں ایسے بڑے بڑے شہر بن گئے تھے جو اصفہان کے برابر بلکہ اس سے بھی بڑے تھے۔ ایسی صورت میں اصفہان کو آدھی دنیا کہنا عجیب سی بات ہے، لیکن پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ ایرانی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس لیے کہ ایک تو آب وہوا کے لحاظ سے اصفہان بڑی اچھی جگہ ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کے کم شہر اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں دوسرے یہ کہ اصفہان بڑی خوبصورتی سے آباد کیا گیا تھا، تیسرے یہ کہ یہاں جیسی شاندار عمارتیں تھیں ویسی قسطنطنیہ اور قاہرہ کو چھوڑ کر دوسرے شہروں میں نہیں تھیں۔ لاہور، دہلی آگرہ کی شاندار عمارتیں ابھی نہیں بنی تھیں۔ عباس اعظم نے اصفہان میں جو عمارتیں بنوائی تھیں ان میں جامع مسجد، قصر چہل ستون، زندہ رود ندی کے دو پل اور چہار باغ بہت مشہور ہیں۔ یہ

عمارتیں آج بھی اصفہان کی سب سے زیادہ پرشکوہ عمارتیں ہیں۔شاہ عباس اگرچہ ایک کامیاب اور سمجھدار حکمران تھا،لیکن اعظم کا لقب اس کو زیب نہیں دیتا۔وہ انتہائی ظالم اور شکی مزاج تھا۔اس نے محض شک میں اپنے ایک لڑکے کو قتل اور دو کو اندھا کر دیا۔مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے دور میں پانچ سو جلاد لوگوں کو قتل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔وہ بدترین مستبد حکمران تھا۔

عباس اعظم کے بعد صفوی خاندان میں چار حکمران اور ہوئے۔عباس کا جانشین شاہ صفی (۱۶۲۹ء تا ۱۶۴۱ء) نہایت ظالم اور سفاک تھا۔اس کے عہد میں ۱۶۳۴ء میں بغداد پر ترکوں نے اور ۱۶۳۸ء میں قندھار پر دہلی کے تیموریوں نے قبضہ کرلیا۔اگرچہ خراسان پر ازبکوں کے حملے اس نے کامیابی سے پسپا کر دیئے۔

عباس دوم (۱۶۴۱ء تا ۱۶۶۸ء) کے عہد میں ایران کو پھر خوشحالی نصیب ہوئی۔رعایا کے ساتھ اس کا سلوک منصفانہ تھا۔اس نے ۱۶۴۹ء میں قندھار پھر واپس لے لیا اس کا جانشین سلیمان (۱۶۶۸ء تا ۱۶۹۴ء) اپنے باپ کی پالیسی پر چلتا رہا اور اس کا دور عہد صفوی کا آخری پُرامن دور تھا۔

سلیمان کے بعد صفویوں کا زوال شروع ہوگیا۔آخری حکمران شاہ حسین (۱۶۹۴ء تا ۱۷۲۲ء) نااہل ثابت ہوا۔شیعہ علماء کے زیر اثر آکر اس نے سنیوں پر مظالم کیے جس کا نتیجہ افغانوں کی بغاوت کی شکل میں نکلا۔قندھار کے افغانوں نے دہلی کے مغلوں سے بچنے کے لیے خود کو ایران کی حفاظت میں دے دیا تھا،لیکن جب ایرانیوں نے ان پر سختی کی تو انہوں نے اپنے ایک سردار میر اویس کی قیادت میں آزادی کا اعلان کر دیا۔۱۷۱۵ء میں اویس کے انتقال کے بعد اس کے جانشین امیر محمود نے ایران پر حملہ کر دیا اور ۱۷۲۲ء میں اصفہان پر قبضہ کر کے صفوی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

صفوی دور کی خصوصیات

صفوی سلطنت ایران کی آخری طاقتور اور پرشکوہ حکومت تھی۔ساسانیوں،سلجوقیوں اور تیموریوں کی طرح صفویوں نے بھی دنیا میں ایران کا بڑا نام کیا۔ان کے بعد ایران کو زوال ہوگیا اور آج تک کوئی ایسی حکومت وہاں قائم نہیں ہوئی جس کے عہد میں کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا گیا ہو

جو ایران کے نام کو روشن کرے۔

صفوی حکومت سوا دو سو سال قائم رہی۔ اس زمانہ میں علمی ترقی جس میں ایران ہمیشہ سے ممتاز رہا، بالکل ختم ہو گئی۔ اس لیے صفوی دَور میں ایسے بڑے بڑے عالم اور مصنف پیدا نہیں ہوئے جیسے پچھلے دَور میں ہوئے۔ کچھ شاعر اور مؤرخ البتہ پیدا ہوئے، لیکن وہ بھی ایران چھوڑ کر دہلی اور آگرہ چلے گئے کیونکہ وہاں ان کی سرپرستی صفویوں سے زیادہ کی جاتی تھی۔

صفوی دَور صرف فنِ تعمیر اور مصوری کی وجہ سے مشہور ہے۔ رضا عباسی اور میرک اس زمانہ کے مشہور مصور ہیں۔ ایران کے سب سے بڑے مصور بہزاد کا ذکر تیموریوں کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ وہ بھی اپنے آخری زمانہ میں تبریز آ گیا تھا۔ جو شاہ اسمٰعیل کا دار السلطنت تھا۔

صفوی دَور میں صنعت و حرفت کو بھی ترقی ہوئی۔ بہترین قسم کے سوتی اور ریشمی کپڑے تیار ہونے لگے اور ایران کے مشہور قالین کی صنعت نے عروج پایا۔ صفویوں کے بعد ان صنعتوں کو بھی زوال ہو گیا۔

صفویوں کا سب سے بڑا کارنامہ ایران میں فوجی حکومت کا قیام بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ایران کی سنی آبادی کو جس طرح بزورِ شمشیر شیعہ بنایا، اس پر مظالم کیے اور علماء کو قتل کرایا وہ تاریخ اسلام کا ایک افسوسناک باب ہے۔ ایران میں شیعیت کے فروغ، ایرانیوں کے غلو اور تعصب نے ایران کو باقی اسلامی دنیا سے کاٹ دیا جو سنی تھی، اور پڑوسیوں کو بھی اپنا دشمن بنا لیا۔ اسلامی دنیا سے کٹ جانے سے ایران کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایرانیوں کی تخلیقی قوتوں کے اظہار کے راستے بند ہو گئے اور ایران باقی اسلامی دنیا کے افکار سے پہلے کی طرح استفادہ کرنے سے محروم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو ایران قبول اسلام کے بعد سے تیموری دَور تک عالم اسلام کے بہترین دماغ پیدا کرتا رہا تھا، اسی ایران کی سرزمین عہد صفوی میں اہلِ علم و کمال کے لیے بنجر ہو گئی۔ اس کے برخلاف برصغیر پاکستان و ہند کے تیموری سلاطین نے رواداری اور وسعت قلبی کا ثبوت دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کے صاحب کمال ہندوستان کا رُخ کرنے لگے اور تیموری مملکت میں علم و ادب کو غیر معمولی فروغ ملا۔ ایران میں متعصب شیعی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے اسلامی دنیا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ برصغیر اور ترکستان کا دنیائے عرب اور ترکی سے روایتی تعلق بڑی حد تک ختم ہو گیا اور مشرق سے مغرب اور مغرب سے

مشرق کی طرف علوم و افکار کی منتقلی میں رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ یہ بات ایران ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کے زوال کا باعث بنی۔ موجودہ دَور کے ایرانی مورخین بھی صفوی سلاطین کے مذہبی مظالم، تنگ نظری اور تعصب کی مذمت کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ صفوی سلاطین نے ایرانیوں کو شیعیت پر متحد کر کے ایران کے قومی وجود کا تحفظ کیا ورنہ ایران بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن جاتا۔ (تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۳۰)

صفوی سلطنت

(۱۵۰۲ء/۹۰۷ھ تا ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ)

(۱) اسمٰعیل اوّل	۱۵۰۲ء/۹۰۷ھ تا ۱۵۲۴ء/۹۳۰ھ
(۲) طہماسپ	۱۵۲۴ء/۹۳۰ھ تا ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ
(۳) اسمٰعیل دوم	۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ تا ۱۵۷۸ء/۹۸۵ھ
(۴) محمد خدابندہ	۱۵۷۸ء/۹۸۵ھ تا ۱۵۸۷ء/۹۹۵ھ
(۵) عباس اول	۱۵۸۷ء/۹۹۵ھ تا ۱۶۲۹ء/۱۰۳۸ھ
(۶) صفی	۱۶۲۹ء/۱۰۳۸ھ تا ۱۶۴۲ء/۱۰۵۲ھ
(۷) عباس دوم	۱۶۴۲ء/۱۰۵۲ھ تا ۱۶۶۷ء/۱۰۷۷ھ
(۸) سلیمان	۱۶۶۷ء/۱۰۷۷ھ تا ۱۶۹۴ء/۱۱۰۵ھ
(۹) حسین	۱۶۹۴ء/۱۱۰۵ھ تا ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ

باب ۱۸

وسط ایشیا کے اُزبک

(۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)

(۱) آلِ شیبان (۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۵۹۸ء/۱۰۰۷ھ)

سولھویں صدی میں وسط ایشیا میں ازبکوں کی نئی طاقت کا ظہور ہوا۔ فاتحین اور لشکر کشوں کی یہ آخری نسل ہے جو وسط ایشیا سے اٹھی۔ اس کے بعد اس خطہ میں فاتحین کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مغربی قپچاق یا دریائے والگا کی وادی میں آباد منگولوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد منگولوں، مقامی ترکوں اور دیگر ہم نسل باشندوں کے خونی اختلاط سے جو مسلمان قومیں وجود میں آئیں، ان میں ایک ازبک بھی تھے۔ ترکوں کی یہ روایت تھی کہ وہ پوری قوم کا نام اپنے کسی ہیرو یا ممتاز شخصیت کے نام پر رکھ لیتے تھے، خواہ وہ قوم اس کی نسل سے ہو یا نہیں۔ چنانچہ دشت قپچاق کی یہ قوم سرائے کے مشہور حکمران ازبک خاں کے نام پر اسی طرح ازبک کہلاتی ہے جس طرح چغتائی خاں کے نام پر چغتائی ترک اور عثمان خاں کے نام پر عثمانی ترک اپنے آپ کو چغتائی اور عثمانی ترک کہتے ہیں۔

ہم یہاں ازبکوں کی جس شاخ کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ شیبائی یا آلِ شیبان ہیں۔ شیبان منگول حکمران چنگیز خاں کے بیٹے جوجی خاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ شیبانی حکومت کا بانی ابوالخیر (۱۴۲۸ء تا ۱۴۶۸ء) اسی شیبان کی اولاد میں تھا۔ جب سرائے میں آلتن اوردہ کی حکومت کو زوال ہوا اور وہ چار بڑی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تو ازبک شہزادہ ابوالخیر نے بھی مغربی سائبیریا میں ''تورا'' کے مقام پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ابوالخیر ابھی اپنی ریاست کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا کہ ۱۴۶۸ء/۸۷۳ھ میں مشرقی ترکستان کے حکمران یونس خاں نے شکست دے کر اسے قتل کر دیا۔

محمد شیبانی خان (۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ)

ابوالخیر کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا حیدر سلطان جانشین ہوا، لیکن شیبانیوں کو حقیقی عروج

محمد شیبانی خاں کے دَور میں حاصل ہوا جو ابوالخیر کے ایک دوسرے بیٹے بوداق سلطان کا لڑکا تھا۔ ازبک قبائل ابوالخیر کے انتقال کے بعد دریائے سیحوں کی زیریں وادی میں منتقل ہو گئے تھے اور یہاں سے وہ کبھی مشرقی ترکستان کے منگول حکمرانوں اور تیموریوں کے حلیف کی حیثیت سے اور کبھی ان کے خلاف لشکر کشی میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۴۶۸ء/۸۷۳ھ میں منگول حکمران محمود خاں ابن یونس خاں نے محمد شیبانی کو اس کی خدمات کے صلے میں دریائے سیحوں کے کنارہ شہر ترکستان کی حکومت دے دی۔ شیبانی خاں ۱۴۹۴ء/۹۰۰ھ میں ماوراء النہر میں داخل ہوا اور پانچ چھ سال کے عرصہ میں پورے ماوراء النہر پر قابض ہو گیا۔ بخارا اور سمرقند کے درمیان سرپل کی جنگ میں بابر کو شکست دے کر ۱۵۰۰ء/۹۰۶ھ میں سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا اور ترکستان میں تیموریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۵۰۵ء/۹۱۱ھ میں اس نے خوارزم فتح کرنے کے بعد دریائے جیحوں کو پار کیا اور مرو کے قریب مرو چک کے مقام پر حسین بائقرا کے لڑکے بدیع الزمان اور دوسرے تیموری شہزادوں کے متحدہ لشکر کو شکست دی اور ۱۱ محرم مطابق ۲۴ مئی ۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ کو پُرامن طور پر ہرات میں داخل ہو گیا اور اس طرح شیبانی نے خراسان سے بھی تیموری اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۵۰۸/۹۱۴ھ میں شیبانی نے صوبہ جرجان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب شیبانی ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کا مالک تھا جو جھیل ارال سے بلخ اور ہرات تک اور فرغانہ سے جرجان تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی ایک طاقتور حکومت قائم کر چکا تھا اور سنیوں کو زبردستی شیعہ بنا رہا تھا۔ اس کے اس تعصب اور کٹرپن نے عثمانی ترکوں اور ازبکوں میں جو کٹر سنی تھے، ایک آگ لگا دی تھی۔ ازبکوں کا ردعمل خاص طور پر ویسا ہی متعصبانہ تھا جیسا صفوی حکمران کا تھا اور وہ کسی صورت میں صفویوں سے تصفیہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب ازبکوں نے ایران کی طرف پیش قدمی کی تو شاہ اسمٰعیل سے ٹکراؤ ہو گیا۔ مرغاب کے پاس (۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ) ازبکوں اور صفویوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی۔ ازبک بے جگری سے لڑے، لیکن ان کو شکست ہوئی اور شیبانی خاں مارا گیا۔ شاہ اسمٰعیل کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے شیبانی خاں کی کھوپڑی اتار لی اور اس پر سونا چڑھا لیا۔ وہ اس کھوپڑی کو پیالے کی جگہ استعمال کرتا تھا۔

ازبک ایران اور ماوراء النہر کے متمدن علاقوں سے دور دشت قپچاق میں خانہ بدوشوں کی زندگی گذارتے تھے۔ وہ جاہل اور نیم وحشی تھے اور ماوراء النہر میں آنے تک بھیڑوں اور گھوڑوں

کی کھالیں پہنتے تھے۔ ان کی زندگیوں پر اسلام کے اثرات بہت سطحی تھے اور ان کی رسوم ترکوں اور منگولوں کی قبل از اسلام کی رسوم اور اسلام کا مجموعہ تھیں۔ ان کی مذہبیت بارہویں صدی کے بزرگ احمد یسیوی [1] سے عقیدت تک محدود تھی۔ ایرانی مورخوں نے ان کی برائیوں کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے جس میں مبالغہ اور تعصب شامل ہے۔ انہوں نے محمد شیبانی خاں کی بھی بڑی کریہہ تصویر کھینچی ہے جو حقیقت سے دور ہے۔ چنانچہ ہنگری کا مشہور مستشرق ویمبری اپنی تاریخ بخارا میں شیبانی کے متعلق لکھتا ہے:

''شیبانی ہرگز وحشی نہ تھا جیسا کہ اس کے ایرانی دشمن بیان کرتے ہیں۔ اس کو راگ رنگ اور شاعری سے دلچسپی تھی۔ لڑائیوں تک میں اس کے ساتھ چھوٹا سا کتب خانہ رہتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور اس کا کلام مشرقی ترکی ادب کا اچھا نمونہ ہے۔ وہ علماء کی عزت کرتا تھا۔ سلطان حسین بائیقرا کے مرنے کے بعد جو علماء اور فضلاء بے خانماں ہو گئے تھے، انہیں شیبانی نے روزگار فراہم کیا۔ بخارا، سمرقند اور تاشقند میں اس نے مدرسے بنائے۔ جب وہ تاریخ کے منظر پر پہلی بار ظاہر ہوا تو لفظ ازبک جاہل اور وحشی کے ہم معنی تھا، لیکن یہ تعریف شیبانی پر صادق نہیں آتی۔ وہ ویسا ہی شائستہ اور مہذب تھا جیسے تیموری گھرانے کے دوسرے شہزادے'' [2]

اس نے ہرات کو فتح کرنے کے بعد غارت گری سے محفوظ رکھا۔

شیبانی خاں کے بعد ازبکوں اور ایرانیوں میں صلح ہو گئی اور دریائے جیحوں دونوں کے درمیان سرحد قرار پایا، لیکن یہ صلح زیادہ مدت برقرار نہیں رہی۔ ۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ میں بابر نے شاہ اسمٰعیل سے اتحاد کر کے جیحوں عبور کیا اور سمرقند پر آسانی سے قابض ہو گیا، لیکن جلد ہی ازبک جانشینی کے جھگڑوں سے فارغ ہو گئے اور شیبانی کے بھائی کوچ کنجی کو نیا حکمران تسلیم کر لیا۔ کوچ

(۱) احمد یسیوی متوفی ۱۱۶۶ء/۵۶۲ھ سمرقند کے ایک ترک ولی اللہ تھے۔ انہوں نے بخارا میں تعلیم حاصل کی اور دریائے سیحوں کے کنارے یسی نامی بستی میں رہائش اختیار کی۔ یسی کو ''ترکستان'' بھی کہا جاتا ہے۔ بعد میں تیمور نے ان کی قبر پر شاندار مقبرہ بنا دیا۔ دیوانِ حکمت کے نام سے ایک مجموعہ کلام ان سے منسوب ہے۔ اس دیوان نے ترکی زبان کی صوفیانہ شاعری پر اثر ڈالا۔ ترکی کے صوفی شاعر احمدی اور یونس امرہ ان سے متاثر تھے۔

(۲) ویمبری: تاریخ بخارا ص ۳۴۱ (اردو ترجمہ)

کنجی بڑھاپے کی وجہ سے میدان جنگ میں نہیں جاسکتا تھا، اس لیے فوجی امور اپنے ایک بھتیجے عبیداللہ خاں ابن محمود خاں کے سپرد کیے۔ عبیداللہ خاں نے ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ میں بابر سے سمرقند واپس لے لیا۔ عبیداللہ خاں نے چھ مرتبہ خراسان پر حملے کیے، اگرچہ وہ خراسان سے صفویوں کو بے دخل نہیں کرسکا، لیکن ان حملوں میں مرو، مشہد، ہرات اور استرآباد کو بہت نقصان پہنچا۔ اس دوران بابر نے شاہ اسمٰعیل کے تعاون سے ایک مرتبہ پھر ماوراء النہر پر قبضہ کرنا چاہا، لیکن ایرانی فوج نے سنیوں کا جس طرح قتل عام کیا اس سے متنفر ہوکر بابر واپس چلا گیا اور ازبکوں نے ایرانی فوج کو شکست دے کر بلخ اور ہرات واپس لے لئے۔

عبیداللہ خان (۱۵۵۷ء/۹۶۴ھ تا ۱۵۹۸ء/۱۰۰۶ھ)

ازبکوں کے مقبوضہ علاقے حکمران خاندان کے افراد میں تقسیم کردیئے جاتے تھے، جس کی وجہ سے ازبک مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھی۔ یہ تمام ریاستیں مرکزی خان کی اطاعت کرتی تھیں جس کا انتخاب بعض اوقات ان مختلف ریاستوں میں سے کسی ایک سے کیا جاتا تھا۔ جب ایسا کوئی امیر منتخب ہوجاتا تھا تو وہ اپنی ریاست پر بھی بدستور قابض رہتا تھا۔ مرکزی دارالحکومت سمرقند تھا، لیکن کبھی کبھی جب بخارا میں کوئی طاقتور خان پیدا ہوجاتا تھا تو وہ پوری ازبک سلطنت کا حکمران بن جاتا تھا۔ اسی قسم کے حکمرانوں میں سے ایک ابوالخیر کا پڑپوتا عبیداللہ خان تھا۔ عبیداللہ کے انتقال کے چند برس بعد ماوراء النہر ایک بار پھر ہنگاموں کا شکار ہوگیا اور مشرقی ترکستان کے ایک منگول سردار براق خاں ابن محمود خاں نے بخارا تک سارا ماوراء النہر تاراج کردیا۔ ۱۵۵۵ء/۹۶۳ھ میں براق خاں کا انتقال ہوا تو عبیداللہ نے بخارا پر قبضہ کرلیا۔ ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ میں اس نے سمرقند کی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لی جہاں پہلے اس کا باپ اور پھر اس کے جانشین حکمران تھے۔ عبداللہ کے زمانے میں ازبک سلطنت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ مشرق میں اس نے کاشغر، اور ختن اور مغرب میں ہرات، مشہد، مرو اور استرآباد فتح کرلیے۔ عبداللہ اب آگے بڑھ کر ایران سے صفویوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عثمانیوں سے مدد حاصل کرنا چاہی، لیکن عثمانی شاہ عباس سے صلح کرچکے تھے اس لیے مدد نہیں کرسکے۔ بہرحال سلطان مراد سوم اور خان کریمیا نے عبداللہ کو اس کی فتوحات پر مبارکباد دی اور اپنے سفیر بخارا بھیجے۔

عبداللہ کے زمانے میں بخارا۔ دوبارہ سیاسی اور علمی زندگی کا مرکز بن گیا۔ اس کا دور ازبک شان و شوکت کا آخری دور تھا۔ تعمیر و ترقی کے لحاظ سے بھی اس کا دور ممتاز ہے۔ مستشرق ویمبری نے لکھا ہے کہ:

عبداللہ نے چالیس سال سے زیادہ حکومت کی اور اپنا نام ایسا چھوڑا کہ اہل بخارا اب تک اس کو یاد کرتے ہیں۔ اس کے دور میں ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں، مدرسے، حمام، شفاخانے، کارواں سرائے، پل اور آبی ذخیرے تعمیر کیے گئے۔ وہ تجارت، زراعت اور علوم و فنون کا فاضل دوست پرست تھا۔ لوگوں کو شائستہ بنانے اور انہیں خوشحال رکھنے کی جتنی کوششیں اس نے کیں، کسی اور شیبانی نے نہیں کی۔ بخارا میں اس کا تعمیر کردہ باغ چہار باغ اور سمرقند اور مشہد میں سایہ دار سڑکیں انیسویں صدی کے آخر تک موجود تھیں۔ بخارا کا بہترین بازار ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ میں اسی نے بنوایا۔ سڑکوں پر سنگ میل لگوائے اور ڈاک کا بہترین نظام قائم کیا۔ اس کے عہد میں جیسا امن و امان تھا اس سے پہلے کبھی نہیں رہا۔

عبداللہ خاں کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے المومن نے صرف چھ ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد شیبانی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی اور جیحوں پار کا سارا علاقہ بلخ سے استرآباد تک کچھ مدت کے لیے ازبکوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

ایرانی مورخوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان میں ازبکوں کے دور کی بہت برائیاں بیان کی گئی ہیں، لیکن ان میں مبالغہ زیادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ازبک شروع میں ایرانیوں کی طرح مہذب نہیں تھے اور ان کی تاخت و تاراج سے خراسان کے شہروں کو نقصان پہنچا، لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا گیا ہے انہوں نے تعمیر و ترقی کے کام بھی انجام دیے۔ ازبک دور میں فقہ پر کتابیں لکھی گئیں، تفسیروں پر حاشیے لکھے گئے، ترکی شاعری کا رواج عام ہوا اور ایک ازبک شہزادہ محمد صالح نے شیبانی نامہ لکھا جو ترکی شاعری کا بہت اچھا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ازبکوں نے ترکی زبان کو ایک نئی شکل اور نیا نام دیا۔ آج یہ زبان ازبک ترکی کہلاتی ہے اور چغتائی ترکی کی جانشین ہے۔

(۲) استر خانی حکومت

(۱۵۹۸ء/۱۰۰۷ھ تا ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)

استر خانی حکمران جنہوں نے شیبانیوں کے بعد ماوراء النہر پر دو سو سال تک حکومت کی سرائے کے آلتن اوردہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا ایک شہزادہ قتلق تیمور سمرقند کے امیر تیمور کا حلیف ہوگیا تھا اور تیمور کی طرف سے توقتمش سے جنگ کی تھی۔ بعد میں قتلق تیمور کے جانشین استر خاں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور وہاں دو سو سال تک گمنامی کی حالت میں رہے۔ اس کے بعد ان کا ایک شخص یار محمد خان اپنے بیٹے جانی خاں کے ساتھ بخارا آ گیا، جہاں ازبک حکمران عبداللہ خاں کے باپ اسکندر خاں نے اپنی لڑکی سے جانی خاں کی شادی کر دی۔ جانی خاں نے جو عبداللہ کا بہنوئی ہوگیا تھا عبداللہ کے ساتھ مل کر اس دور کی جنگوں میں حصہ لیا۔ عبداللہ خاں کے بعد جب اس کا بیٹا عبدالمومن قتل کر دیا گیا اور شیبانی خاندان میں کوئی جانشین نہیں رہا تو امراء نے جانی خاں کے لڑکے محمد باقی خاں کو ۱۵۹۸ء/۱۰۰۷ھ میں بخارا کا امیر منتخب کر لیا اور اس طرح بخارا میں استر خانی خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔

امام قلی

استر خانیوں میں امام قلی جس نے ۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ تا ۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ حکومت کی، بڑا نیک دل حکمراں گذرا ہے۔ وہ زیادہ وقت علماء اور شعراء میں گذارتا تھا۔ اس کے زمانے میں راستے محفوظ تھے اور وہ لباس بدل کر شہر میں گشت کر کے لوگوں کے حالات معلوم کرتا تھا۔ آخر میں اس نے اپنے بھائی نذر محمد خاں کو بلا کر جو بلخ میں حکومت کرتا تھا، حکومت سپرد کر دی اور خود حج کو چلا گیا اور مدینہ میں ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مدینہ میں اس کے قائم کردہ دوسرے اوقاف کے علاوہ ایک باغ اور حمام انیسویں صدی کے آخر تک موجود تھے۔

نذر محمد متلون مزاج تھا اس لیے لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور فوج نے بغاوت کر دی۔ نذر محمد نے یہ صورت دیکھی تو اپنے بیٹے عبدالعزیز کو بلا کر بخارا کی حکومت اس کے سپرد کی اور خود بلخ میں جہاں وہ عرصہ دراز تک حاکم رہ چکا تھا چلا آیا۔ دہلی کے مغل سلاطین بلخ، بدخشاں اور ماوراء

النہر کو اپنی آبائی میراث سمجھتے تھے۔ یہ دَور شاہجہاں کا تھا۔ اس نے اہل بخارا کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور شہزادہ مراد کی قیادت میں ایک فوج بھیج کر ۱۶۴۶ء/۱۰۵۶ھ میں بدخشاں اور بلخ کو فتح کرلیا۔ لیکن ازبکوں نے مغلوں کا متحد ہو کر مقابلہ کیا اور مغلوں کو صلح کرنے پر مجبور کردیا، چنانچہ دس سال بعد ۱۶۴۷ء/۱۰۵۷ھ میں مغل فوجیں بلخ اور بدخشاں سے واپس چلی گئیں۔

عبدالعزیز (۱۶۴۵ء/۱۰۵۵ھ تا ۱۶۸۰ء/۱۰۹۱ھ) کا دَور استر خانیوں کا اچھا دَور سمجھا جاتا ہے۔ عبدالعزیز آخر میں تخت سے دست بردار ہو کر حج پر چلا گیا اور مدینہ میں انتقال ہوا، اور باپ اور چچا کے پاس دفن ہوا، لیکن اب استر خانی طاقت روبہ زوال ہوگئی تھی۔ مختلف علاقوں کے حکمران خود مختار ہونے لگے۔ خیوہ میں ایک آزاد ریاست قائم ہوگئی۔ پھر خوقند اور فرغانہ کا علاقہ بھی آزاد ہوگیا۔ اور بخارا کی مملکت بہت محدود ہوگئی۔ ۱۷۴۰ء/۱۱۵۳ھ میں نادر شاہ نے جیحوں کے جنوب کا علاقہ پھر ایران میں شامل کردیا اور امیر بخارا ابوالفیض خاں (ــــنہ تا ـــــنہ) کو باجگذار بنالیا۔ ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ میں میر معصوم نے استر خانیوں کی حکومت ختم کر کے منگیت خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

استراخانی دَور میں اگرچہ بعض حکمران نیک اور سمجھدار تھے، لیکن اب ماوراء النہر اور ترکستان کا خطہ بتدریج زوال کی طرف جارہا تھا۔ جس طرح ازبکوں کا دَور علمی ادبی اور تمدنی میدان میں تیموری دَور کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اسی طرح استراخانی دَور ازبکوں اور شیبانی دَور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تعمیری کام شیبانی دَور کے مقابلے میں بہت کم ہوئے اور علم و ادب کو ایسا زوال ہوا کہ اس دَور کی تاریخ کی پوری تفصیلات بھی معلوم کرنا مشکل ہے۔ دراصل ایران میں شیعی حکومت کے قیام کے بعد وسط ایشیا ساری دنیا سے کٹ گیا تھا۔ شمال میں خانہ بدوش قبائل تھے یا روسی مسیحی جن سے تعلق قائم کرنا آسان نہیں تھا۔ چین نے ۱۷۶۰ء میں مشرقی ترکستان پر قبضہ کر کے ترکستان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اب مغربی ترکستان ایک ایسا جزیرہ بن گیا تھا جس کو نہ باقی دنیا سے دلچسپی تھی اور نہ اس میں باقی اسلامی دنیا کے لیے کوئی کشش تھی۔ اس صورت حال نے وہاں کے باشندوں کو جہالت، تعصب، تقلید اور تنگ نظری کا شکار بنادیا اور یہ بات ترکستان کے زوال کا باعث بنی۔

(تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۳۲)

وسط ایشیا کے اُزبک

(۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)

(۱) آل شیبان (۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ)

(۱) شیبانی خان	۱۴۸۸ء/۸۹۳ھ تا ۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ
(۲) کوچ کنجی	۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ تا ۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ
(۳) ابوسعید	۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ تا ۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ
(۴) عبیداللہ	۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ تا ۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ
(۵) عبداللہ خاں اول	۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ تا ۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ
(۶) عبداللطیف خان	۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ تا ۱۵۴۱ء/۹۴۸ھ
(۷) عبدالعزیز	۱۵۴۱ء/۹۴۸ھ تا ۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ
(۸) برہان خان	۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ تا ۱۵۵۵ء/۹۶۳ھ
(۹) عبداللہ خاں دوم	۱۵۵۵ء/۹۶۳ھ تا ۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ
(۱۰) عبدالمومن	۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ تا ۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ

(۲) استرخانی حکمران

(۱۵۹۸ء/۱۰۰۷ھ تا ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ)

(۱) باقی محمد	۱۵۹۹ء/۱۰۰۷ھ تا ۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ
(۲) ولی محمد	۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ تا ۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ
(۳) امام قلی	۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ تا ۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ
(۴) نادر محمد	۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ تا ۱۶۴۷ء/۱۰۵۷ھ
(۵) عبدالعزیز	۱۶۴۷ء/۱۰۵۷ھ تا ۱۶۸۰ء/۱۰۹۱ھ
(۶) سبحان قلی	۱۶۸۰ء/۱۹۰۱ھ تا ۱۷۰۷ء/۱۱۱۴ھ

(۷) عبداللہ	۱۷۰۷ء/۱۱۱۴ھ تا ۱۷۰۹ء/۱۱۱۷ھ
(۸) ابوالفیض	۱۷۰۹ء/۱۱۱۷ھ تا ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ
(۹) عبدالمومن	۱۱۶۰ھ تا ۱۱۶۴ھ
(۱۰) عبداللہ دوم	۱۱۶۴ھ تا ۱۱۶۷ھ
(۱۱) محمد رحیم منگت	۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۱ھ
(۱۲) ابوالغازی	۱۱۷۱ھ تا ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ

باب ۱۹

بابر، ہمایوں اور شیر شاہ

(۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ)

(۱) بابر

۱۴۶۷ء/۸۷۲ھ میں سلطان ابوسعید کے انتقال کے بعد وسط ایشیا کی تیموری سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ خراسان اور دریائے جیحوں کے جنوب میں واقع علاقے سلطان حسین بائیقرا کے قبضے میں آ گئے۔ سمرقند اور بخارا پر سلطان ابوسعید کا لڑکا احمد قابض ہو گیا اور فرغانہ میں احمد کا بھائی عمر شیخ قابض ہو گیا۔ ہندوستان کی تیموری سلطنت کا بانی بابر اسی عمر شیخ کا لڑکا تھا۔ تیمور سے اس کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: بابر ابن عمر شیخ مرزا، ابن ابوسعید مرزا، ابن مرزا سلطان محمد ابن میران شاہ ابن تیمور۔

بابر کی ماں قتلغ نگار خانم مشرقی ترکستان کے منگول حکمران یونس خاں کی بیٹی تھی اور اس کا سلسلۂ نسب چغتائی خاں کے واسطے سے چنگیز سے ملتا تھا۔ اس طرح بابر کی رگوں میں تیمور اور چنگیز دونوں کا خون تھا۔ عمر شیخ کا ۱۴۹۴ء/۸۹۸ھ میں جب انتقال ہوا تو بابر کی عمر صرف بارہ سال تھی اور وہ چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا تھا اور یہ دشمن اس کے چچا اور ماموں تھے جو فرغانہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں ازبک حملہ آور شیبانی خاں کی قیادت میں ماوراء النہر میں داخل ہو گئے جن کا مقابلہ کرنا نہ تو بابر کے چچا کے بس میں تھا اور نہ بابر کے بس میں۔ بہرحال بابر نے سب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس نے کئی مرتبہ سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش ۱۴۹۷ء/۹۰۱ھ میں کی لیکن ناکام رہا۔ ۱۴۹۷ء/۹۰۲ھ کے موسم بہار میں وہ سمرقند پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا، لیکن صرف ایک سو دن شہر پر قابض رہ سکا۔ فرغانہ میں بغاوت کی وجہ سے سمرقند چھوڑنا پڑا۔ لیکن فرغانہ بھی ہاتھ میں نہیں آیا اور سمرقند بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک تو کم عمری اور پھر ساتھیوں کی کمی۔ جگہ جگہ مارا پھرتا تھا لیکن بس نہیں چلتا تھا۔ اس زمانے کا حال بیان کرتے

ہوئے اس نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میرا حال ایک گیند کی طرح ہو گیا تھا جو ہر ٹھوکر کے ساتھ کبھی ادھر چلی جاتی ہے اور کبھی ادھر۔ لیکن بابر نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ ۱۵۰۰ء/۹۰۶ھ میں اس نے دوبارہ سمرقند فتح کر لیا۔ یہ فتح بھی عارضی ثابت ہوئی اور شیبانی خاں نے آٹھ ماہ بعد بابر کو سمرقند سے نکال دیا۔ مختلف نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد جب وہ اپنے آبائی وطن میں ناکام ہو گیا تو اس نے ماوراء النہر کو خیر باد کہا اور ۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ میں کابل فتح کر لیا اور وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔ تیموری حکمران اب تک مرزا کہلاتے تھے، بابر نے پہلی مرتبہ ۱۵۰۷ء میں شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اسی سال وہ ہرات گیا تاکہ شیبانی خاں کے مقابلے میں تیموری شہزادوں کا متحدہ محاذ بنا سکے۔ شیبانی خاں کے مرنے کے بعد بابر نے ایک مرتبہ اور ماوراء النہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۵۱۱ء/۹۱۷ھ میں سمرقند پر قابض بھی ہو گیا، لیکن ازبکوں نے جلد ہی پھر نکال دیا۔ ۱۵۲۲ء میں بابر نے شاہ بیگ ارغون سے قندھار لے لیا۔

ترکستان سے مایوس ہونے کے بعد بابر نے برصغیر پاکستان و ہند کا رُخ کیا جہاں لودھی خاندان کی حکومت تھی۔ بابر برصغیر کے ان علاقوں پر جو تیمور فتح کر چکا تھا اپنا خاندانی حق سمجھتا تھا۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کئی حملے کیے اور اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کی پہلی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے لڑکے ہمایوں نے آگے بڑھ کر آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ بابر اپنے آبائی وطن میں تو حکومت قائم کرنے میں ناکام ہو گیا، لیکن ہندوستان میں ایک ایسی عظیم سلطنت کی بنیاد ڈال دی جو اپنی وسعت، آبادی، وسائل شان و شوکت اور کارناموں میں وسط ایشیا کی تیموری سلطنت سے بازی لے گئی۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد راجپوتانہ کے راجپوتوں نے کافی زور پکڑ لیا تھا اور انہوں نے چتوڑ کے راجہ رانا سانگا کی قیادت میں ایک طاقتور حکومت قائم کر لی تھی۔ رانا سانگا ایک بہادر اور جری راجہ تھا۔ گجرات اور مالوہ کے مسلمان حکمرانوں سے اس کی مسلسل لڑائیاں رہتی تھیں اور راجپوت یہ توقع رکھتے تھے کہ اس کی قیادت میں ایک دن وہ دہلی پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ دہلی پر بابر کے قبضے کے بعد رانا سانگا کو یہ موقع ہاتھ آ گیا اور اس نے اس نئے حملہ آور کو ہندوستان سے نکالنے کی کوشش کی۔ بہت سے افغان سردار بھی اس سے مل گئے۔ آگرہ سے بیس میل دور کنواہہ کے مقام پر بابر اور رانا سانگا کی ۱۶۔ مارچ ۱۵۲۷ء کو فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں بابر کی بارہ ہزار

فوج نے رانا سانگا اور اس کے اتحادیوں کی دو لاکھ فوج کو شکست فاش دی۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد افغان سردار مشرق کی طرف فرار ہو گئے تھے، وہاں انہوں نے بنگال کے حکمران نصرت شاہ کی مدد سے بابر سے ایک بار پھر جنگ کی، لیکن بابر نے ان کو بہار اور اودھ کی سرحد پر دریائے گھاگرا کے کنارے ٦۔مئی ١٥٢٩ء کو ایک بار پھر شکست فاش دی۔

بابر اب بنگال کی سرحد تک پورے شمالی ہند کا بادشاہ ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان ہی میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اس غرض سے اس نے آگرہ اور دوسرے مقامات پر کئی باغ اور عمارتیں تعمیر کیں۔ ٢٦۔دسمبر ١٥٣٠ء کو جب اس کا انتقال ہوا تو اسے آگرہ میں دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر خود اس کے تعمیر کیے ہوئے باغ میں دفن کیا گیا۔ بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کابل پہنچا دی گئی اور وہاں بابر ہی کے تعمیر کردہ باغ میں دفن کر دی گئی۔

بابر نے کابل پر ٢٦ سال اور ہندوستان پر صرف چار سال حکومت کی۔ اس کی زندگی لڑائیوں میں صرف ہوئی، لیکن اس کے تدبر اور انتظامی صلاحیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال تھا اور اس کے فوجی اس کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔ وہ شائستگی اور شرافت کا نمونہ تھا۔ دشمن کے ساتھ اس کا طرز عمل فیاضانہ ہوتا تھا اور اس معاملے میں وہ صلاح الدین اور سلیمان قانونی کی طرح ان چند مسلمان حکمرانوں میں سے ہے جن کی مغربی مورخین نے بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ بابر شروع میں شراب نہیں پیتا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہرات میں تیموری شہزادوں کے اصرار پر شراب پی۔ اس کے بعد وہ شراب کا ایسا عادی ہو گیا کہ اپنی تزک میں شراب کی محفلوں کا ذکر بڑی دلچسپی سے کرتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو بھی شراب پینے کی ترغیب دی۔ رانا سانگا سے جب مقابلہ ہوا تو اس نے شراب سے توبہ کر لی۔

بابر صرف ایک سپہ سالار اور حکمران ہی نہیں تھا بلکہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھا۔ وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کی کتاب تزک بابری یا بابر نامہ جس میں اس نے اپنے حالات لکھے ہیں، ترکی ادب کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ ترکی میں اس کا ایک دیوان بھی موجود ہے اور چند دوسری مختصر کتابیں۔ خطاط بھی اعلیٰ درجہ کا تھا، اور ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جسے خط بابری کہا جاتا ہے۔

بابر کی قائم کی ہوئی سلطنت کو مغلیہ سلطنت کہا جاتا ہے، کیونکہ تیمور کا منگول یا مغل نسل سے قریبی تعلق تھا، لیکن اس کے لیے زیادہ صحیح نام سلطنت تیموریہ ہے۔

ہمایوں

بابر کا بیٹا ہمایوں (۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء) باپ کی طرح شریف، نیک اور رحم دل تھا۔ میدان جنگ میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوتا تھا۔ باپ کے ساتھ بیشتر لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پانی پت اور کنواہہ کی جنگ میں شریک تھا۔ آگرہ اسی نے فتح کیا تھا، لیکن عیش پسند اور آرام طلب تھا اور اپنی فوج اور سرداروں کو وہ بابر کی طرح پوری طرح قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ابتدائی چند سال کامیابی کے ہیں۔ اس نے افغانوں کو لکھنؤ کے پاس شکست دے کر مشرق کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ایک باغی سردار نے جب گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کے پاس پناہ لی اور بہادر شاہ نے اس کو ہمایوں کے حوالے نہیں کیا تو ہمایوں نے بہادر شاہ کو شکست دے کر ۱۵۳۵ء میں مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں نے بنگال کا رُخ کیا جہاں ایک افغان سردار شیر خاں قابض ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے بنگال کا دارالحکومت گو آسانی سے فتح کر لیا لیکن وہاں عیش میں پڑ گیا۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا حریف شیر خاں صلاحیت، بہادری اور جفاکشی میں دوسرا بابر ہے۔ شیر خاں نے اس کی واپسی کے راستے بند کر دیئے۔ اور جب ہمایوں گھبرا کر واپس ہوا تو شیر خاں نے چوسا کے مقام پر اس کو شکست دی، (۱۵۳۹ء) اس کے بعد دوسری شکست قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے دی۔ ہمایوں اب آگرہ کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا، لیکن شیر خاں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے اب ملک چھوڑنے ہی میں عافیت دیکھی۔ اس کے دو بھائی کامران اور عسکری کابل چلے گئے اور تیسرا بھائی ہندال قندھار چلا گیا۔ ہمایوں نے کچھ مدت سندھ میں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ بھی ۱۵۴۵ء میں قندھار کے راستے ایران چلا گیا، تاکہ شاہ طہماسپ سے امداد حاصل کر سکے۔ ہمایوں تقریباً دو سال ایران میں رہا۔ قزدین کے قریب شاہ طہماسپ سے اس کی ملاقات ہوئی اور طہماسپ نے اس خواہش کے تحت تیرہ ہزار سواروں سے ہمایوں کی مدد کی کہ وہ شیعہ عقیدہ اختیار کر لے گا اور بارہ اماموں کے

نام خطبے میں شامل کرے گا۔ [1] ہمایوں نے ایرانی فوجیوں کی اس مدد سے ۱۵۴۵ء میں قندھار اور کابل واپس لے لیے، جن پر اس کے بھائی عسکری اور کامران قابض ہو گئے تھے، لیکن دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اس کو دس سال اور انتظار کرنا پڑا اور یہ اس وقت ہی ممکن ہوا جب شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

ہمایوں علم دوست، نرم طبیعت اور عیش پسند انسان تھا۔ بابر کی جفاکشی کا یہ حال تھا کہ جمنا میں کود کر دہلی سے آگرے تک تیرتا چلا جاتا تھا اور گھوڑے کی پشت پر مسلسل دو سو میل سفر کرنا اس کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے برخلاف ہمایوں اگرچہ ایک جری اور بہادر انسان تھا، لیکن آرام طلب اور عیش پسند تھا۔ سپاہ کو بابر کی طرح قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا اس کے بھائیوں نے قدم قدم پر اس سے جھگڑے کیے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ یہ تمام باتیں شیر شاہ کے مقابلے میں اس کی ناکامی کا باعث ہوئیں۔ ہمایوں کو علم ہیئت اور ریاضی سے خاصی دلچسپی تھی۔ خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان۔ بدایونی نے اس کے اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''سخی ایسا تھا کہ محکمۂ مالیات کے کارکن اُس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے اور شریف ایسا کہ اس کی زبان پر کبھی گالی نہیں آئی''

(۲) شیر شاہ سوری

شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) تاریخ کے ان لوگوں میں سے ہے جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بادشاہت تک پہنچے۔ بلند حوصلہ رکھنے والے لوگوں کے لیے شیر شاہ کی زندگی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ اس نے جوانی میں اپنی تلوار سے شیر کو مارا تھا، اس لیے صوبہ بہار (بھارت) کے حاکم نے اس کو شیر خاں کا خطاب دیا تھا۔ شیر خاں کا باپ اسی صوبہ بہار میں سہسرام کے علاقے کا جاگیردار تھا۔ یہ علاقہ اس زمانہ میں دہلی کے لودھی بادشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ شیر خاں بڑا ہونے کے بعد جونپور چلا گیا جو اس زمانہ میں علم وادب کا بہت بڑا مرکز بن گیا

---

(1) جوہر آفتابچی نے جو سفر ایران میں ہمایوں کے ساتھ تھا، لکھا ہے کہ ہمایوں نے شیعہ مذہب بھی قبول کر لیا تھا، لیکن ہمایوں کے کسی طرز عمل سے اس بات کا اظہار نہیں ہوا کہ وہ شیعہ ہو گیا تھا۔ رہا بارہ اماموں کے نام خطبے میں داخل کرنے کا مسئلہ تو اس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا اور نہ ہمایوں نے اس قسم کا کوئی حکم دیا۔

تھا۔ یہاں اس نے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سہسرام واپس آ گیا اور اپنی جاگیر کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ اس کی دُور دُور شہرت ہوگئی۔ اس نے اپنے علاقے سے چوری، ڈکیتی، رہزنی ختم کر دی۔ کاشتکاروں پر محصول لینے والے جو ظلم کرتے تھے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے اس انتظام سے پیداوار بڑھ گئی اور لوگ خوشحال ہو گئے۔

شیر خاں اپنی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا کہ اسی زمانہ میں بابر نے دہلی پر قبضہ کر کے لودھی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور مغلوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ شیر خاں اگرچہ صرف ایک جاگیر کا مالک تھا، لیکن اس کو اپنی قابلیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ ''اگر مجھے موقع ملا تو میں ایک دن مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا'' ایک مرتبہ وہ بابر کی ایک دعوت میں شریک ہوا۔ کھانے میں ایک ایسی چیز بھی تھی جسے چھری سے کاٹ کر کھانا ہوتا تھا۔ شیر خاں کے پاس دستر خوان پر کوئی چھری نہیں تھی لیکن اس نے چھری مانگنے کی بجائے کمر سے پیش قبض نکالا اور کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ بابر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیر خاں کی یہ آزادی اور ہمت دیکھ کر بابر کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ جوانمرد انسان اس کی حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، چنانچہ بابر نے اپنے وزیر کو ہدایت کر دی کہ ''شیر خاں خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے اس پر نظر رکھی جائے'' بابر کا یہ اندیشہ صحیح نکلا۔ شیر خاں اس دعوت کے بعد سہسرام واپس آ گیا اور جب بابر کا انتقال ہو گیا، تو اس نے صوبہ بہار اور بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں سے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہمایوں کو شکست ہوئی اور شیر خاں نے دہلی پر قبضہ کر کے ''شیر شاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ شیر شاہ نے لاہور اور سرگودھا تک ہمایوں کا تعاقب کیا۔ اس کی فوجوں نے ملتان اور سندھ پر بھی قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے ہمایوں کو ایران جا کر پناہ لینی پڑی۔ اس کے بعد شیر شاہ اجمیر، چتوڑ اور مالوہ پر قابض ہو گیا اور اس طرح ایک ایسی سلطنت کا حکمران بن گیا جو لودھی سلطنت سے بڑی اور غلام بادشاہوں کی سلطنت کے برابر تھی۔ شیر شاہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ ایک گولہ لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

کارنامے

شیر شاہ نے پورے ملک پر صرف چار سال حکومت کی۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس نے دہ

کارنامے انجام دیئے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ جس طرح عمر بن عبدالعزیز کا عہد ڈھائی سال کی حکومت کے باوجود غیر فانی ہے، اسی طرح شیر شاہ کی چار سال کی حکومت غیر فانی ہے۔ اس نے سلطنت میں بڑی بڑی سڑکیں بنائیں جن کے کنارے سرائیں تعمیر کرائیں اور سایہ دار درخت لگوائے۔ ان سڑکوں میں سب سے مشہور سڑک وہ ہے جو ڈھاکہ سے پشاور تک جاتی ہے اور بڑی سڑک یا جرنیلی سڑک کے نام سے مشہور ہے یہ سڑک لاہور سے پاس ہو کر گزرتی ہے۔ مغربی پاکستان میں اس نے جو سڑک بنوائی وہ لاہور سے ملتان تک جاتی تھی۔ ان سڑکوں پر دو دو چار چار میل کے فاصلہ پر جو سرائیں بنوائیں ان میں ہندو اور مسلمانوں کے رہنے کے لیے جدا جدا مکان تھے۔ اس نے یہ جدا جدا مکان اس لیے نہیں بنوائے تھے کہ شیر شاہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرتا تھا اور ان کا ایک جگہ رہنا پسند نہیں کرتا تھا جیسا کہ آجکل جنوبی افریقہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کئی یورپی ملکوں میں ہوتا ہے۔ شیر شاہ نے یہ انتظام اس لیے کیا تھا کہ ہندوؤں کو آرام پہنچے، کیونکہ وہ چھوت چھات کے قائل تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور ان کے کھانے کی چیزیں بھی مختلف ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے شیر شاہ نے ان سراؤں میں ہندو باورچی بھی مقرر کیے تھے۔ ہر سرائے میں ڈاک کے دو گھوڑے بھی ہوتے تھے۔

شیر شاہ نے ملک میں ایسا امن قائم کیا کہ چوری، رہزنی ختم ہوگئی۔ زراعت کو اس نے بڑی ترقی دی۔ نئے نئے قوانین بنائے اور نئی اصلاحات کیں۔

شیر شاہ نے غریبوں کے کھانے کے لیے جو لنگر خانے قائم کیے تھے، ان میں روزانہ کا خرچ پانچ سو اشرفی تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سلطنت کے تمام اندھوں، لُولوں، لنگڑوں، بیوہ عورتوں اور مریضوں کے وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ شیر شاہ کا قاعدہ تھا کہ جب لشکر کہیں ٹھہرتا تو اعلان کر دیتا کہ کسی زراعت کو نقصان نہ پہنچے اور سوار پہرہ دار مقرر کر دیتا۔ ایک مرتبہ ایک سپاہی نے کچھ بالیں توڑ لیں، تو شیر شاہ نے اس کی ناک چھید کر اس میں بالوں کو لٹکایا اور اس کی ٹانگیں باندھ کر سارے سفر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کیے ساتھ لیے پھرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی کسی کھیت کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

اس نے قانون بنایا کہ جس علاقہ میں رہزنی ہوئی ہو اور رہزن گرفتار نہ ہو، تو جتنا مال وہ لے گئے ہوں وہ اس علاقہ سے دلایا جائے جس میں چوری ہوئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہزنی ختم ہوگئی۔

یہ روپیہ جو آجکل ہم سکہ کی شکل میں استعمال کرتے ہیں شیر شاہ کی ایجاد ہے۔ فوج وغیرہ میں گھوڑوں کو پہچان کے لیے داغ دینے کا رواج ہر جگہ عام ہے، یہ طریقہ شیر شاہ ہی کا نکالا ہوا ہے۔ برطانوی حکومت میں گورنر جنرل اور وائسرائے کا بھی عہد حکومت پانچ سال ہوتا تھا۔ برطانوی ہند کی پوری تاریخ پڑھ ڈالو تو تم کو معلوم ہوگا کہ کوئی وائسرائے بھی ایسا نہیں آیا کہ جس نے اپنے عہد حکومت میں شیر شاہ کے عہد حکومت کے برابر انتظامی قوانین بنائے ہوں، اتنے علاقے فتح کیے ہوں اور اتنے کام رفاہ عام کے کیے ہوں۔

شیر شاہ کے کئی اقوال بڑی دانشمندی کے ہیں۔ ان میں سے چند اقوال حسب ذیل ہیں:

۱۔ عدل سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

۲۔ فسق و فجور مانع فلاحِ خلق ہوتا ہے۔

۳۔ جو بادشاہ خدا کی اطاعت کرنے میں کمر نہیں باندھتا خلق اس کی خدمت کے لیے کمر نہیں باندھتی۔

۴۔ ظلم سے سلطنت جاتی ہے اور عقبیٰ میں ندامت ہوگی ملک ویران اور رعیت خراب ہوگی۔

۵۔ بڑے آدمی کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر وقت کام میں مصروف رہے۔

۶۔ ملک کی سرسبزی زراعت پر موقوف ہے اور زراعت کا انحصار کسانوں پر ہے، جس قدر وہ خوشحال ہوں گے زمین کو زرخیز کریں گے اور جس قدر خستہ حال ہوں گے زمین کو ویران کریں گے۔

شیر شاہ کے جانشین

شیر شاہ پٹھانوں کے قبیلے "سور" سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے، لیکن سوری خاندان کی یہ حکومت زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ نہ تو شیر شاہ کے جانشین لائق ثابت ہوئے اور نہ اس کے پٹھان امراء جو بلند تر مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ شیر شاہ کے بعد صرف اس کے لڑکے اسلام شاہ (۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۴ء) نے کامیابی سے نو سال حکومت کی۔ اسلام شاہ کے بعد اس کا لڑکا فیروز بارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا، لیکن اس کا ماموں مبارز خاں اس کو قتل کر کے محمود شاہ عادل کے نام سے تخت نشین ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ پنجاب میں شیر شاہ کے بھتیجے سکندر شاہ نے بادشاہی کا اعلان کر دیا، محمد

شاہ سوری نے بنگال میں اور دوسرے سرداروں نے بہار اور دہلی میں تخت کے دعوے شروع کر دیئے۔ ہمایوں نے جب ہندوستان کے حالات کو پراگندہ پایا، تو موقع سے فائدہ اٹھایا اور کابل کی طرف سے حملہ کر دیا۔ نومبر ۱۵۵۴ء میں اس نے پشاور پر اور فروری ۱۵۵۵ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکندر شاہ سوری نے سرہند کے قریب مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور جولائی ۱۵۵۵ء میں ہمایوں دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس طرح ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کر لی۔ لیکن ابھی وہ اپنی سلطنت کو مستحکم نہیں کر پایا تھا کہ فتح دہلی کے چند ماہ بعد وہ دہلی میں اپنے کتب خانہ کے زینے سے گر کر ۲۴۔ جنوری ۱۵۵۶ء کو انتقال کر گیا۔

سوری خاندان

(۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ تا ۱۵۵۵ء/۹۶۲ھ)

(۱) شیر شاہ سوری	۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ تا ۱۵۴۵ء/۹۵۲ھ
(۲) اسلام شاہ سوری	۱۵۴۵ء/۹۵۲ھ تا ۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ
(۳) محمد عادل شاہ سوری	۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ تا ۱۵۵۵ء/۹۶۲ھ
(۴) سکندر شاہ سوری	۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ تا ۱۵۵۵ء/۹۶۲ھ

اہم واقعات

۱۴۸۳ء بابر کی پیدائش۔

۱۴۸۶ء شیر شاہ کی پیدائش۔

۱۵۰۴ء بابر کا کابل پر قبضہ۔

۱۵۲۲ء قندھار پر بابر کا قبضہ۔

۱۵۲۴ء لاہور پر بابر کا قبضہ۔

۱۵۲۶ء (۲۱۔اپریل) پانی پت کی پہلی جنگ، بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی۔

۱۵۲۷ء (۱۶۔مارچ) بابر نے کنواہہ کی جنگ میں رانا سانگا کو شکست دی۔

۱۵۲۹ء (۶۔مئی) گھاگھرا کی جنگ میں بابر نے افغانوں کو شکست دی۔

۱۵۳۵ء ہمایوں کا گجرات اور مالوہ پر عارضی قبضہ۔

۱۵۳۹ء (۲۶۔جون) شیر شاہ نے چوسہ کے مقام پر ہمایوں کو شکست دی۔

۱۵۴۰ء (۱۶۔مارچ) شیر شاہ نے قنوج کے پاس بلگرام کی جنگ میں ہمایوں کو دوبارہ شکست دی۔

۱۵۴۲ء مالوہ اور ملتان پر شیر شاہ کا قبضہ (۱۵۔اکتوبر کو اکبر کی پیدائش)

۱۵۴۳ء سندھ اور مارواڑ پر شیر شاہ کا قبضہ۔

۱۵۵۵ء (جولائی) ہمایوں دہلی پر قابض ہو گیا۔

باب ۲۰

دہلی کی عظیم الشان تیموری سلطنت (۱)

(۱۵۵۶ء تا ۱۷۰۷ء)

(۱) جلال الدین اکبر

(۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء)

پانی پت کی دوسری جنگ

ہمایوں کے انتقال کے وقت اس کا لڑکا اکبر دہلی میں نہیں تھا۔ وہ اپنے اتالیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں بچے کھچے افغانوں کے خلاف کارروائی میں مصروف تھا۔ جب ہمایوں کے انتقال کی خبر ملی تو بیرم خاں نے وہیں ضلع گورداسپور کے ایک گاؤں کلانور میں اکبر کی تخت نشینی کی رسم ادا کی (۱۴۔ فروری ۱۵۵۶ء) ہمایوں اگرچہ دہلی پر قابض ہوگیا تھا، لیکن سوری افغانوں کی طاقت ابھی تک ٹوٹی نہیں تھی۔ ہمایوں کے انتقال کے بعد عادل شاہ سوری کے ہندو سپہ سالار ہیمو بقال نے آگرہ اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ پانی پت کے تاریخی میدان جنگ میں جہاں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی، اکبر اور ہیمو بقال کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اکبر کی فوج نے جس کی قیادت بیرم خاں کررہا تھا، ہیمو کو شکست فاش دی اور اس کو قتل کردیا گیا اور دہلی اور آگرہ پر ایک بار پھر تیموری فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔

اکبر سندھ کے قصبہ عمرکوٹ میں ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہمایوں شیر شاہ سے ہار کر ادھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اسی پریشانی کی حالت میں اکبر پیدا ہوا، لیکن اس وقت کسی کو معلوم تھا کہ یہ بچہ جو ناسازگار حالات میں پیدا ہوا ہے، ایک دن اتنی بڑی

سلطنت کا مالک بن جائے گا، جو اس کے باپ دادا کی حکومت سے کہیں بڑی ہوگی۔ اکبر جس وقت کلانور میں تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اکبر کی نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام کئی سال تک اس کے قابل اور وفادار اتالیق بیرم خاں نے سنبھالا۔ اس کی کوششوں سے چند سال ہی میں اکبر کی سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں اور ۱۵۶۰ء میں جب اکبر نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی حکومت اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ ملک کی صوبائی حکومتوں کے خلاف فوجی کارروائی کر سکے۔ چنانچہ اکبر نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو تیزی سے بڑھانا شروع کر دیا۔ فتوحات کا یہ کام زیادہ تر اس کے سپہ سالار نے انجام دیا، لیکن اکبر خود بھی ایک اچھا فوجی اور سپہ سالار تھا۔ وہ جفاکشی اور سخت کوشی میں بابر سے کم نہیں تھا۔ اکبر نے ایک ایک کر کے شمالی ہند کی ان تمام حکومتوں کو ختم کر دیا جو سلطنت دہلی کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ اکبر کی فوجوں نے ۱۵۶۴ء میں مالوہ، ۱۵۶۹ء میں راجپوتانہ، ۱۵۷۳ء میں گجرات، ۱۵۷۵ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اب تک کشمیر پر دہلی کے بادشاہوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ اکبر نے پہلی مرتبہ ۱۵۸۷ء میں کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ۱۵۹۱ء میں سندھ ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ اور ۱۵۹۵ء میں بلوچستان اور قندھار پر بھی تیموری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

دکن

شمالی ہند پر قبضہ ہو جانے کے بعد اکبر نے دکن کا رخ کیا۔ دکن میں خاندیس کی فاروقی[1] ریاست اور احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کی سرحدیں تیموری سلطنت سے ملتی تھیں۔ ان میں خاندیس کے حکمران راجہ علی خاں فاروقی نے اکبر کی طاقت کا اندازہ کر کے پہلے ہی دہلی کی بالادستی قبول کر لی

---

(۱) دریائے تاپتی اور دریائے نربدا کا درمیانی علاقہ خاندیس کہلاتا تھا۔ زرخیزی اور آب و ہوا کی خوبی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ ۱۳۸۸ء میں یہاں ملک راجہ فاروقی نے آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ خاندیس کے یہ حکمران سلاطین فاروقی کہلاتے تھے۔ ان کا دارالحکومت شہر برہانپور تھا۔ یہ شہر اسی زمانے میں آباد ہوا اور ایک بزرگ برہان الدین کے نام پر اس کا نام برہانپور رکھا گیا۔

تھی۔ لیکن احمد نگر کی نظام شاہی حکومت [1] نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور راجہ علی فاروقی کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا بہادر خاں بھی اکبر کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ اکبر نے ۱۶۰۰ء/ ۱۰۰۹ھ میں برہانپور اور قلعہ اسیر فتح کر کے خاندیس میں فاروقی سلاطین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور احمد نگر فتح کر کے برار اور احمد نگر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن احمد نگر کے جنوب مغرب کا علاقہ نظام شاہیوں کے قبضہ میں رہ گیا۔

اکبر نے کل پچاس سال حکومت کی اور اس عرصہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو وسعت میں تقریباً دہلی کی سلطنت کے برابر تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دکن کا بڑا حصہ اور جنوبی ہند اکبر کی سلطنت میں شامل نہیں تھا لیکن کشمیر، بلوچستان، کابل اور قندھار اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ یہ وہ علاقے ہیں جو دہلی کی سلطنت میں شامل نہیں تھے۔

کارنامے

اکبر اگرچہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اس نے سلطنت کا ایسا انتظام کیا اور ملک کو ایسی ترقی دی کہ تعجب ہوتا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا اور ہر صوبہ میں ایک صوبہ دار مقرر کیا۔ اس نے کاشتکاروں کے متعلق شیر شاہ کی اصلاحات کو اور ترقی دی۔ اس کام میں فتح اللہ شیرازی اور ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل نے جو شیر شاہ کے زمانہ میں کام کر چکا تھا۔ اکبر کی بڑی مدد کی۔ اکبر نے انتظام ملک کے متعلق نئے نئے قوانین بھی بنائے جن پر اتنا زمانہ گزرنے کے بعد آج بھی

---

(۱) نظام شاہی حکومت کی بنیاد بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ایک بہمنی امیر احمد نظام شاہ نے ۱۴۹۰ء میں ڈالی اور احمد نگر کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا تھا جو نظام شاہی حکومت کا دارالحکومت تھا۔ ۱۵۷۴ء میں عماد شاہی حکومت کو ختم کر کے برار بھی نظام شاہی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ تالیکوٹہ کی جنگ کے موقع پر یہاں حسین نظام شاہ کی حکومت تھی۔ مشہور ملکہ چاند بی بی (۱۵۵۰ء تا ۱۶۰۰ء) جس نے احمد نگر میں اکبر کی فوجوں کا کئی سال دلیرانہ مقابلہ کیا، اسی حسین نظام شاہ کی بیٹی اور بیجاپور کے علی عادل شاہ کی بیوی تھی۔ نظام شاہی امراء میں صلابت خاں اور ملک عنبر کے نام بہت نمایاں ہیں۔ صلابت خاں متوفی ۹۹۸ھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مہاراشٹر کے علاقے میں کسی شخص نے رعایا کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لیے اس کے برابر کام نہیں کیا۔ ملک عنبر متوفی ۱۶۲۵ء/ ۱۰۳۵ھ ایک حبشی امیر تھا جس نے آخری دور میں بیس پچیس سال تک نظام شاہی مملکت کے بچے کھچے علاقے کو سلطنت دہلی کے قبضے میں جانے سے بچایا۔ وہ اپنی انتظامی صلاحیت اور عدل و انصاف میں مشہور تھا۔ مرہٹوں نے چھاپہ مار جنگ کی تربیت پہلی مرتبہ اسی سے حاصل کی۔ بعض مورخین نے ملک عنبر کو اپنے دور کی قابل ترین ہستی لکھا ہے۔ نظام شاہی حکمران شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں حبشیوں نے بڑا عروج پایا، لیکن حبشی سردار سنی ہوتے تھے۔

عمل ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے اکبر کے بنائے ہوئے آئین وقوانین کی تفصیل اپنی کتاب آئین اکبری میں دی ہے۔ اس کتاب میں سلطنت کے تمام صوبوں کی پیداوار، تجارت، جغرافیہ اور اقتصادی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبر نے سرکاری عہدے داروں کے لیے جو نظام قائم کیا تھا وہ منصب داری نظام کہلاتا تھا۔ اس کے تحت عہدے داروں کے ۳۳ درجے قائم کیے گئے تھے۔ دس ہزاری سب سے بڑا منصب ہوتا تھا۔ اس سے کم درجے کے منصب ہشت ہزاری۔ ہفت ہزاری اور پنج ہزاری کہلاتے تھے۔ سب سے چھوٹا درجہ دس کا ہوتا تھا۔ اکبری دَور کے منصب دار جن کو صوبوں کا حاکم مقرر کیا جاتا تھا انتظامی اور فوجی دونوں اختیارات رکھتے تھے۔ لیکن عدالتی اختیارات قاضی کو حاصل ہوتے تھے۔ فوج تین قسم کی ہوتی تھی۔ ایک باقاعدہ فوج جو بادشاہ کے پاس دارالحکومت میں ہوتی تھی، دوسری منصب داروں کی فوج جس کے لیے منصب داروں کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اور تیسرے راجپوتانہ کی باجگذار ہندو ریاستوں کی فوج جس کی ضرورت پڑنے پر طلب کیا جاتا تھا۔

علم وادب کی سرپرستی

اکبر نے اَن پڑھ ہونے کے باوجود علم وفن کی بھی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں جیسے بڑے بڑے اہل علم گذرے ہیں، ویسے ہندوستان کی تاریخ میں کسی بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوئے۔

اس کے عہد کے سب سے بڑے عالم مجدد الف ثانی اور شاہ عبدالحق تھے، لیکن ان کا شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے بادشاہوں کی سرپرستی سے آزاد رہ کر اسی طرح کام کیا، جس طرح امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور طبری وغیرہ نے عباسیوں کے زمانہ میں، امام غزالی عبدالقادر جیلانی اور ابن جوزی نے سلجوقیوں کے زمانہ میں اور ابن تیمیہ نے مصر کے مملوک بادشاہوں کے زمانہ میں کام کیا۔

لیکن اس زمانہ کے عالموں اور فاضلوں کی بڑی تعداد شاہی دربار سے وابستہ تھی۔ دربار میں ان کی بڑی قدر تھی اور ان کو بڑے بڑے وظیفے ملتے تھے۔ ان لوگوں میں ایک فیضی ہے۔ فیضی اس زمانہ کا فارسی کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے۔ وہ شاعر کے علاوہ ایک بڑا مصنف بھی تھا۔ کہا جاتا

ہے کہ اس نے ۹۹ کتابیں لکھیں۔فیضی کا بھائی ابوالفضل بھی اس عہد کا بہت اچھا مصنف تھا۔ ابوالفضل اکبر کا وزیر تھا اور اس نے ''اکبر نامہ'' اور ''آئین اکبری'' کے نام سے اس عہد کی دو تاریخیں لکھیں ہیں۔ابوالفضل اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انشا پرداز سمجھا جاتا تھا۔کاشغر کا بادشاہ کہا کرتا تھا کہ مَیں اکبر کی تلوار سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہوں۔

اکبر کے دربار کے سب سے بڑے مورخ عبدالقادر بدایوانی ہوئے ہیں۔انہوں نے اکبر کے حکم سے کئی کتابوں کا عربی اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا،لیکن ان کی کتاب ''منتخب التواریخ'' بڑی مشہور ہوئی۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دوسری درباری تاریخوں کی طرح بادشاہ کی خوشامد نہیں ہے بلکہ اس عہد کی سچی سچی تاریخیں لکھی ہیں۔اس سے ہم کو ایسی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو دوسری کتابوں سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔

اکبر کو عمارتیں بنانے کا بھی بڑا شوق تھا۔آگرہ کا قلعہ، فتح پور سیکری کے محلوں کی بستی، جس کی مسجد کا دروازہ دنیا کا سب سے اونچا دروازہ ہے، دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، لاہور اور سری نگر کے قلعے اسی کے بنائے ہوئے ہیں اور یہ سب عمارتیں بڑی ہی خوبصورت اور قابل دید ہیں۔

اکبر نے ہندوؤں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا اور ان کو سلطنت میں بڑے بڑے عہدے دیئے۔اس سے پہلے اسلامی حکومت میں ہندوؤں کو اس کثرت سے بڑے عہدے کبھی نہیں ملے تھے۔اکبر کے ہندو امراء میں بیربل، مان سنگھ اور ٹوڈرمل مشہور ہیں۔

دینِ الٰہی

اکبر ایک ذہین اور جدت پسند حکمران تھا۔اس کو نئے نئے تجربے کرنے کا شوق تھا۔اُس کی اس جدت پسندی سے سلطنت کو بہت فائدہ پہنچا،لیکن بعض تجربوں نے نقصان بھی پہنچایا۔ ۱۵۷۵ء میں اکبر نے ''عبادت خانہ'' کے نام سے ایک عمارت تعمیر کی۔شروع میں اکبر بڑا راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔نماز باجماعت پابندی سے پڑھتا تھا۔خود اذان دیتا تھا، امامت کرتا تھا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔علماء کا حد سے زیادہ ادب اور احترام کرتا تھا۔پیروں سے عقیدت ایسی تھی کہ اجمیر جاکر مرادیں مانگتا اور ایک مرتبہ آگرہ سے اجمیر تک پیدل سفر کیا۔

اجمیر کی درگاہ میں چڑھاوے چڑھاتا اور مراقبے میں بیٹھتا۔ فتح پور سیکری میں ۱۵۷۵ء میں عبادت خانہ کی عمارت کی تعمیر اس کی اسی مذہبی دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس عمارت میں علماء، فضلاء کا ہر ہفتہ اجتماع ہوتا اور بادشاہ مذہبی اور علمی بحثوں میں حصہ لیتا، لیکن درباری علماء کی تنگ نظری نے جو ایک دوسرے سے بات بات پر لڑتے تھے اکبر کی نظر میں علماء کا بھرم ختم کر دیا۔ اسلام کے بارے میں اس کو شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور اس نے ہر مذہب میں سچائی کی تلاش شروع کر دی۔ اس کے بعض درباری علماء نے جن میں شیخ مبارک، ان کا بیٹا ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح نمایاں ہیں، بادشاہ کو گمراہی سے روکنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ۱۵۸۲ء میں اکبر نے ایک نئے مذہب کا اعلان کر دیا جس کو دین الٰہی کا نام دیا گیا۔ اس مذہب کے تحت اکبر کو امام عادل، امام مجتہد اور معصوم قرار دیا گیا، لیکن اس کا یہ دین چلا نہیں سوائے چند خوشامدی امراء کے نہ ہندو اس پر ایمان لائے اور نہ مسلمان، لیکن اس کی وجہ سے ایک فتنہ ضرور پیدا ہو گیا۔ اکبر نے ویسے اسلام سے انکار کبھی نہیں کیا، لیکن اس کے عمل نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا۔ شاہی محل میں ناقوس بجائے جاتے اور آگ روشن کی جاتی۔ مگر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے بے اعتنائی برتی جاتی۔ گائے کا گوشت حرام قرار دیا گیا اور شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال ہو گیا۔ سور کو پاک جانور سمجھا جانے لگا۔ سود، جوا اور شراب حلال قرار دیئے گئے۔ قدیم ایرانی اور ہندو تہوار اہتمام سے منائے جانے لگے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا رواج ہوا اور علماء اور شعائر اسلام کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اکبر ذاتی طور پر مسلمان تھا لیکن اس نے یہ طرز عمل ہندو اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے اختیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے نہ ہندو مطمئن ہوئے اور نہ مسلمان؛ دونوں نے ان باتوں کو اپنے مذہب میں مداخلت سمجھا اور سوائے چند خوشامدی امراء کے نہ ہندو اس پر ایمان لائے اور نہ مسلمان۔

اکبر نے ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اور بھی کئی اقدامات کیے۔ ۱۵۶۳ء میں اس نے ہندو زائرین پر سے ٹیکس اٹھا دیئے، ۱۵۶۴ء میں ان سے جزیہ لینا ختم کر دیا۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے گائے کی قربانی بند کر دی گئی۔ راجپوت شہزادیوں سے اپنی اور شہزادوں کی شادیاں کیں اور محل کے اندر ان کو پوجا پاٹ کی اجازت دی، حالانکہ مشرک عورتوں سے اسلام میں شادی ممنوع ہے۔ ہندوؤں کو محمود غزنوی سے اب تک ہمیشہ سلطنت میں

ملازمتیں دی گئی تھیں، لیکن اکبر نے ان کو جس کثرت سے اعلیٰ عہدے دیئے اتنی کثرت سے پہلے کبھی نہیں دیئے گئے۔ ہندوستان کے موجودہ دور کے ہندو مورخ اکبر کو ہندو مسلم متحدہ قومیت کے تصور کا بانی قرار دیتے ہیں۔ ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اکبر کے بعض اقدامات یقیناً قابل قدر تھے لیکن ان سے ہندو قریب نہیں آسکے۔ ان کا مستقل قومی وجود قائم رہا اور راجپوتانہ میں رانا پرتاپ سنگھ آخر وقت تک اکبر سے لڑتا رہا۔ اکبر کی اس پالیسی کے نتیجے میں ایک طرف ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے اور دوسری طرف ہندوؤں کے اس قرب سے مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم اور بہت سی بدعتیں شروع ہوگئیں اور ان کے عقائد کو ضعف پہنچا۔ حکومت مسلمانوں کی تھی لیکن حالت یہ ہوگئی تھی کہ حضرت مجدد الف ثانی کے الفاظ میں ''کافر غالب ہوکر دارالاسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور اہل اسلام، اسلامی احکام جاری کرنے سے عاجز و مجبور تھے اور اگر کرتے تو قتل کر دیئے جاتے تھے''

(۲) نورالدین جہانگیر

(۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء)

اکبر کے بعد اس کا لڑکا سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) اپنے باپ کے برعکس آرام طلب اور عیش پسند تھا۔ اکبر کے تمام لڑکے دربار کے غیر مذہبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے شراب کے عادی تھے۔ شراب اکبر بھی پیتا تھا، لیکن اعتدال کے ساتھ۔ اس کے لڑکوں نے اس معاملے میں حد کی قید اڑا دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہزادہ مراد اور شہزادہ دانیال شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے جوانی ہی میں مر گئے۔ جہانگیر بھی اس مرض میں مبتلا تھا اور اگر اسکی عقلمند بیوی نور جہاں اس کی شراب کم نہ کر دیتی تو شاید جہانگیر کا حشر بھی اپنے بھائیوں کی طرح ہوتا۔

جہانگیر اگرچہ آرام طلب اور عیش پسند تھا، لیکن سلطنت کے انتظام میں اس نے کبھی غفلت نہیں کی۔ راجپوتانہ اور بنگال میں دہلی کا اقتدار جہانگیر کے زمانے ہی میں مستحکم ہوا اور ہر قسم کی مخالفت کچل دی گئی۔ جہانگیر کے زمانے میں دکن میں نظام شاہی حکومت سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن تیموری امراء کی غفلت اور نااہلی اور نظام شاہی امیر ملک عنبر حبشی کی غیر معمولی

قابلیت کی وجہ سے دکن میں تیموری سلطنت کی حدود آگے نہیں بڑھ سکیں۔ شمال میں البتہ ہمالیہ کے دامن میں کانگڑہ فتح ہوا (۱۶۲۰ء) لیکن اس کے دو سال بعد ایرانیوں نے قندھار پر قبضہ کرلیا (۱۶۲۲ء) جہانگیر کے زمانے میں دو انگریز سفیر ولیم ہاکنس اور طامس مور ہندوستان آئے اور انگریزوں کو پہلی مرتبہ تجارتی مراعات دی گئیں۔ بنگال میں ڈھاکہ کا شہر اسی زمانے میں آباد کیا گیا اور صوبہ کا صدر مقام لکھنوتی سے ڈھاکہ منتقل کردیا گیا۔

جہانگیر ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا اور اس معاملے میں بڑی حد تک باپ کی پالیسی پر گامزن رہا، لیکن اس نے اکبر کی مذہبی پالیسی اختیار نہیں کی۔ تخت نشینی کے بعد اس نے جو بارہ احکام جاری کیے ان میں سے چند یہ تھے: سلطنت میں شراب اور نشہ آور چیزیں نہ بنائی جائیں اور نہ فروخت کی جائیں، کسی جرم میں آدمی کی ناک، کان نہ کاٹے جائیں، کوئی سرکاری عہدے دار معاوضہ دیئے بغیر رعایا کے کسی مکان میں رہائش اختیار نہ کرے اور ہر بڑے شہر میں شفاخانے بنائے جائیں۔ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی نے احیائے دین کے کام میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ شروع میں بادشاہ کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی تھی اور ان کو نظر بند رکھا لیکن بعد میں رہا کردیا۔

زنجیر عدل

عدل وانصاف کو جہانگیر کتنی اہمیت دیتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے اس نے آگرہ کے قلعے میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی، جس کا دوسرا کنارہ باہر سڑک پر تھا۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جس شخص کے ساتھ عدالت میں انصاف نہ ہوا ہو وہ اس زنجیر کو کھینچے۔ اس زنجیر کے کھینچنے سے محل میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اور بادشاہ خود اس کی شکایت سننے آجاتا تھا۔

جہانگیر فن مصوری کا بہت شوقین تھا۔ اس کے زمانہ میں مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے اس کے عہد میں نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ استاد ابوالحسن نادر الزمان، استاد منصور، بشن داس اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔ کشمیر جہانگیر کو بہت پسند تھا اور وہ اکثر سیر و سیاحت کے لیے وہاں جاتا تھا۔ کشمیر میں اس نے کئی باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ ان میں شالامار باغ اور نشاط باغ آج بھی موجود ہیں۔ اور سری نگر کے قابل دید

مقامات میں سے ہیں۔

آگرے کے قریب سکندرہ میں اکبر کا شاندار مقبرہ بھی جہانگیر کے عہد کی تعمیر ہے۔ لاہور اور آگرہ کے قلعے میں بھی اس نے کئی عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ بابر کی طرح جہانگیر نے بھی فارسی میں اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ یہ کتاب تزک جہانگیری کہلاتی ہے۔ تزک بابری کی طرح یہ بھی ایک دلکش کتاب ہے۔ اس کی تحریر میں بناوٹ کی بجائے سادگی اور صاف گوئی پائی جاتی ہے۔

جہانگیر کشمیر کی سیر سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں بیمار پڑا اور لاہور پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ لاہور پہنچ کر اس کو دفن کیا گیا اور اس کے بیٹے، شاہ جہان نے بعد میں اس کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرا دیا، جو آج لاہور کی شاندار تاریخی یادگاروں میں سے ایک ہے۔

(۳) شہابُ الدین شاہجہان

(۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۷ء)

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا خرم، شہاب الدین محمد شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس دَور کے اہم سیاسی واقعات میں سے ایک ہگلی (بنگال) میں پرتگیزوں کا ہنگامہ ہے، جس کے بعد پرتگیزوں کو ۱۶۳۲ء میں مستقل طور پر نکال دیا گیا۔ قندھار جس پر ایرانیوں نے جہانگیر کے زمانے میں قبضہ کر لیا تھا، ۱۶۳۸ء میں ایران سے پھر واپس لے لیا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے تین مرتبہ قندھار لینے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وسط ایشیا میں بخارا کے حکمران امام قلی کے بعد اس کے بھائی نذر محمد کو جب ازبکوں نے نکال باہر کیا، تو ازبکوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہجہاں نے اپنے آبائی وطن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۶۴۶ء میں بدخشاں اور بلخ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن دہلی کے سپاہی موسم کی شدت سے گھبرا گئے اور شاہ جہاں کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔

نظام شاہی حکومت کا خاتمہ

اس دور میں دہلی کی فوجوں کو نمایاں کامیابی دکن میں حاصل ہوئی۔ ۱۶۳۶ء میں احمد نگر پر شاہجہاں کا مستقل قبضہ ہو گیا اور نظام شاہی حکومت ختم کر دی گئی۔ آخری حکمران حسین نظام شاہ کا

وظیفہ مقرر کر کے گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی سال بیجاپور[1] اور گولکنڈہ کی حکومتوں نے شاہجہاں کی اطاعت کر لی۔ وہ سالانہ خراج دینے پر راضی ہو گئیں اور دونوں مملکتوں میں

---

(1) اس زمانہ میں بیجاپور میں عادل شاہی اور گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت قائم تھی۔ بیجاپور کی حکومت کا بانی ایک بہمنی امیر یوسف عادل شاہ تھا جس نے ۱۴۹۰ء میں بہمنی سلطنت سے آزادی کا اعلان کیا۔ اس خاندان کا پانچواں حکمران علی عادل شاہ (۱۵۵۸ء تا ۱۵۸۰ء) تھا جو چاند بی بی کا شوہر تھا اور جس نے تالیکوٹہ کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا اور اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ ۱۶۱۹ء میں اس نے بیدر پر قبضہ کر کے بریدشاہی ریاست کو ختم کر دیا۔ مشہور مورخ فرشتہ، حکیم فتح اللہ شیرازی اور فارسی کے شاعر ظہوری اس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۵۶ء) اس خاندان کا آخری ممتاز حکمران تھا۔ بیجاپور کی حکومت دہلی اور احمد نگر کی لڑائیوں میں احمد نگر کی حلیف تھی۔ اس کے علاوہ ریاست میں آباد مرہٹے تیموری علاقوں پر چھاپے بھی مارتے رہتے تھے۔ اس لیے محمد عادل شاہ کے زمانے میں شاہجہاں نے احمد نگر پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۶۳۶ء میں بیجاپور کو سلطنت دہلی کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ محمد عادل شاہ نے دہلی کو سالانہ خراج دینا اور خطبہ اور سکے میں شاہجہاں کا نام داخل کرنا منظور کر لیا اور اس طرح اپنی ریاست کو بچا لیا۔ معاہدے کے تحت عادل شاہی حکومت اس بات کی بھی پابند تھی کہ مرہٹہ سردار ساہو جی بھونسلا کو جس کو شاہ جی بھونسلا بھی لکھا جاتا ہے کوئی عہدہ نہیں دے گی۔ ساہو جی مشہور مرہٹہ سردار سیوا جی کا باپ تھا اور ملک عنبر کے زمانے میں اس نے چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل کی تھی۔ محمد عادل شاہ کے بعد ریاست میں بدامنی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ مرہٹے زور پکڑ گئے۔ سیوا جی نے بیجاپوری فوج کو ۱۶۵۹ء میں شکست دی اور بیجاپوری سپہ سالار افضل خاں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا۔ ان حالات میں اورنگ زیب نے سکندر عادل شاہ کے دور میں لشکر کشی کر کے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور فتح کر لیا اور عادل شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ عادل شاہی حکمران عام طور پر شیعہ تھے۔ صرف ابراہیم عادل شاہ اول سنی تھا۔ یہاں خطبہ میں بارہ اماموں کے نام لیے جاتے تھے، لیکن رعایا کی اکثریت چونکہ سنی تھی اس لیے عادل شاہی حکمرانوں نے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد سے بارہ اماموں کے ساتھ خلفائے راشدین کا نام بھی خطبوں میں پڑھا جاتا تھا۔ بیجاپوری امراء میں اسد خاں لاری متوفی ۱۵۹۶ء اور ابراہیم ثانی کا وزیر شاہنواز خاں ممتاز ہیں۔ احمد نگر کی طرح یہاں بھی حبشیوں نے عروج حاصل کیا۔ بیجاپور میں ساٹھ ہزار حبشی تھے۔ حبشی وزیروں میں دلاور خان سپہ سالاروں میں سہیل خاں اور امیر البحر یاقوت حبشی کے نام بہت ممتاز ہیں۔ دکن میں سب سے شاندار عمارتیں بیجاپور ہی میں تعمیر ہوئیں۔ عادل شاہی سلاطین علم و ادب کے بھی سرپرست تھے۔ ان میں اکثر شاعر تھے۔ اردو کو سرکاری سرپرستی پہلی مرتبہ عادل شاہی اور قطب شاہی دربار میں ہوئی۔ نصرتی اُردو کا ممتاز شاعر اور علی عادل شاہ کا ملک الشعراء تھا۔

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ وہ بھی بہمنی صوبے داروں میں سے ایک تھا۔ یہ حکومت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی۔ اس کے تیسرے سلطان ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) نے تالیکوٹہ کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ حیدر آباد کا شہر ۱۵۸۹ء میں اسی نے آباد کیا اور دارالحکومت گولکنڈہ سے حیدر آباد منتقل کر دیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۶۳۶ء میں دہلی کی بالادستی قبول کر لی تھی اور بیجاپور کی طرح قطب شاہی حکومت بھی تیموریوں کی باجگذار بن گئی۔ آخری حکمران ابوالحسن ایک عیش پسند اور آرام طلب حکمران تھا۔ حکومت ہندو وزیروں کے ہاتھ میں چلی گئی جو مرہٹوں سے ملے ہوئے تھے، اس لیے بیجاپور کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ فتح کر کے قطب شاہی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ سکندر عادل شاہ کی طرح الحسن تانا شاہ کو قلعہ دولت آباد میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے وظیفے مقرر کر دیے گئے۔ نظام شاہیوں، عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی حکمران بھی شیعہ تھے۔ انہوں نے بھی اردو کی سرپرستی کی۔ ان میں تین بادشاہ اُردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان میں محمد قلی قطب شاہ سب سے بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں دکنی اردو عروج پر پہنچ گئی۔ ملا وجہی کی ''سب رس'' جسے اردو نثر کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے، ۱۶۳۵ء میں عبداللہ قطب شاہ کے دور میں لکھی گئی۔

شاہجہاں کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہو گیا۔ بیجاپور کے حکمران پر یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ وہ مرہٹہ سردار ساہو جی بھونسلا کو، جو سلطنت دہلی کے علاقے پر چھاپے مارا کرتا تھا، ریاست میں کوئی عہدہ نہیں دے گا۔

تعمیرات

شاہجہاں نے تیس سال حکومت کی۔ مورخین نے اس کے دور کو سلاطین تیموری کا عہد زرین کہا ہے۔ اس کے عہد میں جیسا امن و امان تھا اور ملک جیسا خوشحال تھا ویسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ شاہجہاں کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا۔ اس معاملے میں وہ اکبر سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارتیں اکبر کی عمارتوں سے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور خوبصورت بھی زیادہ ہیں۔ اس کے دور میں تیموری طرز تعمیر اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ تعمیرات کے میدان میں وہ اندلس کے عبدالرحمن اعظم، ترکوں کے سلیمان اعظم اور ایران کے عباس اعظم سے کم نہیں تھا، بلکہ شاید کچھ زیادہ تھا۔ اس نے پرانی دہلی کے پاس ایک پورا شہر آباد کیا جو شاہجہاں آباد کہلاتا تھا۔ یہی شہر اب پرانی دلی کے نام سے مشہور ہے، شاہجہاں کے زمانہ میں یہ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اسی شہر میں اس نے لال قلعہ اور اس کے اندر خوبصورت محل اور سرکاری عمارتیں بنائیں جن میں بادشاہ دربار کرتا تھا اس شہر میں اس نے ایک جامع مسجد بنائی جو آج بھی دنیا کی شاندار مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح آگرہ کے قلعہ میں جو اکبر کا بنایا ہوا تھا شاہجہاں نے ایک مسجد بنائی جو موتی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد زیادہ تر سنگ مرمر کی ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں دنیا کی سب سے خوبصورت مسجد ہے۔ لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اور شالا مار باغ شاہجہاں کے حکم سے ہی بنائے گئے۔ اسی طرح کشمیر کی شاہی مسجد اور چشمۂ شاہی کا باغ اور سندھ میں ٹھٹھ کی جامع مسجد اسی کے زمانہ میں بنائی گئیں۔

شاہجہاں کے عہد کی عمارتوں میں تاج محل سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ اس کا اور اس کی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ ہے اور پورا سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس پر کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ قبروں پر اتنی رقم خرچ کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن بعض بادشاہوں کو اس کا شوق تھا۔ اگر شاہجہاں یہ رقم نظام الملک نور الدین اور صلاح الدین کی طرح مدرسوں اور شفا خانوں کی تعمیر پر خرچ کرتا تو وہ

خود بھی نیک نام ہوتا اور ملک کو بھی فائدہ پہنچتا۔ پھر بھی ان عمارتوں سے لوگوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچا۔ ہزاروں لاکھوں مزدور برسوں روزگار سے لگے رہے۔ صرف تاج محل کی تعمیر میں بیس ہزار مزدوروں نے سولہ سال تک حصہ لیا۔

شاہجہاں کے عہد کی ان عمارتوں کا ذکر کر دینے کے بعد بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اس عہد کے ایک مشہور ماہر تعمیر استاد احمد کا ذکر نہ کریں۔ استاد احمد لاہور کے رہنے والے تھے اور اس عہد کی کئی عمارتیں جن میں تاج محل، لال قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد زیادہ مشہور ہیں، اسی استاد احمد کی تیار کی ہوئی ہیں۔ یوں سمجھو کہ جو حیثیت سلیمان اعظم کے زمانہ میں سنان کی تھی وہی حیثیت شاہجہاں کے زمانہ میں استاد احمد کی تھی۔

شاہجہاں اگرچہ شاہانہ ٹھاٹھ کی زندگی گذارتا تھا اور ملک کی آمدنی کا بڑا حصہ عام بادشاہوں کی طرح اپنے اور اپنے شاہی خاندان کے عیش و آرام پر خرچ کر دیتا تھا، لیکن پھر بھی ان بادشاہوں میں اس کی ذات غنیمت تھی۔ اس کو اپنی رعایا کے آرام کا بھی خیال تھا۔ وہ اچھی عادتوں اور رفاہ عام کے کاموں کی وجہ سے رعایا میں بڑا ہر دلعزیز تھا۔ اس کے زمانہ میں یورپ کے کئی سیاح ہندوستان اور پاکستان آئے۔ انہوں نے شاہجہاں کی حکومت کو ایک مہربان باپ کی حکومت کہا ہے۔

شاہجہاں اہل علم کا بھی بڑا قدردان تھا۔ اور ان کو بڑے بڑے انعامات دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے پاکستان کے ایک مشہور عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو چاندی میں تلوا دیا اور یہ سب چاندی ان کو انعام میں دے دی۔

شاہجہاں مذہب کا بھی پابند تھا۔ وہ اکبر اور جہانگیر کی طرح شراب نہیں پیتا تھا اور نہ ان کی طرح عیش پسند تھا۔ اکبر نے یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جو کوئی دربار میں آئے تو وہ بادشاہ کو سلام کی بجائے سجدہ کیا کرے۔ اس سجدہ کو سجدہ تعظیمی کہا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان سوائے خدا کے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ یہ سجدہ اسلام کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھا۔ شاہجہاں نے اپنے زمانہ میں سجدۂ تعظیمی کا طریقہ بند کر دیا۔

جہانگیر اور شاہجہاں کا پچاس سالہ عہد بلاشبہ عہد مغلیہ کا عہد زریں ہے۔ فتوحات کا دور اکبر کے زمانہ ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ اب سارے ملک میں امن امان قائم ہو چکا تھا۔ تجارت اور صنعت ترقی پر تھی۔ ملک میں ارزانی اور خوشحالی عام تھی۔ علم و ادب اور تہذیب و تمدن ترقی کی منزلیں طے

کررہے تھے۔''

امرائے مغلیہ

اکبر اور جہانگیر کے امراء میں دو ایسے ہیں جن کے نام زرین حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ان میں ایک عبدالرحیم خانخاناں (۱۵۵۶ء/۹۶۴ھ تا ۱۶۲۷ء/۱۰۳۶ھ) ہے اور دوسرے شیخ فرید۔عبدالرحیم شہنشاہ بابر، ہمایوں اور اکبر کے مشہور امیر بیرم خاں کا لڑکا تھا۔ وہ ایک اچھا سپہ سالار اور عادل اور رعایا پرور حاکم تھا۔ اکبر کے زمانے میں دکن میں فتوحات حاصل کرنے کے علاوہ عبدالرحیم خانخاناں نے گجرات اور سندھ کے صوبے بھی فتح کیے۔ وہ مختلف اوقات میں جونپور، گجرات، سندھ اور دکن کا صوبے دار رہا۔ فیاضی اور سخاوت میں اپنے وقت کا حاتم تھا۔ علماء اور بزرگانِ دین کی پوشیدہ اور ظاہر مالی امداد کرتا رہتا تھا اور اس کے صدقات وخیرات کا سلسلہ عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اپنے طویل دَورِ اقتدار میں برہانپور، گجرات، لاہور، دہلی اور سورت میں بے شمار مسجدیں، مدرسے، حمام، نہریں، تالاب، سرائے اور باغات تعمیر کرائے۔ اس نے برہانپور اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں خربوزے اور ایران کے دوسرے پھلوں کی کاشت شروع کرائی۔ خانخاناں عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سندھی کا ماہر تھا۔ تزک بابری کا اس نے اکبر کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی اور ہندی کا ممتاز شاعر تھا۔ اس کا ہندی کلام آج بھی مقبول ہے۔ اس نے شاعروں کی شاہانہ انداز میں سرپرستی کی۔ عرفی اور نظیری حقیقت میں خانخاناں کے دربار کے شاعر تھے۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی کے نام سے کئی جلدوں میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس میں عبدالرحیم خانخاناں کے کارناموں، اس کے رفاہی کاموں اور اس سے وابستہ شاعروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔

نواب مرتضیٰ خاں شیخ فریدالدین متوفی ۱۶۱۶ء/۱۰۲۵ھ جہانگیر کے دَور کے ممتاز امیر تھے۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں ان کا نمایاں ہاتھ تھا۔ شیخ فرید، خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور ان کے تعاون سے انہوں نے عہد جہانگیر میں اسلامی شعائر کے احیاء کے لیے کام کیا۔ وہ گجرات اور پنجاب کے صوبے دار بھی رہے۔ ان کے رفاہِ عام کے کام کا کوئی شمار نہیں۔ بیواؤں اور محتاجوں کے انہوں نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ وہ روزانہ

ایک ہزار آدمیوں کو کھانا کھلاتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر خود بھی کھانا کھاتے تھے۔ انہوں نے احمد آباد اور دوسرے مقامات پر متعدد مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ احمد آباد میں شاہ وجیہہ الدین کا مقبرہ اور مسجد ان ہی کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ دہلی کے نواح میں فرید آباد کی بستی، عمارتیں اور تالاب تعمیر کرائے اور لاہور میں ایک پورا محلہ تعمیر کرایا۔

عہد شاہجہاں میں کئی امیر اور صوبے دار ایسے ہوئے ہیں جو اپنے عدل وانصاف اور رفاہی کاموں کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ان میں ایک پنجاب کے صوبے دار نواب وزیر خاں متوفی ۱۶۴۱ء/ ۱۰۵۱ھ ہیں۔ وزیر آباد کا شہر ان ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ لاہور کی مشہور مسجد وزیر خاں بھی ان ہی کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ کتب فروشوں، جلد سازوں اور خطاطوں کی دکانیں، ایک مدرسہ اور حمام تھے۔ نواب وزیر خاں چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے سڑکیں، بازار، شفاخانے، مدرسہ، مسجد اور کنوئیں تعمیر کرائے تھے۔ وزیر خاں اپنے وقت کے بہت اچھے طبیب بھی تھے اور ان کا شمار شاہی دربار کے تین سب سے بڑے اطبا میں ہوتا تھا۔ انہوں نے نور جہاں اور دارا شکوہ کے حیرت انگیز علاج کیے۔

عہد شاہجہانی کے وزیروں میں سب سے عظیم شخصیت سعد اللہ خاں علامی (۱۵۹۱ء/۹۹۹ھ تا ۱۶۵۶ء/۱۰۶۶ھ) کی تھی جن کو تیموری دور کا سب سے بڑا وزیر اعظم سمجھا جاتا ہے۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی کے ماہر تھے اور بہت اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے۔ ابو الفضل کے بعد تیموری دور میں صرف ان ہی کو علامی کا خطاب ملا۔ انہوں نے اپنی وزارت کے زمانے میں کئی اہم اصلاحات کیں۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد ان ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "دیانت قابلِ تعریف چیز ہے اور وفاداری بہترین طریقہ، لیکن بادشاہ کے کاموں میں جو عوام سے متعلق ہوتے ہیں بادشاہ کی بجائے عوام کا خیال رکھنا بہترین وفاداری ہے"

پنجاب اور کشمیر کے صوبے دار علی مردان خان متوفی ۱۶۵۷ء/۱۰۶۷ھ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا انجینئر تھا۔ لاہور کا مشہور شالامار باغ اس نے اپنے نقشے کے مطابق تعمیر کیا تھا۔ نہریں نکالنے کا وہ بہت ماہر تھا۔ چنانچہ اس نے کابل، کشمیر اور مشرقی پنجاب میں کئی نہریں نکلوائیں اور پرانی نہروں کی مرمت کی اور باغات لگائے۔

کشمیر کا صوبے دار ظفر خاں متوفی ۱۶۶۲ء/۱۰۷۳ھ عہد شاہجہانی کا عبدالرحیم خانخاناں

تھا۔ وہ کابل کا چھ سال تک اور کشمیر کا بارہ سال تک صوبے دار رہا۔ بلتستان اسی کی صوبے داری کے زمانہ میں فتح ہوا۔ کشمیر میں زعفران پر سے محصول ختم کرانا اس کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر میں اس نے کئی باغ لگائے اور کشمیر میں ایران اور ترکستان کے ان پھلوں اور پھولوں کی کاشت کرائی جو اس وقت تک کشمیر میں نہیں ہوتے تھے۔ ظفر خاں شاعروں کا بڑا سرپرست تھا۔ کشمیر میں صائب، کلیم اور غنی اس کے گھر پر جمع ہوتے تھے اور شعروسخن کی محفلیں جمتی تھیں۔ وہ خود بھی صاحب دیوان شاعر تھا۔

اہم واقعات

۱۵۵۶ء (۱۴۔فروری) کلانور میں اکبر کی تخت نشینی۔

۱۵۵۶ء (۵۔نومبر) پانی پت کی دوسری جنگ۔ اکبر نے ہیمو بقال کو شکست دی۔

۱۵۶۰ء اکبر نے بیرم خاں سے اختیارات لے لیے۔

۱۵۶۲ء اکبر نے جے پور کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی۔

۱۵۶۴ء مالوہ کی فتح، گونڈوانہ کی فتح، جزیہ ختم کر دیا گیا۔

۱۵۶۷ء چتوڑ کی فتح۔

۱۵۶۹ء رنتھمبور کی فتح۔

۱۵۷۳ء گجرات کی فتح۔

۱۵۷۴ء شمالی سندھ (بھکر) کی فتح۔

۱۵۷۵ء عبادت خانہ کی تعمیر۔

۱۵۷۶ء بنگال کی فتح۔

۱۵۸۲ء دین الٰہی کا آغاز۔

۱۵۸۷ء کشمیر کی فتح۔

۱۵۹۱ء جنوبی سندھ (ٹھٹھہ) کی فتح۔

۱۵۹۵ء بلوچستان اور قندھار پر قبضہ۔

۱۶۰۰ء احمد نگر پر قبضہ۔ برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل۔

۱۶۰۱ء اسیر گڑھ (دکن) کے قلعہ کی تسخیر۔

۱۶۰۹ء جہانگیر کے دربار میں انگریزی سفیر ولیم ہاکنس کی آمد۔

۱۶۱۱ء جہانگیر کی نور جہاں سے شادی۔مسولی پٹم (گولکنڈہ) میں انگریزوں کی فیکٹری کا قیام۔

۱۶۱۳ء سورت میں انگریزوں کو تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت۔

۱۶۱۵ء دوسرے انگریزی سفیر تامس رو کی جہانگیر کے دربار میں آمد۔

۱۶۱۸ء (۲۴۔اکتوبر) اورنگ زیب کی پیدائش۔

۱۶۲۰ء کانگڑہ کی فتح۔

۱۶۲۲ء قندھار پر ایران کا قبضہ۔

۱۶۳۶ء بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں دہلی کی باجگذار بنائی گئیں۔

۱۶۳۷ء قندھار ایران سے واپس لے لیا۔احمد نگر قطعی طور پر فتح ہو گیا۔

۱۶۴۶ء بلخ اور بدخشاں کی عارضی فتح۔

۱۶۵۷ء شاہجہاں کی بیماری کا سن کر بنگال میں شجاع نے اور گجرات میں مراد نے دسمبر میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔اورنگ زیب نے جو دکن میں تھا، بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔

۱۶۳۴ء میں انگریزوں نے مدراس میں تجارتی کوٹھی قائم کی اور سینٹ جارج کا قلعہ بنایا۔

۱۶۵۸ء میں ڈھاکہ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھی قائم ہوئی۔

باب ۲۱

دہلی کی عظیم الشان تیموری سلطنت (۲)

(۱۶۵۷ء تا ۱۷۱۹ء)

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر

(۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء)

ابتدائی زندگی

شاہجہاں کے بعد اس کا لڑکا اورنگ زیب، محی الدین عالمگیر کے لقب سے تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اورنگ زیب ہندوستان کا سب سے بڑا تیموری حکمران ہے۔ جس طرح عربوں کی سلطنت ولید کے زمانے میں، سلجوقیوں کی سلطنت ملک شاہ کے زمانے میں اور عثمانی سلطنت وزیر اعظم محمد پاشا صوقوللی کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی تھی، اسی طرح دہلی کی تیموری سلطنت اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔

اورنگ زیب حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ لڑکپن ہی سے بہادر، ذہین اور نیک طبیعت تھا۔ ابھی وہ چودہ سال کا تھا کہ شاہجہاں قلعہ پر سے ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ نیچے میدان میں اور لوگوں کے ساتھ اورنگ زیب اور اس کے بھائی بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اورنگ زیب کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ ان ہاتھیوں کے بالکل پاس لے گیا۔ اچانک ایک ہاتھی نے اس پر حملہ کر دیا، لیکن اورنگ زیب بھاگا نہیں۔ اس نے تاک کر ایک نیزہ ہاتھی کی پیشانی پر مارا۔ اس پر ہاتھی اور غصے میں آ گیا اور اورنگ زیب کو گھوڑے سمیت اپنی سونڈ سے دانتوں کے نیچے کر لیا۔ بہادر شہزادہ فوراً اچھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر گیا اور میان سے تلوار نکال کر ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ بھلا ہاتھی اور انسان کا کیا مقابلہ۔ وہ تو خیر ہوئی کہ راجہ جے سنگھ سپاہیوں کو لے کر مدد کو پہنچ گیا، ہاتھی کو مار کر بھگایا اور شہزادے کو بچا لیا۔

اورنگ زیب جب اپنے ماں باپ کے پاس پہنچا جو اس حادثہ کی وجہ سے پریشان تھے تو دونوں

نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور پیار کیا۔ باپ نے نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''بیٹا! ایسی جگہ اڑتے نہیں، ہٹ جاتے ہیں'' اورنگ زیب نے اس پر جواب دیا: ''ابا! خدا نے اورنگ زیب کو ہٹنے کے لیے پیدا نہیں کیا''

شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بیس سال کی عمر ہی سے بڑے بڑے ملکی کام سپرد کرنا شروع کر دیئے تھے اور اس نے یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ کئی سال تک وہ دکن کا صوبہ دار رہا۔ اس زمانہ میں اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کو مغلیہ سلطنت کا باجگذار بنایا، اس نے دکن کے علاقہ کے کسانوں کی حالت سدھاری اور دکن کو مغلیہ سلطنت کا خوشحال ترین علاقہ بنادیا۔ اس کے بعد وہ سندھ کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس صوبہ کو بھی اس نے بڑی ترقی دی اور لہری بندر کے نام سے ایک نئی بندرگاہ قائم کی۔

ایک مرتبہ شاہجہاں نے اس کو ازبکوں سے جنگ کرنے کے لیے بلخ بھیجا جو افغانستان میں دریائے جیحوں کے کنارے ایک تاریخی شہر ہے۔ ازبکوں کی فوج تعداد میں زیادہ تھی اس نے اورنگ زیب کی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ خوب زوروشور کی لڑائی ہو رہی تھی کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ فوجی سرداروں نے منع کیا، لیکن اورنگ زیب فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور اطمینان سے نماز باجماعت پڑھی۔ ازبک حکمران عبدالعزیز خاں کو جب اورنگ زیب کی اس دلیری کا حال معلوم ہوا تو اس نے جنگ کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور کہا:

''ایسے شخص سے لڑنا موت کو دعوت دینا ہے، جو شخص خدا سے ڈرتا ہو کسی دوسرے سے نہیں ڈر سکتا''

تخت نشینی

اورنگ زیب جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر چالیس سال کی تھی لیکن اس کو یہ بادشاہت آسانی سے نہیں ملی۔ اس کے لیے اس کو بڑی مشکلوں اور خطروں سے گزرنا پڑا۔ قصہ یوں ہے کہ شاہ جہاں کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے بڑے لڑکے داراشکوہ سے باپ کو بڑی محبت تھی، لیکن داراشکوہ میں حکومت کرنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ اس کے سپرد جو بھی کام کیا جاتا تھا وہ اس کو بگاڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہبی عقائد بھی اس کے صحیح نہیں تھے۔ اس کا مزاج اور طبیعت اس معاملے میں اکبر سے ملتی جلتی تھی۔ اورنگ زیب کی طبیعت اس کے بالکل مخالف تھی۔ داراشکوہ

اگر بے دینی کی طرف مائل تھا تو اورنگ زیب دیندار تھا۔ داراشکوہ حکومت کے معاملات میں جتنا نااہل تھا اورنگ زیب اتنا ہی اہل تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت اور مزاج کے اس فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے نفرت تھی۔ اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں جب شاہجہان بیمار پڑا تو داراشکوہ باپ کے پاس آگرہ میں تھا اور اورنگ زیب دارالحکومت سے دُور دکن میں تھا۔ داراشکوہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تخت پر قبضہ کر لینا چاہا لیکن اس کو اورنگ زیب کی طرف سے خطرہ تھا۔ اس لیے داراشکوہ نے باپ کی طرف سے جعلی خط بنا کر اورنگ زیب کو آگرہ بلوانا چاہا۔ اورنگ زیب اُس کی اس چال کو سمجھ گیا اور اپنی تجربہ کار فوج کو لے کر آگرہ روانہ ہو گیا۔ داراشکوہ نے گوالیار کے قریب دریائے چنبل کے کنارے سموگڑھ کے مقام پر اورنگ زیب کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ داراشکوہ کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور اورنگ زیب کے پاس صرف تیس ہزار فوج تھی لیکن جنگ میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہان چونکہ بیٹے کی محبت میں داراشکوہ کی سازشوں میں شریک ہو گیا تھا اس لیے اورنگ زیب نے اس کو قلعہ میں نظر بند کر دیا اور کہہ دیا کہ اب آپ کی عمر کافی ہو گئی ہے، خدا کو یاد کیجیے۔ بعد میں داراشکوہ پر مرتد ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے اس کو سزائے موت دے دی۔

اورنگ زیب نے آگرہ کی بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنایا۔ اس زمانہ کے ایک فرانسیسی سیاح برنیئر نے جو شاہجہان اور اورنگ زیب کے دربار میں بارہ سال رہا لکھا ہے کہ اورنگ زیب جب دہلی پہنچا تو جون کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اس گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھے۔ وہ روزے کے باوجود حکومت کے سارے کام کرتا۔ شام ہوتی تو روزہ افطار کرتا۔ افطار میں وہ جوار اور مکئی کی روٹی کھاتا، پھر تراویح پڑھتا اور رات کا زیادہ حصہ عبادت میں گذارتا۔

اورنگ زیب نے بادشاہ بننے کے بعد پچاس سال حکومت کی۔ اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کا مستقل حصہ بنا لیا۔ شمال میں لداخ فتح ہوا اور مشرق میں آسام کا ایک حصہ اور چاٹگام سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیے گئے۔ اس طرح اورنگ زیب کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اب تک برصغیر کے علاقہ میں اتنی بڑی سلطنت

کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

انتظام حکومت

اورنگ زیب اس برصغیر کا سب سے بڑا بادشاہ ہے۔ وہ صرف اس لحاظ سے ہی بڑا نہیں ہے کہ اس کے قبضہ میں سارا ملک تھا، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اخلاق، عادت، محبت، دیانت، انصاف اور حکومت کی ذمہ داری اور رعایا پروری کے لحاظ سے بھی وہ بے مثل تھا۔ وہ سرکاری آمدنی کو اپنے ذاتی خرچ میں نہیں لاتا تھا کیونکہ وہ رعایا کا مال تھی۔ رعایا سے جو رقم ٹیکس کے ذریعے وصول کی جائے اسے رعایا پر ہی خرچ کرنا چاہیے۔ اسے اپنے ذاتی عیش و آرام اور مقبروں کی تعمیر پر خرچ کرنا بُری بات ہے۔ خلفائے راشدین، نور الدین زنگی، صلاح الدین اور خود ہندوستان میں ناصر الدین محمود کا یہی طریقہ تھا۔ اورنگ زیب نے بھی اس اعلیٰ مثال پر عمل کیا۔ اس جگہ ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے اورنگ زیب کی طبیعت کا اندازہ ہو سکے گا۔

شاہجہاں دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر تاج محل کے سامنے اس نمونہ کا ایک اور مقبرہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ دونوں مقبروں کو ملانے کے لیے ایک پل تعمیر کیا جا رہا تھا جس میں دونوں طرف کی جالیاں چاندی کی بنوائی گئی تھیں۔ اورنگ زیب جب بادشاہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ سرکاری روپیہ ان بے کار چیزوں پر خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ اس چاندی کو گلا کر اس کے سکے بنائے جائیں اور اس رقم سے سڑکیں اور پل بنوائے جائیں تاکہ مسافروں کو آرام پہنچے۔ اورنگ زیب نے اپنے پچاس سالہ دَور میں اسی نصب العین کے مطابق حکومت کی۔ اس نے ملک میں جو اصلاحات کیں وہ بڑی اہم ہیں اور ان سے رعایا کو بڑا آرام ملا۔

اصلاحات

بادشاہت میں جو خرابیاں ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ شاہی خاندان کے لوگ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں جس کو لوٹ لیں اور چاہیں جس کو قتل کر ڈالیں۔ چونکہ وہ بادشاہ کے رشتہ دار ہوتے تھے اس لیے کوئی ان سے باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس ظلم کو سختی سے روک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی شہزادہ یا صوبہ دار یا بڑے سے بڑا عہدے دار کسی کو قتل کرانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سارے کام عدالت کے ذریعہ ہوتے تھے

اور عدالت ہی مقدمہ کے بعد مجرم کو قتل کا حکم دے سکتی تھی۔ اورنگ زیب انصاف کے معاملہ میں اتنا سخت تھا کہ اس کے سامنے امیر و غریب سب یکساں تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے پورے ملک میں اعلان کرا دیا تھا کہ اگر کوئی بادشاہ پر مقدمہ چلانا چاہے، تو وہ عدالت میں مقدمہ کر سکتا ہے۔

یہ اورنگ زیب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اگر اس نے اپنے عہد میں کوئی اور کام نہ بھی کیا ہوتا تو بھی اس کا نام تاریخ میں زندہ رہتا۔

اورنگ زیب کی دوسری بڑی اصلاح ''محکمۂ احتساب'' کا قائم کرنا ہے۔ لوگوں کو ناجائز اور برے کاموں سے روکنے کے لیے یہ محکمہ عام طور پر ہر اسلامی حکومت میں ہوتا تھا، لیکن مغل حکومت میں ایسا کوئی محکمہ نہیں تھا۔ اورنگ زیب نے لوگوں کی اصلاح کے لیے اس محکمہ کو قائم کیا۔ یہ محکمہ شراب خوری اور دوسرے برے کاموں کی روک تھام کرتا تھا۔ اس محکمہ نے جوا کھیلنے پر بھی پابندی لگا دی اور نجومیوں پر بھی پابندی لگا دی جو ہمارے زمانہ کی طرح اس زمانہ میں بھی سڑک کے کنارے بیٹھے تقدیر کا حال بتاتے تھے۔

بادشاہ عام طور پر شاعروں کی بڑی سرپرستی کرتے تھے اور یہ شاعر اپنا سارا وقت بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھنے پر صرف کیا کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے اس قسم کی خوشامدانہ شاعری کی سرپرستی ختم کر دی۔ تعریف کے شعر وہ بہت کم سنتا تھا۔ ہاں ایسے شعر سُن لیا کرتا تھا جس میں کوئی اچھی بات کہی گئی ہوتی تھی، لیکن اشعار سننے کے بعد کہہ دیتا تھا کہ وہ ایسے بے سود کاموں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

اورنگ زیب نے درباریوں کو حکم دیا کہ وہ رنگ دار اور ہیرے جواہر جڑے ہوئے لباس نہ پہنا کریں، کیونکہ ان سے زنانہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

اکبر نے ہندوؤں سے جزیہ لینا بند کر دیا تھا۔ اورنگ زیب نے ان ہندوؤں پر جو فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے، پھر جزیہ لگا دیا۔

اورنگ زیب کا ایک بڑا کارنامہ قانون کی تدوین ہے۔ حکومت کے احکام چونکہ شریعت اسلامی پر مبنی ہوتے تھے اس لیے اورنگ زیب نے قانون کا ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کا حکم دیا۔ یہ کام چالیس علماء کی جماعت نے مل کر انجام دیا۔ اسلامی قانون کا یہ مجموعہ ''فتاویٰ عالمگیری'' کے نام سے مشہور ہے اور چھ جلدوں میں ہے۔

رفاہِ عام کے کام

اورنگ زیب نے دکن کے شہر اورنگ آباد سے آگرہ تک اور لاہور سے کابل تک سڑکوں کے کنارے پختہ مسافر خانے، بازار، مسجد، کنوئیں اور حمام بنوائے اور ہر منزل پر مسافروں کے لیے منزل گاہ بنوائیں جس میں وہ اپنی سواری اور سامان رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام پرانی سراؤں کی مرمت کرانے اور پلوں کے بنوانے کا حکم دیا۔ اس قسم کے کاموں پر اورنگ زیب بہت روپیہ صرف کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راستے محفوظ ہو گئے اور مسافروں کو آمد ورفت کی سہولتیں ہو گئیں اور تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔

اس کے عہد میں غریبوں، لنگڑے، لولوں اور اندھوں کے لیے محتاج خانے قائم کیے گئے جن میں ان کو کھانا کپڑا وغیرہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا تھا۔

تعلیم کی طرف بھی اورنگ زیب کی بہت توجہ تھی۔ اس نے سارے ملک میں عالموں فاضلوں اور طالبعلموں کے لیے وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔

اورنگ زیب مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ حافظ قرآن تھا، تفسیر حدیث اور فقہ سے واقف تھا۔ امام غزالی کی تصانیف اور دوسرے علماء کی کتابیں اکثر پڑھتا رہتا تھا۔ فارسی شاعری کا بڑا اچھا مطالعہ تھا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبانوں کا ماہر تھا اور ان میں سے ہر زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب اعلیٰ درجہ کا خوشنویس بھی تھا۔ قرآن مجید لکھا کرتا تھا۔ ایک قرآن لکھ کر مدینہ بھجوایا اور ایک مکہ معظمہ بھجوایا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن اور سورتیں اب بھی ملتی ہیں۔

اورنگ زیب فارسی زبان کا بہت بڑا انشا پرداز تھا۔ اس نے جو خطوط لکھے ہیں وہ فارسی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان خطوں کے کئی مجموعے کتابوں کی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔

اورنگ زیب کو بڑے بڑے محل اور مقبرے بنوانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ صرف رفاہِ عام کے کاموں پر روپیہ خرچ کرتا تھا۔ ہاں اس کو مسجدوں کی تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ملک میں اس نے ہزاروں مسجدیں بنوائیں اور ہر سال ہزاروں مسجدوں کی مرمت کرواتا تھا۔ مسجدوں کے تمام

اخراجات شاہی خزانہ سے ادا ہوتے تھے۔ اس معاملہ میں اورنگ زیب کو ہندوؤں کا بھی خیال تھا اور اس نے ہندوؤں کے پاٹھ شالاؤں اور کئی عبادت گاہوں کے لیے جاگیریں دے رکھی تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ کی عمارتوں میں سب سے مشہور لاہور کی شاہی مسجد ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد سمجھی جاتی ہے اور دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کے نمونہ کی ہے۔ ٹھٹھہ کی جامع مسجد کی توسیع بھی اس کے زمانہ میں ہوئی۔ مسجد کا یہ نیا حصہ باقی مسجد کے مقابلہ میں زیادہ اچھی حالت میں ہے اور اس کی چھت کے خوبصورت نقش ونگار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اورنگ زیب دن رات میں صرف تین گھنٹہ سوتا تھا۔ اس کا بیشتر وقت انتظام ملکی اور عبادت میں گزرتا تھا۔ وہ سلطنت کی ایک ایک بات سے باخبر رہتا تھا۔ نوے سال کی عمر تک جب کہ اس کا انتقال ہوا اس کی محنت اور جفاکشی کا یہ حال تھا کہ لوگ تعجب کرتے تھے اس کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ کپڑے بھی سادہ پہنتا تھا اور کھانا بھی سادہ کھاتا تھا۔ اخلاق ایسا تھا کہ ساری زندگی کبھی گندے یا بُرے الفاظ منہ سے نہیں نکالے۔ وہ اپنا خرچ ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر پورا کرتا تھا۔

اورنگ زیب کا دکن کے شہر احمد نگر میں انتقال ہوا اور اورنگ آباد کے پاس خلد آباد میں اس کو دفن کیا گیا، جہاں اس کی قبر اب تک موجود ہے۔ اس کی نعش جب احمد نگر سے اورنگ آباد لے جائی جارہی تھی تو راستہ بھر لوگ کھڑے زار وقطار رو رہے تھے، جیسے وہ ان کا باپ تھا۔

مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ ساڑھے چار روپے جو میرے ہاتھ کی محنت کے ہیں اور ٹوپیوں کی سلائی سے بچے ہیں اس میں تجہیز وتکفین ہو اور آٹھ سو پنچ روپے جو قرآن نویسی کی اُجرت سے حاصل ہوئے ہیں، مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔

ایک مورّخ نے لکھا ہے:

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں یوں تو علاء الدین خلجی، فیروز شاہ اور شیر شاہ نے عوامی فلاح وبہبود کے بہت کام کیے، مگر ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے پیوند لگا ہوا لباس اس لیے پہنا ہو کہ عوام پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔ جس نے رُوکھی سُوکھی روٹی اس لیے کھائی ہو کہ عوام کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو"

شائستہ خان

اورنگ زیب کے امراء میں سب سے عظیم شخصیت شائستہ خان متوفی ۱۶۹۴ء/۱۱۰۵ھ کی تھی۔ وہ اورنگ زیب کا ماموں تھا۔ دکن، گجرات اور مالوہ کا کئی سال تک صوبہ دار رہنے کے بعد اس کو دو مرتبہ بنگال کا صوبے دار بنایا گیا۔ پہلی مرتبہ ۱۶۶۴ء سے ۱۶۷۷ء تک اور دوسری بار ۱۶۸۰ء سے ۱۶۸۸ء تک شائستہ خان بنگال کا صوبے دار رہا۔ بنگال کے کسی صوبے دار نے تاریخ میں شائستہ خاں کے برابر نیک نامی حاصل نہیں کی۔ اس کے دَور میں چاٹگام سلطنت تیموریہ میں شامل ہوا اور اس نے ہگلی کے انگریزوں کے خلاف، جو حکومت کے خلاف سازش کر رہے تھے کارروائی کی۔ اس کی صوبے داری کے زمانے میں بنگال میں دو سو مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ سرائے، پل اور مقبرے اس کے علاوہ ہیں۔ ڈھاکہ کی بہترین تاریخی عمارتیں اسی کی بنوائی ہوئی ہیں اور ایک خاص طرز تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں جس کو شائستہ خانی طرز تعمیر کہا جاتا ہے۔ شائستہ خان عدل و انصاف اور رعایا پروری میں اپنی مثال آپ تھا۔

جانشین

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے محمد معظم نے بہادر شاہ اور شاہ عالم اول کے نام سے پانچ سال تک اور پڑپوتے فرخ سیر (۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۹ء) نے سات سال تک حکومت کی۔ فرخ سیر کے زمانہ میں اگرچہ سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغلیہ سلطنت کے اثر اور اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ۱۷۱۴ء میں دکن کے صوبے دار حسین علی خان نے مرہٹوں کو دکن کے چند صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی کے نام سے ٹیکس وصول کرنے کا حق اس شرط پر دے دیا کہ وہ سلطنت دہلی کی بالادستی کو تسلیم کریں گے۔ یہ حق تیموری سلطنت کے معاملات میں مرہٹوں کی مداخلت اور اس کے بعد ان کے طاقت پکڑنے کا باعث ہوا۔ ۱۷۲۰ء میں بہادر شاہ کا پوتا محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی یہ تخت نشینی سلطنت تیموریہ کے زوال کا آغاز ہے۔ (تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۲۸)

دہلی کی سلطنت تیموریہ

(۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۸۵۸ء/۱۲۷۶ھ)

عہد عروج	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ
(۱) بابر	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ تا ۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ
(۲) ہمایوں	۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ تا ۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ
(۳) اکبر	۱۵۵۶/۹۶۳ھ تا ۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ
(۴) جہانگیر	۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ تا ۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ
(۵) شاہجہاں	۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ تا ۱۶۵۷ء/۱۰۶۸ھ
(۶) اورنگ زیب	۱۶۵۷ء/۱۰۶۸ھ تا ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ
(۷) بہادر شاہ	۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ تا ۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ
(۸) فرخ سیر	۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ تا ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ

اس کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوگیا۔

اہم واقعات

۱۶۵۸ء/۱۰۶۸ھ (۱۵۔اپریل) دھرمات کی جنگ۔ اورنگ زیب نے نربدا کے کنارے جسونت سنگھ کو شکست دی۔ (۲۶۔مئی) سموگڈھ کی جنگ۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دی اور ۸۔جون کو آگرہ میں داخل ہوگیا۔ ۲۱۔جولائی کو دہلی میں بادشاہت کا اعلان کیا۔

۱۶۵۹ء/۱۰۶۹ھ (۵۔جنوری اورنگ زیب نے شجاع کو کھجواہہ کی جنگ میں شکست دی۔

۱۶۶۱ء/۱۰۷۱ھ سیواجی نے سپہ سالار افضل خاں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا۔ بیجاپور کوچ بہار اور آسام کے ایک حصہ کی فتح۔

۱۶۶۴ء فرانس نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔

۱۶۶۶ء چاٹگام کی فتح۔ سیواجی نے ہتھیار ڈال دیئے اور دہلی آیا جہاں بادشاہ نے پنج ہزاری منصب دیا، لیکن اس کے بعد وہ چھپ کر بھاگ گیا۔ ۲۲۔جنوری کو شاہجہاں کا انتقال۔

۱۶۷۰ء سیواجی نے بندرگاہ سورت کو لوٹا۔

۱۶۷۳ء فرانس نے پانڈیچری میں تجارتی کوٹھی قائم کی اور اگلے سال چندرنگر (بنگال) میں

۱۶۸۴ء لداخ کی فتح۔

۱۶۸۶ء (۱۲۔ستمبر) اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کیا۔ انگریزوں نے ہگلی میں ہنگامہ کیا، تو

شائستہ خاں نے نکال دیا۔

۱۶۸۷ء (۲۱۔ستمبر) اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا۔

۱۶۸۹ء مرہٹوں کے دارالحکومت رائے گڈھ پر قبضہ اور سیواجی کا لڑکا شمبھوجی قتل کر دیا گیا۔

۱۶۹۰ء بمبئی کے انگریزوں کی بغاوت کچل دی گئی۔ انگریزوں نے معافی مانگی۔

۱۶۹۱ء تنجور اور ترچنا پلی باجگذار بنائے گئے۔

۱۶۹۳ء گوا کے پرتگیزوں کو شکست اور پرتگالی گورنر کا معافی مانگنا۔

۱۶۹۵ء مہاراشٹر میں جینجی کا قلعہ فتح۔

۱۷۰۰ء مرہٹوں کا آخری قلعہ ستارہ فتح کر لیا گیا۔

۱۷۰۳ء (۲۱۔فروری) شاہ ولی اللہ کی پیدائش۔

۱۷۰۷ء (۲۱۔فروری مطابق ۲۸۔ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ بروز جمعہ) اورنگ زیب کا انتقال۔

۱۷۱۴ء دکن کے صوبیدار حسین علی خاں نے مرہٹوں کا چوتھ وصول کرنے کا حق تسلیم

کر لیا۔

باب ۲۲

سونے کی چڑیا

عہد تیموری کا ہندوستان

تیموریوں کی حکومت، ان سولہ سالوں کو نکال کر کہ جب شیر شاہ اور اس کے جانشینوں نے تیموری اقتدار کو ختم کر دیا تھا، ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک، کل ۳۱۵ سال قائم رہی۔ اس مدت میں عروج کا زمانہ (۱۵۵۶ء تا ۱۷۱۹ء) ایک سو ۶۳ سال ہے۔ برصغیر، پاکستان و ہند کی تاریخ میں کسی ایک خاندان کی حکومت نہ اتنے طویل عرصہ تک قائم رہی اور سلطنت دہلی کو چھوڑ کر نہ کوئی دوسری حکومت اتنے عرصہ تک عروج پر رہی۔ اس کے علاوہ اس ڈیڑھ سو سال کی مدت میں سلطنت میں جیسا امن و امان رہا اس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے وسیع و عریض خطہ پر ایک طویل مدت تک جیسا امن و امان لوگوں کو تیموریوں کی حکومت کے تحت حاصل ہوا، اس کی مثال پوری اسلامی تاریخ میں بھی سوائے عثمانی ترکوں کے اور کہیں نہیں ملے گی۔ عربوں کا ڈھائی سو سالہ دور حکومت بھی امن و امان اور خوشحالی کے لحاظ سے ممتاز ہے، لیکن تیموریوں کے عہد حکومت کے مقابلہ میں اس دور میں بغاوت، تشدد اور خونریزی کے واقعات زیادہ کثرت سے پیش آئے۔ اس کے برخلاف تیموری سلطنت کا انتظام اتنا اچھا تھا کہ پورا دَور بغاوتوں سے تقریباً خالی ہے۔ تیموری حکمران اور حاکم ایسے رعایا پرور تھے کہ اس دور میں ملک نے بے مثل خوشحالی حاصل کر لی تھی۔ سونا جو خوشحالی کا سب سے بڑا ثبوت ہے، برصغیر میں اس دور میں اس کثرت سے جمع ہو گیا تھا کہ یہ خطہ ساری دنیا میں ''سونے کی چڑیا'' کہلاتا تھا۔

آئیے اب ہم عہد تیموری کے پاکستان و ہند کی تھوڑی سی سیر کر لیں اور یہ دیکھیں کہ اب سے تین سو سال پہلے یہاں کے باشندے کیسی زندگی گذارتے تھے:

زراعت وصنعت

ہم اپنی سیر کا آغاز کشمیر سے کرتے ہیں جو عہد مغلیہ کے بہترین صوبوں میں سے تھا۔ایک فرانسیسی سیاح برنیس، جس نے اورنگ زیب کے زمانہ میں برصغیر کی کئی سال تک سیر کی تھی، کشمیر کے قدرتی مناظر کی خوبصورتی، زمین کی زرخیزی اور پھلوں اور پھولوں کی کثرت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''کشمیری اپنی ذہانت میں مشہور ہیں اور ہندوستان کے باشندوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین سمجھے جاتے ہیں۔شاعری اور علم و ادب میں وہ ایرانیوں سے کم نہیں ہیں۔وہ بڑے مستعد اور محنتی ہوتے ہیں۔ان کی بنائی ہوئی پالکیوں، پلنگوں، صندوقوں، قلمدانوں، چمچوں اور مختلف دوسری چیزوں کی کاریگری اور خوبصورتی بڑی حیرت انگیز ہے۔ان کی بنائی ہوئی چیزیں ہندوستان کے ہر حصہ میں استعمال کی جاتی ہیں۔وہ دارنش کرنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں اور لکڑی پر اتنا چھا زریں کام کرتے ہیں کہ میں نے اس سے زیادہ مکمل اور خوبصورت کام کہیں نہیں دیکھا۔لیکن کشمیر کی خاص چیز جس سے تجارت کو فروغ حاصل ہے اور جس کی وجہ سے صوبہ میں دولت آتی ہے، وہ شال کی صنعت ہے۔یہ شال کثیر تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں اور اس صنعت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بچے بھی روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔آگرہ، لاہور اور پٹنہ میں بھی اس قسم کے شال بنانے کی بڑی کوشش کی گئی، لیکن ان میں وہ نرمی اور ملائمیت پیدا نہ ہوسکی جو کشمیری شالوں میں ہوتی ہے''

مغربی پاکستان عہد تیموریہ میں چار صوبوں میں تقسیم تھا۔ایک کشمیر، دوسرا لاہور، تیسرا ملتان اور چوتھا سندھ یا ٹھٹھہ۔صوبہ لاہور کے متعلق اکبر کے درباری مؤرخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

''صوبہ لاہور بڑا آباد، زرخیز اور صحت بخش ہے۔زراعت میں اپنی نظیر کم رکھتا ہے۔اکثر حصہ کنوؤں کے پانی سے سیراب ہوتا ہے۔یہاں کے گھوڑے بہت اچھے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے ہنرمند اس صوبہ میں موجود ہیں''

ابوالفضل کے ایک سو سال بعد عہد اورنگ زیب کا ایک ہندو مؤرخ سجن رائے کھتری لکھتا ہے کہ:

''صوبہ لاہور کا موسم خوشگوار اور حسن بے نظیر ہے۔ یہاں کے خربوزے اور انگور ایران اور ترکستان کی طرح ہیں، آم ہندوستان جیسے ہیں، چاول بنگال سے بہتر اور گنا دکن کے گنے سے زیادہ میٹھا ہے''

شہر لاہور عہد مغلیہ میں مخمل، ریشم، سوت اور اُون کے کپڑے کی صنعت کا بڑا مرکز تھا اور شال اور قالین کشمیر کے بعد سب سے زیادہ یہیں تیار ہوتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں لاہور میں صرف شال اور قالین کے ایک ہزار کارخانے تھے۔

سیالکوٹ میں اعلیٰ درجہ کا کاغذ تیار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ زردوزی اور ریشمی کشیدہ کاری کا کام یہاں عروج پر تھا۔ ہلکے ہتھیار کٹار اور تیر وغیرہ بھی تیار ہوتے تھے۔

گجرات کا شہر اکبر کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔ یہ زردوزی کے کام اور تلواروں کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔

ملتان سوتی کپڑے اور شکر کی صنعت کے لیے مشہور تھا، لیکن یہاں کی خاص صنعت کمان سازی تھی اور یہاں کی بنی ہوئی کمانیں اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔

ٹھٹھہ۔ سوتی کپڑوں کی صنعت کا مرکز تھا اور اس صنعت میں ساٹھ ہزار آدمی مصروف رہتے تھے۔ ایک انگریز سیاح اور تاجر ہملٹن نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ٹھٹھہ میں تعلیم کے لیے چار سو مدرسے تھے۔

اب تک جن شہروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب مغربی پاکستان میں شامل ہیں مشرقی پاکستان اور بھارت کے صوبے اور شہر بھی اپنی سرسبزی، شادابی اور صنعت وحرفت کی ترقی میں کچھ کم نہیں تھے، بلکہ زیادہ ہی تھے۔ مشرقی پاکستان تو حقیقت میں سلطنت مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوشحال صوبہ تھا۔ برنیئر نے اس صوبہ کی جو اس زمانہ میں بنگال کہلاتا تھا دل کھول کر تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''مصر ہر زمانہ میں سب سے اچھا اور دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار والا ملک سمجھا جاتا رہا ہے اور اس زمانہ کے مصنف بھی یہی کہتے ہیں کہ مصر کی طرح کوئی دوسرا ملک قدرت کی نعمتوں سے بہرہ ور نہیں، لیکن میں نے اپنے دوسفروں کے زمانہ میں بنگال سے متعلق جو واقفیت پیدا کی ہے اُس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصر کو جو مقام دیا گیا ہے وہ

دراصل بنگال کو ملنا چاہئے۔ اس خطہ میں چاول اس کثرت سے ہوتا ہے کہ صرف پڑوس کے صوبوں ہی کو نہیں بلکہ لنکا اور مالدیپ تک بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح بنگال میں شکر اس کثرت سے ہوتی ہے کہ دکن، عرب، عراق اور ایران تک جاتی ہے۔ بنگال میں مٹھائیاں بھی بڑی اچھی تیار ہوتی ہیں۔ پھلوں میں آم، اناناس اور لیموں خوب ہوتا ہے۔

روئی اور ریشم اس کثرت سے ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں یہ خطہ صرف تیموری سلطنت ہی کا نہیں بلکہ تمام پڑوسی ملکوں اور یورپ تک کا ذخیرہ گھر ہے۔ یہاں طرح طرح کا سوتی کپڑا جس کثیر مقدار میں تیار ہوجاتا ہے اور جو جاپان اور یورپ تک جاتا ہے، اسے دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ یہی حال ریشم اور ریشمی کپڑوں کا ہے۔ ریشم اگرچہ ایران اور شام کی طرح اچھا نہیں ہوتا لیکن قیمت میں وہاں کے ریشم سے بہت سستا ہوتا ہے''

باشندے سبزیاں، چاول اور گھی کھاتے ہیں اور یہ چیزیں برائے نام قیمت پر حاصل ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح ایک روپیہ میں بیس بلکہ اس سے زیادہ مرغیاں مل جاتی ہیں۔ بطخیں اور بھی سستی ہیں۔ بکریوں اور بھیڑوں کی کثرت ہے اور ہر قسم کی مچھلی افراط سے پائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ۔

بنگال میں ضرورت کی ہر چیز کثرت سے موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ پرتگالی باشندے اور دوسرے عیسائی جن کو ولندیزیوں نے ان کی نوآبادیوں سے نکال دیا ہے اس زرخیز مملکت میں آباد ہونا پسند کرتے ہیں۔ ملک میں چیزوں کی ریل پیل کی وجہ سے یورپ کے باشندوں میں یہ مثل عام ہے: ''بنگال میں داخلے کے سو دروازے ہیں اور جانے کا ایک بھی نہیں''

آگرہ، دہلی، لاہور

آگرہ، دہلی اور لاہور مغلوں کے دارالحکومت تھے۔ اکبر زیادہ تر آگرہ میں، جہانگیر لاہور میں اور شاہجہاں اور اورنگ زیب اور بعد کے مغل بادشاہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے آخری دورِ حکومت میں دکن میں اورنگ آباد کو بھی دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ایک عادل اور عوام کی خیر خواہ حکومت کے تحت ان شہروں نے بڑی ترقی کی۔ آگرہ کے پاس اکبر نے فتح پور سیکری کے نام سے ایک نیا شہر بھی آباد کیا تھا۔ یہ کچھ اسی قسم کا شہر تھا جیسا قرطبہ میں مدینۃ الزہرا تھا۔ لیکن فتح پور سیکری کی قسمت مدینۃ الزہرا سے اچھی تھی۔ اس لیے کہ مدینۃ الزہرا کی بستی تو

بہت جلد تباہ ہوگئی اور اب کھنڈروں کے علاوہ وہاں کچھ نہیں۔ لیکن فتح پور سیکری کے شاندار محل اور عمارتیں آج بھی موجود ہیں اور دنیا کے ہر حصہ کے لوگ ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ فتح پور سیکری کی عمارتیں اگرچہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں، لیکن عہد تیموریہ کی سب سے شاندار عمارت ''تاج محل'' ہے۔ فرانسیسی سیاح برنیئر نے، جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے، جب تاج محل کو دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''روئے زمین پر کوئی عمارت ایسی خوبصورت نہیں ہے۔ میں نے مصر کے اہرام بھی دیکھے ہیں جن کو دنیا کے عجائبات میں سے شمار کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہرام نہیں بلکہ تاج محل کو عجائبات میں سے شمار کرنا چاہیے''

دہلی کے پرانے شہر کے پاس شاہجہاں نے نیا شہر آباد کیا تھا۔ یہ شہر اپنی باقاعدگی، صاف اور چوڑی سڑکوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ جامع مسجد اور لال قلعہ اسی نئے شہر میں تھے یہ نیا شہر جو اب پرانی دلی کہلاتا ہے اُس زمانہ میں جہاں آباد کہلاتا تھا۔

ان شہروں کے علاوہ ڈھاکہ، برہانپور، احمد آباد اور سورت بھی سلطنت مغلیہ کے بڑے شہر تھے اور زیادہ تر صنعت وحرفت اور تجارت کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس دَور کے امن وامان، عدل و انصاف اور صنعت و تجارت اور زراعت کی ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت کی آمدنی بڑھ گئی۔ اکبر کے زمانہ میں کل آمدنی بیس کروڑ روپے تھی، لیکن اورنگ زیب کے زمانہ میں یہ مقدار چالیس کروڑ روپے ہوگئی۔

فن تعمیر

مغل حکمران صرف فن تعمیر کا اچھا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کو شہروں کو آباد کرنے اور عمارتیں اور باغات بنانے سے بھی انتہائی دلچسپی تھی۔ ڈھاکہ، دہلی، (جہاں آباد) فتح پور سیکری، گجرات اور اورنگ۔آباد کے شہران ہی کے آباد کیے ہوئے ہیں۔ ان شہروں میں اور دوسرے شہروں میں خوبصورت قلعے، محل، مسجدیں، باغ، پُل اور کارواں سرائیں تعمیر کی گئیں جن کی ایک بڑی تعداد آج تک موجود ہے۔ خوبصورت عمارتوں کی تعمیر میں برصغیر کا کوئی دَور تیموری دَور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انہوں نے جن شہروں میں عمارتیں تعمیر کیں وہ آج بھی ان شہروں کی سب سے خوبصورت اور دلکش عمارتیں ہیں، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عہد عروج کے دوسرے

دَور میں اسلامی دنیا میں سب سے حسین اور دلکش عمارتیں برصغیر پاکستان و ہند میں تیموری دَور میں تعمیر ہوئیں۔ یہاں کے صنّاع ترکستان، ایران، ترکی اور مصر کے صناعوں سے بازی لے گئے۔ انہوں نے ترکی اور ایرانی طرز تعمیر کو ہندی طرز تعمیر سے ملا کر ایک نیا تیموری طرز تعمیر پیدا کیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

باب ۲۳

قلم اور دوات، منبر اور محراب

تیموری سلاطین کے دور عروج میں بلند پایہ مصنف، عالم، ادیب اور شاعر جس کثرت سے پیدا ہوئے، برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں ہوئے۔ اندلس کی تاریخ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہاں اموی دَورِ حکومت میں اس کثرت سے مصنف پیدا نہیں ہوئے جس کثرت سے اموی دَور کے بعد پیدا ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اموی دَور اندلس میں مسلمانوں کا ابتدائی دَور تھا۔ اس دَور میں علم و فن کی بنیاد پڑی لیکن اس پر عمارت بعد کے دَور میں تعمیر ہوئی۔ برصغیر پاکستان و ہند میں بھی علمی ترقی اسی انداز پر ہوئی۔ سلطنت دہلی کے زمانے میں سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور ترکستان اور ایران سے آنے والے مسلمانوں نے علم و ادب کا پودا یہاں کی سرزمین پر لگایا۔ سلطنت دہلی کے بعد یہ تناور درخت بن گیا اور تیموری دَور میں طرح طرح کے پھل دینے لگا۔

مغل سلاطین، صوبہ دار اور امراء سب علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے، چنانچہ اس دور میں تعلیم پھیلانے کی کافی کوششیں کی گئیں۔ پوری سلطنت میں اساتذہ اور اہل علم و فن لوگوں کے حکومت کی طرف سے وظیفے مقرر تھے اور وہ بے فکر ہو کر لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اور علم و ادب کی خدمت کرتے تھے۔ لاہور، دہلی، آگرہ اور جونپور اس زمانہ میں سب سے بڑے علمی مرکز تھے۔ گجرات کا شہر احمد آباد بھی ایک بڑا علمی مرکز تھا۔

علم و ادب کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد مغلیہ میں بڑے بڑے صاحب کمال عالم اور ادیب پیدا ہونے لگے، بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ اس دَور میں جس کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے اس کی مثال سلطنت دہلی کے زمانہ میں نظر نہیں آتی۔ اس دَور کے عالموں میں سب سے بڑی شخصیت مجدد الف ثانیؒ کی ہے۔

مجدد الف ثانیؒ

مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء) کا نام احمد تھا۔ وہ اکبر کے زمانۂ حکومت میں

سرہند میں پیدا ہوئے تھے جو دہلی اور لاہور کے درمیان ایک شہر ہے اور بھارت کے صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ آجکل سرہند ایک معمولی بستی ہے لیکن مغلوں کے زمانہ میں یہ بہت بڑا شہر تھا اور آبادی کی کثرت میں دہلی کا مقابلہ کرتا تھا۔ مجدد الف ثانیؒ ابتدائی تعلیم سرہند میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے سیالکوٹ چلے گئے جو اس وقت علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے خود کو لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے وقف کر دیا۔ وہ اگرچہ لاہور، دہلی اور آگرہ میں کئی سال رہے لیکن ان کا زیادہ وقت اپنے وطن سرہند میں ہی گذرتا تھا، جہاں انہوں نے اپنے لیے ایک حویلی اور مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنائی تھی۔ مجدد الف ثانیؒ نے اسی مسجد کو مرکز بنا کر لوگوں کی اصلاح و ہدایت کا کام شروع کیا۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں کچھ تو ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے اور کچھ اکبر کی بے دینی کی وجہ سے مسلمانوں کے عقائد خراب ہونا شروع ہو گئے تھے اور ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو بہت سی اسلامی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ مجدد الف ثانیؒ نے جب یہ حالت دیکھی تو انہوں نے بے دینی کی اس تحریک کا مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔ انہوں نے کتابیں اور رسالے لکھ کر اور حکومت کے عہدے داروں اور علمائے دین کو خطوط لکھ کر اور وعظ و تقریر کے ذریعہ اسلام کی صحیح تعلیم پیش کی اور دلیلیں دے کر ثابت کیا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ ان کی باتوں میں چونکہ خلوص ہوتا تھا اس لیے لوگوں پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس طرح ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے عقائد صحیح ہو گئے۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی ان کی تعلیم اور اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور بہتوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

مجدد الف ثانیؒ نے اس مقصد کے لیے ایک مکمل نظام قائم کیا تھا۔ وہ سرہند میں لوگوں کو ضروری تربیت دیتے تھے۔ اس طرح تیموری سلطنت کے کونے کونے میں اُن کا پیغام پہنچ گیا۔

جب کوئی شخص اصلاح کا کام کرتا ہے تو اس کے بہت سے مخالف بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے اور انہوں نے جہانگیر سے جو اس زمانہ میں بادشاہ تھا مجدد الف ثانیؒ کی شکایتیں کیں، جس پر جہانگیر نے ان کو سرہند سے اپنے پاس بلوایا۔ اکبر کے زمانہ سے دربار میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے سامنے آتا تھا تو تعظیم کے طور پر اس کو سجدہ کرتا تھا، لیکن مجدد الف ثانیؒ جب دربار میں پہنچے تو

انہوں نے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور ان کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ مجدد الف ثانیؒ ایک سال قلعہ میں قید رہے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ تبلیغ میں مصروف رہے اور قلعہ کے کئی ہندو قیدی ان کے ہاتھ پر اسلام لے آئے۔ بعد میں جہانگیر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ان کو رہا کر دیا۔ رہا ہونے کے بعد وہ تین چار سال تک جہانگیر کے لشکر کے ساتھ رہے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ فوجیوں کی، امراء کی اور خود بادشاہ کی اصلاح کا کام کرتے رہے اس کے بعد وہ سرہند چلے گئے۔ جہاں سال بھر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

مجدد الف ثانیؒ کی لکھی ہوئی تحریریں آج بھی لوگوں کے بجھے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کی کوششوں سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور اسلامی تعلیم نئے سرے سے زندہ ہوئی۔ اسی لیے ان کو مجدّد کہا جاتا ہے یعنی اسلام کو نئی زندگی دینے والا۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط جنہوں نے انقلاب پیدا کر دیا تھا، فارسی زبان میں ہیں جو اس زمانہ کی سرکاری زبان تھی۔ ان خطوط کا ہماری قومی زبان اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

علم و حکمت

تیموری سلطنت کے دَورِ عروج کی سب سے بڑی علمی اور فکری شخصیت بلا شک و شبہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تھی، لیکن اس دَور میں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بلند پایہ مصنفوں، ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ ذیل میں علم و حکمت، ادب اور شاعری کے میدانوں کی چند نمایاں شخصیتوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ تا ۱۶۴۲ء/۱۰۵۲ھ) انہوں نے عربی اور فارسی میں تقریباً ایک سو کتابیں اور کتابچے لکھے۔ اب تک ہندوستان میں فقہ کا بہت رواج تھا اور احادیث کی طرف سے غفلت برتی جاتی تھی۔ شاہ عبدالحق کا سب سے بڑا کارنامہ برصغیر میں علم حدیث کو رواج دینا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس خطے میں ایسے عظیم محدث اور اہل علم پیدا ہوئے جن کو اسلامی دنیا کے عظیم محدثوں اور علماء کی صف میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے علم حدیث کے موضوع پر کتابیں لکھیں اور حدیثوں کی مشہور کتاب 'مشکوٰۃ' کی شرح لکھی۔ ان کی ایک اور اہم

کتاب 'اخبار الاخیار' ہے جس میں اسلامی ہند کے اولیاء اللہ اور بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔ حضورؐ کی سیرت پر بھی ایک مفصل کتاب ''مدارج النبوۃ'' لکھی ہے۔

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۶۵۶ء/۱۰۶۷ھ سیالکوٹ اور آگرے کے مدرسوں میں طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے تفسیر، فقہ اور علم کلام کی مختلف مشہور کتابوں پر حاشیے لکھے۔ مشہور تفسیر بیضاوی پر بہت سے علماء نے حاشیے لکھے ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ سب سے اچھا اور مقبول حاشیہ مولانا عبدالحکیم کا ہے۔ ان کی کتابیں صدیوں تک اسلامی ہند، مصر اور ترکی کی درس گاہوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ شاہجہاں نے ان کو دو مرتبہ چاندی میں تولا اور چاندی کے برابر رقم ان کو انعام میں دی۔

مولانا محمود جونپوری (۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ تا ۱۶۵۲ء/۱۰۶۲ھ) بھی عہد شاہجہاں کے ممتاز عالم ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت 'شمس بازغہ' کو حاصل ہوئی۔ یہ اپنی سلاست کی وجہ سے فلسفہ کی شاہکار کتابوں میں سمجھی جاتی ہے اور اس وقت سے آج تک دینی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

عہد شاہجہاں کے ایک اور ممتاز عالم شیخ محب اللہ الہ آبادی متوفی ۱۰۵۸ھ ہیں۔ آپ نے زیادہ تر تصوف کے موضوع پر لکھا۔ مشہور صوفی ابن عربی کی کتاب 'فصوص الحکم' کی شرح لکھی اور صوفیانہ انداز میں قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ ابن عربی کے نظریات کی انہوں نے اس شدت سے حمایت کی کہ وہ اسلامی ہند کے ابن عربی مشہور ہو گئے۔ انہوں نے فلسفہ پر بھی کتاب لکھی۔

میر زاہد متوفی ۱۶۸۹ء/۱۱۰۱ھ عہد عالمگیری میں علم کلام، فلسفہ اور منطق کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ عالمگیری لشکر میں محتسب تھے۔ انہوں نے علم کلام میں شریف جرجانی کی مشہور کتاب شرح مواقف اور منطق کی دوسری کتابوں پر جو حاشیے لکھے وہ ان کتابوں پر سب سے اچھے حاشیے سمجھے جاتے ہیں۔ قاضی محب اللہ بہاری متوفی ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں لکھنؤ کے قاضی تھے۔ منطق اور اصول فقہ میں اسلامی ہند میں کسی کی کتابیں ان کی کتابوں مسلم العلوم (منطق) اور مسلم الثبوت (اصول فقہ) کے برابر مقبول نہیں ہوئیں۔

علوم حکمت اور طب میں اگرچہ اس دور میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوا، لیکن اس میدان میں حسب ذیل اشخاص نے امتیاز حاصل کیا:

حکیم فتح اللہ شیرازی متوفی ۹۹۷ھ ریاضی اور طبیعات کے ماہر تھے۔ ان علوم پر اگرچہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان سے کئی ایجادیں منسوب ہیں۔ انہوں نے برصغیر میں پہلی ہوا چکی بنائی، ایک ایسا آئینہ بنایا جس میں دُور دُور کی چیزیں نظر آتی تھیں اور ایک ایسی بندوق بنائی جو یکے بعد دیگرے بارہ گولیاں چلا سکتی تھی۔ اکبر کے دَور میں سرکاری کاموں کے لیے سن الٰہی کے نام سے ایک نئی شمسی تقویم تیار کی گئی تھی جس کو سن الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ تقویم فتح اللہ شیرازی ہی نے تیار کی تھی۔

حکیم ابوالفتح متوفی ۱۵۸۹ء/۹۹۷ھ کا نام جن کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا تھا، اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ حقہ انہی کی ایجاد ہے۔ وہ طب میں ایک کتاب 'فتاحی' کے مصنف تھے اور 'اخلاق ناصری' کی شرح بھی لکھی۔ اکبر کو گمراہ کرنے میں اس دور کے اطبا میں غالباً حکیم علی گیلانی متوفی ۱۰۱۸ھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے ابن سینا کی مشہور کتاب 'قانون' کی عربی میں شرح لکھی جو قانون کی سب سے اچھی شرح سمجھی جاتی ہے۔ حکیم گیلانی نے جہانگیر کے زمانے میں لاہور اور آگرہ میں دو ایسے حوض تیار کیے تھے جن کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے، لیکن ان کمروں کے دروازے اور کھڑکیوں سے کھلا ہونے کے باوجود پانی اندر نہیں جا سکتا تھا۔

سندھ کے میر معصوم بھکری (۹۲۲ھ تا ۱۰۱۹ھ) بھی ایک ممتاز طبیب تھے اور علم طب پر دو کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی لکھی ہوئی 'تاریخ سندھ' اپنے موضوع پر بہت اہم کتاب ہے۔ سکھر میں ان کا بنایا ہوا مینار آج بھی شہر کی سب سے نمایاں عمارت ہے۔

شاہجہاں کے ملک الشعرا طالب آملی کی بہن ستی النساء کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ وہ اس دَور کی ممتاز خاتون طبیبہ تھی اور شاہی محل کی عورتوں کا علاج کیا کرتی تھی۔

استاد کبیر حسین عہد اکبری کے مشہور بندوق ساز تھے۔ اکبر کے دَور میں طرح طرح کی بندوقیں اور توپیں بنائی گئیں اور فن اسلحہ سازی کو اتنی ترقی دی گئی کہ سلطنت عثمانیہ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان ملک میں اتنا اچھا توپ خانہ نہیں تھا۔[1]

---

(۱) عہد اکبری میں توپ سازی اور بندوق سازی کے فن کی ترقی کے لیے ملاحظہ کیجیے مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہندوستان جلد پنجم ص ۶۵۸ اور ۶۵۹ (مطبوعہ علی گڈھ ۱۹۱۸ء)

علم تاریخ

علوم دینی کے بعد اس دَور کی سب سے اہم کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ علوم دینی پر اس دَور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ عام طور پر عربی میں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن تاریخ کے موضوع پر کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ ابوالفضل کے اکبر نامہ اور آئین اکبری کا تذکرہ اکبر کے حالات میں کیا جاچکا ہے۔ عہد اکبری کے دوسرے اہم مورخ نظام الدین احمد متوفی ۱۵۹۴ء/ ۱۰۰۳ھ اور ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ تا 1595ء/۱۰۰۴ھ) ہیں۔ نظام الدین کی کتاب 'طبقات اکبری' اسلامی ہند کی مفصل اور مستند ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بدایونی کی 'منتخب التواریخ' اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ سلاست زبان، دلچسپ انداز، ناقدانہ نقطۂ نظر اور معلومات کی کثرت کے لحاظ سے برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کے علاوہ اسلامی ہند کی کوئی تاریخ 'منتخب التواریخ' کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اکبر کے دین الٰہی سے متعلق جو باتیں دوسرے مورخ ڈر کی وجہ سے پیش نہیں کر سکتے، بدایونی نے ان کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس دَور کی علمی اور ادبی تاریخ کے لیے بھی یہ بہترین ماخذ ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں، پہلا محمود غزنوی سے اکبر تک، دوسرے حصے میں اکبر کے عہد کی تاریخ ہے اور تیسرے میں ہمعصر علماء ادیبوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔

شاہجہاں کے دَور میں عبدالحمید لاہوری متوفی ۱۶۵۴ء/۱۰۶۵ھ نے ابوالفضل کے انداز میں بادشاہ نامہ لکھا اور محمد صالح کنبوہ متوفی ۱۶۷۴ء/۱۰۸۵ھ نے 'عمل صالح' لکھی جو شاہجہاں کی پیدائش سے لے کر اس کی قید اور پھر وفات تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں اس دَور کے مشاہیر کے مختصر حالات بھی ہیں۔

اس دَور کی ایک اہم تصنیف ''دبستان مذاہب'' ہے۔ اس کے مصنف کا نام نہیں معلوم۔ کتاب شاہجہاں کے آخری دَور میں لکھی گئی۔ ابن حزم اور شہرستانی کی 'الملل والنحل' کی طرح ''دبستان مذاہب'' میں دنیا کے مختلف مذاہب کے عقائد پیش کیے گئے ہیں۔ ہندو مذہب اور اس کے مختلف فرقوں اور سکھوں کے عقائد سے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسلمان فرقوں اور دین الٰہی کا تذکرہ بھی ہے۔

شعر و ادب

اس دَور میں تاریخ کی طرح شعروادب کی ترقی بھی زیادہ تر سلاطین اوران کے امراء کی سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ جامی کے بعد سے فارسی شاعری رو بہ زوال ہو چکی تھی، اس لیے ہمیں اس دَور میں ایسے شاعر نظر نہیں آتے جو رومی، سعدی، خسرو، حافظ وغیرہ کے ہم پلہ ہوں۔ پھر بھی سولہویں اور سترہویں صدی میں فارسی شاعری کے سب سے اچھے نمائندے اسلامی ہند نے پیش کیے۔ اگرچہ ان شاعروں کی اکثریت ایرانی تھی، لیکن ان کی قدر آگرہ اور دہلی کے تیموری دربار میں کی گئی۔ اس دَور کے فارسی شعراء میں جدت اور زور بیان کے لحاظ سے اکبر کا ملک الشعراء فیضی (۱۵۴۷ء/۹۵۴ھ تا ۱۵۹۶ء/۱۰۰۴ھ) سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی مثنوی ''نل ودمن'' فارسی شاعری کا شاہکار ہے اور نقادوں کا کہنا ہے کہ امیر خسرو کے بعد اس پایہ کی مثنوی کسی نے نہیں لکھی۔ اس دَور کا دوسرا شاعر جو جدت اور ندرت افکار کے لحاظ سے اہم ہے، مرزا عبدالقادر بیدل متوفی ۱۷۲۱ء/۱۱۳۳ھ ہے۔ اس نے دلوں کو حقائق و معارف کی طرف متوجہ کیا۔ افغانستان اور ترکستان میں اس کو دوسرا رومی سمجھا جاتا ہے۔

فیضی اور بیدل کے علاوہ اس دَور کے ممتاز شعراء۔

فیضی اور بیدل کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ ان کے علاوہ اس دور کے دوسرے ممتاز شعراء، غنی کشمیری متوفی ۱۶۶۱ء کو چھوڑ کر تمام کے تمام ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں عرفی (۱۵۵۶ء تا ۱۵۹۱ء)، نظیری متوفی ۱۶۱۳ء، ظہوری متوفی ۱۶۱۵ء، دربار جہانگیر کا ملک الشعراء طالب آملی متوفی ۱۶۲۶ء، دربار شاہجہانی کا ملک الشعراء ابوطالب کلیم متوفی ۱۶۵۱ء ہیں۔ ان میں صائب متوفی ۱۰۸۱ھ کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے جس کو تیموری دربار کی کشش ایران سے ہندوستان لے آئی تھی۔ اس نے جب شاہجہاں کی تخت نشینی پر قطعہ تاریخ لکھ کر پیش کیا تو اس کو بارہ ہزار روپے انعام ملے، لیکن صائب برصغیر میں چھ سال قیام کے بعد ایران چلا گیا۔ شبلی نے لکھا ہے کہ ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور صائب پر ختم ہوگئی۔ ان شاعروں کی وجہ سے غزل اور قصیدہ نے عروج پایا۔ لیکن ان کے کلام میں جذبات اور تخیل دونوں کی کمی اور لفاظی اور شوکت الفاظ کا زور ہے۔ اس جگہ آرمینیہ کے ایک یہودی النسل صوفی شاعر سرمد متوفی ۱۶۶۰ء کا

ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ فارسی کا آخری بڑا رباعی گو ہے اور عہد شاہجہان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کی رباعیوں میں ہمیں وہ بات ملتی ہے جس کی مذکورہ بالا شاعروں میں کمی تھی، یعنی سوز و گداز۔

مقامی ادب

تیموری دَور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں مقامی زبانوں کے ادب اور شاعری کو بھی فروغ ہوا۔ اگر چہ یہ مقامی ادب سرکاری سرپرستی سے آزاد کر پروان چڑھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تیموری سلاطین کی رواداری، اور ان کی پیدا کردہ امن و امان اور خوشحالی کی فضا مقامی مسلم اور غیر مسلم ادب کے فروغ کا باعث ہوئی۔ پشتو ادب کے باوا آدم خوشحال خان خٹک (۱۰۲۲ھ تا ۱۱۰۰ھ) اور پشتو کے سب سے بڑے شاعر رحمن بابا (۱۰۴۲ھ تا ۱۱۱۸ھ) اسی دَور میں ہوئے ہیں۔ اسی طرح پنجابی کے مشہور شاعر سلطان باہو متوفی ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء، بُلھے شاہ (۱۶۸۰ء تا ۱۷۸۵ء) اور وارث شاہ (اٹھارہویں صدی) بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں۔ سندھی زبان کے سب سے بڑے شاعر شاہ عبداللطیف ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۲ء) جن کو سندھی زبان کا رومی کہا جاتا ہے اسی دَور میں پیدا ہوئے۔ بنگالی زبان کے دو بلند پایہ شاعر دولت قاضی جس کا انتقال ۱۶۳۸ء کے قریب ہوا اور علاول (۱۶۰۷ء تا ۱۶۸۰ء) تیموری دَور کے شاعر ہیں۔ یہ دونوں حقیقت میں بنگالی شاعری خصوصاً بنگال کی اسلامی شاعری کے باوا آدم ہیں۔ علاول کا شمار آج بھی بنگالی زبان کے درجہ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔

اس دَور میں مقامی زبانوں میں جو ہندو شاعر ہوئے ہیں ان میں ہندی کے عظیم شاعر تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء) اور بہاری لال (۱۶۰۳ء تا ۱۶۶۳ء) بہت اہم ہیں۔ تلسی داس کی رامائن ہندی کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے عالمی ادب کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ گجراتی شاعری کے باوا آدم پرمانند (۱۶۳۶ء تا ۱۷۳۴ء) اور مرہٹی کے عظیم شاعر رام داس (۱۶۰۸ء تا ۱۶۸۱ء) بھی اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنگالی میں سترھویں صدی میں جو ہندو شاعر ہوئے ہیں ان میں کاشی رام اور مُکند قابل ذکر ہیں۔ انتہائی جنوب میں تامل اور کنری زبانوں میں بھی اس زمانے میں کئی شاعر اور مصنف ہوئے ہیں۔

تیموری دَور نے پورے برصغیر میں جو سیاسی وحدت قائم کی تھی اس کی وجہ سے مختلف علاقوں

کے لوگوں کو جو مختلف زبانیں بولتے تھے ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع فراہم ہوئے اور ان کے اس میل جول نے ایک مشترکہ زبان کی شکل اختیار کی، جس کو ہندو 'ہندی' اور مسلمان 'اُردو' کہتے ہیں۔ شروع میں اس نے دکنی اردو کی ادبی شکل اختیار کی لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں اس نے موجودہ اُردو کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ موجودہ اُردو کا پہلا بڑا اور صاحب دیوان شاعر ولی دکنی (۱۶۶۷ء تا ۱۷۰۷ء) اور سراج الدین خاں آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) اسی دَور میں ہوئے ہیں۔

ہندوؤں نے اس زمانے میں فارسی میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ شاہجہاں کے میرمنشی چندر بھان متوفی ۱۶۶۲ء کا شمار فارسی کے بلند پایہ شاعروں اور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف تھا۔

تیموری حکمرانوں نے شاعری اور ادب ہی پر کیا موقوف، انہوں نے ہر جوہر قابل کی قدر کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ایران، افغانستان اور وسط ایشیا سے لوگ کھنچ کھنچ کر دربار دہلی کی طرف چلے آتے تھے، جہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ ان میں سرکاری عہدے دار، عالم، ادیب، شاعر اور فن کار سب ہی ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران اور وسط ایشیا کے ملک باصلاحیت انسانوں کی قدر نہ کرنے کی وجہ سے علم و ہنر سے خالی ہو گئے اور برصغیر پاکستان و ہند میں علم و ہنر کی ریل پیل ہو گئی۔ ہمارے ملی شاعر اقبال نے اپنی نظم ''بچوں کا گیت'' میں اس بات کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے ان کو چمکایا کہکشاں سے

شاہی خاندان میں نور جہاں، اس کا باپ اعتمادالدولہ اور بھائی آصف خاں، صوبے داروں میں علی مردان خاں اور میر جملہ، حکماء میں میر فتح اللہ شیرازی، حکیم ابوالفتح اور حکیم علی گیلانی اور شاعروں میں عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، ظہوری، طالب آملی، ابوطالب کلیم اور صائب تبریزی ان ہی ٹوٹے ہوئے ستاروں میں سے چند تھے جو فارس کے آسمان سے ٹوٹ کر آسمان ہند کی زینت بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ تیموری دَور میں علم و ادب، صنعت و حرفت اور ہر قسم کے ہنر کی جیسی سرپرستی کی گئی اس کی مثال سولہویں اور سترہویں صدی میں پوری اسلامی دنیا میں نہیں ملے گی۔

تیموری دَور میں ڈالی ہوئی اسی علمی داغ بیل کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی ہند اور پاکستان کے مسلمان علمی اور ذہنی لحاظ سے پوری اسلامی دنیا سے آگے ہیں اور جیسا کہ ہم آگے چل کر پڑھیں گے کہ اس خطے سے شروع ہونے والی تحریکوں نے بعد کے زمانے میں اسلامی دنیا کے بڑے حصے پر اثر ڈالا۔

باب ۲۴

برِ صغیر کا اِسلامی دَور

پاکستان میں اسلامی حکومت کی ابتداء ۷۱۲ء سے ہوتی ہے جب کہ محمد بن قاسم نے راور کی جنگ میں راجہ داہر پر فتح پائی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کا با قاعدہ آغاز 1192ء سے جب کہ محمد غوری نے پرتھوی راج پر تھانیسر کے میدان جنگ میں فتح پائی تھی، ہوتا ہے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ہوا اور ہندوستان میں بھی قریب قریب اس زمانے میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں نے برکوچک کے مختلف حصوں میں جتنے عرصے حکومت کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

سندھ اور بلوچستان	۷۱۲ء تا ۱۸۴۳ء
پنجاب و سرحد	۱۰۲۱ء تا ۱۸۰۰ء
شمالی ہند	۱۲۰۰ء تا ۱۸۰۸ء
مشرقی پاکستان	۱۲۰۰ء تا ۱۷۵۷ء
وسط ہند اور دکن	۱۳۰۰ء تا ۱۸۰۰ء
جنوبی ہند	۱۳۰۰ء تا ۱۳۳۸ء پھر ۱۵۷۵ء تا ۱۸۰۰ء

اشاعت اسلامی اور اس کے فائدے

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ برکوچک پاکستان و ہند کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومت ڈھائی سو سال سے سوا گیارہ سو سال تک رہی۔ اس طویل عرصے میں مسلمانوں نے یہاں کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس خطے میں جو بت پرستی اور توہم پرستی کا مرکز تھا ''توحید'' کی روشنی پھیلی۔ مسلمان بزرگوں اور اولیاء اللہ کی تبلیغی کوششوں، مسلمانوں کی اچھی زندگی اور اسلامی حکومت کی رواداری اور خوبیوں کی وجہ سے اس ملک کے لاکھوں انسانوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ہندوؤں اور غیر مسلموں کے اس کثرت سے اسلام لانے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی اور۔

علاقے مستقل طور پر اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گئے۔ اس طرح ایک بہت بڑے خطے کا جو رقبہ اور آبادی میں اندلس سے دو گنے سے زیادہ ہے، اندلس کی طرح حشر نہیں ہوا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد لوگ قبل از اسلام کی بہت سی خرابیوں اور عیبوں سے پاک ہو گئے۔ ذات پات کی تمیز، چھوٹے بڑے کا فرق، چھوت چھات کا رواج ختم یا کم ہو گیا۔ بیواؤں کی شادی ہونے لگی۔ عورتوں کو وراثت میں حصہ ملنے لگا۔

مسلمانوں کی حکومت نے انسانی قربانی کی رسم کو بند کر دیا۔ ستی کے متعلق حکم دیا کہ جبراً کسی عورت کو ستی نہ کیا جائے اور شراب پینے اور اس کی خرید وفروخت اور جوئے پر پابندی لگائی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دور حکومت میں شراب خوری اور جوا بہت کم ہوتا تھا اور ویسا عام نہیں تھا جیسے آجکل ہمارے ملک میں انگریزی اثر کی وجہ سے ہو گیا ہے۔

ایک فرانسیسی سیاح برنیئر، جو شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں آیا تھا، لکھتا ہے کہ:

"دہلی کی کسی دوکان پر شراب نہیں ملتی، مسلمان اور ہندو دونوں اسے برا سمجھتے ہیں۔ مغل سلطنت میں کبھی کبھی شیراز یا یورپ سے شراب آجاتی ہے۔ جس کو یورپی تاجر لاتے ہیں۔ مَیں نے یہ شراب احمد آباد اور گولکنڈہ میں انگریزوں اور ولندیزوں کے گھروں پر پی، لیکن یہ اتنی زیادہ مہنگی ہوتی ہے کہ قیمت کی وجہ سے ساری لذت غارت ہو جاتی ہے۔ ہاں یہاں ایک قسم کی گھٹیا شراب ملتی ہے جسے لوگ عرق کہتے ہیں، لیکن یہ نقصان دہ ہوتی ہے اور اس کے استعمال پر بھی اتنی پابندی ہے کہ سوائے عیسائیوں کے اور کوئی پینے کی ہمت نہیں کر سکتا"

برنیئر نے آخر میں لکھا ہے کہ اس ملک میں ایک عقلمند آدمی کے لیے بھی بہتر ہے کہ وہ خالص اور ٹھنڈا پانی پیئے یا لیموں کا بہترین شربت پیئے جو کم خرچ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی نہیں کرتا۔

اسلامی حکومت کا ہندوؤں پر بھی اثر پڑا۔ ان میں بت پرستی سے بیزاری پیدا ہوئی اور ایک خدا کو پوجنے کی تحریک نے زور پکڑا۔ بھگت کبیر اور گورونانک نے بت پرستی کو ختم کر کے ایک خدا کو پوجنے پر زور دیا۔ خود ہندوؤں میں شری شنکراچاری، دیانند جی اور رامانند نے بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس طرح اگرچہ اسلام نہیں پھیل سکا لیکن ہندوؤں کا ایک بہت بڑا طبقہ بت پرستی چھوڑ کر موّحد ہو گیا۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ اندلس سے جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو عیسائی حکومت نے وہاں لاکھوں مسلمانوں کو تلوار کے زور سے عیسائی بنا لیا۔ صقلیہ، تھریس اور فلپائن بھی عیسائی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا اور موجودہ دَور میں یہی سب کچھ روس میں ہو رہا ہے، لیکن مسلمانوں نے کہیں بھی کسی قوم یا جماعت کو جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ پاکستان اور بھارت میں بھی انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو پوری آزادی دی۔ ان کو سلطنت میں ملازمتیں اور عہدے دیئے۔ ان کو ان کے مذہبی رسم ورواج اور طور طریقوں پر چلنے کی پوری آزادی دی۔ وہ اپنے مذہب کی حمایت میں خوب آزادی سے لکھتے اور بحث کرتے تھے۔

ہندوؤں میں برہمنوں کے علاوہ دوسرے لوگ علم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسلامی حکومت نے علم پر سے برہمنوں کی اس اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ سکندر لودھی کے زمانہ کے بعد سے کائستھ اور چھتریوں نے سرکاری سرپرستی میں فارسی سیکھی اور پھر علم میں ایسی ترقی کی کہ ہندوؤں میں فارسی کے بہترین ادیب، شاعر اور مصنف پیدا ہونے لگے۔ ہندوؤں میں تاریخ لکھنے کا بالکل رواج نہ تھا، لیکن اسلامی دَور میں انہوں نے تاریخ لکھنا بھی شروع کر دی۔

تمدنی ترقی

مسلمانوں نے تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی ملک کو بڑی ترقی دی۔ اس ترقی میں سب سے بڑا حصہ مغلوں کا ہے۔ مغلوں کی آمد پر ہندوستان کی جو حالت تھی اور ہندوؤں کی جو تہذیب تھی اس کا ذکر بابر نے اپنی توزک میں اس طرح کیا ہے:

''ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں ہوتے، اچھا گوشت نہیں ملتا۔ انگور نہیں، خربوزہ نہیں، برف نہیں، ٹھنڈا پانی نہیں، حمام نہیں، مدرسے نہیں، شمعدان نہیں، شمع کی بجائے ڈیوٹ ہوتا ہے۔ باغوں اور عمارتوں میں نہ صفائی ہے اور نہ موزونی، نہ ہوا نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں ایک لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں۔ عورتیں دھوتی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں''

کشمیر کے بادشاہ زین العابدین نے وادیٔ کشمیر میں ایران اور ترکستان کے پھل پھول

اور وہاں کی صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے جو کوششیں کی تھیں ان کا حال ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس طرح پاکستان اور بھارت میں فیروز تغلق نے جو سینکڑوں باغ لگوائے ان کا حال بھی گذر چکا ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں یہ شوق اور بھی بڑھ گیا۔ وہ تو بس باغ لگانے کے لیے بہانہ ہی ڈھونڈتے تھے۔ اگر کوئی فتح حاصل ہوئی تو اس کی یاد میں باغ لگا دیا، کسی کی وفات ہوئی تو مقبرہ کو باغ اور نہروں سے سجا دیا۔ نیا شہر بستا تھا تو ہر امیر اپنا باغ الگ بنواتا تھا۔ اکثر شہر تو باغوں کے شہر کہلاتے تھے۔ پھر یہ باغ آج کل کے باغوں کی طرح محض پھولوں اور سایہ دار درختوں کے باغ نہ ہوتے تھے بلکہ پھلوں کے باغ ہوتے تھے، جس سے ہر غریب فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اکبر نے پٹنہ میں آموں کا جو باغ لگوایا اس میں ایک لاکھ درخت تھے۔ اس طرح دکن کے نظام شاہی بادشاہوں کے ایک وزیر نے آم اور کھرنی کے پانچ لاکھ درخت لگوائے۔ سڑکوں کے اوپر بھی پھل دار ہی درخت لگائے جاتے تھے تاکہ مسافر ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کریں اور پھل مفت میں کھائیں۔

آم مشرقی پاکستان اور بھارت کا خاص پھل ہے۔ مغربی پاکستان میں یہ پھل نہیں ہوتا تھا۔ اکبر نے پنجاب کے علاقے میں آم کے باغ لگوائے جس کے بعد سے مغربی پاکستان میں بھی یہ لذیذ پھل پیدا ہونے لگا۔

اکبر کے زمانہ میں کشمیر کے باغوں کا ایک داروغہ محمد علی افشار تھا۔ اس نے خوبانی اور شاہ آلو کی قلمیں کابل سے منگوا کر کشمیر میں لگوائیں۔ اس میں خوبانی تو اتنی پھلی کہ آج جب خوبانی کا نام آتا ہے تو ساتھ ہی کشمیر کا نام بھی آ جاتا ہے۔

اکبر اور اس کے مشہور صوبہ دار عبدالرحیم خانِ خاناں نے انگور، انجیر، خربوزہ، سنترہ، انار، شفتالو، بادام اور پستہ وغیرہ کے بیج اور پودے ایران اور ترکستان سے منگوا کر یہاں لگوائے اور اس طرح یہ تمام چیزیں بہترین قسم کی برکوچک میں پیدا ہونے لگیں۔ جہانگیر کے زمانہ میں یورپ سے اناس آیا اور اب مشرقی پاکستان میں اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے جیسے وہاں کی اصل پیداوار ہو۔ اسی زمانہ میں پھلوں کے درختوں میں قلم اور پیوند لگانے کے طرح طرح کے طریقے نکالے گئے جس سے اچھی قسم کے قلمی اور پیوندی آم اور دوسرے پھل پیدا ہونے لگے۔ ہندوستان میں پہلے صرف تخمی آم ہوتا تھا، اورنگ زیب کے زمانہ میں اس میں قلم لگا کر قلمی آم پیدا کیا گیا۔ مغلوں کے زمانہ میں گھوڑوں اور اونٹوں کی بھی اچھی نسلیں پیدا کی گئیں۔ عراق، عرب، روم، ترکستان اور

تبت سے گھوڑے منگوا کر اس ملک میں ان کی نئی نسلیں تیار کی گئیں۔ اس طرح یہاں عمدہ گھوڑے ہونے لگے۔ آج کل مغربی پاکستان میں برکوچک کے سب سے اچھے گھوڑے ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں لباس کو بھی ترقی ہوئی۔ دھوتی اور ساری کی جگہ پاجامہ، دستار، کلاہ اور شیروانی کا مردوں میں اور شلوار، غرارہ، قمیص اور دوپٹہ کا عورتوں میں رواج ہوا۔ اس طرح اس خطہ میں ایسے لباس تیار ہو گئے جو خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور جن میں ننگا پن بھی نہیں ہوتا ہے۔

موزوں اور سلیم شاہی اور دوسرے قسم کے جوتوں کا استعمال بھی مسلمانوں کے ہی زمانہ میں شروع ہوا ورنہ اس سے پہلے ہندو یا تو ننگے پاؤں پھرتے تھے یا بدنما قسم کے جوتے پہنتے تھے۔

ہندوؤں کے زمانہ میں عورتوں کے زیور بھاری بھاری، بڑے بھدے قسم کے ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے سر، کان، ناک، گلے، ہاتھ اور پاؤں کے بے شمار ہلکے اور خوبصورت زیور ایجاد کیے جو آج تک استعمال میں آتے ہیں۔

ہندوؤں کے زمانہ میں زیادہ تر دال چاول اور ترکاری کھانوں میں استعمال ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے پلاؤ، زردہ، قورمہ، بریانی اور طرح طرح کے لذیذ کھانے ایجاد کیے۔ ہندوؤں کے یہاں ہر شخص الگ الگ تھال میں یا پتوں پر کھانا کھاتا تھا، مسلمانوں نے ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانے کا رواج دیا۔ ہاتھ دھونے کے لیے لوٹے اور آفتابے کا رواج شروع ہوا۔

ہندو گوبر سے گھروں کو لیپتے تھے۔ مسلمانوں نے فرش، فرنیچر اور شیشے کے آلات کو رواج دیا۔

ہندوستان کے قدیم مکانوں کی چھت نیچی ہوتی تھی اور صحن نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے روشنی اور ہوا نہیں آتی تھی، مسلمانوں نے اونچے دروازوں بڑے بڑے دالانوں اور شہ نشینوں کو رواج دیا۔ ایسے مکان بنائے جن میں ہوا اور روشنی اچھی طرح آتی تھی۔ مکانوں میں مردانہ حصے علیحدہ اور زنانہ حصے علیحدہ کیے۔ بارہ دری، خانہ، باغ، حوض، فوارے، چمن، مسلمانوں ہی نے شروع کیے۔ لاہور اور کشمیر کے شالا باغ اور نشاط باغ کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغلوں کے بعد ہمارے ملک میں کیسے کیسے خوبصورت باغ بننا شروع ہو گئے تھے۔

صنعت وحرفت

مسلمانوں نے صنعت وحرفت کو بھی بڑی ترقی دی۔ کاغذ مسلمانوں سے پہلے نہ پاکستان

میں تیار ہوتا تھا اور نہ ہندوستان میں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں کاغذ سازی کی صنعت شروع کی جس کی وجہ سے علوم وفنون کو بڑی ترقی ہوئی اور کتابیں کثرت سے لکھی اور چھاپی جانے لگیں۔ کشمیر، گجرات، دولت آباد کاغذ سازی کے بڑے مرکز تھے۔ یہ کاغذ عرب، شام اور ایشیائے کوچک تک جاتا تھا۔ کاغذ کے علاوہ چمڑے کو رنگنے اور شکر بنانے کی صنعت کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے اگرچہ قدیم زمانہ سے ہندوستان میں بنتے تھے، لیکن مسلمانوں نے اس صنعت کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ سمرقند اور ایران سے کاریگر بلوا کر کپڑوں کی نئی صنعتیں شروع کیں۔ دہلی، آگرہ، لاہور، سری نگر، احمد آباد، اورنگ آباد اور ڈھاکہ صنعت پارچہ بانی کے بڑے مرکز بن گئے۔ بیس سے زیادہ قسم کے سوتی اور چوبیس سے زیادہ قسم کے ریشمی کپڑوں کے ایک ہزار کارخانے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں ڈھاکہ کی مشہور ململ تیار ہونے لگی جو اتنی نرم اور باریک ہوتی تھی کہ پورا ایک تھان انگوٹھی کے اندر سے نکل جاتا تھا اورنگ زیب کے عہد میں ایک انگریز سیاح، ہیملٹن تجارت کے سلسلہ میں کئی برس بّرِ کوچک میں رہا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

''ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا بکثرت ملتا ہے، جس کی مثال یورپ میں ملنی دشوار ہے۔ یہاں روئی کا کپڑا نہایت باریک اور بہت ملائم ہوتا ہے اور اس قدر پائدار ہوتا ہے کہ مَیں نے اپنی زندگی میں کبھی استعمال نہیں کیا''

بنگال کے ریشمی کپڑے کشمیر اور لاہور کے شال اور اونی کپڑے اور ٹھٹھہ کے سوتی کپڑے ساری دنیا میں مشہور تھے اور یورپ سے جاپان تک جاتے تھے۔ یہ کپڑے جب ولایت پہنچے تو عورتوں اور بچیوں نے اپنے ہاں کا کپڑا پہننا چھوڑ دیا۔ ہندوستان کے کپڑوں نے بازار میں وہ رنگ جمایا کہ ولایت کے کپڑے ماند پڑ گئے۔ مانچسٹر کے کارخانوں نے بہت کچھ ان چھینٹوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر ان کے رنگ کا نکھار۔ ان کے بیل بوٹوں کا حسن کہاں سے لاتے۔ آخر کار مجبور ہو گئے۔ بال آخر حکومت نے ان کی مدد کی اور ایک قانون بنا دیا گیا کہ آج سے ولایت کا کوئی باشندہ پاکستان اور ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا۔

مسلمانوں نے چینی کی صنعت بھی شروع کی۔ چینی کے برتن طشتری، گلدان ایسے اچھے اچھے تیار ہوتے تھے کہ جن کی مثال نہیں تھی۔ یہ کام کاش گری کا کام کہلاتا تھا۔ ملتان اور سندھ میں تو یہ برتن بہت خوبصورت بنتے تھے۔ یہ کام اب بھی ہوتا ہے لیکن قدردانی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا

زوال ہو گیا۔

۱۸۷۱ء میں یورپ میں ایک نمائش ہوئی تھی۔ اس میں ایک جگہ سندھ کے پرانے چینی کے برتن لگے ہوئے تھے۔ وہاں اتفاقاً ایک انگریز شوقین بھی جا نکلا۔ یہ برتن جو دیکھے تو وہیں کا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ دل میں کہنے لگا: "ارے۔ ہمارے لوگ جو ہندوستان سے گھر واپس آتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں خوبصورت چیزوں کے بنانے اور رکھنے کا شوق نہیں۔ پھر بھلا اتنی اچھی چیزیں ان کے ہاں کیسے بن سکیں" وہ لکھتا ہے:

"یورپ کے نقاشوں اور کارخانہ داروں کو ان چیزوں کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کرنا چاہیے۔ رنگوں کے میل اور نقش بنانے کے کام میں ہم ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور بھلا ہم مغربی لوگ جو ہندوستان میں اپنی طرف سے آرٹ اسکول قائم کر رہے ہیں اس میں کیا دانائی ہے۔ میری رائے میں اس ملک کے پس ماندہ ضلعے اور گوشے بھی ہمارے لیے اچھے خاصے آرٹ اسکول کا کام دے سکتے ہیں۔ جہاں ہم بجائے سکھانے کے بہت کچھ ان لوگوں سے گر سیکھ سکتے ہیں"

مسلمانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے آرٹ اور فن کا اظہار خوبصورت نقش و نگار، بیل بوٹے پھولوں اور حسین مناظر وغیرہ کے ذریعے کرتے تھے۔ ننگی اور عریاں تصویریں اور بے حیائی کے مناظر یورپ کی وجہ سے آرٹ میں عام ہو گئے ہیں، ہمارے فنکار اس سے کوسوں دور تھے۔

ارزانی

صنعت و حرفت کی ترقی، زراعت کی ترقی، امن و امان اور عدل و انصاف کی وجہ سے جن کا حال پیچھے گذر چکا ہے پاکستان اور ہندوستان میں عہد اسلامی میں ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی تھی۔ ملک میں ضرورت کی ہر چیز افراط سے ہوتی تھی۔ یہاں کی پیداوار اور مصنوعات دوسرے ملکوں کو جاتی تھیں اور باہر کے لوگ سونے کی شکل میں معاوضہ دیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ یہ خطہ "سونے کی چڑیا" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں بعض چیزوں کی قیمتوں سے اندازہ لگایئے کہ کتنی ارزانی تھی:

گائے کا گوشت .... چھ فاردنگ کا ایک سیر

نمک .... ساڑھے تین روپے کا ایک ٹن

مچھلی .... تین آنے میں دس سیر

مکھن .... دو آنے سیر

بنگال میں اورنگ زیب کے گورنر شائستہ خاں کے آخر زمانہ میں چاول کسی قدر مہنگا ہو گیا تھا تو اس کو اس کی اتنی فکر ہوئی کہ جب وہ ڈھاکہ سے دہلی روانہ ہونے لگا تو حکم دے دیا گیا کہ وہ دروازہ جس سے میں جا رہا ہوں اس وقت تک نہ کھولا جائے، جب تک چاول سستا نہ ہو جائے۔

اس کے باوجود صوبہ میں چاول کی وہ ارزانی تھی کہ ایک یورپی سیاح لکھتا ہے:

''شہر ڈھاکہ میں ضرورت کی چیزیں اس کثرت سے اور اس قدر سستی ملتی ہیں کہ اس وقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ موسم سرما میں چاول ایک روپیہ میں ۵۸۰ پونڈ (یعنی سات من' دس سیر) ملتا ہے''

پاکستان اور ہندوستان اپنی خوشحالی اور ترقی کے عروج پر تیموریوں کے زمانہ میں پہنچے۔ اس زمانہ میں یہ خطہ تہذیب و تمدن میں ساری دنیا سے بڑھ گیا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں دنیا کا کوئی ملک بھی اس لحاظ سے اسلامی ہند کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں جیسی خوبصورت عمارتیں بنوائی گئیں جس کثرت سے باغ لگوائے گئے، یہاں زراعت اور صنعت و حرفت کو جیسی ترقی ہوئی، جس کثرت سے لوگوں کو تعلیم دی گئی، یہاں جیسا امن و امان تھا، جیسے بڑے بڑے شہر تھے، عدل و انصاف تھا اس کی مثال اس زمانہ کی ساری دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

(تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۲۸)

باب ۲۵

مراکش کے حسنی شُرفاء

(۱۵۴۴ء/۹۵۱ھ تا ۱۷۲۷ء/۱۱۳۹ھ)

سولھویں صدی کی ابتداء میں جب بنی مرین کی حکومت کا شیرازہ بکھرا، تو مراکش مختلف حکومتوں میں تقسیم ہوگیا اور آخری مرینی حکمراں کی عملداری شہر فاس تک محدود ہوکر رہ گئی۔ ساحل کے بہترین حصوں پر پرتگالی قابض ہوگئے تھے۔ مسلمانوں میں انتشار اور طوائف الملوکی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب اہل مراکش پرتگالیوں سے صلح کے لیے کہتے تو وہ طنزاً جواب دیتے کہ تمہارا سردار کونسا ہے جس سے ہم گفتگو کریں۔

(۱) سعدی خاندان

(۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ تا ۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ)

ملک کی یہ حالت دیکھ کر جنوبی مراکش کے علماء اور امراء نے غور و فکر کے بعد ضلع درعہ کے ایک شخص شریف محمد کے ہاتھ پر بیعت کرلی جو امام حسن کی اولاد میں تھا اور جس کے زہد و پرہیزگاری کی دُور دُور شہرت تھی۔ اس طرح ۱۵۱۱ء میں مراکش میں شریفی خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑی جس کو سعدی خاندان بھی کہا جاتا ہے۔

ابوعبداللہ محمد نے، جس نے بعد میں القائم کا لقب اختیار کیا، کفار کے مقابلے میں جہاد کا اعلان کیا اور بیس سال تک جنگ جاری رکھی اور پرتگالیوں کے مقابلے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ القائم کے بعد اس کا بڑا لڑکا احمد جانشین ہوا۔ القائم کے زمانے میں اس کے دونوں بیٹے احمد اور محمد الشیخ مل کر کام کرتے تھے، لیکن اب دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوگئی۔ محمد الشیخ غالب آیا اور احمد کو نظر بند کردیا گیا۔

محمد الشیخ (۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ تا ۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ) نے پرتگالیوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی۔ ۱۵۴۱ء میں اناد یر ۱۹۴۲ء میں آزیمور کے اہم مقامات پرتگالیوں سے واپس لے

لیے۔اس نے ۱۵۴۸ء میں مکناس اور ۱۵۵۰ء میں فاس پر قبضہ کر کے بنو مرین کی وطاسی شاخ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔اس طرح محمد الشیخ پورے مراکش کا حکمران ہو گیا۔

محمد الشیخ کے زمانے میں اہل مراکش کا پہلی مرتبہ ترکوں سے تصادم ہوا۔اس زمانے میں عثمانی ترک پورے الجزائر پر تلمسان تک قابض ہو چکے تھے۔وطاسی حکمران سلطان ابی حسون نے ترکوں کے پاس پناہ حاصل کر لی۔اس بات پر مشتعل ہو کر محمد الشیخ نے ۱۵۵۱ء میں تلمسان پر حملہ کر دیا۔اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ترکوں نے جوابی کارروائی کر کے ۱۵۵۴ء میں فاس فتح کر لیا اور ابی حسون کو سلطان بنا کر واپس چلے گئے۔ترکوں کی واپسی پر محمد الشیخ نے فاس پھر واپس لے لیا۔

محمد الشیخ کے جانشین سلطان محمد عبداللہ غالب (۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ تا ۱۵۷۴ء/۹۸۱ھ) کا دور اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس نے مراکش میں ایک جامع مسجد، ایک عالی شان شفاخانہ ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک ذخیرۂ آب تعمیر کر دیا۔

غالب کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد متوکل باللہ تخت نشین ہوا۔ابھی اس نے دو سال ہی حکومت کی تھی کہ اس کے چچا عبدالملک نے ترکوں کی مدد سے فاس اور مراکش پر قبضہ کر کے متوکل کو بے دخل کر دیا۔متوکل نے شکست کھا کر پرتگال میں پناہ لی اور پرتگال کے بادشاہ سے اس شرط پر مدد حاصل کی کہ وہ کامیابی کے بعد تمام ساحلی علاقہ پرتگالیوں کو دے دیگا۔پرتگالیوں نے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھایا۔انہوں نے اس لڑائی کو صلیبی جنگ کی شکل دے دی اور سارے یورپ نے اس مہم میں پرتگال کی مدد کی اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل مسیحی لشکر تیار کیا گیا جس میں پرتگالیوں اور رضا کاروں کے علاوہ بیس ہزار ہسپانوی، تین ہزار اطالوی اور تین ہزار جرمن بھی شامل تھے۔پاپائے روم نے بھی چار ہزار پیدل سپاہیوں، ڈیڑھ ہزار سواروں اور بارہ توپوں کی امداد فراہم کی۔مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار تھی اور ان کے پاس کل ۳۴ توپیں تھیں۔مسیحی فوجیں طنجہ پر اتریں اور فاس کے قریب تک پہنچ گئیں۔۴۔اگست ۱۵۷۸ء کو قصر الکبیر کے پاس فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی۔ان کے ۲۶۔ہزار آدمی جن میں تین ہزار جرمن، دو ہزار ہسپانوی اور سات سو اطالوی شامل تھے، جنگ میں مارے گئے، لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنگ میں شاہ پرتگال، متوکل اور عبدالملک بھی کام آئے۔اس کی وجہ سے اس لڑائی کو تین بادشاہوں کی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔پرتگالی اپنے ساتھ

عورتوں، بچوں، شاہانہ ساز وسامان اور سواری کی گاڑیوں کو بھی لائے تھے، تاکہ دارالحکومت فاس میں ایک فاتحانہ جلوس کی شکل میں داخل ہوں، لیکن ان کی آرزو پوری نہ ہوئی اور انہوں نے تمام ساز وسامان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔ قصر الکبیر کی یہ جنگ مغربی بحر روم کے علاقے میں آخری صلیبی جنگ تھی۔

منصور ذہبی

عبدالملک کے بعد اس کا بھائی احمد تخت نشین ہوا جو تاریخ میں منصور ذہبی (۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ھ تا ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ منصور ذہبی کے دَور کا آغاز بڑی مبارک ساعت میں ہوا تھا، اس لیے اس نے عثمانی سلطان اور ہمسایہ مسیحی حکومتوں کو القصر کی فتح اور اپنی تخت نشینی کی اطلاع خاص سفیروں کے ذریعے بھجوائی، جس کے جواب میں پہلے الجزائر کے ترک گورنر، پرتگال، ہسپانیہ اور آخر میں سلطان مراد عثمانی کے سفیر تحفے اور مبارک باد کے پیغامات لے کر آئے۔ سب سے آخر میں فرانس کی سفارت آئی۔ قصر الکبیر کی فتح نے مراکش کی ساری دنیا میں شہرت کر دی اور اس کو ایک بڑی طاقت تسلیم کر لیا گیا۔

شریف ابوالعباس احمد منصور ذہبی بلا شک وشبہ سعدی خاندان کا سب سے ممتاز حکمران ہے۔ شمال کے حملوں سے محفوظ ہو جانے کے بعد اس نے جنوب کا رُخ کیا۔ ارض سوڈان یا دریائے نائیجر کی وسطی وادی میں صونغائی خاندان کا آخری حکمران اسحٰق برسرِ اقتدار تھا۔ یہ علاقہ صدیوں سے سونے کی پیداوار کی وجہ سے مشہور چلا آ رہا تھا۔ منصور سونے کی ان کانوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوج مع توپ خانے کے جوذر پاشا کی قیادت میں روانہ کی جس نے ۱۵۹۱ء میں اسحٰق کو شکست دے کر ٹمبکٹو اور گاؤ پر قبضہ کر لیا اور مملکت مالی کو سلطنت مراکش کا ایک حصہ بنا لیا۔ سوڈان کی تسخیر کے بعد مراکش میں سونے کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ اس کا حساب رکھنا مشکل ہو گیا۔ زیورات بنانے والوں کے علاوہ صرف اشرفیاں بنانے کا کام چودہ سو سنار انجام دیتے تھے۔ سونے کی اسی نسبت سے منصور نے ''ذہبی'' کے لقب سے شہرت پائی۔

کہا جاتا ہے کہ احمد منصور ذہبی آخر میں اندلس پر لشکر کشی کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

منصور ذہبی کے زمانہ میں اہل مراکش نے پہلی مرتبہ ہاتھی دیکھا اور تمباکو سے واقف ہوئے۔ یہ دونوں چیزیں سوڈان سے آئی تھیں۔

منصور دہلی کے اکبر اعظم اور ایران کے عباس اعظم کا ہمعصر تھا اور اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود انتظامی صلاحیتوں میں ان کا ہم پلہ تھا۔ اس کا دَور امن و خوشحالی کا دَور تھا۔ عثمانی ترکوں سے اس نے قریبی تعلقات قائم کیے اور ان کی مدد سے جدید طرز کی فوج منظم کی جو بندوق اور توپ خانے سے مسلح تھی۔ اس کے بڑے بڑے فوجی افسر ترک تھے۔

منصور کو عمارتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے دَور میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں ان میں قصر البدیع سب سے ممتاز تھا، جو سترہ سال میں تعمیر ہوا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے سامنے قرطبہ کا قصر الزہرا بھی ماند پڑ گیا تھا۔ اس قصر کی تکمیل پر جب منصور نے جشن منعقد کیا تو مہمانوں میں ایک مجذوب بھی تھا۔ جب منصور نے قصر کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ ''جب یہ گرے گا تو مٹی کا عظیم الشان تودہ دکھائی دے گا'' اور یہی ہوا ۱۱۱۹ھ میں مراکش ہی کے ایک حکمران سلطان اسمٰعیل نے اس کو ڈھا دیا اور اس کا ملبہ اپنی عمارتوں میں استعمال کیا۔

منصور کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ دو کتابوں کا مصنف تھا اور اعلیٰ درجہ کا خطاط تھا۔ اس نے ایک لباس بھی ایجاد کیا تھا جو اس کے نام پر منصوریہ کہلاتا تھا۔

منصور ذہبی کے بعد سعدی خاندان کی حکومت نصف صدی اور قائم رہی، لیکن یہ دَور خانہ جنگیوں اور بدامنی کا دَور ہے۔ اہل ہسپانیہ نے اس صورت حال سے ایک بار پھر فائدہ اٹھایا اور مراکش کے کئی ساحلی مقامات پر قابض ہو گئے۔ ۱۶۶۶ء میں شرفائے مراکش کے ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص شریف رشید نے سعدی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی جو فلالی شریف یا علوی کہلاتا ہے اور آج تک مراکش میں برسر اقتدار ہے۔

(۲) فلالی شرفاء

(۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ تا ۱۷۲۷ء/۱۱۳۹ھ)

مراکش کے نئے حکمران خاندان فالی شرفا کے اجداد اور پچھلے خاندان سعدی شرفاء کے اجداد ایک ہی تھے۔ وہ سب حضرت حسنؓ کی اولاد میں ہیں اور حسنی سید ہیں، جن کو مراکش میں

شریف کہا جاتا ہے۔ فلالی شرفاء کو علوی بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کا پہلا حکمران مولائے شریف (۱۶۳۴ء تا ۱۶۴۱ء) ہے جس نے ۱۶۳۴ء میں مراکش کے جنوب میں تحلیماسہ کے علاقہ میں حکومت قائم کر کے اس کا نام تافیلات رکھا۔ شریف کے لڑکے محمد ۱۶۴۱ء تا ۱۶۶۴ء) نے حکومت کو مزید توسیع دی اور اس کے بعد اس کے بھائی مولائے رشید ۱۶۶۴ء تا ۱۶۷۲ء نے سعدیوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے پورے مراکش پر نئے خاندان کی حکومت مستحکم کر دی۔ مولائے رشید ایک رعایا پرور حکمران تھا۔ اس نے فاس اور مراکش میں مدرسے قائم کیے۔ آبپاشی کے لیے بند تعمیر کیا اور فاس کے باہر دریائے مسیوا پر چار محرابوں کا پختہ پُل بنایا۔ فلالی شرفاء کی حکومت کا حقیقی بانی مولائے رشید ہی ہے۔

مولائے اسمٰعیل

مولائے رشید کے بعد اس کا بھائی مولائے اسمٰعیل (۱۶۷۲ء تا ۱۷۲۷ء) تخت نشین ہوا۔ اسمٰعیل نے شروع میں اندرون ملک استحکام پیدا کیا اور تمام خودسر امیروں کا زور توڑ کر مرکزی حکومت کو مستحکم کیا۔ اس کے بعد اس نے ساحلی علاقوں کی طرف توجہ دی جہاں ہسپانوی، پرتگالی اور انگریز مختلف مقامات پر قابض تھے۔ ۱۶۸۱ء میں اسمٰعیل نے ہسپانویوں سے معمورہ واپس لے لیا، ۱۶۸۴ء میں انگریزوں کو طنجہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور ۱۶۸۹ء میں العرائش بھی فتح کر لیا۔ ۱۶۹۱ء تک سوائے سبتہ کے مراکش کا پورا ساحلی علاقہ بیرونی تسلط سے آزاد کرا لیا۔ اب اسمٰعیل طنجہ سے دریائے سینیگال اور دریائے نائیجر تک سارے شمال مغربی افریقہ کا بلا شرکت غیرے مالک ہو گیا۔ اس نے اپنی سلطنت میں ایسا امن قائم کیا کہ بقول مؤرخین ایک بوڑھی عورت سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سونا اچھالتی جا سکتی تھی اور اس کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مولائے اسمٰعیل نے افریقی غلاموں پر مشتمل ایک فوج تیار کی تھی جس کا نام عبید البخاری تھا۔ احادیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری چونکہ اس لشکر کے ساتھ رہتی تھی اس لیے اس کا نام عبید البخاری یعنی بخاری کے غلام رکھا گیا۔ اسمٰعیل کی قوت کا انحصار اسی لشکر پر تھا۔ اس نے یورپی نومسلموں پر مشتمل کئی فوجی دستے بھی تیار کیے تھے۔ اس کی کل فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔

مولائے اسمٰعیل نہ صرف تاریخ مراکش بلکہ اپنے زمانے کے طاقتور ترین حکمرانوں میں

سے تھا۔ یورپ کی حکومتوں نے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ انگلستان، فرانس اور ہسپانیہ نے اپنے سفیر دربار مراکش میں بھیجے۔ اسمٰعیل ہسپانیہ کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اس پر مرد نہیں عورتیں حکومت کر رہی ہیں۔ شاہ انگلستان کو وہ پارلیمنٹ کا غلام کہا کرتا تھا۔ وہ یورپ کے حکمرانوں میں صرف فرانس کے لوئی چہاردہم کو ایک ایسا حکمران سمجھتا تھا جو صحیح معنوں میں بادشاہ کے لقب کا مستحق ہے۔ اس سے اسمٰعیل کے قریبی تعلقات تھے۔

مولائے اسمٰعیل اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک ظالم اور جابر حکمران تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی بیس سال میں بیس ہزار آدمیوں کو قتل کرایا۔ اگرچہ اس پر ظلم و جبر کے الزامات زیادہ تر یوروپی مورخین نے لگائے ہیں جن میں مبالغہ ہوسکتا ہے، لیکن وہ بالکل بے بنیاد بھی نہیں۔ حقیقت میں اسمٰعیل، حجاج بن یوسف کی طرح متضاد شخصیت کا مالک تھا۔ اس تمام ظلم و جبر کے باوجود مورخین متفق ہیں کہ اس کے دور میں مراکش میں بے مثل امن وامان تھا اور ملک اپنی خوشحالی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

مولائے اسمٰعیل کو شاندار عمارتیں اور باغات بنانے کا شوق خبط کی حد تک تھا۔ اس کی تعمیر کی ہوئی عمارتیں اگرچہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن سب سے زیادہ مکناس میں موجود ہیں۔ مولائے رشید نے فاس کو دارالحکومت قرار دیا تھا، لیکن مولائے اسمٰعیل نے دارالحکومت مکناس منتقل کر دیا۔ اس کی مشہور عمارتوں میں ایک مکناس کی جامع الاخضر ہے۔ لیکن مکناس کا قصر شاہی جس کی تعمیر میں بیس ہزار مزدور روزانہ مصروف رہتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ گھوڑوں کے اصطبل ڈھائی میل میں پھیلے ہوئے تھے اور ان میں بارہ ہزار گھوڑے بندھے رہتے تھے اور مکناس کے گرد اس نے جو فصیل تعمیر کی اس کی لمبائی پچیس میل تھی۔ اس کی بنائی ہوئی عمارتوں کی تعداد چھیاسٹھ سے زیادہ ہے۔ ان میں مدرسے، مسجدیں، حمام، مسافر خانے، باغات اور محل سب شامل ہیں۔ اس نے ایک باغ کی آمدنی جس میں زیتون کے ایک لاکھ درخت تھے، حرمین شریفین کے لیے وقف کر دی تھی۔

مولائے اسمٰعیل نے کل ۵۵ سال حکومت کی۔ وہ مراکش کا آخری طاقتور حکمران تھا۔ دہلی کے مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا ہمعصر تھا۔ مولائے اسمٰعیل اگرچہ انتظامی صلاحیت اور تدبیر میں اپنے اس ہمعصر سے کم نہیں تھا، لیکن رعایا پروری، عدل و انصاف اور کردار کی بلندی میں

اورنگ زیب کے ہم پلہ نہیں تھا۔

مولائے اسمٰعیل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں یورو پی قوتوں کے خلاف فوجی کامیابیاں حاصل کیں جب کہ اس زمانے میں ترکوں کو ان کے مقابلے میں ناکامیاں ہوئیں اور ہنگری ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مشرق بعید میں بھی ولندیزی اور پرتگالی، انڈونیشی مسلمانوں کے مقابلے میں مسلسل کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ اگر ہم اسلامی ہند اور ایران کو شامل نہ کریں جن کا ابھی تک مغربی قوموں سے فوجی تصادم نہیں ہوا تھا، تو اسلامی دنیا میں صرف مراکش ایسا ملک تھا جس نے پرتگالیوں، اہل ہسپانیہ اور انگریزوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کیں۔

مولائے اسمٰعیل کے بعد اگرچہ کئی باصلاحیت حکمران مراکش کے تخت پر بیٹھے، لیکن مراکش اس شان وشوکت اور عظمت کو دوبارہ حاصل نہ کر سکا، جو مولائے اسمٰعیل کے زمانے میں اس کو حاصل تھی۔ اب مراکش ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

(تسلسل کے لیے ملاحظہ کیجیے باب۔ ۳۴(۴) المغرب)

سعدی یا حسنی شریف

(۱۵۴۴ء/۹۵۱ھ تا ۱۶۵۸ء/۱۰۶۹ھ)

(۱) محمد الشیخ اول المہدی	۱۵۴۴ء/۹۵۱ھ تا ۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ
(۲) عبداللہ	۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ تا ۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ
(۳) محمد دوم المتوکل	۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ تا ۱۵۷۵ء/۹۸۳ھ
(۴) ابومروان عبدالملک	۱۵۷۵ء/۹۸۳ھ تا ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ
(۵) احمد المنصور ذہبی	۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ تا ۱۶۰۳ء/۱۰۱۲ھ
(۶) ابوفارس	۱۶۰۳ء/۱۰۱۲ھ تا ۱۶۰۸ء/۱۰۱۶ھ
(۷) زیدان	۱۶۰۸ء/۱۰۱۲ھ تا ۱۶۲۸ء/۱۰۳۸ھ

۱۶۰۸ء/۱۰۱۶ھ تک ابوفارس شریک حکومت رہا۔ اس کے بعد زیدان تنہا حکومت کرنے لگا۔

(۸) ابومروان عبدالملک دوم	۱۶۲۸ء/۱۰۳۸ھ تا ۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ

(۹) ولید	۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ تا ۱۶۳۵ء/۱۰۴۵ھ
(۱۰) محمد سوم	۱۶۳۵ء/۱۰۴۵ھ تا ۱۶۵۴ء/۱۰۶۴ھ
(۱۱) احمد دوم	۱۶۵۴ء/۱۰۶۴ھ تا ۱۶۵۸ء/۱۰۶۹ھ

۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ میں سعدی شرفاء کے خاندان کی حکومت بالکل ختم ہوگئی۔

(۲) فلالی یا علوی شریف

(۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ تا حال)

(۱) مولائے رشید بن شریف	۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ تا ۱۶۷۲ء/۱۰۸۳ھ
(۲) مولائے اسمٰعیل	۱۶۷۲ء/۱۰۸۳ھ تا ۱۷۲۷ء/۱۱۳۹ھ
(۳) مولائے احمد	۱۷۲۷ء/۱۱۳۹ھ تا ۱۷۲۹ء/۱۱۴۱ھ
(۴) مولائے عبداللہ	۱۷۲۹ء/۱۱۴۱ھ تا ۱۷۵۷ء/۱۱۷۱ھ
(۵) مولائے محمد اول	۱۷۵۷ء/۱۱۷۱ھ تا ۱۷۸۹ء/۱۲۰۴ھ
(۶) مولائے یزید	۱۷۸۹ء/۱۲۰۴ھ تا ۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ
(۷) مولائے ہشام	۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ تا ۱۷۹۵ء/۱۲۰۹ھ
(۸) مولائے سلیمان	۱۷۹۵ء/۱۲۰۹ھ تا ۱۸۲۲ء/۱۲۳۸ھ
(۹) مولائے عبدالرحمن	۱۸۲۲ء/۱۲۳۸ھ تا ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ
(۱۰) مولائے محمد دوم	۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ تا ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ
(۱۱) مولائے حسن اول	۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ تا ۱۸۹۴ء
(۱۲) مولائے عبدالعزیز	۱۸۹۴ء/تا ۱۹۰۸ء
(۱۳) مولائے عبدالحفیظ	۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء
(۱۴) مولائے یوسف	۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۷ء
(۱۵) سلطان محمد خامس	۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۱ء
(۱۶) شاہ حسن ابن محمد خامس	۱۹۶۱ء تا

باب ۲۶

مشرق بعید میں مسلمانوں کی بالادستی کا آخری دَور

مشرق بعید سے متعلق باب دہم میں ہم جزیرہ نمائے ملایا اور جزائر شرق الہند میں اسلام کی آمد، اس کی توسیع اور اشاعت اور ساترا کی مملکت سمدر پسائے اور ملایا کی سلطنت ملکا کے حالات پڑھ چکے ہیں، جو اس خطے میں مسلمانوں کی پہلی حکومتیں تھیں۔ ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ جاوا اور دوسرے جزیروں میں اسلام کی اشاعت ساترا اور ملایا کے بعد ہوئی۔ شرق الہند کے ان جزیروں میں رقبہ کے لحاظ سے اگرچہ ساترا اور کلیمنتان (بورنیو) سب سے بڑے ہیں، لیکن آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا جزیرہ جاوا ہے۔ مجاپہت کی ہندو سلطنت کا مرکز یہی جزیرہ تھا اور اسی سلطنت کے آخری دَور میں، یعنی پندرہویں صدی میں جاوا میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور سولہویں صدی میں یہاں مسلمانوں کی کئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں تین حکومتیں قابل ذکر ہیں۔: دیماک کی حکومت، بانتن کی حکومت اور ماترم کی حکومت۔

دیماک (۱۵۰۰ء تا ۱۵۷۸ء)

یہ جاوا کی پہلی اہم مسلم حکومت ہے۔ اس کا صدر مقام چونکہ دیماک کا شہر تھا، اس لیے اس کی نسبت سے دیماک کی حکومت کہلاتی ہے۔ اس کے بانی رادن پاتح تھے، جنہوں نے ۱۵۰۰ء سے ۱۵۱۸ء تک حکومت کی اور ۱۵۱۸ء میں انہوں نے مجاپہت کی ہندو مملکت کو ختم کر دیا۔ یہ حکومت ۱۵۷۸ء تک قائم رہی۔ اس کے تیسرے حکمران ترنگانا (TRENGANNAU) نے پہلی مرتبہ سلطان کا لقب اختیار کیا۔ مغربی جاوا میں ماترم اور سنڈا کلاپا کی ہندو حکومتوں کو اس نے فتح کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد دیماک کے شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور حکومت تقسیم ہوگئی۔ ایک حصہ کا مرکز دیماک تھا اور دوسرے کا پاجانگ۔ ۱۵۷۸ء میں دیماک میں بغاوت ہوگئی، جس کو سلطان پاجانگ نے اپنے ایک سپہ سالار سنو پاتی کو بھیج کر فرو کیا اور اس طرح دیماک پر سلطان پاجانگ کا قبضہ ہوگیا، لیکن سلطان پاجانگ خود بھی زیادہ مدت حکومت قائم نہ رکھ سکا۔ اس کی رعایا اس کے خلاف ہوگئی اور ۱۵۸۶ء میں اسے اپنے سپہ سالار سنو پاتی کے حق میں دست

بردار ہونا پڑا۔ ماترم کی مشہور سلطنت کا بانی یہی سنو پاتی ہے۔

بانتن کی ریاست (۱۵۲۶ء تا ۱۶۸۷ء)

اس ریاست کے بانی جاوا کے مشہور عالم اور بزرگ پاتح ہلا (۱۵۲۶ء تا ۱۵۵۲ء) ہیں۔ وہ سونان گننگ جاتی کے نام سے مشہور ہیں اور جاوا کے نو اولیاء اللہ میں شامل ہیں، جن کی کوششوں سے جاوا میں اسلام پھیلا۔ وہ دیماک کے سلطان ترنگانا کے بہنوئی تھے اور ترنگانا کے زمانے کی فتوحات میں ان کا ہاتھ نمایاں تھا۔ چیری بون، سنڈا کلاپا اور بانتن کی ہندو ریاستوں کو انہوں نے فتح کر کے مغربی جاوا میں ایک نئی مملکت کی بنیاد ڈالی، جو اپنے صدر مقام کے نام پر بانتن کہلاتی ہے۔ سنڈا کلاپا کا نام انہوں نے بدل کر جکارتا کر دیا۔ یہ وہی شہر ہے جو آج کل جمہوریہ انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔

پاتح ہلا ایک دیندار حکمران تھے۔ وہ ۱۵۵۲ء میں اپنے لڑکے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے اور خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا۔ اٹھارہ سال تک اشاعت اسلام میں مصروف رہنے کے بعد ان کا ۱۵۷۰ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کا مزار شہر چیری بون میں واقع ہے۔

پاتح ہلا کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا حسن الدین (۱۵۵۲ء تا ۱۵۷۰ء) بانتن کے سلطان ہوئے۔ ان کے زمانے میں مزید فتوحات ہوئیں، لیپونگ فتح ہوا۔ انہوں نے اسلامی احکام پر مبنی حکومت قائم کی اور ریاست میں مسجدیں، مدرسے، سرائے اور باغات تعمیر کیے۔ ان کے زمانے میں علماء کثرت سے بانتن آئے۔ وہ خود بھی عربی جانتے تھے۔ مولانا حسن الدین اپنے باپ کی طرح دیندار انسان تھے۔ چنانچہ ۱۵۷۰ء میں انہوں نے بھی تخت چھوڑ دیا اور باقی عمر تبلیغ اور اشاعت اسلام میں صرف کی۔

مولانا حسن الدین کے تخت چھوڑنے کے بعد ان کا لڑکا یوسف (۱۵۷۰ء تا ۱۵۸۰ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے دَور میں ۱۵۷۹ء مغربی جاوا کی آخری بدھ ریاست پکوان فتح کر لی گئی۔

سلطان یوسف کے لڑکے سلطان محمد (۱۵۸۰ء تا ۱۵۹۶ء) کے دَور کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۵۹۵ء میں ولندیزیوں نے بانتن پر پہلی مرتبہ حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ سلطان محمد نے بحری بیڑے کو بھی ترقی دی۔ سلطان محمد کے بعد بانتن کی ریاست کا زوال شروع ہو گیا۔ باہمی خانہ جنگی

اور امراء کی سرکشی کو دیکھ کر ولندیزیوں نے فائدہ اٹھایا اور ملکی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ ۱۶۱۹ء میں انہوں نے جکارتا کی جگہ بٹاویا کے نام سے ایک بستی آباد کی اور قلعہ تعمیر کیا۔ سلطان ابوالفتح آگنگ (۱۶۵۱ء تا ۱۶۸۲ء) نے بانتن کی کھوئی ہوئی عظمت بحال کرنے کی جدوجہد کی، لیکن سلطان اور ولی عہد کے درمیان اختلافات نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ ولندیزیوں نے ولی عہد کی حمایت کی اور سلطان کو شکست ہوئی اور بانتن کی ریاست ولندیزیوں کے زیر اثر آ گئی۔ ۱۶۸۷ء میں بانتن پر ان کا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔

ماترم (۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۵ء)

جاوا میں مسلمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سب سے بڑی باعظمت ماترم کی ریاست تھی۔ اس کا بانی سلطان پاجانگ پنگیران بونو کا سپہ سالار سنوپاتی (۱۵۸۶ء تا ۱۶۰۱ء) ہے۔ یہ وہی سنوپاتی ہے جس نے ۱۵۷۸ء میں دیماک کی بغاوت فرو کر کے دیماک کی ریاست کا خاتمہ کیا تھا۔ عوام اس کے فوجی کارناموں کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس لیے جب لوگ سلطان پاجانگ کے خلاف ہو گئے، تو سلطان اپنے اس لائق سپہ سالار کے حق میں ۱۵۸۶ء میں تخت سے دست بردار ہو گیا۔ سنوپاتی نے پاجانگ کی بجائے ماترم کو دارالحکومت قرار دیا اور اس طرح ماترم کی ریاست کی بنیاد پڑی۔

سنوپاتی بڑا کامیاب سپہ سالار تھا۔ اس نے مغرب میں چیری بون سے لے کر پالسبانکن تک کا علاقہ فتح کر لیا، جو کبھی ریاست بانتن کا حصہ تھا۔ جنوب میں اس کی سلطنت کیدیری تک پہنچ گئی۔ مشرق میں اس نے جزیرہ مدورا فتح کر لیا۔

سلطان آگنگ

ماترم کا سب سے بڑا حکمران سلطان آگنگ (۱۶۱۳ء تا ۱۶۴۵ء) ہوا ہے۔ اسی نام کا ایک حکمران بانتن میں بھی ہوا ہے۔ ماترم کا سلطان آگنگ سنوپاتی کا بڑا لڑکا تھا اور اس کا بانتن سے کوئی تعلق نہیں۔ ماترم کے حکمرانوں میں سب سے پہلے سلطان کا لقب اسی آگنگ نے اختیار کیا۔ آگنگ کے علاوہ اس کو سلطان رایا بھی کہا جاتا ہے۔ آگنگ کے معنی اعظم اور رایا کے معنی رعب داب والا ہے۔

جاوا میں اب بھی کئی ہندو ریاستیں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ ماترم کے خلاف سازش کر کے قدیم ہندو خاندان مجاپہت کا اقتدار بحال کرنا چاہتی تھیں، لیکن اس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور سلطان آگنگ نے ان تمام ریاستوں کو ختم کر دیا۔ سلطان نے مشرق میں سورابابا کی شہری مملکت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح سلطان آگنگ نے جاوا میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی جو بانتن کو چھوڑ کر پورے جاوا پر حاوی تھی۔

سلطان آگنگ نے اپنی پڑوسی ریاستوں سے بھی تعلقات مضبوط کیے۔ چنانچہ اچیہ (سماترا)، جوہور (ملایا)، کلیمنتان اور سلادیسی کی مسلم حکومتوں سے اس کے تعلقات اچھے تھے۔ ولندیزیوں کے مقابلے میں البتہ اس نے سخت طرزِ عمل اختیار کیا اور ان کی جارحانہ کاروائیوں کو ناکام بنایا۔

سلطان آگنگ ایک دیندار حکمران تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کے مطابق قوانین بنائے اور ہندوؤں کے اثرات کو دور کر کے اسلامی تہذیب اور ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں جاوا میں کثرت سے مدرسے قائم کیے گئے۔ سلطان آگنگ فلسفہ اور حکمت پر ایک کتاب کا مصنف بھی تھا۔

سلطان آگنگ کا جانشین ہمنگ کورت اول (۱۶۴۵ء تا ۱۶۷۷ء) ایک نااہل حکمران تھا۔ اس نے قدیم ہندو رسم و رواج کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی اور ولندیزیوں کو مراعات دیں۔ ۱۶۵۵ء میں اس نے ولندیزیوں کو گرم مسالے کی تجارت کی اجارہ داری دی اور عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت دی۔ ہمنگ کورت کے دور میں ماتحت ریاستوں پر ماترم کا اقتدار کمزور پڑ گیا۔ ولندیزیوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۶۷۷ء میں جب ہمنگ کورت اول کا ایک لڑکا تخت کا دعویٰ لے کر اٹھا تو ولندیزیوں نے اس کی مدد کی۔ قوم پرستوں کو شکست ہوئی اور وہ ہمنگ کورت دوم کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ آخر میں اگرچہ ہمنگ کورت دوم ولندیزیوں کا مخالف ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک جاوا میں ولندیزی اثر بہت بڑھ چکا تھا۔ ۱۷۰۳ء میں ہمنگ کورت دوم کے انتقال کے بعد جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو ولندیزیوں نے ماترم کے معاملات میں کھلی مداخلت شروع کر دی۔ تخت کے ایک دعوے دار پاکووانا نے ولندیزیوں سے فوجی امداد طلب کی اور اس کے معاوضہ میں جاوا کے کئی علاقے ان کو دے دیئے۔ اب ماترم کی ریاست پوری طرح

ولندیزیوں کے اثر میں آ گئی اور انہوں نے جاوا کو ۳۳ انتظامی حصوں میں تقسیم کر کے صوبہ داروں کو اتنے اختیارات دے دیئے کہ مرکزی حکومت کا اقتدار برائے نام رہ گیا۔ ۱۷۵۵ء میں ماترم کی یہ برائے نام حکومت بھی دو ریاستوں میں تقسیم کر دی گئی۔ ایک سوراکارتا اور دوسری جوگجکارتا پہلی ریاست کا باکوداتا کو سلطان مقرر کیا اور دوسری ریاست کا اس کے بھائی منگ کابوی کو سلطان مقرر کیا۔

آچیہ کی ریاست (۱۵۱۴ء تا ۱۸۷۴ء)

یہ ریاست سمدر پسائے کی ریاست کے خاتمہ کے بعد سماترا کے شمال مغربی علاقے آچیہ میں ۱۵۱۴ء میں قائم ہوئی۔ علی مغایت شاہ (۱۵۱۴ء تا ۱۵۳۰ء) اس سلطنت کا بانی تھا۔ آچیہ کی یہ ریاست سمدر پسائے، ملکا اور جاوا کی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ثابت ہوئی اور جزیرہ سماترا کا بہت بڑا حصہ اس کے تحت تھا۔ یہ ریاست تین سو ساٹھ سال قائم رہی اور اس مدت میں کل ۳۴ حکمران ہوئے۔

سولہویں صدی میں بحر ہند میں پرتگالیوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور ان کو جہاں بھی موقع ملتا تھا وہاں قابض ہو جاتے تھے۔ مشرقی افریقہ کا تقریباً سارا ساحل ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر بھی انہوں نے نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ ۱۵۱۱ء میں وہ بندرگاہ ملکا پر قابض ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جنوبی ایشیا اور انڈونیشیا کے جزیروں میں مداخلت شروع کر دی۔ اسلامی ملکوں میں صرف سلطنت عثمانیہ کا بحری بیڑہ اس قابل تھا جو ان کی روک تھام کر سکتا تھا۔ بحر ہند کے کنارے واقع مسلم ریاستیں پرتگالیوں کے خلاف ان سے مدد طلب کیا کرتی تھیں۔ ان مسلم ریاستوں کی درخواست پر عثمانی بیڑہ مشرقی افریقہ اور گجرات میں پرتگالیوں کے خلاف کئی دفعہ کارروائیاں کر چکا تھا۔ اسی قسم کی ایک کارروائی عثمانی ترکوں نے آچیہ کے سلطان کی درخواست پر بھی کی۔ آچیہ کے تیسرے حکمران علاء الدین رعایت شاہ (۱۵۳۷ء تا ۱۵۷۱ء) نے جو علی مغایت شاہ کا لڑکا تھا، پرتگالیوں کے خلاف عثمانی سلطان کی مدد حاصل کرنا چاہی اور اس مقصد کے لیے ۱۵۶۳ء/۹۷۰ھ میں ایک سفیر سلیمان اعظم کے پاس استنبول بھیجا۔ درخواست میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ترک پرتگالیوں سے محفوظ رکھ سکیں تو اس علاقے کے بہت سے حکمران اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بعض اسباب کی وجہ سے آچیہ کا سفیر سلطان

سلیمان قانونی سے عرصے تک ملاقات نہ کر سکا اور اس کے بعد سلیمان کا انتقال ہو گیا اور سفیر کو دو سال استنبول میں رُکنا پڑا۔ آخر کار وزیر اعظم محمد صوقولی کی ہدایت پر سوئیز کے امیر البحر کرداوغلو خضر رئیس کی زیر قیادت انیس بڑے جہازوں اور چند دیگر جہازوں پر مشتمل ایک مہم سماترا کی طرف بھیجی گئی، لیکن اس دوران میں یمن میں بغاوت ہو گئی تھی اس لیے اس مہم کا رخ یمن کی طرف کر دیا گیا اور صرف دو جہاز جنگی ساز و سامان کو لے کر جن میں توپیں اور ماہرین شامل تھے سماترا کی طرف روانہ ہو سکے۔ اس مختصر جماعت نے آچیہ پہنچ کر کیا کیا، اس کا حال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم کہ ان ترک ماہرین نے سلطان آچیہ کی ملازمت اختیار کر لی۔

سترہویں صدی کے نصف اول میں سلطان اسکندر مودا (۱۶۰۷ء تا ۱۶۳۶ء) کے عہد میں آچیہ اپنی قوت، ترقی اور خوشحالی کے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ ریاست کی حدود سماترا کے جنوبی حصوں تک پہنچ گئیں اور جزیرہ نما ملایا میں ملکا اور پہانگ کے خلاف بحری مہمیں بھیجی گئیں۔

تاریخ آچیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ۱۶۴۱ء سے ۱۶۹۹ء تک یعنی تقریباً ساٹھ سال تک چار عورتوں نے مسلسل حکومت کی۔ اسلامی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ عورتوں نے کسی ملک پر اتنی طویل مدت تک حکومت کی ہو۔ مصر میں شجرۃ الدر صرف چند ہفتے حکمران رہی، دہلی میں سلطانہ رضیہ مشکل سے چار سال حکومت کر سکی اور احمد نگر کی چاند بی بی کی مدت حکومت بھی چند سال سے زیادہ نہیں اور وہ بھی حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ والی اور سرپرست کی حیثیت سے۔

ان خواتین کے دَورِ حکومت میں امراء کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے امراء میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا عورتوں کا حکومت کرنا شرعاً جائز بھی ہے یا نہیں۔ آخر کار مکہ سے فتویٰ منگوایا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ عورتوں کی حکومت اسلام میں جائز نہیں۔

بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان خواتین کے دَور تک آچیہ ایک مضبوط اور طاقتور حکومت کی حیثیت سے برقرار رہا۔ اس کے بعد آچیہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس نے ریاست کو کمزور کر دیا اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ سترہویں صدی میں ولندیزی سماترا میں داخل ہو گئے اور ۱۶۸۱ء میں پاڈانگ کے علاقے پر جو آچیہ کا ایک حصہ رہ چکا تھا، قبضہ کر لیا۔ آخر میں انہوں نے آچیہ کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی۔ اس پر آچیہ کے عوام نے امام بونجول (۱۷۷۲ء تا ۱۸۶۴ء) کی زیر قیادت جہاد شروع کر دیا، جو ۱۸۲۳ء سے ۱۸۳۷ء تک جاری

رہا، لیکن مجاہدین کو کامیابی نہیں ہوئی۔ آچیہ کے ۳۳ ویں سلطان محمود شاہ کے ۱۸۷۴ء میں انتقال پر ولندیزیوں نے پھر مداخلت کی اور آچیہ پر قبضہ کر لیا۔ آچیہ کی آزادی اب بالکل ختم ہو گئی، لیکن عوام کی طرف سے اس کے بعد بھی جہاد جاری رہا، جس کا سلسلہ ۱۹۰۷ء تک جاری رہا۔ اس دوسری تحریک جہاد کے ہیرو تیکو عمر ہیں جن کا آچیہ کے شاہی خاندان سے تعلق تھا اور جنہوں نے ۱۸۷۴ء سے ۱۸۹۹ء میں اپنی شہادت تک ولندیزوں سے جنگ جاری رکھی۔

جوہور (۱۵۳۰ء تا ۱۸۸۵ء)

جزیرہ نمائے ملایا میں اگرچہ ولندیزی شہر ملکا پر ۱۵۱۱ء میں قابض ہو گئے تھے لیکن ان کا قبضہ شہر تک محدود رہا۔ اندرون ملک مختلف مسلمان ریاستیں موجود رہیں۔ ان میں ریاستوں میں سب سے اہم جوہور کی ریاست ہے۔ ملکا کا سلطان محمود شاہ جب سماترا میں ۱۵۲۸ء میں مر گیا تو اس کا لڑکا علاء الدین رایت شاہ دوم ملایا آ گیا اور ۱۵۳۰ء میں جوہور میں اپنی آزاد ریاست قائم کر لی۔ اس نے پرتگالیوں سے لڑائی جاری رکھی۔ سلطان علاء الدین رایت شاہ نے ۱۵۶۴ء تک حکومت کی۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جوہور پر جزیرہ سلاویسی کی ایک قوم ہوگی نے جو مسلمان تھی، قبضہ کر لیا اور جوہور کو ایک طاقتور ریاست کی شکل دے دی اور ملکا کے علاوہ سارے مغربی ملایا پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ شمال میں کیدہ، کلانتان اور ترنگانو کی ملائی ریاستیں سیام کے زیر اثر رہیں۔ ۱۷۴۳ء میں ریاست سلانگور اور ۱۷۷۳ء میں نگری سمبیلن اور پیراک کی ریاستیں جوہور کے اثر سے آزاد ہو گئیں۔ جوہور کی باقی ریاست بھی جلد ہی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک پہانگ اور دوسری جوہور۔ ان میں پہلی ریاست ولندیزوں کے اثر میں آ گئی اور دوسری انگریزوں کے اثر میں۔ اس کے بعد جزیرہ نمائے ملایا پر انگریزوں کا اثر تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا۔ ۱۷۸۶ء میں انہوں نے پنانگ پر، ۱۷۹۵ء میں ملکا پر، ۱۸۱۹ء میں سنگاپور پر، ۱۸۷۴ء میں پیراک، سلانگور، نگری سمبیلن اور پہانگ پر اور ۱۸۸۴ء میں جوہور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۹ء میں سیام (تھائی لینڈ) شمال کی چار ملائی ریاستوں کلانتن، ترینگانو، پرلس اور کیدہ پر اپنی بالادستی سے برطانیہ کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ جزیرہ نمائے ملایا پوری طرح برطانیہ کے قبضہ میں آ گیا،

لیکن برطانیہ نے صرف پنانگ، ملکا اور سنگاپور پر براہ راست حکومت قائم کی اور ملایا کی باقی ریاستوں کو اسی طرح قائم رکھا جس طرح ہندوستان اور پاکستان میں انگریزوں نے دیسی ریاستوں کو قائم رکھا۔ یہ ریاستیں انگریزوں کی بالادستی تسلیم کرتی تھیں اور اندرونی معاملات میں ایک حد تک آزاد تھیں۔

ملایا میں اسلامی اثرات کے تحت ملائی زبان کا رسم الخط آچیہ کی زبان کی طرح عربی ہوگیا اور اس نئے رسم الخط میں جوہور کی ریاست کے دَورِ عروج میں عربی اور فارسی سے ملائی زبان میں کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ سولہویں صدی کے آخر میں مثنوی مولانا روم، سکندر نامہ نظامی اور تحفہ الاحرار جامی کے ترجمے ہوئے۔ جوہور کے سلطان عبدالجلیل شاہ کے وزیراعظم تان محمد نے سجارو ملایو کے نام سے ساترا اور ملایا کے سلاطین کی تاریخ لکھی۔

[ولندیزی اور برطانوی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک انڈونیشیا اور ملائیشیا کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

سلاطین ماترم

(۱) سنوپاتی	۱۵۸۶ء تا ۱۶۰۱ء
(۲) پانم بہان کراپیاک	۱۶۰۱ء تا ۱۶۱۳ء
(۳) سلطان اگنگ	۱۶۱۳ء تا ۱۶۴۵ء
(۴) پرابوئیمنگ کورت	۱۶۴۵ء تا ۱۶۷۷ء
(۵) ہمنگ کورت دوم	۱۶۷۷ء تا ۱۷۰۳ء
(۶) ہمنگ کورت سوم	۱۷۰۳ء تا ۱۷۱۹ء
(۷) پاکوبودانا اول	۱۷۰۵ء تا ۱۷۱۹ء
(۸) ہمنگ کورت چہارم	۱۷۱۹ء تا ۱۷۲۵ء
(۹) پاکوبودانا دوم	۱۷۲۵ء تا ۱۷۴۹ء

(۱۰) پاکو بودانا سوم	۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۵ء

سلاطین بانتم

(۱) پاتح بلا	۱۵۲۶ء/۹۳۳ھ تا ۱۵۵۰ء/۹۷۸ھ
(۲) مولانا حسن الدین	۱۵۵۰ء تا ۱۵۷۰ء
(۳) مولانا یوسف	۱۵۷۰ء تا ۱۵۸۰ء
(۴) مولانا محمد	۱۵۸۰ء تا ۱۵۹۶ء
(۵) سلطان عبد القادر	۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۱ء
(۶) عبد الفتح سلطان اگنگ	۱۶۵۱ء تا ۱۶۸۲ء
(۷) عبد القہار سلطان حاجی	۱۶۸۳ء/۱۰۹۳ھ تا ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ

سلاطین آچیہ (سماترا)

(۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء تا ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)

(۱) علی مغایت شاہ	۱۴۹۶ء تا ۱۵۳۰ء
(۲) صلاح الدین	۱۵۳۰ء تا ۱۵۳۷ء
(۳) علاء الدین رعایت شاہ	۱۵۳۷ء تا ۱۵۷۱ء
(۴) علی رعایت شاہ اول	۱۵۷۱ء تا ۱۵۷۹ء
(۵) سلطان مودا	۱۵۷۹ء
(۶) سلطان سری عالم	۱۵۷۹ء
(۷) زین العابدین	۱۵۷۹ء
(۸) علاء الدین منصور شاہ	۱۵۷۹ء تا ۱۵۸۶ء
(۹) علی رعایت شاہ دوم	۱۵۸۶ء تا ۱۵۸۸ء
(۱۰) علاء الدین رعایت شاہ	۱۵۸۸ء تا ۱۶۰۴ء

(۱۱) علی رعایت شاہ سوم	۱۶۰۴ء تا ۱۶۰۴ء
(۱۲) اسکندر مودا	۱۶۰۷ء تا ۱۶۳۶ء
(۱۳) اسکندر ثانی علاء الدین مغایت شاہ	۱۶۳۶ء تا ۱۶۴۱ء
(۱۴) تاج العالم صفیہ الدین شاہ	۱۶۴۱ء تا ۱۶۴۱ء
(۱۵) نور العالم نقیہ الدین شاہ	۱۶۷۵ء تا ۱۶۷۸ء
(۱۶) عنایت شاہ ذکیہ الدین	۱۶۷۸ء تا ۱۶۸۸ء
(۱۷) کمالات شاہ	۱۶۸۸ء تا ۱۶۹۹ء
(۱۸) بدر العالم شریف ہاشم جمال الدین	۱۶۹۹ء تا ۱۷۰۲ء
(۱۹) پرکاسا عالم شریف لامتوی	۱۷۰۲ء تا ۱۷۰۳ء
(۲۰) جمال العالم بدر المنیر	۱۷۰۳ء تا ۱۷۲۶ء
(۲۱) جوہر العالم	۱۷۲۶ء
(۲۲) شمس العالم	۱۷۲۶ء تا ۱۷۲۷ء
(۲۳) علاء الدین احمد شاہ	۱۷۲۷ء تا ۱۷۳۵ء
(۲۴) علاء الدین جوہن شاہ	۱۷۳۵ء تا ۱۷۶۰ء
(۲۵) محمود شاہ اول	۱۷۶۰ء تا ۱۷۸۱ء
(۲۶) بدر الدین	۱۷۶۴ء تا ۱۷۶۵ء
(۲۷) سلیمان شاہ	۱۷۷۳ء
(۲۸) علاء الدین محمد شاہ	۱۷۸۱ء تا ۱۷۹۳ء
(۲۹) علاء الدین جوہر العالم شاہ	۱۷۹۵ء تا ۱۸۲۴ء
(۳۰) شریف سیف العالم	۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۰ء
(۳۱) محمد شاہ	۱۸۲۴ء تا ۱۸۳۶ء
(۳۲) منصور شاہ	۱۸۳۶ء تا ۱۸۷۰ء

(۳۳) محمود شاہ دوم ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۴ء

(۳۴) محمد داؤد شاہ ۱۸۷۴ء تا ۱۹۰۴ء

آچیہ کی مملکت عملاً ۱۸۷۴ء میں ختم ہو چکی تھی اور ولندیزوں کا اس پر قبضہ ہو گیا تھا، لیکن آچیہ کے باشندوں نے ولندیزی اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور یہ سلسلہ ۱۹۰۷ء تک جاری رہا۔ آخری حکمران داؤد شاہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

[مذکورہ بالا شجرہ اور سنہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی) جلد اول لیڈن ۱۹۶۰ء کے مقالہ ''آچیہ'' سے لیے گئے ہیں]

اِسلامی دُنیا کا دَورِ زوال

(۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ تا ۱۹۲۴ء/۱۳۴۲ھ)

[مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کوئی ایک تاریخ تعین کرنا مشکل ہے۔ ۱۶۸۲ء میں ویانا کے محاصرہ میں ترکوں کو ناکامی ہوئی۔ ۱۶۸۷ء میں مُہاکز کی دوسری جنگ میں شکست کے نتیجے میں ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور ۱۶۹۹ء میں معاہدۂ کارلووٹز کے تحت ترکوں کو اپنی ان ناکامیوں کو تسلیم کرنا پڑا اور وہ پہلی مرتبہ اپنے علاقوں سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے۔ مشرق بعید میں بھی سترہویں صدی کے آخری حصے میں مسلمانوں کو یوروپی اقوام کے حملوں کے مقابلے میں مسلسل ناکامیاں ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ جاوا میں ۱۶۷۷ء میں، ماترم پر اور ۱۶۸۲ء میں بانتن پر ولندیزی بالادستی قائم ہوگئی تھی۔ سماترہ میں پڈانگ پر ۱۶۸۱ء میں ولندیزی قابض ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف اسلامی دنیا کے وسطی حصے میں اور مغرب اقصیٰ میں مسلمانوں کو ۱۷۰۰ء کے بعد بھی یورپ اور غیر مسلم طاقتوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مراکش میں ۱۷۲۷ء میں مولائے اسمٰعیل کی وفات تک مسلمان بیرونی حملوں کو کامیابی سے پسپا کرتے رہے، مشرقی افریقہ کے ساحل سے ۱۶۹۸ء میں عربوں نے پرتگالی اقتدار ختم کردیا۔ ایران میں ۱۷۳۵ء میں نادر شاہ نے زار روس کی حکومت کو ایرانی مقبوضات چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ہندوستان میں مرہٹوں کو اس کے بعد کامیابیاں حاصل ہونا شروع ہوئیں، لہٰذا ان مختلف تاریخوں کے پیش نظر ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے سال وفات کو اسلامی دنیا کے زوال کی تاریخ مقرر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔]

باب ۲۷

مسلمانوں کے عہد عروج کا خاتمہ اور یورپ کا عروج

سیاسی عروج اور معاشرہ کا زوال

سترہویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی۔ اس صدی میں مسلمان اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی تہذیب تھی۔ مشرق میں انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک اور شمال میں ہنگری سے لے کر جنوب میں ایک طرف راس کماری اور دوسری طرف یمن تک مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ پاکستان و ہند میں تیموریوں کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی۔ ایران میں صفوی خاندان کا زور تھا۔ بغداد سے الجزائر تک اور ہنگری سے عدن تک عثمانی سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغرب اقصیٰ میں مراکش سے سوڈان تک مراکش کے خاندان فلالی کی حکومت قائم تھی۔ گویا اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ چار بڑی حکومتوں میں منقسم تھا اور مسلمان افتراق اور انتشار سے بڑی حد تک بچے ہوئے تھے۔ ان مضبوط اور سمجھ دار حکومتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں امن و امان تھا۔ زراعت اور صنعت و تجارت ترقی پر تھی۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ علوم و فنون ترقی کر رہے تھے۔ شاہ عبدالحق، مجدد الف ثانی اور حاجی خلیفہ جیسے اہل علم، صائب اور بیدل جیسے شاعر، استاد حامد اور احمد جیسے ماہر فن تعمیر اس دور میں پیدا ہوئے۔ تاج محل، لال قلعہ دہلی اور لاہور کی جامع مسجد، اصفہان کی شاندار عمارتیں لاہور اور کشمیر کے باغ اور فاس اور مکناس کی لاجواب عمارتیں اسی زمانہ میں تعمیر ہوئیں۔ ڈھاکہ کی ململ، ٹھٹھہ اور گجرات کی نفیس سوتی چھینٹیں۔ ملتان کی تلواریں اور کمانیں، سیالکوٹ اور دولت آباد کا کاغذ، بنگال کا ریشم، ایران اور ترکی کے بہترین قالین اسی سترہویں صدی میں بنائے گئے۔

ہم عربوں کے دور میں بغداد، قرطبہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ کے حالات پڑھ چکے ہیں، اس کے بعد پندرھویں صدی میں سمرقند، ہرات، تبریز اور قاہرہ کا حال بھی پڑھ چکے ہیں، اس زمانہ تک

یورپ کے شہر وسعت اور خوبصورتی میں اسلامی دنیا کے شہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن اب یورپ والوں نے بھی ترقی شروع کر دی تھی اور وہاں بڑی بڑی حکومتیں اور بڑے بڑے شہر قائم ہو رہے تھے۔ سترھویں صدی میں تو یورپ والے بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں لندن اور پیرس یورپ کے سب سے بڑے اور خوبصورت شہر بن گئے تھے۔ ان کی آبادی چار پانچ لاکھ کے قریب تھی، لیکن اسلامی دنیا کے شہر اب بھی بازی لیے ہوئے تھے۔ دہلی کی آبادی لندن اور پیرس کے برابر تھی لیکن آگرہ اور لاہور ان سے بھی بڑے شہر تھے۔ احمد آباد کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی نو لاکھ کے قریب تھی۔ اس طرح ڈھاکہ آبادی میں لندن کے برابر تھا۔ لیکن ڈھاکہ میں تجارت اور کاروبار لندن سے زیادہ ہوتا تھا۔ ایران میں اصفہان نصف جہان کا حال ہم پڑھ ہی چکے ہیں۔ تبریز کا اگرچہ اب زوال شروع ہو گیا تھا، پھر بھی اس کی آبادی پانچ لاکھ تھی۔ استنبول کے عظیم الشان اور حسین شہر کے متعلق عثمانی امیر البحر سید علی نے جو رائے دی تھی وہ پیچھے گذر چکی ہے۔ قاہرہ کی آبادی تقریباً پانچ چھ لاکھ تھی اور استنبول کی آبادی پندرہ لاکھ۔ یہ تمام شہر یورپ والوں کے لیے عجوبہ روزگار تھے اور مسلمانوں کی تمدنی ترقی اور برتری کا نمونہ تھے۔

لیکن مسلمانوں کا یہ عروج سیاسی اور تمدنی لحاظ سے تھا۔ اخلاقی اور علمی لحاظ سے مسلمان زوال کی طرف جا رہے تھے۔ مسلمانوں کا اخلاقی اور علمی زوال اگرچہ تباہی بغداد کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا، لیکن سترہویں صدی میں تو وہ انتہائی پستی میں پہنچ گئے تھے۔ سلطنت عثمانیہ رقبہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت تھی، لیکن بددیانتی اور رشوت خوری عام ہو گئی تھی۔ عورتیں سلطنت کے معاملات کو گھروں کے معاملوں کی طرح سمجھ کر ہر بات میں دخل دیتی تھیں۔ ینی چری فوج آرام طلب ہو گئی تھی اور اس کو صرف لوٹ مار سے دلچسپی تھی۔ یہ فوج افسروں کی بات بات میں مخالفت کرتی تھی۔ امراء اور جاگیردار رعایا پر ظلم کرنے لگے تھے۔ سلطان مراد چہارم اور اس کے بعد وزیر اعظم محمود کوپریلی اور احمد کوپریلی نے ملک کی حالت بڑی حد تک درست کر دی لیکن ان کے بعد پھر وہی حالت ہو گئی۔

سلطنت عثمانیہ کے بعد تیموری سلطنت اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی، لیکن یہاں بھی سو سالہ امن و امان کی وجہ سے امراء فوجی اور رعایا سب آرام طلب ہو گئے تھے۔ امراء اور رؤسا کو بس اس کی فکر تھی کہ ان کی دولت میں اضافہ ہوتا رہے اور وہ بغیر تکلیف اٹھائے کام کر لیا

کریں۔ بددیانتی آہستہ آہستہ گھر کر رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت میں ان خرابیوں کو دُور کرنے کی بڑی کوشش کی، لوگوں کو سادہ زندگی گذارنے اور جفاکشی اختیار کرنے کی ترغیب دی، بددیانتوں کو ہٹا کر دیانتدار لوگ لانے کی کوشش کی لیکن اس کو ان اصلاحات کے نافذ کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ آرام طلب اور تن آسان لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب کی مضبوط گرفت ڈھیلی پڑی تو پورے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جو بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال سکے۔

یہی حال ایران اور ترکستان کا تھا۔ ایران میں شراب و شاعری کا دَور تھا اور ترکستان جو کبھی دنیا میں علم و فن اور تہذیب و تمدّن کا سب سے بڑا مرکز تھا، تنگ نظری، تعصب اور جہالت کا شکار ہو رہا تھا۔

یہ تو سترھویں صدی میں اسلامی دنیا کی اخلاقی حالت کا نقشہ تھا۔ علم و ادب کی حالت اس سے بھی خراب تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس دَور میں بھی مجدد الف ثانی اور حاجی خلیفہ اور اولیائے چلپی جیسے ذہین اور اہل علم نظر آتے ہیں۔ کچھ اچھی تاریخیں بھی لکھی گئیں اور عام مصنف تو سینکڑوں مل جائیں گے۔ اسی طرح شاعروں کی کوئی کمی نہیں تھی، مصوری اور فن تعمیر کے لحاظ سے یہ صدی اسلامی تاریخ کی سب سے شاندار صدی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اول تو پوری صدی میں درجۂ اول کے دو ایک آدمیوں کے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ عربوں کے دَور عروج میں درجۂ اول کے عالم اور مصنف ایک ہی وقت میں ایک دو نہیں بیسیوں نظر آتے تھے، بلکہ ریاضی دان، طبیب، ماہرین ہیئت، ماہرین جغرافیہ، لغت نویس، فلسفی غرض ہر علم و فن کے مصنف نظر آئیں گے، لیکن سترھویں صدی میں اسلامی دنیا میں ان علوم کا بلند پایہ عالم ایک بھی نہیں ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ عروج جس کا خاتمہ ۱۷۰۰ء میں ہوا، ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک رہا۔ دنیا کی کسی قوم کو آج تک اتنا عروج نہیں ہوا۔ مسلمان ایک ہزار سال تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنے رہے۔ یونانیوں کا عہد عروج دو سو سال میں ختم ہو گیا۔ رومی چار سو سال تک دنیا کی عظیم طاقت بنے رہے۔ موجودہ یورپ کے عروج کو ابھی تین سو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کا عہد عروج ایک ہزار سال تک رہا۔ صرف چینیوں نے مسلمانوں کے برابر عروج حاصل کیا وہ صرف چین اور اس کے قریبی علاقوں تک محدود تھا۔ برخلاف اس کے

مسلمان دنیا کے بیشتر حصہ پر چھائے ہوئے تھے۔

۱۶۹۹ء میں کارلووٹز کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد عثمانی ترکوں کو زوال ہوا۔ پاکستان اور ہند میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ۱۷۰۷ء میں برکوچک میں مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا۔ ۱۷۲۷ء میں سلطان اسمٰعیل کے انتقال پر مراکش کمزور ہوگیا اور تقریباً اسی زمانہ میں ایران کی صفوی سلطنت ختم ہوگئی۔ یہ تمام باتیں ۲۵ سال کے اندر اندر ہوگئیں، اس لیے ہم آسانی کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۷۰۰ء اسلامی دنیا کے عروج کا آخری سال تھا اس کے بعد زوال شروع ہوگیا۔

عروج کے دو دور

مسلمانوں کے عروج کے اس زمانہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور آغاز اسلام سے ۱۲۵۸ء تک جب کہ بغداد تباہ ہوا اور دوسرا دور ۱۲۵۸ء سے ۱۷۰۰ء تک جب کہ یورپ والوں کا غلبہ شروع ہوا، پہلے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے اندر مذہبی جوش وخروش بہت تھا۔ عربی زبان ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔ پوری اسلامی دنیا کا ایک دوسرے سے تعلق قائم تھا اور علم و فضل نے بڑی ترقی کی۔ امام غزالی، بوعلی سینا، رازی، ابن زہیر، البیرونی، ابوحنیفہ، شافعی، طبری، مسعودی جیسے اہل علم گذرے، جن کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں۔ انہوں نے مذہب، طب، ریاضی، سائنس غرض ہر چیز میں کتابیں لکھیں۔ یہ مسلمانوں کی جدت اور دانشمندی کا دور تھا اور اس زمانہ میں دنیا کا کوئی ملک علمی معاملات میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

دوسرا دور اس سے مختلف تھا۔ سیاسی حیثیت سے تو اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کو عروج رہا بلکہ ان کی سلطنت کی حدود پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ صرف ایک اندلس ہاتھ سے نکلا لیکن اندلس سے کئی گنا بڑا خطہ برکوچک پاکستان و ہندان کے ہاتھ میں آ گیا۔ روس کے بڑے حصہ میں وہ قابض ہوگئے اور انڈونیشیا کے سرسبز اور زرخیز جزیروں میں اسلام کا بول بالا ہوگیا۔ لیکن علمی لحاظ سے یہ زمانہ بہت خراب رہا۔ طب ریاضی، فلسفہ اور سائنس میں کتابیں بالکل نہیں لکھی گئیں۔ جغرافیہ میں بھی کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی اور بڑے بڑے سیاح بھی اس دور میں پیدا نہیں ہوئے۔ حالانکہ دنیا کی ترقی کے لیے یہی علوم ضروری ہیں۔ مذہب کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ

زیادہ تر پچھلے زمانہ کی لکھی ہوئی کتابوں کی تشریح میں تھیں۔ علماء میں تقلید عام ہوگئی تھی اور وہ ان کتابوں میں جو پچھلے زمانہ کے عالم لکھ گئے تھے اضافہ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ جب ایسی صورت ہو تو پھر امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام غزالی جیسے عالم کیسے پیدا ہو سکتے تھے۔ ان کا تو کہنا یہ تھا کہ پچھلے زمانہ کے عالم بھی ایسے ہی انسان تھے جیسے ہم ہیں۔ ہمیں قرآن اور رسول خدا کے بعد کسی کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں۔

تقلید اور ذہنی جمود

تقلید پر زور اور تجدید و اجتہاد سے فرار صرف علمائے دین تک محدود نہیں تھا، دنیوی علوم اور حکمت اور معقولات کے دعوے دار بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ بزرگوں کو اساتذہ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ عقیدت مندی کی وجہ سے علمائے دین اور علمائے معقولات دونوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہم دور اول کے علماء اور حکماء کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں اب اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب اہل علم میں یہ ذہنیت کام کر رہی ہو تو وہ ایجاد و اختراع کیسے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس علمی اور ذہنی جمود نے ترقی کے تمام راستے بند کر دیے۔

سقوط بغداد کے بعد علم امراض چشم میں آخری بڑا اضافہ کمال الدین کمال نے کیا، اندلس میں متعدی امراض سے متعلق ابن خطیب (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) اور گردش خون سے متعلق ابن نفیس (۱۲۱۰ء تا ۱۲۸۸ء) کی تحقیقات، علم طب میں مسلمانوں کے آخری بڑے اضافے ہیں۔ اسی طرح ارسطوئی منطق پر ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء تا ۱۳۲۸ء) کی اجتہادی انداز میں تنقید اور فلسفہ تاریخ اور فلسفہ اجتماعیات کی ابن خلدون کے مقدمہ میں وضاحت فکری میدان میں مسلمانوں کے آخری اضافے ہیں۔ ابن ماجد (پندرھویں صدی) آخری مسلمان جہاز ران ہے جس کے آلات جہاز رانی یورپ کے جہاز رانوں کے آلات سے بہتر تھے۔ سقوط بغداد کے بعد ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۷ء) اور اولیا چلپی (۱۶۱۲ء تا ۱۶۷۹ء) کے علاوہ اسلامی دنیا میں کوئی منچلا سیاح پیدا نہیں ہوا۔ پندرھویں صدی میں مسلمان قطب نما سے واقف ہو چکے تھے، لیکن وہ اس سے یورپ کے جہاز رانوں کی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ بارود اور آتشیں اسلحہ کے استعمال کرنے والی قوموں میں مسلمان یقینی طور پر پہلی قوم تھے، لیکن ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ کے موقع

پر اور سولہویں صدی کے وسط میں دکن میں مسلمانوں نے جو بڑی اور بھاری توپیں استعمال کیں اس کے بعد وہ اسلحہ سازی کی صنعت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔

ایجاد و اختراعات اور جذبۂ تگ و دو (adventure) کے سلسلے میں یہ بے حسی اور جمود صرف اسلامی دنیا سے مخصوص نہیں تھا۔ مشرق کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا۔ ہندوستان کے ہندو، جنوب مشرقی ایشیا کے بودھ باشندے اور چین اور جاپان کے لوگ بھی جو ذہانت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے اختراع اور ایجاد، ندرت فکر اور اجتہاد سے اتنے ہی دور تھے جتنے مسلمان۔ یورپ والے اس میدان میں اگر آگے بڑھ گئے تو اس کا سبب یورپ کا مخصوص معاشی اور سماجی پس منظر تھا جس نے ان کو ترقی اور تگ و دو پر مجبور کیا۔

زوال کے اسباب

(۱) اسلامی دنیا میں فکری اور علمی جمود اور مسلمانوں کے زوال کے متعدد اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ اسلامی دنیا کی تین سب سے بڑی قومیں یعنی عرب، ایرانی اور ترک ایک ہزار سال تک محیر العقول کارنامے انجام دینے کے بعد اپنی توانائیاں ختم کر چکی تھیں اور وہ اس عزم و حوصلے سے جو نئی قوموں کی خصوصیات ہوتی ہیں، محروم ہو چکی تھیں۔

(۲) مسلمانوں کے زوال کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اب ان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین باقی نہیں رہا تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان غلبہ اسلام کے نصب العین سے سرشار تھے اور وہ دنیا کی نجات کے لیے اسلامی انقلاب کو ایک لازمی چیز سمجھتے تھے۔ ملوکیت کے زیر اثر مسلمانوں کا یہ اسلامی نصب العین کمزور ہوتا چلا گیا اور ایک وقت وہ آ گیا کہ مسلمان حکمرانوں کے ذہن سے یہ نصب العین بالکل محو ہو گیا اور اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک رسمی مذہب بن گیا۔ جہاد کا تصور اپنے اعلیٰ مقصد سے ہٹ گیا اور صرف کافروں کے گشت و خون کا نام رہ گیا اور مسلمان حکمرانوں کی زندگی کا مقصد ذاتی اقتدار اور ذاتی شہرت کے علاوہ اور کچھ نہ رہا۔

(۳) اندلس سے مسلمانوں کے اخراج اور ترکستان سے شام تک اسلامی دنیا کے بڑے حصے کی منگولوں کے ہاتھوں تباہی نے بھی اس ذہنیت کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ مسلمانوں کے بیشتر علمی ذخیرے تباہ ہو گئے۔ کتب خانے اور تعلیمی ادارے برباد ہو گئے۔ منگولوں نے

اسلامی دنیا کی بستیوں کو جس طرح اجاڑا، عورتوں، مردوں اور بچوں کا جس طرح قتل عام کیا، اس نے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیئے اور ان کو مایوسی کا شکار بنا دیا۔ دنیا سے ان کو نفرت ہوگئی اور وہ ترک دنیا کی طرف مائل ہوگئے۔ تصوّف نے عروج پایا۔ پیری مریدی کا زور بڑھ گیا۔ شرعی احکام پر عمل کرنے اور محنت کرنے کی بجائے لوگ پیروں کی دعاؤں اور مزاروں پر جا کر مرادیں مانگنے پر انحصار کرنے لگے۔

(۴) عربی زبان کی بجائے قومی زبانوں کا فروغ بھی مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوا۔ اس طرح عربی کی وحدت ختم ہوگئی۔ عربی صرف دینی علوم کی زبان رہ گئی۔ دوسرے علوم پر ترکی اور فارسی میں زیادہ لکھا جانے لگا۔ علوم حکمت، ریاضی، فلسفہ اور کلام پر عربوں کے دَور میں جو فکر انگیز کتابیں لکھی گئیں ان تک رسائی کم ہوگئی۔ قومی زبانوں کا فروغ اگرچہ اپنی افادیت رکھتا ہے لیکن ان کی وجہ سے لسانی وحدت کو نقصان پہنچا۔ اسلامی ہند اور ایران کی علمی کتابیں جو فارسی میں تھیں ترکی اور عرب دنیا تک نہ پہنچ سکیں اور اسی طرح ترکی اور عرب دنیا کے بہت سے علوم زبان کی رکاوٹ کی وجہ سے اسلامی ہند منتقل نہ ہوسکے۔ مثال کے طور پر سولھویں صدی میں ترکی میں یورپ اور امریکہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا اس سے ایران اور ہندوستان کے مسلمان واقف نہ ہوسکے۔

(۵) ایران میں ایل خانی منگولوں کی حکومت اور اس کے بعد صفویوں کی حکومت کا قیام بھی مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوا۔ ایل خانیوں کے مظالم اور صفوی حکومت کے شیعیت میں غلو کی وجہ سے نہ صرف ایران باقی اسلامی دنیا سے کٹ گیا بلکہ ترکستان اور اسلامی ہند بھی باقی اسلامی دنیا سے کٹ گئے۔ اسلامی دنیا دو ایسے حصوں میں تقسیم ہوگئی جن کے درمیان صرف سمندر کے راستے ربط قائم ہوسکتا تھا۔ اس تقسیم کی وجہ سے ایک حصے کے افکار و خیالات دوسرے حصے تک نہیں پہنچ سکے۔ اسلامی ہند اور ترکستان کے لوگ ترکوں اور عرب دنیا کی تاریخ سے ناواقف رہے اور ترک اور عرب اسلامی ہند اور ترکستان کی تاریخ سے ناواقف رہے۔ یہ بات سقوط بغداد سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ ہندوستان میں سترہویں صدی تک علم حدیث کے فروغ نہ پانے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر و شام سے' جو علوم حدیث کے مرکز تھے، اسلامی ہند کا براہِ راست تعلق ختم ہوگیا۔ گجرات کا چونکہ سمندر کے راستے حجاز سے ربط قائم تھا اس لیے وہاں علم حدیث کا چرچا سب سے پہلے ہوا۔

اخلاقی زوال، یورپ کا عروج

یورپ سے اسلامی دنیا کی بے تعلقی بھی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی پانچ سو سال کے دوران جب کہ مسلمان تہذیب و تمدن اور علم و فن میں ساری دنیا سے آگے تھے اور یورپ کے رہنے والے غیر مہذب زندگی گذارتے تھے۔ یہ زمانہ یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔ ان کے یہاں نہ بڑے بڑے شہر تھے نہ طاقتور اور منظم حکومتیں اور نہ اسلامی دنیا کی طرح شاندار مدرسے، شفاخانے، کتب خانے، مسافر خانے اور حمام۔ پندرہویں صدی کے بعد یورپ اپنے قرون وسطیٰ کے تاریک دور سے نکل آیا تھا۔ عربوں سے تعلقات، عربی اور یونانی کتابوں کے لاطینی ترجموں اور یورپ کے مخصوص سماجی اور معاشی حالات کی بدولت وہاں نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح کا آغاز ہو گیا تھا۔ یورپ والوں نے تقلید کے تمام بندھن توڑ کر اجتہاد کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ نئی نئی ایجادیں کر رہے تھے جن میں سستے کاغذ کی تیاری اور پندرھویں صدی کے وسط میں چھاپے خانے کی ایجاد بہت اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ ان ایجادوں کی وجہ سے یورپ میں کتابیں عام ہو گئیں اور علوم و فنون کو تیزی سے فروغ ہوا۔ قطب نما کی مدد سے یورپ کے جہاز ران ساری دنیا کے چکر لگانے لگے۔ اگر عربوں کے دور کی طرح اس دور میں بھی مسلمان یوروپی علوم کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے تو وہ نئی ایجادوں سے اور یورپ کی ترقی کے اسباب سے واقف ہو سکتے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس خیال خام میں مگن رہے کہ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان کفار کی ہمارے سامنے کیا حقیقت ہے۔ صرف ترکی میں سترہویں صدی میں چند تاریخی اور جغرافیائی کتابیں یوروپی زبانوں سے ترجمہ کی گئیں لیکن ان سے بھی ترکی کے باہر کوئی واقف نہیں تھا۔

یورپ کے عروج میں مسلمانوں کا حصہ

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی، جنوبی فرانس اور اسپین سے ہوا۔ یہ وہ ملک تھے جو اسلامی دنیا سے قریب تھے اور جن کے مسلمانوں سے تعلقات قائم تھے۔ یورپ والوں نے مسلمانوں سے کاغذ بنانا، ہندسوں اور صفر کا استعمال سیکھا۔ قطب نما اور بارود بنانا بھی غالباً انہوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا۔ اندلس کے شہر طلیطلہ میں ۱۰۸۵ء کے بعد دو سو سال تک عربی کتابوں

کے لاطینی زبان میں ترجمے ہوتے رہے۔ اس کے بعد ترجموں کا یہ سلسلہ صقلیہ، اٹلی اور جنوبی فرانس تک پھیل گیا۔ اطالوی شاعر دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) کی کتاب ''طربیۂ خداوندی'' اور ہسپانوی ادیب سروانتے (۱۵۴۷ء تا ۱۶۱۶ء) کی کتاب ''دان کوئک زوت'' کو یورپی ادب کے احیاء میں بنیادی مقام حاصل ہے، لیکن یہ دونوں کتابیں مسلمان مصنفین کے زیر اثر لکھی گئی تھیں۔ 'طربیہ خداوندی' کے بارے میں اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ابن عربی کی 'فتوحاتِ مکیہ' سے ماخوذ ہے۔ راجر بیکن (۱۲۱۴ء تا ۱۲۹۴ء) اور فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) کو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ میں بنیادی مقام حاصل ہے، لیکن ان دونوں نے عربی کتابوں سے استفادہ کر کے یورپ میں علم و حکمت کی بنیاد ڈالی۔ رازی، ابن سینا، ابن رشد، غزالی، ابن عربی، ابن حزم اور ابن ہیثم وہ ممتاز مسلمان حکماء تھے جن کی تحریروں نے یورپ میں نئی بیداری پیدا کی۔ مشہور فرانسیسی محقق موسیو رینان نے کولمبس کے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن رشد ان مصنفین میں سے ہے جس کی تصنیفات پڑھ کر کولمبس کو امریکہ کے وجود کا خیال پیدا ہوا۔[1]

یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر مسلمانوں کا جو اثر پڑا اب اہل یورپ اس کا کھل کر اعتراف کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

''اگر چہ یورپ کی ترقی اور نشوونما کا ایک بھی پہلو ایسا نہیں جس پر مسلمانوں کا اثر نہ پڑا ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ اثر تحقیق کے میدان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے''[2]

موسیو رینان نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:

مراکش اور قاہرہ میں جو کتاب لکھی جاتی تھی وہ اس سے کم مدت میں جتنی کہ آجکل ایک اہم کتاب جرمنی سے رائن پار پہنچنے میں لگتی ہے پیرس یا کولون میں مشہور ہو جاتی تھی''[3]

ادھر یورپ کی ترقی شروع ہوئی ادھر اسلامی تاریخ کا دوسرا دَور شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی علمی ترقی رُک گئی تھی۔ وہ صرف اچھی عمارتیں بنانا اور مصوری کرنا جانتے تھے، لیکن ریاضی،

---

(۱) موسیو رینان: ابن رشد و فلسفہ ابن رشد ص ۳۰۶ (اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۹ء)

(۲) Briffault: Making of Humanity

(۳) موسیو رینان: ابن رشد و فلسفہ ابن رشد ص ۲۰۱ (اردو ترجمہ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۹ء)

طب، جغرافیہ اور سائنس سے متعلق علوم بھولتے جارہے تھے۔ اس کے برخلاف یورپ علمی ترقی کررہا تھا۔ وہاں فلسفہ، سائنس، ریاضی اور جغرافیہ میں نئی کتابیں لکھی جارہی تھیں اور یورپ کے سیاح دُور دُور کے ملکوں کے سفر کررہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان اعظم اور احمد کوپریلی کے زمانہ میں یورپ اتنا ترقی یافتہ ہوگیا کہ اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ یورپ کی فوجوں کے پاس ایسے ایسے ہتھیار ہوگئے جو مسلمانوں کے پاس نہیں تھے اور ان کی فوجیں بہت منظم ہوگئیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ بارود مسلمانوں نے ایجاد کی لیکن خود وہ اس کا استعمال بھول گئے۔ سب سے پہلی باقاعدہ فوج عثمانیوں نے مرتب کی لیکن وہ اسے مزید ترقی نہ دے سکے۔ یورپ والوں نے علم طب، ریاضی، سائنس اور جغرافیہ میں بھی ترقی کی۔ وہ نئی نئی ایجادیں کرنے لگے۔ یورپ میں بڑے بڑے شفاخانے اور مدرسے قائم ہوگئے۔ لوگوں میں سیر وسیاحت کا ویسا ہی شوق پیدا ہوگیا جیسا کہ عہد عروج میں مسلمانوں میں تھا۔ وہ چین جاپان تک سفر کرنے لگے اور ۱۴۹۲ء میں یعنی اندلس سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ کے سال ہسپانیہ کے ایک ملاح کولمبس نے سمندر پار ایک نئی دنیا دریافت کرلی جو امریکہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۴۹۸ء میں پرتگال کے جہاز ران واسکوڈی گاما نے افریقہ کے جنوب سے ہوکر ایشیا آنے کا راستہ معلوم کرلیا۔ اس سے پہلے خشکی کے راستہ آمدورفت تھی، لیکن اس راستہ پر عثمانیوں کی سلطنت قائم تھی۔ یورپ والے ان کی وجہ سے ایشیا تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایشیا کے یہ ملک فوجی لحاظ سے ترکوں سے کمزور تھے اس لیے یورپ والوں نے ان پر حملے شروع کردیئے۔

اس زمانہ میں انڈونیشیا اور فلپائن میں اسلام پھیل گیا تھا اور وہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ہسپانیہ والوں نے سب سے پہلے فلپائن سے مسلمانوں کو نکالا۔ اس کے بعد ہالینڈ والوں نے انڈونیشیا کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ زمانہ سترھویں صدی کا تھا۔ اس کے بعد برکوچک پاکستان وہند میں انگریزوں نے، شمالی اور مغربی افریقہ میں فرانسیسیوں نے اور سلطنت عثمانیہ کے شمالی حصوں میں روسیوں نے مداخلت شروع کردی۔

نیا سماجی ڈھانچہ

یورپ کے عروج کے اس دَور میں سائنس اور علم وادب کی ترقی کو اگرچہ بنیادی اہمیت

حاصل ہے، لیکن یورپ کے عروج وترقی کے اور اسباب بھی ہیں۔ ان میں جمہوری نظام کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ جمہوریت انسان کا ایک ایسا فطری حق ہے جسے انسان ہمیشہ عزیز رکھتا چلا آیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خلافت راشدہ کے زمانہ میں جمہوریت کا ایک مثالی نظام پیش کیا گیا تھا۔ لیکن عہد قدیم میں طاقت، دلیر اور قوی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو اپنے بااثر ساتھیوں کی مدد سے مخالفوں کو طاقت کے زور پر ختم کر دیتے تھے اور پھر ایسے مطلق العنان حکمران بن جاتے تھے کہ اپنے حکم کے آگے کسی کی رائے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن یورپ میں علم وادب کی ترقی کے ساتھ لوگوں میں اپنے حقوق اور ان کی حفاظت کا احساس بڑھتا چلا گیا، پھر صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ عوام کی اہمیت بھی بڑھتی چلی گئی اور اب ان کا دبانا آسان نہیں رہا۔ عوام نے بادشاہوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اختیارات کم کر دیں اور حکومت کا نظم ونسق ان نمائندوں کے سپرد کر دیں جو عوام کی طرف سے منتخب کیے ہوئے ہوں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ہر ملک میں پارلیمان یا مجالس قانون ساز بن گئی۔ ان مجلسوں کے رکن عوام کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ پھر مجالس قانون ساز کے یہی ارکان حکومت کے لیے وزیروں کو منتخب کرنے لگے۔ اس طرح بادشاہوں کے اختیارات بڑی حد تک چھین لیے گئے اور حکومت براہ راست عوام کے ہاتھوں میں آ گئی۔ بعض ملکوں میں تو بادشاہت بالکل ختم کر دی گئی اور حکومت کی قیادت صدر یا وزیر اعظم کے سپرد کر دی گئی جو عوام کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ یہ اختیارات چونکہ جمہور یعنی عوام کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ نیا سیاسی نظام جمہوریت کہلاتا ہے۔

جدید دَور کی دوسری خصوصیت معاشی مساوات ہے۔ پرانے زمانہ میں لوگ یا تو انتہائی دولت مند ہوتے تھے یا انتہائی مفلس اور غریب۔ دولت مندوں کو ہر قسم کا عیش وآرام اور ہر قسم کی ممکن سہولتیں حاصل ہوتی تھیں، لیکن عوام زیادہ تر اس قسم کے آرام اور سہولتوں سے محروم رہتے تھے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں امیر اور غریب کے اس فرق کو دُور کرنے کی بڑی کوششیں کی گئی تھیں، لیکن بعد میں کچھ تو بادشاہت کے استبدادی نظام کی وجہ سے دولتمندوں کی یہ اجارہ داری ختم نہ ہو سکی اور کچھ وسائل زندگی کی کمی کی وجہ سے عوام کی زندگی کا معیار بلند نہ ہو سکا۔ جدید دَور میں جہاں ایک طرف سیاسی اقتدار عوام کے ہاتھ میں آیا وہاں دوسری طرف سائنس اور صنعت کی ترقی کی بدولت روزی کمانے کے ذرائع بھی بڑھ گئے

اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہونے لگا۔ اگرچہ یورپ، امریکہ اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں اب بھی امیر اور غریب کے درمیان کافی بڑا فرق ہے، لیکن افلاس بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے اور اب وہاں عام لوگ بھی زندگی کی تمام سہولتوں سے کسی نہ کسی حد تک فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔

معاشی مساوات حاصل کرنے کے لیے یورپ والوں نے جو اصلاحیں کیں ان میں دو قابل ذکر ہیں، اول یہ کہ انہوں نے بڑی بڑی زمینداریاں ختم کر دیں اور کسانوں کو یا تو زمین کا مالک بنا دیا یا قوانین بنا کر ان کے حقوق کا تحفظ کر دیا۔ اس طرح ایک طرف کسان زمینداروں کے ظلم سے بچ گئے، جو اپنی زمینداریوں میں خود مختار بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور دوسری طرف زمینوں کے مالک ہو جانے کی وجہ سے کھیتی باڑی سے زیادہ دلچسپی لینے لگے اور اس طرح پیداوار بڑھ گئی۔

دوسری اصلاح صنعتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت بہتر بنانے سے متعلق ہے۔ جس طرح دیہات میں زمیندار کسانوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے اسی طرح شہروں میں صنعت کار، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ یہ کارخانہ دار مزدوروں سے کام تو زیادہ لیتے تھے لیکن ان کو اجرتیں کم سے کم دیتے تھے مزدوروں نے اپنی انجمنیں بنا کر کارخانہ داروں کی ان سختیوں اور بے انصافیوں کا مقابلہ کیا۔ اس جدوجہد میں ان کو کامیابی ہوئی اور مغربی حکومتوں نے بالآخر ایسے قوانین بنا دیئے جن سے کارخانہ داروں کی بادشاہت ختم ہو گئی۔ مزدوروں کے کام کرنے کا وقت بھی کم ہو گیا اور ان کی اجرتوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔

اہم واقعات

۱۴۴۲ء پرتگالی جہاز ران افریقہ میں خلیج گنی پہنچے۔

۱۴۸۶ء جہاز ران بارتھولومیو (Bartholomeo) جنوبی افریقہ میں راس امید تک پہنچا۔

۱۴۹۲ء ہسپانوی جہاز ران کولمبس امریکہ پہنچ گیا۔

۱۴۹۸ء پرتگالی جہاز ران واسکوڈی گاما جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر مالندی کے راستے کالی کٹ پہنچ گیا۔ اور اس طرح یورپ اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ دریافت کر لیا۔

۱۴۹۹ء اطالوی جہازوں ایمیریگو (Amerigo) جنوبی امریکہ کے انتہائی جنوبی گوشہ تک پہنچ گیا۔

۱۵۰۸ء پرتگالیوں نے گجرات میں دیو کے پاس گجراتی مصری بحری بیڑے کو شکست دی۔

۱۵۱۰ء پرتگالیوں نے بیجاپور سے بندرگاہ گوا چھین لیا اور شہر کے تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔

۱۵۱۱ء پرتگالیوں نے جزیرہ نما ملایا کی بندرگاہ ملکا پر قبضہ کر لیا۔

۱۵۱۳ء ہسپانوی جہازراں بلبوا (Balboa) نے خاکنائے پناما کو پار کر کے پہلی مرتبہ بحرالکاہل کا نظارہ کیا۔

۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۲ء پرتگالی جہازراں فرڈینڈ ماجیلان (Magellan) جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر فلپائن پہنچا جہاں وہ مر گیا، لیکن اس کے ساتھی جنوبی افریقہ سے ہوتے ہوئے پرتگال واپس پہنچ گئے اور اس طرح انہوں نے ساری دنیا کا پہلی مرتبہ چکر لگایا۔

۱۰۸۵ء سے ۱۵۰۰ء تک: عربی کتابوں کے ترجمہ کا دور۔ ترجمے کے سب سے بڑے مرکز طلیطلہ (اندلس) اور جزیرہ صقلیہ تھے۔ سلرنو (نیپلز کے پاس) کے طبی مدرسے میں بھی ۱۰۷۰ء سے ۱۰۸۷ء تک عربی سے ترجمے کیے گئے۔

۱۴۵۰ء کے قریب گوٹنبرگ (Gutenberg) نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا پولستانی ہیئت داں کوپرنیکس (Copernicus) ۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

اطالوی سائنس داں گیلیلیو (Galileo ۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ء) نے دوربین بنائی۔

برطانوی سائنس دان نیوٹن (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) نے کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا۔

جرمن فلسفی اور ریاضی دان ولہم لائبنز (Wilhelm Leitnitz) ۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء نے علم الاحصا (Statistics) کی بنیاد ڈالی جس سے انجینئرنگ کی ترقی میں بڑی مدد ملی۔

۱۷۶۹ء میں جیمس واٹ نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا۔

باب ۲۸

محمد شاہ سے بہادر شاہ تک

(۱۷۲۰ء تا ۱۸۵۸ء)

(۱) تیموری سلطنت کا آخری دَور

دہلی کی سلطنت کا نیا تیموری تاجدار محمد شاہ (۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۸ء) اپنے باپ دادا کی تمام خوبیوں سے محروم تھا۔ آرام طلب اور عیش پسند تھا۔ انتظامی صلاحیت، تدبر اور دُور اندیشی سے کوسوں دُور تھا۔ تاریخ میں اس کو بجا طور پر محمد شاہ رنگیلے کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ تیموریوں کے پرامن ڈیڑھ سوسالہ دَور کی خوشحالی نے نہ صرف شاہی خاندان کو عیش و عشرت کا دلدادہ بنا دیا تھا' بلکہ امراء اور رؤسا بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ آرام طلبی، محنت اور تکلیف سے فرار، قربانی سے گریز، بد دیانتی خود غرضی اور جاہ طلبی جو کثرت دولت کی لازمی خرابیاں ہیں' وہ تیموری سلطنت کے امراء میں پوری طرح سرایت کر چکی تھیں۔ سخت کوش اورنگ زیب نے اپنے دَور میں ان کمزوریوں کو دُور کرنے کی بہت کوشش کی اور اپنے سخت نظم و ضبط کی وجہ سے امراء اور سرکاری عہدے داروں کو بے قابو نہیں ہونے دیا، لیکن جب تخت دہلی پر محمد شاہ رنگیلے جیسے اشخاص بابر اور اورنگ زیب کے جانشین ہونے لگے، تو نتیجہ زوال کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب تک بادشاہ سے وفاداری کا جذبہ سلطنت کی مضبوطی کا ضامن تھا، لیکن اب تیموری امراء بادشاہ کی بجائے اپنی ذات کے وفادار ہو گئے تھے۔ یہ امراء ترکستانی، ایرانی اور ہندوستانی گروہوں میں تقسیم تھے۔ جب تک اورنگ زیب کا مضبوط ہاتھ موجود رہا۔ ان گروہوں کے درمیان اتحاد قائم رہا۔ لیکن اب جب نااہل بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھنے لگے، تو یہ اتحاد ختم ہو گیا۔ ہر گروہ یہ کوشش کرنے لگا کہ بادشاہ اس کے اثر میں رہے۔ نتیجہ خانہ جنگی، انتشار اور بدامنی کی صورت میں نکلا۔ اسلامی ہند اگرچہ اورنگ زیب کے زمانے سے قحط الرجال میں مبتلا تھا، لیکن آدمیوں کا ایسا قحط بھی نہیں تھا کہ کوئی قابل آدمی ملک میں موجود ہی نہ ہو۔ نظام الملک آصف جاہ جنہوں نے بعد میں دکن میں

ایک طاقتور ریاست قائم کر لی یقیناً ایسے لوگوں میں سے تھے جو زوال سلطنت کو روک سکتے تھے، لیکن امراء کے باہمی اختلاف اور تعصبات نیز بادشاہ کی نااہلی نے ان کو اور ان جیسے دوسرے امیروں کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا، ورنہ سلطنت عثمانیہ کی طرح یہاں بھی چند وزیر ایسے نکل آتے جو زوال سلطنت کو کچھ مدت تک روکنے میں کامیاب ہو جاتے۔

محمد شاہ کے زمانے میں سب سے پہلے مہاراشٹر کے مرہٹوں نے زور پکڑا۔ ان جفاکش مرہٹوں کو جن میں مسلمانوں سے آزادی حاصل کرنے کی بڑی خواہش تھی، اورنگ زیب کے زمانے میں بڑی مشکل سے قابو میں رکھا گیا تھا۔ اب ان کو کئی ایسے اچھے رہنما مل گئے، جن کا محمد شاہ جیسا عیش پسند بادشاہ اور اس کے آرام طلب اور خودغرض امراء مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان مرہٹوں نے ۱۷۱۹ء اور ۱۷۲۴ء کے درمیان پانچ سال کی مختصر مدت میں مہاراشٹر سے مالوہ تک وسط ہند کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ۱۷۳۱ء میں گجرات کا زرخیز اور دولت مند صوبہ بھی سلطنت دہلی سے چھین لیا۔ ۱۷۳۷ء میں بادشاہ نے مجبور ہو کر دریائے نربدا سے دریائے چنبل تک کے علاقے پر ان کی حکومت تسلیم کر لی۔

نادر شاہ کا حملہ

ادھر جنوب میں مرہٹوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اُدھر شمال سے ایک نئی مصیبت آ پڑی۔ ایران کے حکمران نادر شاہ نے افغانوں کو ایران سے نکالنے کے بعد ان کے مرکز قندھار پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں سے کچھ افغان سرداروں نے فرار ہو کر کابل میں پناہ حاصل کر لی تھی۔ یہ شہر چونکہ دہلی کی تیموری سلطنت میں شامل تھا، اس لیے نادر شاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ وہ ان لوگوں کو ایران کے سپرد کر دے۔ جس وقت نادر شاہ کا یہ خط آیا محمد شاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ نشہ میں تو تھا ہی خط کا کوئی معقول جواب دینے کے بجائے یہ کہہ کر کہ یہ بے معنی چیز ہے، خط کو پانی میں ڈبو دیا۔ نادر ایک محنتی اور جفاکش سپہ سالار تھا۔ وہ بھلا محمد شاہ کی اس حرکت کو کہاں برداشت کر سکتا تھا، فوراً فوج لے کر چڑھ دوڑا اور کابل، پشاور اور لاہور کو فتح کرتا ہوا ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قریب آ گیا۔ یہاں تھانیسر کے مقام پر محمد شاہ نے مقابلہ کیا۔ محمد شاہ تو آرام طلب تھے ہی۔ اس کے ساتھی بھی کچھ کم نہ تھے۔ لڑائی تو شروع ہو گئی لیکن مغلیہ توپ خانہ

وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ بس اب کیا تھا نادر شاہ کے توپخانہ نے کئی ہزار مغل فوجیوں کو بھون ڈالا اور اس کے صرف چند سو آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔

نادر شاہ کا حملہ بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ دلی کے باشندے تین سو سال سے امن و امان کی زندگی گزار رہے تھے اور تیمور کے قتل عام کے بعد سے ان کو کسی تباہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، لیکن نادر شاہ نے تیمور کی یاد تازہ کردی۔ اس نے شہر میں قتل عام کیا جس میں ہزاروں انسان مارے گئے اور ہزاروں کے گھر بار لوٹ لیے گئے۔ نادر اگر بابر اور اکبر کی طرح یہاں اپنی حکومت قائم کر لیتا تو شاید کچھ فائدہ بھی ہوتا، لیکن وہ تباہی پھیلا کر اور تیموریوں کا کروڑوں کا خزانہ اپنے ساتھ لے کر ایران چلا گیا۔

نادر کے اس حملے کے بعد تیموری سلطنت کا ڈر لوگوں کے دل سے نکل گیا اور ملک میں ہر جگہ بغاوتیں ہونے لگیں اور تیموری صوبے داروں نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ چند سال کے اندر دکن، سندھ، بنگال اور اودھ میں مستقل حکومتیں قائم ہوگئیں اور ۱۷۵۲ء میں کشمیر بھی بادشاہ دہلی کے ہاتھ سے نکل گیا۔

محمد شاہ اور اس کے جانشین احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) اور عالمگیر دوم (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) سلطنت کے اس زوال کو نہ روک سکے۔ وہ امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھے اور یہ امراء ایرانی اور تورانی پارٹیوں میں تقسیم تھے اور ایک دوسرے سے برسرپیکار۔ ان کو اپنے مقصد کے حصول اور فریق مخالف کو شکست دینے کے لیے مرہٹوں سے مدد لینے میں بھی عار نہیں تھا۔ ہر گروہ یہ چاہتا تھا کہ بادشاہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے۔ ایک امیر شہاب الدین کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا کہ اس نے پہلے احمد شاہ کو معزول کرکے اندھا کردیا اور پھر اس کے جانشین عالمگیر ثانی کو قتل کرکے اس کے لڑکے شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ لیکن شاہ عالم مارے خوف کے دہلی سے فرار ہو کر الہ آباد چلا گیا اور وہاں نواب اودھ اور پھر انگریزوں کی پناہ حاصل کی جو بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد الہ آباد تک آگئے تھے۔

پانی پت کی تیسری جنگ

ادھر مشرق سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے اُدھر شمال مغرب سے احمد شاہ ابدالی جو

نادر شاہ کے بعد افغانستان کا بادشاہ ہوگیا تھا سلطنت دہلی کے صوبوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ ۱۷۵۶ء میں دہلی پر قابض بھی ہو چکا تھا اور شہاب الدین کو بے دخل کر کے واپس چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی پر شہاب الدین نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی فتح کر لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مرہٹے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ لاہور تک بڑھتے چلے گئے اور ابدالی کے عہدداروں کو لاہور سے نکال دیا۔

مرہٹوں کے اس بڑھتے ہوئے زور سے مسلمانوں کو تشویش پیدا ہوگئی اور مشہور عالم دین شاہ ولی اللہ، روہیلے سردار نواب نجیب الدولہ اور چند دوسرے امراء نے مرہٹوں کا زور توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ ابدالی اس دعوت پر ایک بار پھر ہندوستان آیا۔ دہلی کے قریب پانی پت کے میدان جنگ میں مرہٹوں اور مسلمانوں کے درمیان ۱۴۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو سخت جنگ ہوئی جو پانی پت کی پہلی دو جنگوں سے زیادہ خونریز تھی۔ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ صرف نوے ہزار تھی اور مرہٹہ فوج کی تعداد تین لاکھ، لیکن مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ دو لاکھ مرہٹے جنگ میں کام آئے اور ان کے کئی بڑے بڑے سپہ سالار مارے گئے۔

احمد شاہ ابدالی برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی مدد کے لیے اسی طرح آیا تھا جس طرح اندلس میں یوسف بن تاشفین اور عبدالمومن عیسائی حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے اندلسی مسلمانوں کی درخواست پر آئے تھے، لیکن یوسف نے اندلس فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی جس کی وجہ سے اندلس کے مسلمان ایک سو سال تک عیسائی حملے سے محفوظ رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کے برخلاف ہندوستان میں اپنی حکومت قائم نہیں کی اور قندھار واپس چلا گیا۔ یہ بات اسلامی ہند کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ یہاں کوئی ایسی طاقت یا شخصیت موجود نہیں تھی جو جنوب سے آنے والے مرہٹوں کا یا مشرق سے آنے والے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کر سکے۔ (احمد شاہ ابدالی کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے باب۔ ۳۱)

انگریزوں کی آمد

پرتگال کے ملاح واسکوڈی گاما نے ہندوستان اور چین وغیرہ کی طرف آنے کا بحری راستہ ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شمالی ہند اور مغربی پاکستان میں سکندر لودھی کی حکومت تھی اور دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔

پرتگالیوں کے بعد ولندیزی انگریز اور فرانسیسی بھی مشرقی ملکوں میں آنا شروع ہو گئے۔ یورپ کی ان قوموں کا سب سے بڑا مقصد تجارت تھا۔ یہ تاجر مشرقی ملکوں کا بنا ہوا سامان سوتی اور ریشمی کپڑے اور جزائر کا گرم مصالحہ یورپ لے جاتے تھے۔

تیموری سلاطین کے زمانہ میں انگریزوں نے تجارت کی اجازت لے لی تھی اور کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ ان انگریزوں نے آہستہ آہستہ ان تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر دیا اور وہ یہاں ہر قسم کا لڑائی کا سامان جمع کرنے لگے۔ کلکتہ کے قریب ہگلی میں پرتگالی باشندوں کی بھی اسی قسم کی ایک بستی تھی۔ شاہجہاں کے زمانہ میں انہوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن شاہی فوجوں نے ان کو وہاں سے نکال دیا۔ انگریزوں نے اورنگ زیب کے زمانہ میں بمبئی میں لڑائی کرنا چاہی، لیکن ان کو بھی ناکامی ہوئی اور معافی مانگنے کے بعد اورنگ زیب نے ان کو رہنے کی اجازت دے دی، ہگلی کے پرتگیزیوں کی طرح بے دخل نہیں کیا۔

لیکن جب تیموری سلطنت کو زوال ہوا اور ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو انگریزوں کی بَن آئی۔ انہوں نے اپنے تجارتی قلعوں میں فوجوں کی تعداد بڑھا لی اور کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے سب سے زیادہ قوت کرناٹک کے علاقہ میں حاصل کی جہاں شہر مدراس ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جب اس علاقہ میں وہ طاقتور ہو گئے تو انہوں نے سمندر کے راستہ بنگال پر حملہ کیا۔ بنگال کا حکمران اس زمانہ میں نواب سراج الدولہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ اور انگریزوں میں لڑائی ہوئی۔ سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ پلاسی کی لڑائی ہندوستان کی فیصلہ کن لڑائی سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور وہ مشرقی پاکستان سے بنارس تک ایک بہت بڑے علاقہ پر قابض ہو گئے۔ چند سال بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور نواب اودھ کو شکست دے کر الہ آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو جو انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد میں تھا، تخت پر بحال رکھا اور اودھ کے شجاع الدولہ کو اس کا وزیر اور روہیلے سردار نجیب الدولہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ شاہ عالم کی غیر حاضری میں نجیب الدولہ نے ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک بڑی قابلیت سے حکومت کی

اور دہلی کو جاٹوں اور دوسرے سرکش گروہوں کے حملوں سے بچایا۔

تیموری سلطنت کا خاتمہ

پانی پت کی جنگ میں اگرچہ مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی تھی اور چند سال کے لیے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا، لیکن یہ شکست فیصلہ کن نہیں تھی۔ چند سال بعد مرہٹوں نے پھر شمال کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور ۱۷۶۹ء میں دریائے چنبل پار کر لیا اور ۱۷۷۲ء میں پھر دہلی پر قابض ہو گئے۔ شاہ عالم جو اب تک انگریزوں کی پناہ میں تھا اب اس نے خود کو مرہٹوں کی حفاظت میں دے دیا اور دہلی آ گیا۔ اس نے مرہٹہ سردار پیشوا کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ ۱۷۸۸ء میں روہیلہ سردار غلام قادر نے جو نجیب الدولہ کا پوتا تھا، دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ مرہٹوں نے فوراً جوابی کاروائی کی اور غلام قادر روہیلے کو دہلی سے نکال دیا اور شاہ عالم کو بحال کر دیا، لیکن اب حقیقی حکومت مرہٹوں کی تھی۔ شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ تھا۔ چنانچہ مثل مشہور ہے:

سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم (۱)

۱۷۹۵ء کے بعد مرہٹے خانہ جنگی میں مبتلاء ہو گئے اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر میں کوئی ایسی طاقت نہیں رہی جو انگریزوں کا مقابلہ کر سکے۔ نظام دکن اور مرہٹوں کے ایک گروہ نے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں دہلی کے پاس مرہٹوں کے دوسرے گروہ کو شکست دے کر دہلی، آگرہ اور علی گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے بھی انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ ان کے کچھ علاقوں کو انگریزوں نے براہِ راست اپنے انتظام میں لے لیا اور کچھ میں ان کی ریاستوں کو برقرار رکھا، لیکن تمام اہم اختیارات سے محروم کر دیا۔ اب شاہ عالم انگریزوں کی حفاظت میں چلا گیا اور انگریزوں نے لال قلعہ میں بھی فوجی دستہ تعینات کر دیا۔ شاہ عالم کے بعد اس کے دو جانشین اکبر شاہ دوم (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۸ء) بھی صرف لال قلعہ کے حکمران تھے اور انگریزوں کے پنشن خوار۔ ۱۸۵۷ء میں جب برطانوی فوج کے ہندوستانی دستوں نے بغاوت کی تو انہوں نے دہلی پر

(۱) پالم شہر دہلی کی حدود ہی میں ایک جگہ ہے۔ آج کل یہاں ہوائی اڈہ ہے۔ قدیم شہر دہلی کی فصیل سے پالم کا فاصلہ صرف دس بارہ میل ہے۔

قبضہ کر کے بہادر شاہ کو جنگ آزادی کی قیادت سپرد کرنی چاہی لیکن یہ کام بوڑھے بادشاہ کے بس کا نہ تھا۔ بغاوت یا جنگ آزادی ناکام ہوگئی۔ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے ۲۲۔ستمبر ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ لال قلعہ میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کے جرم میں ۹۔مارچ ۱۸۵۸ء کو اس کو رنگون جلاوطن کر دیا۔ جہاں ۱۳۔جمادی الاول مطابق ۷۔نومبر ۱۸۶۲ء/۹/۷/۱۲ھ کو اس کا انتقال ہوا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کا انگریزوں نے مسلمانوں سے بڑا سخت انتقام لیا۔ دہلی میں ان کے محلے کے محلے اجاڑ دیئے اور ان کی جگہ ہندوؤں کو بسا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے تحریک مجاہدین کے خلاف کاروائی کی۔ پٹنہ کے محلے صادق پور کے گھروں کو ڈھا کر زمینوں پر ہل چلا دیا۔ اس لیے کہ ان کا تعلق ان مجاہدین سے تھا جو بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد سرحد کے پہاڑوں میں رہ کر ابھی تک انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں انبالہ میں مجاہدین پر مقدمہ چلایا گیا۔ ہزاروں مسلمان کالا پانی بھیج دیئے گئے اور بے شمار علماء کو پھانسی دے دی گئی۔ مسلمانوں کی جاگیریں چھین لی گئیں اور ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں مسلمان ہندوستان میں سب سے جاہل اور سب سے غریب ہو گئے۔ (تحریک مجاہدین کے لیے ملاحظہ کیجیے اگلا باب)

زکریا خاں اور مرشد قلی خاں

سلطنت تیموریہ کے دورِ زوال میں پنجاب میں عبدالصمد خان جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۶ء تک پنجاب کے صوبے دار رہے اور ان کے صاحبزادے نواب زکریا خاں جو ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۵ء تک صوبے دار رہے اور بنگال میں مرشد قلی خاں بڑے نیک نام اور قابل صوبے دار تھے۔ نواب زکریا خاں خاص طور پر رعایا پروری اور بے تعصبی کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ ان کی کوششوں سے نادر شاہ نے ہزاروں ہندوستانی قیدیوں اور ہنرمندوں کو جن کو وہ اپنے ساتھ ایران لے جا رہا تھا رہا کر دیا۔ زکریا خاں نے اپنی دانشمندی سے لاہور کو نادر شاہی قتلِ عام اور لوٹ مار سے بچایا۔ جو حیثیت نواب زکریا خاں کی پنجاب میں تھی، وہی حیثیت بنگال میں مرشد قلی خاں کی تھی جو اورنگ زیب کے آخری دور میں بنگال کے صوبے دار مقرر ہوئے تھے۔ مرشد قلی خاں ۱۷۰۴ء سے ۱۷۲۵ء تک بنگال کے صوبے دار رہے۔ وہ آخر تک سلطنت دہلی کے

وفادار رہے اور ان کی بدولت بنگال کا خزانہ سلطنت کے لیے ایک ایسے زمانے میں سہارا بنا رہا، جب کہ دوسرے صوبے انتشار اور ہنگاموں کا شکار تھے۔ مرشد آباد کا شہر ان ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس شہر کو مرشد قلی خاں نے ڈھاکہ کی بجائے بنگال کا صدر مقام قرار دیا تھا۔

دور زوال میں علم ادب

تیموری دَور کی تاریخ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسلامی ہند کی سب سے بڑی علمی شخصیت اور عظیم ترین مفکر شاہ ولی اللہ اسی دَورِ زوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ سارا ملک اور خود دارالسلطنت دہلی ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ان ہی ہنگاموں میں علمی تحقیق کی اور ان ہی ہنگاموں میں سوچا اور ان کی بدولت اسلامی ہند میں ایک ایسی زبردست علمی تحریک شروع ہوئی جس نے اسلامی دنیا کو اگلی دو صدیوں میں بے مثل عالم، فاضل اور مفکر دیئے۔ خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے میں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ اسمٰعیل شہید جیسی علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی بدولت اسلامی ہند میں اسلامی علوم کا احیاء ہوا اور سیاسی اور سماجی بیداری کی تحریک شروع ہوئی ہم نے اسی کتاب میں اگلے ایک باب میں شاہ ولی اللہ اور تحریک مجاہدین کے عنوان کے تحت اور تمام بزرگوں اور عظیم ہستیوں کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں ہم شاہ ولی اللہ کے خانوادہ سے ہٹ کر چند دوسرے مصنفوں کا حال لکھتے ہیں جو تیموریوں کے دورِ زوال میں دہلی اور نواحی علاقوں میں ہوئے۔

دَورِ زوال کے ممتاز مؤرخوں میں ایک محمد ہاشم خوانی خاں (۱۶۶۴ء تا ۱۷۳۳ء) میں جن کو غلطی سے خافی خاں لکھا جاتا ہے۔ انہوں نے 'منتخب اللباب' کے نام سے ہندوستان کے تیموریوں کی ایک مفصل اور مستند تاریخ لکھی ہے جس میں بابر سے محمد شاہ تک (۱۷۲۹ء تک) کی تاریخ پیش کی ہے۔ یہ دورِ زوال کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے اور اسلامی ہند میں لکھی جانے والی چند اچھی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔

اُردو زبان کی نشوونما اور ترقی اس دَور کی خصوصیت ہے۔ اگرچہ اُردو میں نظم و نثر کا آغاز سولھویں صدی سے شروع ہو گیا تھا، لیکن اُردو نے مکمل شکل اسی دَور میں اختیار کی۔ اُردو کے عظیم شاعر سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۱ء)، مرزا

مظہر جان جاں (۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۱ء)، سودا (۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۰ء) میر درد (۱۷۱۹ء تا ۱۷۸۵ء) اور میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء) اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دَور کے آخر میں اُردو شاعری اپنے عروج پر پہنچ گئی اور ذوق (۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء) مومن (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۱ء) نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء تا ۱۸۳۰ء) اور غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) عظیم شاعر پیدا ہوئے۔ ان آخر الذکر شاعروں کا تعلق اگرچہ ایک ایسے دَور سے ہے جب انگریزوں کی حکومت شروع ہو چکی تھی، لیکن ان شاعروں کا دہلی کے دربار سے گہرا تعلق تھا۔ ذوق آخری تیموری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور غالب بھی شاہی دربار سے برسوں تک وابستہ رہے۔ غالب فارسی کے بھی صف اول کے شاعر تھے اور انہوں نے اپنے خطوط کے ذریعے اُردو نثر نگاری کے بھی بہت اچھے نمونے پیش کیے۔ بہادر شاہ ظفر خود بھی اردو کے ممتاز اور صاحب طرز شاعر تھے۔

دہلی کے آخری تیموری سلاطین

(۱۷۲۰ء/۱۱۳۲ھ تا ۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ)

(۱) محمد شاہ	۱۷۲۰ء/۱۱۳۲ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ
(۲) احمد شاہ	۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ تا ۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ
(۳) عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ تا ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ
(۴) شاہ عالم ثانی	۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ
(۵) اکبر شاہ ثانی	۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ تا ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ
(۶) بہادر شاہ	۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ تا ۱۸۵۷ء/۱۲۷۵ھ
وفات	۱۸۶۲ء

(۲) بنگال

(۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۵ء)

نادر شاہ کے حملے کے بعد برصغیر پاکستان و ہند میں جن علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم ہوئی تھیں ان میں ایک بنگال تھا۔ بنگال دہلی کی سلطنت کا انتہائی زرخیز اور خوشحال صوبہ تھا۔ اورنگ زیب

کے زمانے میں یہاں مرشد قلی خاں (۱۷۰۴ء تا ۱۷۳۹ء) صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ جس نے مرشد آباد کا شہر آباد کر کے بنگال کا صدر مقام ڈھاکہ سے مرشد آباد منتقل کر دیا تھا۔ مرشد قلی خان کے بعد اس کا داماد شجاع الدین خاں (۱۷۲۵ء تا ۱۷۳۹ء) صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس کے بعد شجاع الدین کا بیٹا سرفراز خاں صوبہ دار رہا، لیکن جب نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا، تو سرفراز خاں نے بنگال میں نادر کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔ اس پر بہار کے صوبہ دار علی وردی خاں نے سرفراز پر غداری کا الزام لگایا اور محمد شاہ سے اپنے لیے بنگال کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کر کے سرفراز خاں کو بے دخل کر دیا اور بنگال پر قبضہ کر لیا۔

علی وردی خاں (۱۷۴۰ء تا ۱۷۵۶ء) نے بڑی قابلیت سے بنگال پر حکومت کی۔ موجودہ صوبہ بہار اور اڑیسہ بھی اس کی حکومت میں شامل تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت چونکہ اب انتشار کا شکار ہو گئی تھی اس لیے علی وردی خاں نے ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے حکومت کی، لیکن وہ دہلی کے بادشاہ کی بالادستی کو تسلیم کرتا تھا اور خطبہ اور سکہ بادشاہ دہلی کا جاری رکھا۔

پلاسی کی جنگ

یوروپی قوموں انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں نے دہلی کے تیموری بادشاہوں سے برصغیر میں تجارت کرنے کی اجازت لے رکھی تھی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف مقامات پر زمینیں لے کر تجارتی کوٹھیاں بنالی تھیں۔ انگریزوں نے اس قسم کی کوٹھیاں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں بنا رکھی تھیں۔ بعد میں انہوں نے حفاظت کے بہانے ان کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر لیا۔ جب دہلی کی حکومت کو زوال ہوا اور ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو انگریزوں نے ان قلعوں اور بستیوں سے جو فوجی چھاؤنیوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں، ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ علی وردی خاں جب تک زندہ رہا کلکتہ کی انگریزی بستی پر اس نے کڑی نظر رکھی، لیکن اس کے بعد جب اس کا نواسہ سراج الدولہ مرشد آباد کے تخت پر بیٹھا تو وہ انگریزوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ انگریزوں نے بنگال میں سازش کا جال بچھا دیا اور انہوں نے صرف تین ہزار فوج سے ۲۲۔ جون ۱۷۵۷ء کو مرشد آباد کے قریب پلاسی کے میدان جنگ میں سراج الدولہ کی تقریباً ستر ہزار فوج کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ

سراج الدولہ کی شکست کے اسباب میں انگریزوں کی خفیہ سازشوں اور سراج الدولہ کے ساتھیوں اور اس کے رشتہ دار میر جعفر کی غداری کا بھی بڑا حصہ ہے، لیکن انگریزوں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ان کی فوجی برتری اور عسکری تنظیم تھی۔ سراج الدولہ کی فوج ایک بھیڑ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی جب کہ انگریزوں کے پاس جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ایک منظم فوج تھی۔ اس کی وجہ سے چند سو انگریزی سپاہیوں نے سراج الدولہ کی کئی ہزار فوج کو شکست دے دی۔

انگریزوں نے سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد میر جعفر کو اس کی خدمات کے صلہ میں بنگال کا نواب بنا دیا۔ تین سال بعد میر جعفر کو معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم (۱۷۶۰ء تا ۱۷۶۳ء) کو نواب بنا دیا، لیکن جب میر قاسم نے انگریزوں کے اشارے پر ناچنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے پھر میر جعفر کو نواب بنا دیا جس کو عوام الناس "انگریز گورنر" کلائیو کا گدھا" کہتے تھے۔ میر قاسم نے اب اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور تیموری حکمران شاہ عالم کی مدد سے جو دہلی چھوڑ کر نواب اودھ کی پناہ میں آیا ہوا تھا، انگریزوں کو نکالنے کا منصوبہ تیار کیا۔ بنارس کے مشرق میں بکسر کے مقام پر ۲۲۔ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو انگریزوں اور اتحادیوں میں دوسری جنگ ہوئی جس میں شاہ عالم کو شکست[1] ہوئی اور بنگال سے اودھ تک انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو گئی۔ اگلے سال انگریزوں نے شاہ عالم سے مقبوضہ علاقے کی دیوانی کا حق بھی حاصل کر لیا اور اس کے معاوضہ میں بادشاہ کو ۲۶ لاکھ روپے سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ میر جعفر کا لڑکا نجم الدولہ ۱۷۶۵ء سے ۱۷۷۲ء تک برائے نام بنگال کا نواب رہا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس کو بھی علیحدہ کر دیا اور نوابی ختم کر دی۔

(۳) اودھ کی حکومت

(۱۷۲۲ء تا ۱۸۵۶ء)

دہلی کی سلطنت تیموریہ کے بعد جو نیم آزاد اور آزاد حکومتیں قائم ہوئیں ان میں ایک اودھ کی حکومت بھی تھی۔ اس کا بانی دربار دہلی کا ایک ایرانی امیر سعادت خاں (۱۷۲۲ء تا

(۱) بکسر کی جنگ میں انگریزی فوج کی تعداد سات ہزار اور ہندوستانی فوج کی تعداد پچاس ہزار تھی۔

۱۷۳۹ء) تھا جس کو تیموری حکمران کی طرف سے برہان الملک کا خطاب ملا تھا۔ اودھ کی ریاست بھی سلطنت دہلی کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھی اور اس کے کئی حکمران بادشاہ دہلی کے عہدیدار تھے۔ سعادت خاں نے کرنال کی جنگ میں اپنے توپ خانے کے ساتھ نادر کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی تھی، صفدر جنگ (۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء) اور شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء) نے وزیر سلطنت کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آ گئی، لیکن انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اس کا وجود ختم نہیں کیا۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ کی ریاست اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ۱۷۷۴ء میں روہیلکھنڈ کے حکمران حافظ رحمت خاں (۱۷۴۹ء/۱۱۶۲ھ تا ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ) کو انگریزوں کی مدد سے شکست دینے کے بعد روہیلکھنڈ کا علاقہ بھی اودھ میں شامل ہو گیا اور ریاست کی حدود گورکھ پور سے دریائے جمنا کے کنارے تک پھیل گئی۔

شجاع الدولہ کے بعد اودھ کی ریاست پر انگریزی دباؤ بڑھ گیا اور نوابان اودھ انگریزوں کے احکام کے آگے بے بس ہو گئے۔ آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے زمانے میں جونپور اور غازی پور کے اضلاع پر اور سعادت علی (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) کے زمانے میں روہیلکھنڈ، اٹاوہ، کانپور، الٰہ آباد، اعظم گڑھ اور گورکھ پور کے اضلاع پر انگریز قابض ہو گئے۔ نوابان اودھ اب انگریزوں کی کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہے تھے، لیکن اس حالت میں غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) نے نواب کا لقب چھوڑ کر بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ بادشاہ دہلی کے ماتحت نہیں رہے۔ اس کے بعد اودھ کے تمام حکمران بادشاہ کہلائے جانے لگے۔ آخری حکمران واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) پر انگریزوں نے بدنظمی کا الزام لگا کر تخت سے الگ کر دیا اور ۱۸۵۶ء میں مملکت اودھ کو برطانوی ہند میں ضم کر لیا۔ واجد علی شاہ کی پنشن مقرر کر دی گئی اور کلکتہ میں رہنے کی اجازت دے دی، جہاں اس کا ۱۸۸۷ء میں انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ اور اس کا معاشرہ

شجاع الدولہ کے زمانے تک اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔ اس کے لڑکے آصف الدولہ

نے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا اور آخر تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ نوابان اودھ کے زمانے میں دارالحکومت لکھنؤ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اس دور میں اس شہر نے ایک معمولی قصبے سے بڑھ کر ایک بڑے شہر کی شکل اختیار کر لی۔ نوابوں نے شاندار عمارتیں بنائیں جو محلوں، باغوں، مسجدوں امام باڑوں اور مقبروں پر مشتمل ہیں، لیکن ان میں جامع مسجد اور قیصر باغ کے دو مقبروں کے علاوہ دوسری عمارتیں فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ نہیں ہیں۔ بہر حال ان میں سے بیشتر عمارتیں آج بھی لکھنؤ کی زینت ہیں۔ شاہانِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ کا شہر شمالی ہند میں دہلی اور آگرے کے بعد تہذیب وشائستگی کا تیسرا بڑا مرکز بن گیا۔ لیکن شاہان اودھ کا یہ دور ہمارے معاشرتی اور اخلاقی زوال کی انتہا ہے۔ شائستگی کے نام پر تصنع، بناوٹ اور نمود و نمائش نے عروج پایا۔ سرکاری سرپرستی میں جنسی آوارگی بڑھی۔ طوائفوں اور بازاری عورتوں کو تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ لکھنؤ میں عزت اور احترام کا مقام دیا گیا۔

شاہانِ اودھ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ خاص طور پر آصف الدولہ کے بعد سے شیعیت کو سرکاری مذہب کی شکل دے دی گئی۔ اس دور میں مذہب کے نام پر نئے نئے مراسم شروع کیے گئے جو ہندوؤں کی مختلف رسوم کی نقل تھے اور جن کے ذریعے ہمارے معاشرہ میں اور شیعی مذہب کی رسوم میں ہندو اثرات داخل ہوئے۔

اردو ادب اور شاعری کی نشوونما میں دہلی کے بعد لکھنؤ کو اہم مقام حاصل ہے۔ دہلی کے زوال کے بعد خاص طور پر نادر شاہ کے حملے کے بعد سے جب دہلی ہنگاموں کا مرکز بن گیا تو یہاں کے اہل فضل وکمال نے روہیل کھنڈ، مرشد آباد، حیدر آباد، ارکاٹ اور میسور کا رُخ کیا جہاں مقامی مسلمان حکومتوں نے ایک حد تک امن کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ ان تمام شہروں میں لکھنؤ سب سے قریب تھا۔ نوابانِ اودھ نے بھی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی اس لیے ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد نے لکھنؤ ہی کا رُخ کیا۔ جو شاعر اس زمانے میں دہلی اور آگرے سے لکھنؤ آئے ان میں خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء)، سودا (۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۰ء)، مصحفی (۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء) جرأت متوفی ۱۸۱۰ء، انشاء (۱۷۵۷ء تا ۱۸۱۷ء) اور میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشہور شاعر آتش (۱۱۹۲ھ تا ۱۲۶۳ھ) اگرچہ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے والد دہلی سے نقل مکانی کر کے اودھ آ گئے تھے۔

شاہانِ اودھ کے زمانے میں مرثیہ نگاری نے خاص طور پر عروج پایا اور اردو زبان کے سب سے بڑے مرثیہ نگار میرانیس (۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۴ء) اور سلامت علی دبیر (۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۵ء) اسی دور سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ ان کی زندگی کا آخری حصہ انگریزی دور میں گذرا۔

دینی تعلیم کے سلسلے میں یہ دور اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ ملا نظام الدین نے تعلیم کا وہ مشہور نصاب اسی زمانے میں مرتب کیا جو درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لکھنؤ کا محلہ ''فرنگی محل'' اس دور میں برصغیر کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز بن گیا۔ ملا نظام الدین کا انتقال ۱۷۴۸ء کے بعد ہوا۔ اودھ کا قصبہ بلگرام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں وہاں کی خاک سے کئی قابل ذکر علماء اٹھے۔ ان میں غلام علی آزاد کا تذکرہ مملکت آصفیہ کے حالات کے تحت کیا گیا ہے۔ بلگرام کی دوسری عظیم ہستی سید مرتضیٰ زبیدی (۱۷۳۲ء تا ۱۷۹۱ء) کی ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے پھر عرب چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے محدث، ادیب اور ماہر لغت تھے۔ ان کی شہرت ہندوستان اور پاکستان سے زیادہ عرب ملکوں میں ہوئی۔ وہ تقریباً ۶۶ کتابوں کے مصنف تھے جن میں مشہور عربی لغت قاموس کی شرح ''تاج العروس'' اور امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' کی شرح بہت اہم ہیں۔

نوابانِ اودھ (لکھنؤ)

(۱۷۲۲ء تا ۱۸۵۶ء)

(۱) سعادت خاں برہان الملک	۱۷۲۳ء تا ۱۷۳۹ء
(۲) صفدر جنگ	۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء
(۳) شجاع الدولہ	۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء
(۴) آصف الدولہ	۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء
(۵) سعادت علی خاں	۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء
(۶) غازی الدین حیدر	۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء
(۷) ناصر الدین حیدر	۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء
(۸) محمد علی شاہ	۱۸۳۷ء ۱۸۴۲ء
(۹) واجد علی شاہ	۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

(۴) سلطنت خداداد میسور

(۱۷۶۱ء تا ۱۷۹۹ء)

جس زمانے میں بنگال اور شمالی ہند میں انگریز اپنے مقبوضات میں اضافے کر رہے تھے، جنوبی ہند میں دو ایسے مجاہد پیدا ہوئے جن کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان تھے۔ بنگال اور شمالی ہند میں انگریزوں کو مسلمانوں کی طرف سے کسی سخت مقابلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کی منظم فوجوں اور برتر اسلحہ کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکا، لیکن جنوبی ہند میں یہ صورت نہیں تھی۔ یہاں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے قدم قدم پر انگریزوں کی جارحانہ کاروائیوں کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے بے مثل سیاسی قابلیت اور تدبر کا ثبوت دیا اور میدان جنگ میں کئی بار انگریزوں کو شکستیں دیں۔ انہوں نے جو مملکت قائم کی اس کو تاریخ میں ''سلطنت خداداد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیدر علی (۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۲ء)

حیدر علی نے میسور کے ہندو راجہ کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن وہ اپنی بہادری ور قابلیت کی بدولت جلد ہی راجہ کی فوجوں کا سپہ سالار بن گیا، راجہ اور اس کے وزیر نے حیدر علی کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خوفزدہ ہو کر جب اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، تو حیدر علی نے میسور کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کو اس نے اب بھی برقرار رکھا، لیکن حکومت کا اقتدار پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی حکومت کا آغاز ۱۷۶۱ء سے ہوتا ہے۔

حیدر علی کو اپنے بیس سالہ دَور حکومت میں مرہٹوں، نظام دکن اور انگریز، تینوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگرچہ ان لڑائیوں میں اس کو ناکامیاں بھی ہوئیں، لیکن اس کے باوجود اس نے مالابار کے ساحل سے لیکر دریائے کرشنا تک ایک بہت بڑی ریاست قائم کر لی جس میں نظام دکن، مرہٹوں اور انگریزوں سے چھینے ہوئے علاقے بھی شامل تھے۔ اس نے میسور کی پہلی جنگ (۱۷۶۷ء تا ۱۷۶۹ء) اور دوسری جنگ (۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء) میں انگریزوں کو کئی بار شکست دی۔ دوسری جنگ میں حیدر علی نے نظام دکن اور مرہٹوں کو ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بنایا تھا اور

اگر مرہٹہ اور نظام اس کے ساتھ غداری نہ کرتے اور عین وقت پر ساتھ نہ چھوڑتے، تو کم از کم جنوبی ہند سے حیدر علی انگریزی اقتدار کو ختم کر دیتا۔ حیدر علی کی ان کامیابیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوجوں کو جدید ترین طرز پر منظم کیا اور انکو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔

ٹیپو سلطان (۱۷۸۲ء تا ۱۷۹۹ء)

ابھی میسور کی دوسری جنگ جاری تھی کہ حیدر علی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کا لڑکا فتح علی المعروف ٹیپو سلطان اس کا جانشین ہوا۔ ٹیپو سلطان جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر ۳۲ سال تھی۔ وہ ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا اور باپ کے زمانے میں میسور کی تمام لڑائیوں میں شریک رہ چکا تھا۔ حیدر علی کے انتقال کے بعد اس نے تنہا جنگ جاری رکھی، کیونکہ مرہٹے اور نظام دکن انگریزوں کی سازش کا شکار ہو کر اتحاد سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو کئی شکستیں دیں اور وہ ۱۷۸۴ء میں سلطان سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ٹیپو سلطان ایک اچھا سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک مصلح بھی تھا۔ حیدر علی ان پڑھ تھا، لیکن ٹیپو سلطان ایک پڑھا لکھا اور دیندار انسان تھا۔ نماز پابندی سے پڑھتا تھا اور قرآن پاک کی تلاوت اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ٹیپو سلطان نے اپنی ریاست کے عوام کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں دُور کرنے کے لیے کئی اصلاحات کیں۔ شراب اور نشہ آور چیزوں پر پابندیاں لگائیں اور شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی فضول رسمیں بند کرائیں اور پیری مریدی پر بھی پابندیاں لگائیں۔

ٹیپو سلطان نے ریاست سے زمینداریاں بھی ختم کر دی تھیں اور زمین کاشتکاروں کو دے دی تھی جس سے کسانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ٹیپو سلطان نے کوشش کی کہ ہر چیز ریاست میں تیار ہو اور باہر سے منگوانہ نہ پڑے۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی کارخانے قائم کیے۔ جنگی ہتھیار بھی ریاست میں تیار ہوتے تھے۔ اس کے عہد میں ریاست میں پہلی مرتبہ بنک قائم کیے گئے۔

ان اصلاحات سے اگرچہ مفاد پرستوں کو نقصان پہنچا اور بہت سے لوگ سلطان کے خلاف ہو گئے، لیکن عوام کی خوشحالی میں اضافہ ہوا اور ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔ میسور کی خوشحالی کا اعتراف اس زمانے کے ایک انگریز نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''میسور ہندوستان میں سب سے سرسبز علاقہ ہے۔ یہاں ٹیپو کی حکمرانی ہے۔ میسور کے باشندے ہندوستان میں سب سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی مقبوضات صفحۂ عالم پر بدنما دھبوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں رعایا قانونی شکنجوں میں جکڑی ہوئی پریشان حال ہے''(1)

ٹیپو سلطان کے تحت میسور کی یہ ترقی انگریزوں کو بہت ناگوار تھی۔ وہ ٹیپو کو جنوبی ہند پر اپنے اقتدار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ انگریزوں اور میسور کے درمیان صلح کو مشکل سے چھ سال ہوئے تھے کہ انگریزوں نے معاہدے کو بالائے طاق رکھ کر نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کر دیا اور اس طرح میسور کی تیسری جنگ (۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء) کا آغاز ہوا۔ اس متحدہ قوت کا مقابلہ ٹیپو سلطان کے بس میں نہیں تھا، اس لیے دو سال مقابلہ کرنے کے بعد اس کو صلح کرنے اور اپنی نصف ریاست سے دست بردار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

جنگ میں یہ ناکامی ٹیپو سلطان کے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اس نے ہر قسم کا عیش و آرام ترک کر دیا اور اپنی پوری توجہ انگریزوں کے خطرے سے ملک کو نجات دینے کے طریقے اختیار کرنے پر صرف کر دی۔ نظام دکن اور مرہٹوں کی طرف سے وہ مایوس ہو چکا تھا اس لیے اس نے افغانستان، ایران اور ترکی تک اپنے سفیر بھیجے اور انگریزوں کے خلاف متحدہ اسلامی محاذ بنانا چاہا، لیکن افغانستان کے حکمران زمان شاہ کے علاوہ اور کوئی ٹیپو سے تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ شاہ افغانستان بھی پشاور سے آگے نہ بڑھ سکا۔ انگریزوں نے ایران کو بھڑکا کر افغانستان پر حملہ کرا دیا تھا اس لیے زمان شاہ کو واپس کابل جانا پڑا۔

انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے سامنے امن قائم رکھنے کے لیے ایسی شرائط پیش کیں جن کو کوئی باعزت حکمران قبول نہیں کر سکتا تھا۔ نواب اودھ اور نظام دکن ان شرائط کو تسلیم کر کے انگریزوں کی بالادستی قبول کر چکے تھے، لیکن ٹیپو سلطان نے جس کا قول تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے'' ان شرائط کو رد کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے میسور کی چوتھی جنگ چھیڑ دی۔ اس مرتبہ انگریزی فوج کی کمان لارڈ ویلیزلی کر رہا تھا، جو بعد میں

(1) باری: کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۳۷ (مطبوعہ نیا ادارہ لاہور (۱۹۶۹ء)۔

۱۸۱۵ء میں واٹرلو کی مشہور جنگ میں نپولین کو شکست دینے کے بعد جنرل ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس جنگ میں وزیر اعظم میر صادق اور غلام علی اور دوسرے عہدیداروں کی غداری کی وجہ سے جن کو انگریزوں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، سلطان کو شکست ہوئی اور وہ دارالحکومت سرنگا پٹم کے قلعے کے دروازے پر بہادری سے لڑتا ہوا[۴۱]۔ مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گیا۔ سراج الدولہ، واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کے مقابلے میں اس کی موت کتنی شاندار تھی۔ انگریز جنرل ہیرس کو سلطان کی موت کی اطلاع ہوئی تو وہ چیخ اٹھا کہ "اب ہندوستان ہمارا ہے" انگریزوں نے گرجوں کے گھنٹے بجا کر اور مذہبی رسوم ادا کر کے سلطان کی موت پر مسرت کا اظہار کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ملازمین کو انعام و اکرام سے نوازا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب ہندوستان میں برطانوی اقتدار مستحکم ہو گیا اور اس کو اب کوئی خطرہ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اسلامی ہند میں نظام الملک آصف جاہ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسی حیرت انگیز صلاحیت رکھنے والا کوئی تیسرا حکمراں نظر نہیں آتا۔ خاص طور پر حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو اسلامی تاریخ میں اس لیے بلند مقام حاصل ہے کہ انہوں نے ہمارے دورِ زوال میں انگریزوں کا بے مثل شجاعت اور سمجھداری سے مقابلہ کیا۔ یہ دونوں باپ بیٹے دورِ زوال کے ان اولین حکمرانوں میں سے ہیں جنہوں نے نئی ایجادوں سے فائدہ اٹھایا۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی مملکت میں فوجی، انتظامی اور سماجی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی۔ انہوں نے فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوجوں کی جدید انداز پر تنظیم کی جس کی وجہ سے وہ انگریزوں کا ۳۵ سال تک مسلسل مقابلہ کر سکے اور ان کو کئی بار شکستیں دیں۔ یہ کارنامہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں کوئی دوسرا حکمراں انجام نہیں دے سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کا جتنا کامیاب مقابلہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے کیا کسی اور مسلم اور غیر مسلم حکمران نے نہیں کیا۔ ٹیپو سلطان ترکی کے سلیم ثالث (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) کا ہمعصر تھا۔

(۵) مملکت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۹۵۶ء)

دہلی کی تیموری سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی جو خودمختار ریاستیں برصغیر میں قائم ہوئیں، ان میں سب سے بڑی اور پائیدار حیدرآباد دکن کی مملکت آصفیہ تھی۔ اس مملکت کے بانی نظام الملک آصف جاہ تھے اور اسی نام کی نسبت سے اس کو مملکت آصفیہ یا آصف جاہی مملکت کہا جاتا ہے۔ آصف جاہی مملکت کے حکمرانوں نے بادشاہت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ وہ خود کو نظام کہلاتے تھے اور وہ جب تک آزاد رہے تیموری بادشاہ کی بالادستی تسلیم کرتے رہے اور اسی کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری رکھا، اور مسند نشینی کے وقت اس سے فرمان حاصل کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دکن کی مملکت آصفیہ دراصل تیموری سلطنت ہی تھی جو دہلی کے زوال کے بعد دکن میں منتقل ہوگئی تھی۔ اس کے دور میں تیموری نظام حکومت نے اور تیموری سلطنت کے تحت پرورش پانے والی تہذیب نے دکن میں رواج پایا۔

نظام الملک (۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نظام الملک کا اصل نام میر قمرالدین تھا اور یہ نام خود شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے رکھا تھا۔ نظام الملک کے اجداد کا تعلق ترکستان سے تھا۔ انہوں نے عالمگیر کے زیرنگرانی تربیت پائی تھی اور اپنی عادت واطوار میں اور اپنی صلاحیتوں میں اس سے بہت ملتے جلتے تھے۔ نظام الملک میں وہ تمام صلاحیتیں تھیں جو سلطنت تیموریہ کے زوال کو روک سکتی تھیں، اور اگر ان کو موقع ملتا تو نظام الملک برصغیر میں وہی کردار ادا کر سکتے تھے جو سلطنت عثمانیہ میں سلیمان اعظم کے بعد وزیراعظم محمد صوقولی اور محمد کوپریلی اور احمد کوپریلی نے ادا کیا۔ ان کو جب محمد شاہ کے دور میں ۱۷۲۲ء میں ہندوستان کا وزیراعظم بنایا گیا تو انہوں نے زوال سلطنت کو روکنے کے لیے ضروری اصلاحات کرنا چاہیں اور جب بادشاہ اور اس کے نااہل مصاحبین نے ان اصلاحات کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں تو نظام الملک بددل ہوکر ۱۷۲۴ء میں دکن چلے گئے جہاں کے چھ صوبوں کا ان کو صوبہ دار بنا دیا گیا تھا۔ یہاں انہوں نے ایک خودمختار حکمران کی حیثیت سے حکومت کی، مگر وہ

تیموری بادشاہ کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ اس کے حکم پر دہلی پہنچ جاتے تھے، چنانچہ نادرشاہ کے حملے کے موقع پر انہوں نے دہلی جا کر تیموری بادشاہ کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

نظام الملک نے جو وسیع ریاست قائم کی وہ دریائے نربدا سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور مہاراشٹر کے مغربی اور شمال مشرقی حصوں اور موجودہ کرالا کے علاوہ یہ سارا علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔ حیدرآباد، اورنگ آباد، احمد نگر، بیجاپور، ترچناپلی، تنجور اور مدورا مملکت آصف جاہی کے مشہور شہر تھے۔ جس کا رقبہ تین لاکھ مربع میل سے کم نہ تھا۔ نظام الملک نے تیموری سلطنت کے بہت بڑے حصے کو مرہٹوں کو تباہ کاری سے محفوظ کر دیا تھا اور ایک ایسے وقت میں جب کہ پورے برصغیر میں انتشار پھیلا ہوا تھا انہوں نے دکن میں امن وامان کی فضا قائم کی۔

نظام الملک ایک دیانتدار، دیندار اور صاحب کردار حکمران تھے۔ ان کی انتظامی صلاحیت اور تدبر کا مورخین نے کھل کر اعتراف کیا ہے۔ دکن میں نظام آباد کا شہر ان ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ ان کی علمی اور ادبی سرپرستی کی وجہ سے دارالحکومت حیدرآباد علم وادب کا مرکز بن گیا۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ میں اورنگ زیب کے بعد ہم جن تین حکمرانوں کو عظیم کہہ سکتے ہیں ان میں ایک نظام الملک ہیں اور باقی دو حیدرعلی اور ٹیپو سلطان۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد ان کے لڑکوں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کی باہمی خانہ جنگی سے مملکت آصفیہ کو بڑا نقصان پہنچا۔ انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے انگریزوں اور فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کیا اور اس طرح انہوں نے پہلی مرتبہ یورپی قوموں کو برصغیر کی سیاست میں مداخلت کرنے کا موقع فراہم کیا اور انگریزی اقتدار کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اس خانہ جنگی سے دوسرا نقصان یہ ہوا کہ شمالی سرکار، کرناٹک اور جنوب کے کئی علاقے جن میں میسور بھی شامل ہے، نظام کے اقتدار سے باہر نکل گئے اور ریاست کے مشرقی اور شمالی حصوں پر مرہٹہ قابض ہو گئے۔ اس طرح نظام الملک کے انتقال کے بعد پندرہ سال کے اندر ہی ریاست کی حدود نصف رہ گئیں۔

بعد کے حکمرانوں میں نظام علی خاں (۱۷۶۲ء تا ۱۸۰۳ء) کا چالیس سالہ طویل دور اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس نے باقی ماندہ ریاست کو استحکام بخشا، لیکن حیدرعلی اور ٹیپو سلطان سے نظام علی خاں کی لڑائیاں برصغیر میں اسلامی اقتدار کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ حیدرعلی

اور ٹیپو سلطان نے نظام علی خاں کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر انگریزوں کو نکالنے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا اگر نظام علی خاں اس میں تعاون کرتا تو شاید آج برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ لیکن ٹیپو سلطان سے تعاون کرنے کی بجائے نظام علی خاں نے ۱۷۹۸ء میں انگریزوں کے فوجی امداد کے نظام (Subsidiary System) کو قبول کر کے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی اور اس طرح حیدر آباد کی آصف جاہی مملکت اپنے قیام کے ۷۴ سال بعد انگریزوں کی ماتحت ریاست بن گئی۔ یہ وہی نظام تھا جس کو قبول کرنے سے ٹیپو سلطان نے انکار کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کے حملے کا مردانہ وار مقابلہ کر کے جان دے دی۔

نظام علی خاں کی مصلحت آمیز پالیسی نے اس کی جان بھی بچا دی اور ریاست کو بھی محفوظ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی انگریزوں کا سب سے طاقتور حریف ختم ہو گیا اور نظام علی خاں ان کے مقابلے میں بے بس ہو گیا۔ اس کی رہی سہی آزادی ۱۸۰۰ء میں ختم کر دی گئی۔ اب حیدر آباد برطانوی ہند کی ایک محکوم ریاست بن گئی۔

برطانوی ہند کی محکوم ریاست کی حیثیت سے حیدر آباد کا وجود تقریباً ڈیڑھ سو سال اور قائم رہا۔ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے حیدر آباد برطانوی ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر پر سے برطانیہ کی بالادستی ختم ہوئی تو ریاست کے آخری نواب میر عثمان علی خاں نے معاہدے کے مطابق حیدر آباد کو ایک آزاد ریاست قرار دیا، لیکن ہندوستان کی حکومت نے اس کی آزاد حیثیت کو تسلیم نہیں کیا اور ستمبر ۱۹۴۸ء میں فوجی کاروائی کر کے حیدر آباد کو ہندوستان میں ضم کر لیا۔ عثمان علی خاں کو دیش پرمکھ کے نام سے چند سال ریاست کا سربراہ رہنے دیا گیا۔ اس کے بعد ریاست کو لسانی بنیادوں پر تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یہ حصے آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور میسور کے متصلہ صوبوں میں ضم کر دیئے گئے۔ اس طرح حیدر آباد کی اس تاریخی ریاست کا جو تیموری روایات کی حامل تھی ۲۳۲ سال کے بعد خاتمہ ہو گیا۔ میر عثمان علی خاں کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہو گیا۔

علم و ادب کی سرپرستی

حیدر آباد چونکہ ایک دولت مند ریاست تھی اور اس کے حکمران علم دوست تھے، اس لیے

تیموری سلطنت کے زوال کے بعد برصغیر میں علم و ادب کی سب سے زیادہ سرپرستی ریاست حیدرآباد میں کی گئی۔ نادر شاہ کے حملے کے دوران دہلی کی تباہی کے بعد حیدرآباد وہ واحد شہر تھا جہاں سب سے زیادہ امن و سکون تھا اور جہاں کے حکمران علم و ادب کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ چنانچہ برصغیر کے ہر حصے سے اہل علم اور اہل کمال مسلمان کھنچ کھنچ کر حیدرآباد پہنچ گئے۔

اٹھارویں صدی کے ممتاز مصنفوں میں جن کا حیدرآباد سے تعلق رہا شاہ نواز خاں (۱۷۰۰ء/۱۱۱۰ھ تا ۱۷۵۸ء/۱۱۷۱ھ) اور غلام علی آزاد (۱۷۰۴ء تا ۱۷۸۵ء) کے نام بہت نمایاں ہیں۔ شاہ نواز خاں ریاست کے ایک ممتاز عہدے دار تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سب سے اہم "ماثر الامراء" ہے۔ یہ دہلی کی تیموری سلطنت کے امراء اور عہدے داروں کا سب سے بڑا تذکرہ ہے۔ اس میں تقریباً تمام امیروں کے حالات ملتے ہیں۔ غلام علی آزاد بھی اپنے دَور کے بہت بڑے سوانح نگار تھے۔ وہ "سروِ آزاد، ماثر الکرام، خزانہ عامرہ اور سبحہ المرجان" نامی کتابوں کے مصنف تھے جو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان میں ادیبوں، شاعروں اور اولیاء اللہ کے حالات ہیں۔ اس دَور کے جنوبی ہند کے علماء میں مولانا بحر العلوم متوفی ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کا تعلق کرناٹک سے تھا جو شروع میں ریاست حیدرآباد کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں کے نواب محمد علی خاں ان کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ بحر العلوم کا خطاب بھی نواب محمد علی نے دیا تھا۔ وہ اس زمانے میں دینی علوم کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔

بعد کے دَور میں جب حیدرآباد پر برطانوی بالادستی قائم ہوگئی جن علماء اور ادیبوں نے حیدرآباد سے وابستہ ہو کر علمی کام کیے ان میں شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر علی خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاعروں کی کثیر تعداد اس کے علاوہ ہے۔

ریاست حیدرآباد کا ایک اور بڑا کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ ۱۸۵۶ء میں دار العلوم کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوا تھا، ۱۹۱۸ء میں اس کو جدید طرز کی یونیورسٹی کی حیثیت دے دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی یونیورسٹی تھی جس نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم اور ہندوؤں کے لیے اخلاقی تعلیم لازمی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے تحت ایک شعبہ

تالیف وترجمہ قائم کیا گیا تھا جس نے عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی سے، ہر علم وفن پر کئی سو کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اس طرح نہ صرف یونیورسٹی کی درسی ضرورتوں کو پورا کیا گیا بلکہ اردو کے علمی ذخیرے میں قیمتی اضافہ کیا گیا۔ شعبۂ تالیف وترجمہ نے جن علمی اور فنی اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کیا ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔

حیدر آباد میں دائرۃ المعارف کے نام سے ایک اور علمی ادارہ قائم تھا، جس کا کام عربی کی نایاب قلمی کتابوں کو جمع کرنا اور ان کی تصحیح کر کے ان کو شائع کرنا تھا۔ اس ادارے نے تقریباً پانچ سو کتابیں شائع کیں۔ ان کتابوں کی وجہ سے حیدر آباد کا نام پوری اسلامی دنیا میں اور خاص طور پر عرب ملکوں میں سرپرست علوم کی حیثیت سے عام ہو گیا۔

حیدر آباد کا کتب خانہ آصفیہ برصغیر کے سب سے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ خاص طور پر عربی، فارسی کتابوں کے قلمی نسخوں کے لحاظ سے یہ اب بھی برصغیر کا سب بڑا کتب خانہ ہے۔ اس میں قلمی نسخوں کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔ مخطوطات کی اتنی بڑی تعداد استنبول کے کتب خانہ سلیمانیہ کے علاوہ شاید دنیا کے کسی اور کتب خانہ میں موجود نہیں۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر میں اسلامی علوم اور ادب کا سب سے بڑا مرکز حیدر آباد تھا۔

حیدر آباد کی علمی سرپرستی صرف ریاست تک محدود نہیں تھی، برصغیر کے تقریباً تمام تعلیمی، علمی، مذہبی اور معاشرتی اداروں کو بھی ریاست کی طرف سے امداد ملتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو باقاعدہ مالی امداد ملتی تھی۔ علاوہ ازیں بے شمار صاحب کمال اور اہل علم ایسے تھے جن کے ریاست کی طرف سے وظیفے مقرر تھے۔ امداد کا یہ سلسلہ اسلامی ممالک تک پھیلا ہوا تھا، اور اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے۔

سلاطین آصفیہ (حیدر آباد)

(۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ تا ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ)

(۱) نظام الملک آصف جاہ اول ۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ

(۲) ناصر جنگ ابن نظام الملک ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ تا ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ

(۳) مظفر جنگ ابن نظام الملک ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ

(۴) صلابت جنگ ابن نظام الملک	۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ تا ۱۷۶۲ء/۱۱۷۵ھ
(۵) نظام علی خان	۱۷۶۲ء/۱۱۷۵ھ تا ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ
(۶) سکندر جاہ	۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ تا ۱۸۲۹ء/۱۲۴۵ھ
(۷) ناصر الدولہ	۱۸۲۹ء/۱۲۴۵ھ تا ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ
(۸) افضل الدولہ	۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ تا ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ
(۹) محبوب علی خاں بن افضل الدولہ	۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ تا ۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ
(۱۰) عثمان علی خاں ابن محبوب علی خاں	۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ تا ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

نومبر ۱۹۵۶ء میں ریاست حیدرآباد کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان حصوں کو مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور کرالا کے صوبوں میں ضم کر دیا گیا۔

(۶) سندھ

(۱۷۳۹ء تا ۱۸۴۳ء)

پلاسی کی جنگ کے بعد سے برصغیر میں انگریزوں کا اقتدار بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں انہوں نے بنگال اور بہار پر قبضہ کیا، ۱۷۹۸ء میں حیدرآباد دکن پر بالادستی قائم کر لی، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد پورا جنوبی ہندان کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں اودھ پر بالادستی قائم کی اور ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب صرف سندھ اور پنجاب ان کے اقتدار سے باہر باقی رہ گئے تھے۔

کلہوڑہ اور تالپور

سندھ میں ۱۷۶۵ء سے ۱۷۸۳ء تک مقامی کلہوڑہ خاندان کی حکومت قائم تھی۔ یہ حکمران شروع میں دہلی کی حکومت کے تحت تھے، لیکن ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد انہوں نے پہلے ایران اور پھر ابدالی افغانوں کی بالادستی قبول کر لی۔ میاں نور محمد (۱۷۱۹ء تا ۱۷۵۶ء) اور غلام شاہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۲ء) اس خاندان کے ممتاز حکمران تھے۔ غلام شاہ نے ۱۷۶۸ء میں شہر حیدرآباد تعمیر کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

کلہوڑہ دَور حکومت سندھ کی خوشحالی کا دَور ہے۔ اس دَور میں زراعت اور صنعت فروغ پر تھیں اور علم وادب کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ صرف ایک شہر ٹھٹھہ میں جو حیدر آباد سے پہلے سندھ کا صدر مقام تھا، ساٹھ ہزار پارچہ باف موجود تھے۔ اور مدرسوں کی تعداد چار سو تھی۔ کلہوڑہ دَور سندھی شاعری کا عہد زرّین سمجھا جاتا ہے۔ سندھی زبان کے سب سے بڑے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۲ء) اسی دَور میں ہوئے ہیں۔

۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۳ء تک سندھ خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اس کے بعد تالپور خاندان کے بلوچوں نے سندھ میں تین حکومتیں قائم کرلیں جن کے مرکز میر پور خاص، حیدر آباد اور خیر پور تھے۔ تالپوروں کی یہ حکومتیں ۱۷۸۳ء سے ۱۸۴۳ء تک قائم رہیں۔ شاہان اودھ کی طرح تالپور شیعہ تھے، لیکن سب سے رواداری برتتے تھے۔ اس دَور کے سب سے بڑے سندھی شاعر سچل سرمست (۱۷۳۹ء تا ۱۸۲۶ء) تھے۔

۱۸۰۹ء میں انگریزوں نے امیران سندھ سے دوستی کا معاہدہ کرلیا تھا، لیکن انگریزوں نے اس معاہدہ کی بار بار خلاف ورزی کی اور امیرانِ سندھ کی کمزوری سے ہر طرح کا فائدہ حاصل کرنا چاہا۔ ۱۸۳۹ء میں جب انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا، تو معاہدہ کو توڑ کر سندھ سے اپنی فوجیں افغانستان لے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر حملہ کردیا۔ ناصر خاں امیر حیدر آباد اور رستم خاں امیر خیر پور نے حیدر آباد سے چند میل دُور، میانی کے مقام پر ۱۷۔ فروری ۱۸۴۳ء کو جنگ کی، لیکن شکست کھائی اور انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ میر پور کے امیر شیر محمد نے بھی حیدر آباد سے دس میل دُور دبہ (duba) کے مقام پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ انگریزوں نے اب سندھ پر قبضہ کرلیا اور رستم خاں کے بھائی امیر علی مراد کو غداری کے صلے میں ضلع خیر پور کی حکومت دے دی۔ اب پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر کو چھوڑ کر جہاں سکھوں کی حکومت قائم تھی پورے برصغیر پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔

[برطانوی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک اسلامی ہند اور پاکستان کے حالات اور نظریاتی کشمکش کے لیے ملاحظہ کیجئے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

سندھ کے کلہوڑا حکمران

(۱۶۵۷ء تا ۱۷۸۳ء)

(۱) میاں نصیر محمد خان	۱۶۵۷ء تا ۱۶۹۲ء
(۲) میاں دین محمد خان	۱۶۹۲ء تا ۱۶۹۹ء
(۳) میاں یار محمد خان	۱۷۰۱ء تا ۱۷۱۹ء
(۴) میاں نور محمد خان	۱۷۱۹ء تا ۱۷۵۳ء
(۵) محمد مراد یاب خان	۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء
(۶) غلام شاہ خان کلہوڑا	۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۲ء

اس کے بعد کلہوڑا خاندان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور ۱۷۸۳ء میں تالپور خاندان نے کلہوڑا خاندان کو حکومت سے بے دخل کر دیا۔

اہم واقعات

۱۷۱۴ء دہلی کی حکومت نے مرہٹوں کا چوتھ وصول کرنے کا حق تسلیم کرلیا۔

۱۷۲۳ء مالوہ پر مرہٹوں کا قبضہ۔

۱۷۲۴ء گجرات پر مرہٹوں کا قبضہ۔

۱۷۳۹ء (۱۶۔فروری) کرنال کی جنگ۔ نادر شاہ نے تیموری فوج کو شکست دی۔

۱۷۴۴ء تا ۱۷۴۸ء فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان کرناٹک کی پہلی جنگ۔

۱۷۴۸ء ۱۷۵۴ء کرناٹک کی دوسری جنگ۔

۱۷۵۱ء اڑیسہ پر مرہٹوں کا قبضہ۔

۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء کرناٹک کی تیسری جنگ۔

۱۷۵۷ء (۲۲۔جون) پلاسی کی جنگ اور ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز۔

۱۷۵۸ء (مئی) لاہور میں مرہٹوں کا داخلہ۔

۱۷۵۹ء دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ۔

۱۷۶۱ء پانی پت کی تیسری جنگ۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی (۱۴۔ جنوری)

۱۷۶۵ء (۲۲۔ اکتوبر) بکسر کی جنگ۔

۱۷۶۷ء تا ۱۷۶۹ء میسور کی پہلی جنگ۔

۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۴ء میسور کی دوسری جنگ۔

۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء میسور کی تیسری جنگ۔

۱۷۹۹ء (فروری تا مئی) میسور کی چوتھی جنگ۔ ۴۔ مئی کو ٹیپو سلطان کی شہادت۔

۱۸۴۶ء (۱۶۔ مارچ) معاہدۂ امرتسر۔ انگریزوں نے کشمیر جموں کے ڈوگرہ راجہ کو فروخت کر دیا۔

۱۸۵۷ء (۱۰۔ مئی) میرٹھ سے جنگ آزادی کا آغاز۔ ۱۹۔ ستمبر کو انگریزوں کا دہلی پر قبضہ

۱۸۵۸ء (یکم ستمبر) ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کر دی گئی اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آ گیا۔

باب ۲۹

شاہ ولی اللہؒ اور تحریک جہاد

شاہ ولی اللہؒ

برِّکوچک پاکستان و ہند میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو بہت سے لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ زوال کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ ان لوگوں میں عہد مغلیہ کے مشہور عالم اور مصنف شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا شاہ ولی اللہ نے اس کام کی رفتار اور تیز کردی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانی چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے، اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے پھیل گئی تھیں، لیکن شاہ ولی اللہ چونکہ ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا تھا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اور اس کے علاج کے طریقے بھی بتائے۔

شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی کے انتقال کے تقریباً اسی سال بعد دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی چار سال کے تھے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوگیا اس کے چند سال بعد مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگئی۔ سارے ملک میں بدامنی پھیل گئی اور مرہٹے ملک کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہونے کے بعد دہلی پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔

مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت خراب تھی، بلکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بھی زوال کی طرف جارہے تھے۔ آرام طلبی، عیش و عشرت، دولت سے محبت، خود غرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں ان میں عام ہوگئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف و تالیف اور اصلاح کا کام اسی نازک زمانہ میں شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ پھر سے ایک مضبوط سلطنت قائم کردیں اور دوسری طرف وہ اپنی اخلاقی خرابیوں کو دُور کر کے اور

ان غیر اسلامی طریقوں اور رسم و رواج کو چھوڑ کر دور اول کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کر لیں۔

انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امراء سے خط و کتابت بھی کی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے اپنا مشہور حملہ جس میں اس نے پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کو شکست دی تھی، شاہ ولی اللہ کے ایک خط پر ہی کیا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاح کا کام بھی کیا۔ مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے بیوہ عورتوں کی شادی بری سمجھی جانے لگی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے اس رسم کی مخالفت کی۔ اسی طرح انہوں نے بڑے بڑے مہر باندھنے اور خوشی اور غم کے موقع پر لوگوں کو فضول خرچی کرنے سے روکا۔

انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس پر زور دیا کہ اختلاف کی صورت میں انتہا پسندی کی جگہ اعتدال سے کام لیا جائے۔

انہوں نے تصوّف کی بھی اصلاح کی اور پیری مریدی کے طریقوں کو غلط راستہ سے ہٹایا۔

شاہ ولی اللہ کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی زبان فارسی تھی۔ قرآن چونکہ عربی میں ہے اس لیے بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے اس رکاوٹ کو دُور کر دیا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کی تعلیم سے واقف ہونے لگے۔

شاہ ولی اللہ ترجمۂ قرآن کے علاوہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہ کتابیں علمِ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوّف پر ہیں۔ ان عالمانہ کتابوں کی وجہ سے وہ امام غزالیؒ ابن حزم اور ابن تیمیہ کی طرح تاریخ اسلام کے سب سے بڑے عالموں اور مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کی سب سے مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کی طرح یہ کتاب بھی دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔ اس کتاب میں شاہ ولی اللہ نے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی ہے اور اسلامی احکام اور عقائد کی صداقت ثابت کی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے لیکن اس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے جانشین

شاہ ولی اللہ اپنی کوششوں کی وجہ سے غزالی، ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی کی طرح اپنی صدی

کے مجدّد سمجھے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے زوال کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی اور اس وقت جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں ان کے بانی شاہ ولی اللہ ہی ہیں۔ شاہ ولی اللہ جہاں خود ایک بہت بڑے عالم، مصلح اور رہنما تھے وہاں وہ اس لحاظ سے بھی بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کی اولاد میں ایسے ایسے عالم اور مصلح پیدا ہوئے جنھوں نے پاکستان اور ہند کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

ان میں شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے لڑکے شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹ء/۱۷۴۶ء تا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) تھے۔ وہ عربی اور فارسی کے انشا پرداز تھے اور ساٹھ سال تک دینی علوم اور احادیث کی تعلیم دیتے رہے۔ جن لوگوں کی وجہ سے برصغیر میں حدیث کا علم پھیلا، ان میں ایک شاہ عبدالعزیز بھی ہیں۔ ان کے زمانہ میں انگریز مشرقی پاکستان اور ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے اور انگریز پادری ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے اور مسلمان عالموں سے بحث مباحثے کرتے تھے۔ ان مباحثوں میں شاہ عبدالعزیز نے ان پادریوں کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا۔ وہ ان پادریوں کے سوالوں کے ایسے جواب دیتے تھے کہ پھر ان سے کوئی جواب بن نہ پڑتا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے دوسرے لڑکے شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء تا ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اُردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ خدا کے کلام کو سمجھ سکیں۔

شاہ ولی اللہ کے تیسرے لڑکے شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ تا ۱۲۳۰ھ) ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی اُردو تفسیر ہے۔ یہ تفسیر موضح القرآن کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں مشکل حصے آ گئے ہیں، اس کتاب میں ان حصوں کو آسان اُردو میں سمجھا دیا ہے۔ یہ تفسیر اتنی مقبول ہوئی کہ آج تک قرآن مجید کے حاشیے پر اس کو شائع کیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی اولاد میں شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ تا ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ) کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالموں میں شمار ہوتا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن وحدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیلؒ

نے دی۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں ''تقویۃ الایمان'' جسے انہوں نے اُردو میں لکھا تھا سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس مختصر سی کتاب میں شاہ صاحب نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اصل اسلام سے کس قدر دور ہوگئی ہے اور کیسی کیسی نئی باتیں اور بدعتیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہوگئی ہیں۔ اس کتاب نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل کی اصلاح میں وہی کام کیا جو عرب میں محمد بن عبدالوہاب کی ''کتاب التوحید'' اور نائیجیریا اور مغربی افریقہ میں عثمان وان فودیو کی ''احیاء السنہ'' نے کیا۔ ان کی دوسری کتابوں میں جو فارسی میں لکھی گئی تھیں ''منصب امامت'' اور ''عبقات'' بہت اہم ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک ساتھی مولانا عبدالحی کے ساتھ مل کر سید احمد شہیدؒ کے اقوال و ارشادات بھی فارسی میں ''صراط مستقیم'' کے نام سے مرتب کیے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کر کے ان کو دور کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ شاہ اسمٰعیل بالاکوٹ کی جنگ میں اپنے مرشد سید احمد شہید کے ساتھ شہید ہو گئے۔

سید احمد شہید

اس میں شک نہیں کہ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے اور مسلمانوں پر ان کے بڑے احسان ہیں، لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ شہرت جس شخص کو حاصل ہوئی وہ بریلی کے ایک مجاہد سید احمد شہید (۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ تا ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ) ہیں۔ سید احمد شہید شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اس نازک دور میں جب کہ پاکستان اور ہندوستان پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا، اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی۔

سید احمد شہید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات خصوصاً جہاد کی طرف سے غافل ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے ان میں طرح طرح کی اخلاقی خرابیاں آ گئی ہیں۔ سید احمد شہید کی بات میں بڑی تاثیر تھی اور جو شخص انکی صحبت میں رہتا تھا وہ ان کا مرید ہو جاتا تھا۔ ان کی تحریک کا انداز تحریک موحدین کے بانی ابن تومرت سے ملتا جلتا تھا۔ ان کی تبلیغ سے ہزاروں لوگوں نے شراب پینے اور دوسری بری باتوں سے توبہ کر لی۔ اس زمانہ

میں مسلمان شریف خاندانوں میں تلوار باندھنا عیب خیال کیا جاتا تھا۔ سید احمد شہید نے جب جہاد کا جذبہ پیدا کیا تو لوگ فخریہ تلوار باندھنے لگے۔ انہوں نے خود بھی تلوار چلانے، بندوق اور توپ چلانے کی مشق کی اور جب ان کے پاس بہت بڑی جماعت ہوگئی تو وہ ان کو لے کر پشاور پہنچے تاکہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد کر سکیں۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے جہاد اس لیے شروع نہیں کیا کہ ابھی اتنی طاقت فراہم نہیں ہوئی تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کیا جا سکتا۔

اعلان جہاد

سکھ مذہب ہندوؤں کی ایک شاخ ہے۔ اس کے بانی گرونانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء) تھے۔ انہوں نے بت پرستی اور شرک کی مخالفت کی اور توحید کی بنیاد پر ایک جماعت بنائی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سکھوں کی اس جماعت نے فوجی تنظیم قائم کر لی اور اس کا حکومت سے ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد سکھوں کو پنجاب میں عروج حاصل ہوگیا۔ احمد شاہ ابدالی کو ان کی شورش دبانے کے لیے بار بار پنجاب آنا پڑا، لیکن جیسے ہی وہ واپس جاتا سکھ پھر میدان میں آجاتے۔ احمد شاہ ابدالی کے لڑکے زمان شاہ نے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۹ء) کو پنجاب کا والی بنا دیا، لیکن ۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور ۱۸۱۸ء میں ملتان پر ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر اور ۱۸۲۳ء میں پشاور پر قبضہ کر لیا۔

اب تک مرہٹوں اور انگریزوں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا ان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، لیکن ان علاقوں میں جن پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی، مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پھر سکھوں نے نہ صرف ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا بلکہ مسلمانوں پر ظلم بھی کیے۔ اس کے دور میں شاہی مسجد کا صحن گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مسقف حصے میں فوجی گودام تھا اور مرکزی محراب میں بیت الخلاء قائم تھا۔ نماز اور اذان پر پابندی تھی اور مسلمان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ سید احمد شہید کو جب سکھوں کے ان مظالم کا علم ہوا کہ پنجاب میں اذان اور نماز تک کی اجازت نہیں، مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً چکلوں میں بٹھائی جاتی ہیں، تو انہوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ مجاہدین کی جماعت بہاولپور، حیدرآباد (سندھ) شکارپور، درۂ بولان، قندھار اور کابل سے ہوتی ہوئی خیبر کے راستے

پشاور پہنچ گئی اور شہر پر قبضہ کر کے سید احمد شہید نے ۱۱۔ جنوری ۱۸۲۷ء کو اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ مجاہدین کی چار سال تک سکھوں سے لڑائیاں جاری رہیں اور مسلمانوں نے پشاور، مردان اور ہزارہ کے ضلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اسلامی علاقے میں شراب، بھنگ اور افیون کی دکانیں بند کروی گئیں۔ گنہگار مرد اور عورتوں نے بے حیائی کے کام بند کر دیئے اور سید صاحب نے کئی غلط قسم کے مقامی رسم و رواج بدل دیئے لیکن ان اصلاحات کی وجہ سے مقامی پٹھان جن کی صحیح اسلامی تربیت نہیں ہوئی تھی، اپنے بعض خود غرض سرداروں کے بہکانے میں آ کر سید صاحب اور جماعتِ مجاہدین کے خلاف ہو گئے اور سید صاحب کو پشاور چھوڑ کر ہزارہ جانا پڑا جہاں ۲۴۔ ذیقعدہ مطابق ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کے قریب سکھوں نے اچانک حملہ کر کے سید احمد، شاہ اسمٰعیل اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا اور اس طرح تحریک مجاہدین اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکامی ہوگئی۔

سید احمد شہید کے ساتھیوں میں جہاد کا جذبہ کتنا قوی تھا اس کا اندازہ اس پہلے معرکہ سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے سکھوں کے خلاف کیا۔ یہ لڑائی اکوڑہ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ سید احمد شہید کی فوج نے سکھوں کی فوج سے چند میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا مجاہدین نے یہ طے کیا کہ رات کو دشمن کے لشکر پر شبخون مارا جائے۔ اس شبخون کے لیے سید احمد شہید نے مضبوط اور قوی آدمیوں کو منتخب کیا۔ ان میں ایک عبدالمجید آفریدی بھی تھے وہ کئی دن سے بیمار تھے اس لیے سید صاحب نے ان کا نام خارج کر دیا۔ جب عبدالمجید کو اطلاع ہوئی تو وہ دوڑے ہوئے سید صاحب کے پاس آئے اور اصرار کر کے اپنا نام شبخون مارنیوالے دستہ میں لکھوایا۔ جب اسلامی لشکر نے سکھوں پر شبخون مارا تو عبدالمجید نے چودہ آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، اس کے بعد ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ ایک دوسرے مجاہد نے ان کو اپنی تلوار دے دی۔ اس سے بھی انہوں نے کئی فوجیوں کو ختم کر دیا اور آخر میں خود بھی شہید ہو گئے۔

مسلمانوں نے اب تک آزادی کی جو کوشش کی تھی سید احمد شہید کی تحریک ان سب سے مختلف تھی۔ اب تک جو بھی مقابلے ہوئے تھے وہ بادشاہوں سے ہوئے تھے اور مسلمان بادشاہوں نے اپنے تاج و تخت کی حفاظت کے لیے جنگ کی تھی، لیکن سید احمد شہید کی تحریک اگرچہ ناکام ہوگئی لیکن اس نے آئندہ کے لیے ایک مثال قائم کردی کہ ایک اسلامی تحریک کس طرح چلائی جاسکتی ہے۔

حادثۂ بالاکوٹ کے بعد تحریک جہاد

بالاکوٹ کا حادثہ ۱۸۳۱ء میں پیش آیا۔ اس کے چند سال بعد ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا اور رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد ۱۸۴۶ء میں معاہدہ لاہور کے تحت پنجاب کی سکھ ریاست پر اپنی بالادستی قائم کر دی اور کشمیر کو سکھوں سے لے کر معاہدہ امرتسر (۱۶۔ مارچ ۱۸۴۶ء) کے تحت جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو ۷۵ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا۔ اس طرح کشمیر کی وہی حیثیت ہوگئی جو قلات، خیر پور، بہاولپور اور حیدر آباد کی ریاستوں کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کشمیر میں مسلم اکثریت تھی، لیکن راجہ ہندو تھا اور حیدر آباد میں غیر مسلم اکثریت تھی اور نواب مسلمان تھا۔

سید احمد شہید کے بعد مولانا ولایت علی (۱۲۰۵ھ تا ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ) اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی متوفی ۱۸۵۸ء/۱۲۷۴ھ نے تحریک جہاد کو جاری رکھا، لیکن اب اس کا رخ سکھوں کی طرف نہیں تھا، بلکہ انگریزی حکومت کی طرف تھا، جس نے پنجاب اور سرحد میں سکھوں کی جگہ لے لی تھی۔ مجاہدین نے مالاکنڈ کے علاقے میں ستھانہ کے مقام پر اپنا مرکز قائم کرلیا تھا، جہاں سے وہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں انگریزوں کی جارحانہ کاروائیوں کا برسوں مقابلہ کرتے رہے۔ برطانوی ہند میں اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے کیا سلوک کیا اس کا تذکرہ پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔

اہم واقعات

۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ شاہ اسمٰعیل شہید کی پیدائش۔

۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ یکم محرم مطابق ۲۴۔ اکتوبر سید احمد شہید کی پیدائش۔

۱۲۲۲ھ سید احمد صاحب نے شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کی۔

۱۸۲۰ء/۱۲۳۶ھ رائے بریلی سے سید احمد شہید حج کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۸۲۲ء/۱۲۳۷ھ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل نے حج کیا۔

۱۸۲۶ء/۱۲۴۱ھ ۷۔جمادی الاول مطابق ۱۷۔جنوری کو جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۸۲۷ء/۱۲۴۲ء ۱۱۔جنوری کو پشاور میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ ۲۴۔ذیقعدہ مطابق ۶۔مئی کو بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد اور شاہ اسمٰعیل، شہید ہوگئے۔

باب ۳۰

نادر شاہ سے احمد شاہ قاچار تک

(۱۷۳۲ء تا ۱۹۲۵ء)

(۱) خاندان افشار

(۱۷۳۶ء/۱۱۴۸ھ تا ۱۷۹۸ء/۱۲۱۰ھ)

۱۷۲۲ء میں اصفہان پر افغانوں کا قبضہ ہو جانے اور شاہ حسین کے میر محمود کے حق میں دست بردار ہو جانے کے بعد شاہ حسین کا لڑکا طہماسپ قزوین چلا گیا اور وہاں سے افغانوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ ایران کو مشکل میں دیکھ کر روس اور سلطنت عثمانیہ نے فائدہ اٹھایا۔ روس نے داغستان، باکو اور گیلان کے صوبوں پر قبضہ کر لیا اور ترکوں نے گرجستان، تبریز اور ہمدان پر قبضہ کر لیا، لیکن اس موقع پر طہماسپ کو ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل ہو گئیں جو غیر معمولی فوجی صلاحیت کا مالک تھا۔ یہ نادر قلی افشار نامی ایک ترک تھا۔

نادر شاہ (۱۷۳۲ء/۱۱۴۵ھ تا ۱۷۴۶ء/۱۱۶۰ھ)

نادر قلی خراسان میں درّہ غاز کے مقام پر ایک خانہ بدوش گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ جب جوان ہوا تو مختلف سرداروں سے وابستہ ہو کر کئی جنگوں میں بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور آخر میں طہماسپ کی ملازمت کر لی۔ نادر نے طہماسپ کے ساتھ مل کر مشہد اور ہرات کو مقامی سرداروں سے چھین لیا اور جب افغان سردار میر اشرف نے خراسان پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو نادر نے دامغان کے پاس مہن دوست کے مقام پر ۱۷۲۹ء میں افغانوں کو شکست فاش دی اور اس کے بعد اصفہان اور پھر شیراز پر قبضہ کر کے افغانوں کو ایران سے باہر نکال دیا۔

افغانوں کے مقابلے میں نادر کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر روس نے ۱۷۳۲ء میں گیلان

اور مازندران کے صوبے ایران کو واپس کر دیئے۔ لیکن اسی سال طہماسپ نے عثمانی ترکوں سے صلح کر لی جس کے تحت ترکوں نے تبریز، ہمدان اور لرستان کے صوبے خالی کر دیئے لیکن گرجستان اور آرمینہ اپنے قبضے میں رکھے۔ نادر نے اس صلحنامے کو مسترد کر دیا اور اصفہان پہنچ کر ۱۷۳۲ء میں طہماسپ کو معزول کر کے اس کے لڑکے عباس سوم کو تخت پر بٹھا دیا۔ نادر اگرچہ تخت نشین چار سال بعد ہوا، لیکن اس سال سے وہ حقیقی طور پر خود مختار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد نادر عثمانی سلطنت کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ تین سال تک ترکوں سے لڑائی ہوتی رہی۔ جولائی ۱۷۳۳ء میں بغداد کے قریب ایک لڑائی میں نادر کو شکست ہوئی اور وہ زخمی بھی ہو گیا لیکن اسی سال کرکوک کے مقام پر اور ۱۷۳۵ء میں اریوان کے پاس باغ وند کے مقام پر نادر نے ترکوں کو فیصلہ کن شکستیں دیں اور گرجستان اور آرمینیہ پر قبضہ کر لیا۔ باغ وند کی عظیم کامیابی کے بعد نادر نے روس سے باکو اور داغستان کے صوبے خالی کرنے کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ صوبے روس نے خالی نہیں کیے تو وہ عثمانی ترکوں سے مل کر روس کے خلاف کارروائی کرے گا۔ روس نے نادر کی اس دھمکی پر بغیر کسی جنگ کے باکو اور داغستان کو خالی کر دیا۔

تخت نشینی

ان فتوحات نے نادر کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ ایرانی اس کو ایران کا نجات دہندہ سمجھنے لگے اور اس کے سامنے تخت ایران پیش کیا، لیکن نادر نے ایرانیوں کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ وہ جب تک خلفائے راشدین اور صحابہ کے خلاف تبرا اور اہل سنت مسلمانوں کو ستانا بند نہیں کریں گے وہ بادشاہت قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ ان کے اس طرز عمل نے ایران کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ جب اللہ ایک ہے تو ہمارا مذہب بھی ایک ہونا چاہیے۔ ایرانیوں نے اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا اور نادر شاہ نے عباس سوم کو معزول کر کے ۱۷۳۶ء/ ۱۱۴۸ھ میں موغان کے مقام پر بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۷۔ اکتوبر ۱۷۳۶ء کو ایران اور ترکی کے درمیان صلحنامے پر باضابطہ دستخط ہو گئے۔ ترکوں نے گرجستان اور آرمینیہ پر ایران کا قبضہ تسلیم کر لیا اور دونوں سلطنتوں کی حدود وہی قرار پائیں جو سلطان مراد چہارم کے زمانے میں مقرر ہوئی تھیں۔

ہندوستان پر حملہ

اب نادر نے اسی ہزار فوج کے ساتھ قندھار کا رخ کیا جو ابھی تک افغانوں کے قبضے میں تھا۔ نو ماہ کے طویل محاصرے کے بعد اوائل ۱۷۳۸ء میں قندھار فتح کر لیا گیا۔ افغانوں کی ایک تعداد نے کابل میں جا کر پناہ حاصل کر لی جو دہلی کی تیموری سلطنت کی حدود میں تھا۔ نادر نے ان پناہ گزینوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن جب اس کو کوئی جواب نہیں ملا تو نادر نے کابل بھی فتح کر لیا۔ تیموری سلطنت کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا تھا، اس لیے نادر نے اب دہلی کا رخ کیا۔ وہ درۂ خیبر کے راستے برصغیر کی حدود میں داخل ہوا اور پشاور اور لاہور کو فتح کرتا ہوا کرنال کے مقام تک پہنچ گیا، جو دہلی سے صرف ستر میل شمال میں تھا۔ تیموری سلطنت کی بدانتظامی اور اندرونی خلفشار کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ نادر تو کابل سے چھ سو میل کا فاصلہ طے کر کے کرنال پہنچ گیا لیکن محمد شاہ اپنی پوری فوج ستر میل دور کرنال تک میں جمع نہ کر سکا اور توپ خانے کے پہنچنے سے پہلے ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ نادر کے توپ خانے نے ہزاروں ہندوستانی فوجی بھون ڈالے لیکن ایرانی فوج کے گنتی کے چند سپاہی ہلاک ہوئے۔ نادر مارچ ۱۷۳۹ء میں فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا۔ وہ دو ماہ تک دہلی میں رہا۔ اس دوران دہلی کے اوباشوں نے شہر میں گھومنے پھرنے والے ایرانی فوجیوں پر حملے شروع کر دیے اور ان کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ نادر کے روکنے کے باوجود جب حملے بند نہیں ہوئے تو اس نے قتل عام کا حکم دے دیا جس میں تقریباً بیس ہزار افراد مارے گئے۔ نادر شاہ دہلی کو چھوڑ کر اور بادشاہت محمد شاہ کو واپس کر کے چلا تو گیا لیکن دو سو سال کی جمع شدہ شاہی محل کی دولت اور شاہجہان کا مشہور تختِ طاؤس اپنے ساتھ ایران لے گیا۔ اس کی واپسی سندھ کے راستے سے ہوئی۔ دریائے سندھ تک کا سارا علاقہ اس نے سلطنت ایران میں شامل کر لیا۔ ایران پہنچنے سے پہلے نادر شاہ نے ۱۷۴۰ء میں بخارا اور خیوہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ دونوں ریاستوں نے ایران کی بالادستی قبول کر لی۔

اب سلطنت ایران پورے عروج پر پہنچ چکی تھی اور اس کی حدود شاہ عباس کے زمانے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی تھیں۔ ۱۷۴۱ء اور ۱۷۴۳ء کے درمیان نادر شاہ داغستان کے پہاڑوں میں بغاوت کچلنے میں مصروف رہا لیکن اسے اس میں ناکامی ہوئی۔ ۱۷۴۵ء/۱۱۵۸ھ میں ایک

لاکھ چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل عثمانی ترکوں کی ایک فوج کو پھر شکست دی جو اس کی آخری شاندار فتح تھی۔ کہا جاتا ہے کہ داغستان کی شورش کو دبانے میں جو ناکامی ہوئی اس نے نادر کو چڑچڑا بنادیا۔ اب وہ شکی اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ اپنے لائق بیٹے اور ولی عہد رضا قلی کو محض اس بے بنیاد شک کی بنا پر کہ وہ باپ کو تخت سے اتارنا چاہتا ہے، اندھا کردیا۔ اس کے بعد ایران میں جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹنے لگیں۔ ان بغاوتوں کو جب نادر نے زیادہ سختی سے کچلا تو اس کی مخالفت عام ہوگئی۔ شیعہ خاص طور پر اس کے خلاف ہوگئے تھے۔ آخرکار ۱۷۴۷ء میں اس کے محافظ دستے کے سپاہیوں نے ایک رات اس کے خیمے میں داخل ہوکر اس کو سوتے میں قتل کردیا۔

ایشیا کا نپولین

نادر شاہ کو بجاطور پر ایشیا کا آخری فاتح کہا جاتا ہے۔ ایک ماہر سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی جنگی صلاحیت بے مثال تھی اور اس میدان میں اسلامی دنیا میں اس کے بعد ابراہیم پاشا مصری اور مصطفیٰ کمال کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کا مدمقابل پیدا نہیں ہوا۔ اپنی جنگی صلاحیت اور فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے اس کو بجاطور پر ایشیا کا نپولین کہا جاتا ہے۔

نادر شاہ نے شیعہ سنی اتحاد کے لیے قابل تعریف کوششیں کیں۔ اس نے ایرانی شیعوں کو تبرّا سے روک کر فرقہ جعفریہ کو اہل سنت والجماعت کے پانچویں مذہب کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی کوشش کی، لیکن عثمانی ترکوں کے سخت موقف کی وجہ سے اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

نادر شاہ جس میں فوجی صلاحیت غیر معمولی تھی انتظامی صلاحیت اس پایہ کی نہیں تھی۔ دہلی کے قتلِ عام کا تو اس پر زیادہ الزام نہیں آتا، لیکن آخر میں وہ بہت ظالم ہوگیا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اگر نادر شاہ بخارا اور خیوہ کی فتح کے بعد مرجاتا تو ایران کا انتہائی نیک نام حکمران ہوتا۔

نادر شاہ کے بعد ایران ایک بار پھر انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہوگیا۔ نادر کے بعد اس کا بھتیجہ علی قلی، عادل شاہ کے نام سے خراسان میں تخت نشین ہوا، لیکن ایک سال حکومت کر پایا تھا کہ نادر کے اندھے لڑکے رضا قلی کا بیٹا شاہرخ پندرہ سال کی عمر میں ۱۷۴۸ء میں مشہد میں تخت نشین ہوا۔ لیکن ایک شیعہ سردار نے اس کو معزول کرکے اندھا کردیا۔ نادر کے ایک افغان سردار احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی اور اس نے شاہرخ کو ۱۷۴۹ء

میں دوبارہ تخت دلا دیا اور اس کو اپنی حمایت میں لے لیا۔ افشار خاندان کی یہ حکومت افغانوں کی زیر سرپرستی ۱۷۹۶ء/ ۱۲۱۰ھ تک قائم رہی۔ ایران کے دوسرے حصوں میں مختلف ایرانی سردار تخت ایران کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ ان میں آخر کار کریم خاں زند کامیاب ہوا اور اس نے خراسان کو چھوڑ کر تمام ایران پر قبضہ کرلیا۔ خراسان میں شاہرخ سے اس کی لڑائیاں جاری رہیں۔

(۲) خاندان زند

(۱۷۵۰ء/۱۱۶۳ھ تا ۱۷۹۴ء/۱۲۰۸ھ)

کریم خاں زند (۱۷۵۰ء ۱۱۶۳ھ تا ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ)

کریم خاں زند، صوبہ فارس میں ایک چھوٹے سے قبیلے کا سردار تھا، لیکن اپنے کردار کی بدولت ترقی کر گیا۔ نادر شاہ کے بعد ہونے والی خانہ جنگی میں اس نے اپنے سب سے بڑے حریف محمد حسین قاچار کو شکست دے دی جو مازندران اور اس سے ملحقہ صوبوں پر قابض تھا۔ اس کے بعد افغان سپہ سالار آزاد نے جو آذربائیجان پر قابض تھا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ کریم خاں زند نے کل ۲۹ سال حکومت کی۔ اس میں بیس سال وہ خراساں کو چھوڑ کر پورے ایران پر حکمران رہا۔ اس نے شاہ کا لقب اختیار نہیں کیا اور خود کو وکیل کہتا تھا۔ اس کے عہد میں ایران میں امن وامان رہا اور ملک نے خوشحالی کی طرف قدم بڑھایا۔ کریم خاں زند کا دارالحکومت شیراز تھا جہاں اس نے کئی خوشنما عمارتیں بنوائیں جو آج بھی شیراز میں موجود ہیں۔

افشار خاندان کی طرح زند خاندان کی حکومت بھی پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ کریم خاں کے انتقال کے بعد ملک ایک بار پھر خانہ جنگی کا شکار ہوگیا۔ اس خانہ جنگی میں آغا محمد قاچار کامیاب ہوا اور ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی اور کریم خاں کے جانشینوں[1] اور آغا محمد قاچار کے

---

(۱) ۱۷۷۹ء سے ۱۷۸۲ء تک کریم خاں کے بھائی اور آغا محمد قاچار ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔ اس کے بعد زند خاندان میں علی مراد شاہ (۱۷۸۲ء تا ۱۷۸۵ء)، جعفر شاہ (۱۷۸۵ء تا ۱۷۸۹ء) اور لطف علی خاں (۱۷۸۹ء تا ۱۷۹۴ء) حکمران ہوئے۔ آخری حکمران آغا محمد قاچار سے شکست کھا کر مارا گیا اور زند خاندان ختم ہوگیا۔

درمیان دس بارہ سال لڑائیاں جاری رہیں۔ آخر کار آغا محمد قاچار کامیاب ہوگیا اور اس نے ۱۷۹۴ء میں ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔

(۴) شاہانِ قاچار

(۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء تا ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء)

قاچار خاندان کا بانی آغا محمد قاچار (۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ تا ۱۷۹۷ء/۱۲۱۱ھ) ایک خواجہ سرا تھا۔ وہ ایران کا تخت حاصل کرنے کے لیے کریم خاں زند کے جانشینوں سے کئی سال تک جنگ کرتا رہا آخر کار ۱۷۹۴ء میں وہ کل ایران کا بادشاہ بننے میں کامیاب ہوگیا۔ آغا محمد قاچار نے ۱۷۹۰ء میں تہران پر قبضہ کرلیا تھا اور اسی شہر سے اپنی فتوحات کا آغاز کیا تھا، اس لیے اس نے اصفہان یا شیراز کی بجائے تہران کو ایران کا دارالحکومت قرار دیا اور اس کی یہ حیثیت آج تک برقرار ہے۔ آغا محمد اُن اعلیٰ صفات سے محروم تھا جو عموماً ایک بانی سلطنت میں ہوتی ہیں وہ انتہائی ظالم اور انتقام پسند تھا۔ اس کے مظالم سے تنگ آ کر ۱۷۹۷ء میں اس کے غلاموں نے اس کو قتل کر دیا۔

فتح علی شاہ قاچار

فتح علی شاہ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) آغا محمد قاچار کا بھتیجہ اور جانشین تھا۔ اس کے دور میں ایران کی وہ عظمت جو نادر شاہ کے دور میں بحال ہوئی تھی ختم ہوگئی۔ ہرات پہلے ہی ایران کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ (۱) فتح علی شاہ کے دور میں روسیوں نے ۱۷۹۷ء میں داغستان پر اور ۱۸۰۲ء میں گرجستان پر بھی قبضہ کرلیا۔ روسیوں کی ان جارحانہ کاروائیوں کی وجہ سے ایرانی عوام مشتعل ہوگئے اور فتح علی شاہ کو روس سے جنگ کرنی پڑی۔ پہلی جنگ ۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۳ء جاری رہی اور دوسری ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۸ء تک جاری رہی۔ ولی عہد شہزادہ عباس مرزا نے اگرچہ روسیوں کے مقابلہ میں شروع میں کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں، لیکن یہ دونوں جنگیں ایران کے

(۱) ۱۷۹۸ء میں جب زمان شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل لارڈ ویلیزلی کے اشارہ پر فتح علی شاہ نے ہرات واپس لینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے زمان شاہ کو لاہور سے واپس لوٹنا پڑا۔

لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ پہلی جنگ کے نتیجے میں ایران ۱۳ ۔ اکتوبر ۱۸۱۳ء کو معاہدۂ گلستان کرنے پر مجبور ہوا جس کے تحت ایران گرجستان داغستان اور شمالی آذربائیجان پر اپنے دعوے سے دست بردار ہوگیا۔ دوسری جنگ کے نتیجے میں روسی تبریز پر قابض ہوگئے اور ایرانیوں کو ۱۸۲۸ء میں معاہدہ ترکمانچی کرنے پر مجبور کردیا جس کے تحت آرمینیہ پر سے بھی ایران اپنے حق سے دست بردار ہوگیا۔ دریائے ارس کو ایران اور روس کے درمیان حد قرار دیا گیا اور روس کو ایران میں کئی مراعات دی گئیں۔ ان جنگوں نے یہ ثابت کردیا کہ اب ایران بڑی طاقت نہیں رہا۔

ناصرالدین شاہ قاچار

قاچار حکمرانوں کے بارے میں مورخین کا عام خیال یہ ہے کہ وہ نااہل، بے بصیرت اور خود غرض تھے۔ ان میں سے کسی بادشاہ نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جو ان کی نیک نامی کا باعث ہو۔ ان بادشاہوں میں سب سے اچھا ناصرالدین شاہ ۱۸۴۸ء / ۱۲۶۴ھ تا ۱۸۹۶ء / ۱۳۱۳ھ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے دَور میں ایران میں پہلی مرتبہ جدید افکار داخل ہوئے۔ وہ محمد شاہ کا لڑکا تھا۔ اس کے ابتدائی دَور میں وزیراعظم مرزا تقی خان متوفی ۱۸۵۱ء کی مدد سے مفید اصلاحات جاری کی گئیں، لیکن اس کو بادشاہ اور شاہی خاندان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بادشاہ نے آخر کار اس کو قتل کرادیا۔ ناصرالدین شاہ نے ۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۸ء) اور ۱۸۸۹ء میں یورپ کا تین مرتبہ سفر کیا، لیکن یورپ کے یہ دَورے فضول خرچی کا باعث ہوئے۔ حکومت کی بدانتظامی نے ایران کی مالی حالت خراب کردی۔ تجارتی اور صنعتی کاموں میں اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے بیرونی ملکوں کو مراعات دی گئیں۔ بادشاہ نے بڑی بڑی رقمیں قرض لیں، لیکن ان کو فضول خرچیوں میں اڑایا۔ بادشاہی استبداد اور مالی بدحالی سے دانشور طبقے میں بادشاہ کے استبداد کے خلاف جذبات اُبھرنے لگے۔ جمال الدین افغانی کی ایران میں موجودگی نے اس تحریک کو مزید تقویت دی اور ناصرالدین بالآخر ایک قوم پرست نوجوان کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

ناصرالدین شاہ کے دَور کا ایک اہم واقعہ شیراز میں مرزا علی محمد باب (۱۸۲۰ء تا ۱۸۵۰ء) کا ظہور ہے جس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جو بابی مذہب کہلاتا ہے۔ بہائی مذہب اسی کی ایک شاخ ہے۔ علی محمد باب کو ناصرالدین شاہ کے حکم پر قتل کردیا گیا۔

اس دَور کا دوسرا اہم واقعہ ۱۸۵۶ء میں ہرات پر ایران کا قبضہ ہے، لیکن انگریزوں نے دباؤ ڈال کر ایرانیوں کو اگلے سال ہرات چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہرات کو لینے کی یہ آخری کوشش تھی۔ ۱۸۵۷ء میں معاہدۂ پیرس کے تحت ایران کی حکومت ہرات پر اپنے دعوے سے دست بردار ہوگئی۔

دستوری جدوجہد

ناصر الدین شاہ کے بیٹے اور جانشین مظفر الدین شاہ (۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۶ء) نے یورپ کے سفر کر کے اور روس سے بڑے بڑے قرضے لے کر ایران کو دیوالیہ کر دیا۔ صوبوں میں بدامنی پھیل گئی، راستے غیر محفوظ ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں ایران میں باقاعدہ آئینی تحریک شروع ہوگئی۔ نااہل وزیر جس کو جمال الدین افغانی نے ناصر الدین شاہ کے زمانہ میں ایران کی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیا تھا، برطرف کرنے اور دستوری حکومت قائم کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ آخر مظفر الدین شاہ نے مظاہرین کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں دستور منظور کر لیا گیا۔

مظفر الدین کے جانشین محمد علی شاہ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء) کے زمانے میں آئینی تحریک نے انقلابی شکل اختیار کر لی، کیونکہ نئے حکمران نے آئین پر عمل کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا اور روسیوں کی مدد سے دستور کو ختم کرنا چاہا۔ اس پر ملک میں بغاوت ہوگئی۔ مظاہرین نے اصفہان، تبریز اور تہران پر قبضہ کر لیا اور محمد علی شاہ کو روسی سفارت خانہ میں پناہ حاصل کرنی پڑی۔ دستور پسندوں نے حکومت پر قبضہ کر کے محمد علی شاہ کو معزول کر دیا اور ایران میں دستوری حکومت قائم کر دی۔ دستور پسندوں نے احمد شاہ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۵ء) کو بادشاہ بنا دیا۔

ترکی کی دوسری مشروطیت کی طرح جو ایرانی مشروطیت سے ایک سال قبل قائم ہوئی تھی ایرانی مشروطیت بھی بیرونی مداخلت کی وجہ سے کامیابی سے کام نہیں کر سکی۔ ۳۱۔ اگست ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کے ذریعے روس اور برطانیہ نے ایران کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں تقسیم کر لیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ کوئی ملک دوسرے کے حلقے میں سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ان دونوں ملکوں نے فوجی مداخلت بھی کی۔ شمال مغرب میں تبریز اور قزوین پر روس نے قبضہ کر لیا اور جنوب میں اصفہان تک برطانوی فوجیں قابض ہوگئیں۔ یہ صورت حال دوسری

جنگ کے خاتمہ تک قائم رہی۔ ۲۲۔فروری ۱۹۲۱ء کو ایرانی فوج کے ایک دستے کاسک بریگیڈ کے کمانڈر رضا خاں نے تہران پر قبضہ کرلیا۔ یہ دستہ ۱۸۸۲ء میں ناصرالدین شاہ نے قائم کیا تھا اور روسی افسروں کے تحت تھا۔ اسی کی مدد سے محمد علی شاہ نے آئین ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چار روز بعد ۲۶۔فروری کو روس کی اشتراکی حکومت اور ایران میں ایک معاہدہ ہوگیا جس کے تحت روس نہ صرف ایران میں ان مراعات سے دست بردار ہوگیا جو عہد زار میں حاصل کی گئی تھیں، بلکہ روسی قرضے بھی معاف کر دیئے گئے۔ رضا خاں اب وزیر جنگ اور کمانڈر انچیف ہو گئے اور ایران کے حقیقی حکمران بن گئے۔ شروع میں تو انہوں نے احمد شاہ قاچار کو برقرار رکھا جو ۱۹۲۳ء میں فرار ہو کر یورپ چلا گیا تھا، لیکن اکتوبر ۱۹۲۵ء میں قومی اسمبلی کے ذریعہ احمد شاہ قاچار کو معزول کر کے خود بادشاہ بن گئے اور اس طرح ایران میں قاچار خاندان کی حکومت ختم ہو کر پہلوی خاندان کی بادشاہت کا آغاز ہوا جو اب تک قائم ہے۔ احمد شاہ کا ۱۹۳۰ء میں یورپ میں انتقال ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ قومی اسمبلی رضا خاں کو بادشاہ کی بجائے صدر منتخب کرنا چاہتی تھی، لیکن اسی زمانے میں ترکی میں جمہوریت کے قیام اور بادشاہت اور خلافت کے خاتمے نے اسلامی دستور پسندوں کو نئے جمہوری اور سیکولر رجحانات سے خوفزدہ کر دیا اور انہوں نے خالص جمہوری حکومت پر آئینی بادشاہت کو ترجیح دی۔[1] [جدید ایران کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

شاہان قاچار

(۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ تا ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ)

(۱) آغا محمد شاہ	۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ تا ۱۷۹۷ء/۱۲۱۱ھ
(۲) فتح علی شاہ	۱۷۹۷ء/۱۲۱۱ھ تا ۱۸۳۵ء/۱۲۵۰ھ
(۳) محمد شاہ	۱۸۳۵ء/۱۲۵۰ھ تا ۱۸۴۸ء/۱۲۶۴ھ
(۴) ناصرالدین شاہ	۱۸۴۸ء/۱۲۶۴ھ تا ۱۸۹۶ء/۱۳۱۳ھ

(۱) مارچ ۱۹۷۹ء میں اس بادشاہت کا امام خمینی کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا اور ایران اسلامی جمہوریہ بن گیا۔

(۵) مظفر الدین شاہ ۱۸۹۶ء/۱۳۱۳ھ تا ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ
(۶) محمد علی شاہ ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ تا ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ
(۷) احمد شاہ ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ تا ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ

اہم واقعات

۱۷۲۶ء تا ۱۷۲۸ء نادر شاہ اور طہماسپ نے خراسان پر قبضہ کیا۔

۱۷۲۹ء میہن دوست کی جنگ میں نادر نے افغانوں کو شکست دی اور اصفہان پر قبضہ کرلیا۔

۱۷۳۰ء شیراز کے پاس نادر نے افغانوں کو فیصلہ کن شکست دی اور ایران سے نکال دیا۔

۱۷۳۲ء روسی مازندران، جیلان اور استراباد سے دست بردار ہو گئے۔

۱۷۳۳ء جنگ کرکوک میں نادر نے ترکوں کے مقابلہ میں شکست کھائی۔

۱۷۳۵ء باغ وند کی جنگ میں نادر نے ترکوں کو شکست دی اور روسیوں نے نادر کی دھمکی کے بعد داغستان اور آذربائیجان خالی کر دیا۔

۱۷۳۸ء نادر کا قندھار پر قبضہ۔

۱۷۳۹ء کرنال کی جنگ میں محمد شاہ کی شکست اور دہلی پر نادر کا قبضہ۔

۱۷۴۰ء خانانِ بخارا اور خیوہ نے نادر کی اطاعت کرلی۔

۱۷۴۵ء قارص کی جنگ میں نادر نے ترکوں کو شکست دی۔ اس کے بعد ترکی اور ایران میں تصفیہ ہو گیا۔

۱۸۰۰ء روس نے گرجستان پر قبضہ کرلیا۔

۱۸۱۳ء (۱۲۔ اکتوبر) معاہدۂ گلستان۔ ایران نے داغستان، آذربائیجان، گرجستان پر روس کا قبضہ تسلیم کرلیا۔

۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۳ء ترکی اور ایران کی آخری جنگ اور سرحدوں کا تعین۔

۱۸۲۵ء تا ۱۸۲۸ء روس اور ایران کی جنگ۔

۱۸۲۶ء میں گنجہ کے مقام پر ایرانیوں کی شکست۔

۱۸۲۸ء (۲۲۔فروری) معاہدۂ ترکمانچی۔ ایرانی حکومت آرمینیہ اور قرہ باغ سے دست بردار ہوگئی۔

۱۸۵۶ء ہرات پر ایران کا قبضہ، لیکن برطانوی دباؤ کے بعد ۱۸۵۷ء میں معاہدہ پیرس ہوا جس کے تحت ایران نے افغانستان کی آزادی تسلیم کرلی۔

۱۸۷۸ء کاسک بریگیڈ کی تشکیل۔

۱۹۰۶ء مظفر شاہ نے عوامی مظاہروں کے بعد آئین منظور کرلیا۔

۱۹۰۸ء میں مسجد سلمان میں پہلی مرتبہ تیل نکلا۔

۱۹۰۹ء اینگلو پرشین آئل کمپنی کی تشکیل۔

۱۹۲۱ء (۲۱۔فروری) رضا خاں نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔

۱۹۲۵ء مجلس نے احمد شاہ کو معزول کردیا (۳۱۔اکتوبر) اور ۳۱۔دسمبر کو رضا خان کو بادشاہ منتخب کرلیا۔

۱۹۲۶ء (۲۵۔اپریل) کو رضا شاہ نے باقاعدہ تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔

باب ۳۱

افغان اپنی قومی حکومت قائم کرتے ہیں

(۱) ابدالی خاندان (۱۷۴۷ء تا ۱۸۲۶ء)

افغانستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ پٹھان نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے جو خود کو افغان کہتے ہیں۔ یہ باشندے ہزاروں سال سے اس خطے میں آباد ہیں۔ اگرچہ تاریخ میں ان باشندوں نے بعض بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، لیکن اٹھارہویں صدی سے پہلے ان کی کوئی ایسی قومی حکومت قائم نہیں ہوئی جو پورے افغانستان کی حکومت کہلائی جاسکے۔ اسلامی تاریخ میں محمد غوری، شیر شاہ سوری اور سکندر لودھی بڑے نامور پٹھان حکمران ہوئے ہیں، لیکن ان کی حکومتیں یا تو افغانستان کے باہر تھیں، جیسے سکندر لودھی اور شیر شاہ سوری یا ان کی حیثیت افغان حکومت سے زیادہ اسلامی حکومت کی تھی، جیسے محمد غوری کی حکومت، جس کے عہدے داروں، سپہ سالاروں اور فوجوں میں ترک اور ایرانی بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ شیر شاہ سوری کا تعلق ان پٹھانوں سے تھا جو افغانستان میں نہیں، بلکہ پاکستان میں آباد ہیں۔ افغانوں کی پہلی قومی حکومت نادر شاہ کے مشہور سپہ سالار احمد شاہ ابدالی نے قائم کی۔

احمد شاہ ابدالی

سولھویں اور سترہویں صدی میں افغانستان کا ملک تین حصوں میں تقسیم تھا: مشرقی حصہ جس میں شہر کابل ہے دہلی کی تیموری سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ مغربی اور جنوبی حصہ پر جس میں قندھار اور ہرات کے شہر میں زیادہ تر ایران کے قبضے میں رہتے تھے اور شمالی حصہ جو بدخشاں اور بلخ پر مشتمل ہے ازبکوں کے پاس تھا، جو کبھی کبھی ہرات پر بھی قابض ہو جاتے تھے۔ افغانستان کے شمالی حصے کے باشندے نسلی اعتبار سے زیادہ تر تاجیک اور ازبک ہیں اور مغربی حصے کے ایرانی یا منگول۔ افغان یعنی پٹھان آبادی کا اصل مرکز جنوبی اور جنوب مشرقی افغانستان ہے جس کا سب سے بڑا شہر قندھار ہے۔ یہاں کے غلزئی پٹھانوں نے میر اویس کی قیادت میں پہلی بار آزاد ہونے کی جو

کوشش کی تھی اس کا تذکرہ ہم عہد صفوی کے حالات میں کر چکے ہیں، لیکن نادر شاہ نے افغانوں کو ایران سے نکال کر اور ۱۷۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

نادر شاہ نے جب ۱۷۲۸ء میں ہرات پر قبضہ کیا تھا، تو وہاں افغانوں کا ایک قبیلہ جسے ابدالی کہتے ہیں آباد تھا اور بارہ سال سے وہاں حکومت کر رہا تھا۔ نادر شاہ نے اپنی فوج میں ابدالی پٹھانوں کو بھی شامل کر لیا۔ احمد خاں اسی دستے کا سردار تھا۔ احمد خان نے نادر کی لڑائیوں میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی کی فتح کے موقع پر بھی موجود تھا۔ اس کا شمار نادر شاہ کے وفادار ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ جون ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ میں جب کوچان (خراسان) کے مقام پر نادر شاہ کو اس کے شیعہ سرداروں نے قتل کر دیا تو احمد خاں فرار ہو کر قندھار آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ نادر کے خزانے کا ایک بڑا حصہ بھی لے آیا، جس میں مشہور ہیرا کوہ نور بھی شامل تھا، جسے نادر دہلی سے لے گیا تھا۔ قندھار میں ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ میں افغانوں نے احمد خاں کو سردار منتخب کر لیا اور وہ احمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا لقب دردوران اختیار کیا جس کی نسبت سے اس کو احمد شاہ درانی بھی کہا جاتا ہے۔

پانی پت کی تیسری جنگ

احمد شاہ نے برصغیر پاکستان و ہند پر ۱۷۴۸ء اور ۱۷۶۹ء کے درمیان نو مرتبہ حملے کیے اور سرہند تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو مرتبہ دہلی آیا۔ ۱۴۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہندوستان کے مسلمان امراء کے ساتھ مل کر پانی پت کے میدان جنگ میں اس نے مرہٹوں کو شکست دی۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں پنجاب میں مرہٹوں کے بعد سکھوں کا زور بہت بڑھ گیا اور اس کو ان کی وجہ سے بار بار پنجاب آنا پڑتا تھا۔ بادشاہ جب آتا تھا تو یہ سکھ سردار فرار ہو جاتے تھے اور پہاڑوں میں پناہ لے لیتے تھے، لیکن جب وہ واپس چلا جاتا تھا تو پھر قتل و غارت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ۱۷۶۵ء کے بعد عملاً لاہور تک کا علاقہ ابدالی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مغرب میں احمد شاہ نے ۱۷۵۱ء تک ہرات، مشہد اور نیشاپور فتح کر لیا تھا اور مشہد کے علاقے پر اس نے نادر شاہ کے پوتے شاہرخ کو تخت پر بٹھا دیا، لیکن اس کی حیثیت ایک باجگذار کی تھی اور خراسان میں احمد شاہ کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ احمد شاہ کے آخری وقت میں

بلوچستان میں میر نصیر خاں نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا تھا، لیکن بعد میں احمد شاہ کی بالادستی تسلیم کر لی۔ احمد شاہ کا جب انتقال ہوا تو وہ تمام علاقہ جو اب افغانستان کہلاتا ہے اس کے قبضے میں تھا۔ پاکستان میں کشمیر، صوبہ سرحد اور ملتان بھی اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ سندھ، بلوچستان اور خراسان اس کی بالادستی تسلیم کرتے تھے۔

احمد شاہ اپنے اخلاق و کردار، فوجی صلاحیت، عدل و انصاف اور دینداری کی وجہ سے تاریخ اسلام کے ممتاز حکمرانوں میں شامل ہونے کے لائق ہے، لیکن اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اس نے پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کو زبردست شکست دی لیکن دہلی میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی بجائے واپس قندھار چلا گیا۔ پنجاب میں وہ سکھوں کو قابو میں نہیں رکھ سکا۔ لاہور اور دہلی میں اس کی فوجوں نے جس طرح قتل عام کیا۔ وہ ایک مسلمان حکمران کی شایانِ شان نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اپنی فوج پر پوری طرح کنٹرول نہیں تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے جانشین

احمد شاہ کے بعد اس کا لڑکا تیمور شاہ (۱۷۷۳ء تا ۱۷۹۳ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں سندھ اور بلوچستان پر سے افغانوں کی بالادستی ختم ہوگئی اور وہ آزاد ہو گئے۔ مرو پر امیر بخارا نے قبضہ کر لیا اور خراسان میں مشہد اور نیشاپور بھی ہاتھ سے نکل گئے لیکن باقی سلطنت میں تیمور شاہ نے امن قائم رکھا۔ تیمور نے دارالحکومت قندھار سے کابل منتقل کر دیا اور اس وقت سے کابل افغانستان کا مستقل دارالحکومت ہو گیا۔

تیمور شاہ کے بعد اس کا لڑکا زمان شاہ (۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۱ء) تخت نشین ہوا، لیکن اس کا دور خانہ جنگیوں میں گزر گیا۔ ۱۷۶۵ء کے بعد سے لاہور پر سکھ قابض ہو گئے تھے۔ زمان شاہ نے پنجاب پر پھر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۷۹۸ء میں وہ لاہور پر قابض ہو گیا۔ سکھ حسب دستور فرار ہو گئے لیکن جب زمان شاہ واپس چلا گیا تو انہوں نے لاہور پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں زمان شاہ نے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ کو لاہور کا صوبے دار مقرر کیا، لیکن یہ صرف ایک ضابطہ کی کارروائی تھی ورنہ پنجاب مستقل طور پر درانی سلطنت کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اب وہاں ایک آزاد سکھ حکومت قائم ہو چکی تھی۔

۱۸۰۱ء میں زمان شاہ کو اس کے بھائی محمود شاہ نے اندھا کر کے قید کر دیا۔ اب افغانستان پوری طرح خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں سے دوستی کا عہد نامہ کیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگئی اور ۱۸۱۰ء میں محمود شاہ دوبارہ تخت پر قابض ہوگیا، لیکن محمود شاہ نے بارک زئی قبیلے کے سرداروں کو اپنے غلط طرز عمل سے مخالف بنالیا اور ایک بارک زئی سردار دوست محمد خاں نے ۱۸۲۶ء میں کابل پر قبضہ کر کے درانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

دوست محمد خان کے کابل پر قابض ہو جانے کے بعد شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ اور انگریزوں سے مدد لے کر کابل پر قبضہ کرنا چاہا۔ رنجیت سنگھ کی مدد سے وہ کابل پر تو قبضہ حاصل نہ کر سکا، لیکن کوہ نور کا قیمتی ہیرا کھو بیٹھا جسے رنجیت سنگھ نے چالاکی سے حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے البتہ شاہ شجاع کی مدد کی۔ انگریزی فوجیں ۱۸۳۹ء میں امیران سندھ کے علاقے سے زبردستی گھس کر کوئٹہ کے راستے افغانستان میں داخل ہوئیں اور شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا دیا۔ دوست محمد خاں بھاگ کر بخارا چلا گیا۔ شاہ شجاع انگریزوں کی مدد سے زیادہ عرصہ تخت پر قابض نہیں رہ سکا۔ ۱۸۴۲ء میں اس کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ انگریزی دستے کے چار پانچ ہزار سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ اس ہنگامے میں شاہ شجاع بھی ہلاک ہوگیا۔ ستمبر کے مہینے میں انگریزوں نے جوابی کاروائی کی اور کابل کو جلا کر برباد کر دیا۔ انگریزوں کی واپسی کے بعد دوست محمد خاں جنوری ۱۸۴۳ء میں پھر کابل پر قابض ہوگیا۔

افغانستان کے ان ہنگاموں سے پنجاب کے سکھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر اور ۱۸۲۳ء میں پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔

(۲) بارک زئی خاندان

(۱۸۲۶ء تا ۱۹۲۹ء)

دوست محمد خاں بارک زئی خاندان کی حکومت کا بانی ہے۔ اس نے افغانستان پر پہلی مرتبہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۹ء تک حکومت کی اور اس کے بعد ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۳ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں پشاور پر سکھوں کا قبضہ ہوا، اور یہ دوست محمد خاں کا ہی عہد تھا جس میں سید احمد شہید نے پشاور اور ملحقہ علاقے میں پہلی اسلامی جمہوری حکومت قائم کر کے مغربی پاکستان کے

شمالی حصوں کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی۔ دوست محمد خاں کے عہد ہی میں پہلی مرتبہ افغانوں کا انگریزوں سے تصادم ہوا، جنہوں نے شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا کر افغانستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ افغان حریت پسندوں نے اس کوشش کو جلد ہی ناکام بنا دیا۔

دوست محمد خاں کے بعد اس کا لڑکا امیر شیر علی (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء) تخت نشین ہوا۔ انگریزوں نے اس کے دور میں پھر اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رُوسی ترکستان پر قابض ہو گئے تھے اور سلطنت رُوس کی سرحدیں افغانستان سے مل گئی تھیں۔ روسی خطرے کے پیش نظر برطانیہ چاہتا تھا کہ افغانستان پر اس کا اثر قائم رہے، لیکن جب امیر شیر علی انگریزوں کے آگے نہیں جھکا اور روس سے تعلقات قائم کرنا چاہے، تو انگریزوں نے افغانستان کے معاملے میں پھر مداخلت کی۔ اس وقت تک سندھ، پنجاب اور سرحد ان کے قبضے میں آ چکا تھا اور ۱۸۷۶ء میں انہوں نے کوئٹہ اور بلوچستان پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے ۱۸۷۸ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر شیر علی فرار ہو کر ترکستان چلا گیا اور اس کے بیٹے یعقوب خاں نے ۱۶۔ مئی ۱۸۷۹ء کو انگریزوں سے ایک معاہدہ کر لیا جو معاہدۂ گندامک کہلاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت آخر کار انگریز افغانستان پر اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب افغانستان انگریزوں کی مرضی کے بغیر کسی دوسرے ملک سے تعلق قائم نہیں کر سکتا تھا۔ امیر یعقوب نے ایک مختصر فوج بھی کابل میں رکھنے کی اجازت دے دی، لیکن افغان حریت پسندوں نے انگریزی دستہ پر حملہ کر کے اس کو ختم کر دیا۔ یہ واقعہ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان دوسری جنگ کا باعث ہوا جو ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء جاری رہی اور جس کے دوران انگریزوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریزوں نے ایک ایسے شخص کو کابل کے تخت پر بٹھانا چاہا جو افغانستان کے باشندوں کو بھی قابو میں رکھ سکے اور انگریزوں کا دوست بھی ہو، چنانچہ انہوں نے ۲۲۔ جولائی ۱۸۸۰ء کو دوست محمد خاں کے پوتے عبدالرحمن خاں کو امیر افغانستان بنا دیا اور اپنی فوجیں کابل سے واپس بلا لیں۔

عبدالرحمن خاں (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۱ء)

امیر عبدالرحمن خاں تخت نشین ہوئے تو سارے افغانستان میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور ملک

میں تخت کے دعوے دار بھی موجود تھے، لیکن امیر عبدالرحمن نے جلد ہی تمام مخالفوں کو کچل کر امن و امان قائم کر دیا۔ اگر احمد شاہ ابدالی افغانستان کا پہلا بادشاہ تھا، تو امیر عبدالرحمن بجا طور پر جدید افغانستان کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔ موجودہ افغانستان کی حدود ان ہی کے زمانے میں قائم ہوئیں۔ ۱۸۸۷ء میں شمال میں ترکستان کے ساتھ حد بندی کی گئی مشرق میں ۱۸۸۸ء میں ایران اور افغانستان کے درمیان حد بندی کی گئی اور مغرب اور جنوب میں ۱۸۹۳ء میں انگریزوں سے ایک معاہدہ کے تحت برطانوی ہند کے ساتھ حد بندی کی گئی۔ یہ نئی سرحد برطانوی ہند کے سکرٹری خارجہ سر مورٹی مر ڈیورنڈ (Sir Mortimar Durand) کے نام پر ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے اور اب افغانستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد کی حیثیت رکھتی ہے۔

امیر عبدالرحمن کے بعد ان کے لڑکے امیر حبیب اللہ (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء) تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور میں پہلی مرتبہ افغانستان میں بجلی گھر اور کارخانے قائم ہوئے اور پختہ سڑکیں بنائی گئیں۔ افغانستان کا پہلا جدید طرز کا مدرسہ حبیبیہ کالج اسی دور میں قائم ہوا۔ حبیب اللہ خاں کے دور میں جدید نظریات افغانستان میں داخل ہوئے اور ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو ترکی اور ایران کی طرز پر افغانستان میں اصلاحات چاہتا تھا اور افغانستان کو برطانوی اثر سے نکالنا چاہتا تھا۔ اسی دوران ہی جنگ عظیم چھڑ گئی اور افغانستان میں ترکوں کی حمایت کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ امیر حبیب اللہ بعض مصلحتوں کے تحت افغانستان کو غیر جانبدار رکھنا چاہتے تھے اور برطانوی ہند سے ٹکراؤ نہیں چاہتے تھے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیر حبیب اللہ قتل کر دیئے گئے۔

امان اللہ خان (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء)

امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد ان کے لڑکے امان اللہ خان تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کر دی۔ ہندوستان میں اس زمانے میں آزادی کی تحریک پوری قوت سے جاری تھی اس لیے انگریزوں نے افغانستان سے صلح کرنا بہتر سمجھا۔ معاہدہ گندامک کے وقت سے افغانستان کی خارجہ پالیسی انگریزی کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، اس لیے امیر امان اللہ خاں بھی صرف یہ چاہتے تھے کہ افغانستان کی خارجہ پالیسی کو انگریزی اثر سے آزاد کر لیں اور افغانستان کو صحیح معنوں میں یک آزاد ملک بنا دیں۔ چنانچہ ۸۔ اگست ۱۹۱۹ء میں راولپنڈی میں برطانوی

حکومت اور افغانستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا اور انگریزوں نے افغانستان کی مکمل خود مختاری تسلیم کرلی۔ یہ امان اللہ خاں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اسی زمانے میں روس میں اشتراکی انقلاب آ گیا تھا۔ افغانستان کی حکومت نے اشتراکی حکومت کو تسلیم کرلیا اور ۱۹۲۱ء میں روس سے دوستانہ معاہدہ کرلیا۔ اسی سال افغانستان نے ایران اور ترکی سے دوستانہ معاہدے کیے۔ اب تک افغانستان کے بارک زئی حکمران خود کو امیر کہلاتے تھے، ۱۹۲۶ء میں امان اللہ خاں نے شاہ کا لقب اختیار کرلیا۔

امان اللہ خاں ایک بیدار مغز حکمران تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ افغانستان ترقی کر کے ایک جدید ملک بن جائے۔ اس کے لیے انہوں نے بہت سی اصلاحات کیں۔ کابل میں پہلی یونیورسٹی قائم کی اور جدید تعلیم کو فروغ دیا۔ زراعت اور صنعت کی طرف بھی توجہ دی گئی اور کئی کارخانے قائم کیے گئے۔ افغانستان کے آئین میں ترکی کے نمونے پر بعض اصلاحات بھی کی گئیں، جن کی بدولت عوام کو پہلے سے زیادہ آزادی ملی، لیکن امان اللہ خان اپنی اصلاحی کوششوں میں بہت آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے ایسے طور طریقوں کو رواج دینا چاہا جن کو اس وقت کا افغان معاشرہ قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ امان اللہ اتاترک اور رضا خاں کے مقابلے میں زیادہ اسلام پسند تھے، لیکن ان کے طرزِ عمل خصوصاً ملکہ ثریا کو بے پردہ کرانے کی وجہ سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ قبائلی ہر طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انگریزوں نے بھی ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور باغیوں کی در پردہ حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ایک معمولی شخص جو بچہ سقہ کے نام سے مشہور ہے اور درحقیقت ایک ڈاکو اور رہزن تھا، مسلح قبائلیوں کی مدد سے کابل پر قابض ہوگیا۔ امان اللہ خاں ملک کو خونریزی سے بچانے کے لیے ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو تخت سے دست بردار ہوگئے اور افغانستان کو چھوڑ کر اٹلی چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کرلی۔ ان کا روم میں ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔

امان اللہ خاں کی دست برداری پر افغانستان کے بارک زئی خاندان کی اس شاخ کی حکومت ختم ہوگئی جو دوست محمد خاں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

[جدید افغانستان کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

افغانستان کے ابدالی حکمران

(۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ تا ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ)

(۱) احمد شاہ درانی (ابدالی)	۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ تا ۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ
(۲) تیمور شاہ	۱۷۷۳ء/۱۱۸۷ھ تا ۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ
(۳) زمان شاہ	۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ تا ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ
(۴) شجاع الملک شاہ شجاع	۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ تا ـــــــ
(۵) محمود شاہ	۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ تا ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ
(۶) شاہ شجاع (دوبارہ)	۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ تا ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ
(۷) محمود شاہ (دوبارہ)	۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ تا ۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ

۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ میں کابل پر امیر دوست محمد خاں کے قبضے کے بعد محمود شاہ ہرات چلا گیا جہاں ۱۲۴۵ھ تک حکومت کی۔ شاہ شجاع انگریزوں کی مدد سے ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ میں تیسری مرتبہ کابل پر قابض ہو گیا، لیکن ۱۵۔ اپریل ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء کی شورش میں مارا گیا۔ اس کی موت پر ابدالی خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔

بارک زئی خاندان کے حکمران

(۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ تا ۱۹۲۹ء/۱۳۴۷ھ)

(۱) امیر دوست محمد	۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ تا ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ پھر ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ تا ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ
(۲) امیر شیر علی خان	۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ تا ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ
(۳) امیر یعقوب خان	۸۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ تا ۱۸۸۰ء/۱۲۹۶ھ
(۴) امیر عبدالرحمن خان	۱۸۸۰ء/۱۲۹۶ھ تا ۱۹۰۱ء/۱۳۱۹ھ
(۵) امیر حبیب اللہ خان	۱۹۰۱ء/۱۳۱۹ھ تا ۱۹۱۹ء/۱۳۳۷ھ

(۶) شاہ امان اللہ خان ۱۹۱۹ء/۱۳۳۷ھ تا ۱۹۲۹ء/۱۳۴۷ھ

اہم واقعات

۱۷۵۲ء لاہور اور کشمیر پر احمد شاہ ابدالی کا قبضہ۔

۱۷۵۷ء احمد شاہ ابدالی کا دہلی میں داخلہ۔

۱۷۶۱ء (۱۴۔جنوری) پانی پت کی تیسری جنگ۔

۱۷۶۲ء احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کو شکست دی جو لاہور قابض ہو گئے تھے۔

۱۷۹۹ء زمان شاہ نے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا والی مقرر کیا۔

۱۸۱۶ء ہرات پر ایران کا عارضی قبضہ۔

۱۸۱۹ء کشمیر پر سکھوں کا قبضہ۔

۱۸۲۳ء پشاور پر سکھوں کا قبضہ۔

۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء پہلی افغان جنگ۔ دوست محمد خاں کے لڑکے اکبر خاں نے پسپا ہونے والی تین ہزار برطانوی فوج کا خاتمہ کر دیا۔ (جنوری ۱۸۴۲ء)

۱۸۵۶ء ہرات پر ایران کا قبضہ۔

۱۸۵۷ء معاہدہ پیرس۔ ایران نے افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی۔

۱۸۶۳ء ہرات پر افغانستان کا مستقل قبضہ۔

۱۸۷۸ء ۱۸۷۹ء دوسری افغان جنگ۔ شیر علی کے لڑکے یعقوب خاں کو ۱۸۷۹ء (۱۶۔مئی) کو معاہدہ گنڈامک پر مجبور ہونا پڑا۔

۱۸۸۵ء (۱۸۔جون) روس کے ساتھ سرحدوں کی حد بندی کا معاہدہ۔

۱۸۹۳ء (۱۳۔نومبر) ڈیورنڈ لائن کا تعین۔

۱۸۹۵ء (۱۱۔مارچ) پامیر کے علاقہ میں افغانی سرحدوں کی حد بندی۔

۱۹۱۹ء (۸۔اگست) معاہدہ راولپنڈی۔ انگریزوں نے افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی۔

۱۹۲۱ء افغانستان نے روس، ترکی اور ایران سے دوستانہ معاہدے کیے۔

۱۹۲۳ء افغانستان میں بنیادی حقوق کے نفاذ کا اعلان۔

۱۹۲۸ء (جنوری تا جولائی) امان اللہ خاں اور ملکہ ثریا نے ہندوستان، مصر اور یورپ کا دورہ کیا۔ اسی سال نومبر میں افغانستان میں بغاوت ہوگئی۔

۱۹۲۹ء (۱۷۔ جنوری) کابل پر بچہ سقہ کا قبضہ۔ جنرل نادر خاں نے ۸۔ اکتوبر کو کابل پر قبضہ کر کے بچہ سقہ کی حکومت ختم کر دی اور ۱۶۔ اکتوبر کو نادر شاہ کے نام سے کابل پر جلوس کیا۔

باب ۳۲

ترکستان غلامی کی زنجیروں میں

(۱) مشرقی ترکستان

عہد قدیم میں دیوار چین سے لے کر بحیرۂ اسود کے شمالی کنارے تک وسط ایشیا اور روس کا وہ سارا علاقہ جو موجودہ افغانستان اور ایران کے شمال میں واقع ہے ترکوں کا وطن تھا۔ ارض توران کے اس خطے سے قبل از اسلام بھی بڑے بڑے فاتح اٹھے اور اسلام کے بعد بھی اتیلا کی قیادت میں ہنوں کی یلغار اور پھر خزر قبائل کی یلغاریں اسی وسیع وعریض علاقے سے شروع ہوئیں۔ وسط ایشیا اور پاکستان کا کشن خاندان جس کا حکمران کنشک تھا ایک ترکی النسل خاندان تھا۔ کوہ تھیان شان جو ترکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور جسے ترک تزی داغ کہتے ہیں اس کے دامن ترک قوم کا گہوارہ ہیں۔ اسلام سے قبل یہ خطہ کئی سو سال تک چین کی جارحانہ کارروائیوں کا مرکز بنا رہا۔ کبھی چینی کامیاب ہو جاتے تھے اور کبھی ترک۔ دیوار چین ان ہی ترک حملہ آوروں سے بچنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں چینیوں نے آخری بار حملہ کیا، لیکن ترکوں نے عرب سپہ سالار نصر بن سیار سے جو خراسان اور ماوراء النہر کا گورنر تھا، مدد مانگی اور ۷۵۱ء میں عربوں اور ترکوں کی اس متحدہ فوج نے تالاس کے میدان جنگ میں چینیوں کو فیصلہ کن شکست دی اور ترکستان کو مستقل طور پر آزاد کرا لیا۔ اس جنگ نے اس بات کا بھی فیصلہ کر دیا کہ آئندہ ترکستان کی تہذیب اسلامی ہوگی چینی نہیں۔

اس کے بعد ترکوں نے بتدریج اسلام قبول کر لیا۔ ترک قبائل ایک بار پھر ترکستان سے نکل کر ساری اسلامی دنیا میں پھیل گئے۔ ترکستان سے باہر سلجوقی ترکوں اور عثمانی ترکوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ محمود غزنوی کے اجداد اور سلاطین دہلی کے اجداد بھی ترک تھے اور ترکستان سے برصغیر میں آئے تھے۔ خاص ترکستان میں پہلی اسلامی حکومت قرہ خانیوں کی تھی جن

کو ایلک خانی بھی کہتے ہیں اور جو سلاطین غزنی کے ہمعصر تھے۔ قرہ خانیوں کا دارالحکومت کاشغر تھا۔ اسی زمانے میں ترکی ادب وجود میں آیا اور پہلی مرتبہ ترکی زبان میں کتابیں لکھی گئیں۔ ترکی ادب کا ابتدائی شاہکار ''کتادغو بلیغ'' (Kutadgu Bilig) اسی زمانہ میں کاشغر میں لکھا گیا۔ ''دیوان لغات الترک'' جو ترکی ادب اور ثقافت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ۱۰۷۲ء میں بغداد میں مکمل ہوا، لیکن اس کا مصنف مشرقی ترکستان ہی کا ایک باشندہ محمود کاشغری تھا۔

قرہ خانیوں کے بعد منگولوں نے اس خطہ پر حکومت کی۔ چغتائی منگول نسلاً ترکوں کے بھائی بند تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد ترکی زبان اور اسلامی تہذیب اختیار کرلی جس کا اس خطے میں صدیوں سے غلبہ تھا۔ ۱۶۹۹ء میں خواجہ ہدایت اللہ نامی ایک پیر طریقت نے چغتائی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور حکومت پر قابض ہوگیا۔ ترکوں کے اس باہمی تصادم سے ایک منگول قبیلے قالمُق نے فائدہ اٹھایا جو کافر تھا، اور مشرقی ترکستان کے شمالی حصے پر قابض ہوکر شہر اِپلی کو مرکز حکومت بنالیا۔ بعد میں خواجہ ہدایت اللہ نے بھی ان کی اطاعت قبول کرلی۔ ان قالموقوں کی حکومت جن کو جُنگار بھی کہا جاتا ہے ۱۷۶۰ء تک قائم رہی۔

چین کا قبضہ

جنگ تالاس کے بعد سے چینیوں نے پورے ایک ہزار سال تک مشرقی ترکستان کا رُخ نہیں کیا تھا، لیکن قالموقوں نے مشرقی ترکستان پر قابض ہونے کے بعد چین پر حملے شروع کردیئے اور چین کے شہر پیکنگ تک یلغاریں کرنے لگے۔ چنانچہ ان کی اس کاروائی نے چینیوں کو ایک بار پھر ترکستان پر قبضہ کرنے کا بہانہ پیدا کردیا اور ان کی فوجوں نے قالموقوں کو شکست دے کر ۱۷۶۰ء میں مشرقی ترکستان کے شمالی حصہ پر قبضہ کیا اور اس کے بعد کاشغر، یارقند اور ختن پر بھی قبضہ کرلیا۔ یہاں کے حکمران خواجہ برہان الدین اور اس کے بھائی خواجہ جہاں نے بدخشاں میں پناہ لی، لیکن بدخشاں کے حکمران امیر سلطان نے چینیوں کی دھمکی پر ان دونوں بھائیوں کو قتل کرکے ان کے سر چین بھیج دیئے۔ امیر سلطان نے خواجہ جہاں کی بیوی دلشاد سلطان کو بھی چین بھیج دیا جہاں شہنشاہ چین نے اس سے شادی کرنی چاہی، لیکن جب دلشاد سلطان نے سختی سے انکار کردیا تو اس کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ دلشاد سلطان چین اور مشرقی ترکستان میں عفت و ناموس کی

علامت بن گئی اور بعد کے زمانے میں وہ چین اور یورپ میں کئی ناولوں کا موضوع بنی۔

مشرقی ترکستان پر قبضہ کرنے کے بعد چینیوں نے اس علاقے کو چین کا مستقل حصہ بنانے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ ترکوں کا لاکھوں کی تعداد میں قتل عام کیا گیا، لاکھوں مسلمان ترک وطن کرنے پر مجبور کیے گئے اور چینیوں کو بڑی تعداد میں چین سے لاکر مشرقی ترکستان میں آباد کیا گیا۔ اسلامی دور میں جو مساجد، مدرسے، محلات، حمام اور کارواں سرائیں تعمیر کی گئی تھیں، وہ سب ڈھادی گئیں اور ان کی جگہ چینی طرز کی عمارتیں تعمیر کی گئیں تاکہ مسلمان اپنے ماضی کو بھول جائیں اور خود کو چینی تہذیب اور چینی قوم میں ضم کر دیں۔

یعقوب بیگ

چینیوں کے ان مظالم کے خلاف مشرقی ترکستان کے باشندوں نے ایک سو سال کے عرصے میں سترہ دفعہ بغاوت کی اور آخر کار ۱۸۶۵ء میں عظیم ترک رہنما یعقوب بیگ جو خوقند اور فرغانہ کے علاقے میں روسیوں سے کئی لڑائیاں لڑ چکا تھا، چینیوں کو نکال باہر کرنے اور مشرقی ترکستان کی آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی حکومت کو روس، برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ نے بھی تسلیم کر لیا۔ اگرچہ روس نے ایلی کی زرخیز وادی پر جہاں سے روسی ترکستان کو راستہ جاتا ہے اور کاشغر کے قریب کوہ تنری داغ کے کئی دروں پر قبضہ کر لیا، کیونکہ یہ وادی اور درے ترکستان میں وہی اہمیت رکھتے ہیں جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان درۂ خیبر کی ہے۔ یعقوب نے عثمانی حکمران سلطان عبدالعزیز کو خلیفہ تسلیم کیا اور اس کے نام کا خطبہ ترکستان کی مسجدوں میں پڑھا جانے لگا اور اس کے نام کے سکے بھی ڈھالے گئے۔ سلطان عبدالعزیز نے یعقوب بیگ کی درخواست پر ایک فوجی وفد اور کچھ اسلحہ جو توپوں اور بندوقوں پر مشتمل تھا، بمبئی کے راستے کاشغر بھیجا۔ ان ترک فوجی افسروں کی مدد سے یعقوب بیگ نے اسی ہزار افراد پر مشتمل فوج تیار کی۔ لیکن ابھی یہ فوجی تیاریاں مکمل نہیں ہو پائی تھیں کہ چین نے پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ ابھی لڑائی جاری تھی کہ یعقوب بیگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی اس اچانک موت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خودکشی کی وجہ سے ہوئی، لیکن مشرقی ترکستان کے ایک رہنما اور مصنف الپتکین صاحب نے لکھا

ہے کہ یعقوب بیگ کو زہر دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چین نے یہ حملہ روس کے اشارے پر کیا تھا جس نے اگرچہ مصلحتاً مشرقی ترکستان کی حکومت کو تسلیم کرلیا تھا، لیکن وہ مشرقی ترکستان میں ایک طاقتور اور آزاد حکومت کے قیام کو مغربی ترکستان کے نومفتوحہ خطے میں روسی اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔

اس مرتبہ چین نے مشرقی ترکستان کو براہ راست چین میں ضم کر کے اس کو چین کا ایک صوبہ بنالیا اور اس کا نام ''شن چانگ'' رکھ دیا جس کے معنی ''نیا صوبہ'' ہیں۔ سنکیانگ اسی شن چانگ کی بگڑی ہوئی انگریزی شکل ہے۔ آزادی کی متعدد کوششوں کے باوجود مشرقی ترکستان آج بھی چین کی غلامی میں ہے۔

(۲) مغربی ترکستان

ترکستان پر روسی یلغار

دریائے والگا کی وادی میں، جو ترکوں کی سرزمین یا ارض توران کا شمال مشرقی حصہ تھی، مسلمانوں کا زوال سولہویں صدی میں شروع ہوگیا تھا۔ ٹھیک اس زمانے میں جب کہ عثمانی ترک ویانا کا محاصرہ کر کے وسط یورپ پر یلغاریں کر رہے تھے، وادی والگا کے ازبک اور دوسرے ترک قبائل روسیوں کے مقابلے میں مشرق کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ روسیوں نے ۱۵۵۲ء میں کازان پر اور چار سال بعد ۱۵۵۶ء میں استراخان پر قبضہ کر کے دریائے والگا کی وادی میں مسلمانوں اور ترکوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں روس کا حکمران ایوان چہارم (۱۵۳۳ء تا ۱۵۸۴ء) تھا جس کو ایوان مُہیب بھی کہا جاتا ہے اور جس نے پہلی مرتبہ زار کا لقب اختیار کیا جو روسی زبان میں سیزر، قیصر یا شہنشاہ کے ہم معنی ہے۔ ایوان چہارم نے کاسک قبیلے کے ایک لٹیرے سردار یرمک کو یورال کے مشرق میں فتوحات کرنے اور روسیوں کو آباد کرنے کی اجازت دے دی اور اس طرح روسی زار کے نام پر جو روسی تہذیب کا نمائندہ تھا، ایشیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قتل و غارت کرتے اور بستیوں کو جلاتے ہوئے بغیر کسی رحم

اور احساس شرم کے بڑھتے چلے گئے۔''[1] بندوقوں اور آتشیں اسلحہ کی وجہ سے، جن سے سائبیریا کے باشندے ناواقف تھے، ان کو اپنے مقصد کے حصول میں آسانی ہوگئی۔ قازق ترکوں کے مسلمان سردار کچم خاں نے دریائے ارتش کے کنارے اپنے دارالحکومت 'سبری' سے نکل کر ۱۵۸۰ء میں روسی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور سبری پر روسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ ملک غیر آباد اور وسیع تھا۔ مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے روسی آسانی سے سارے مغربی اور وسطی سائبیریا پر قابض ہوگئے اور وہاں آباد ترک قبائل کو جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں تھے اپنا مطیع بنالیا اور ۱۶۳۷ء تک وہ بحر الکاہل تک پہنچ گئے۔ ۱۵۸۷ء میں روسیوں نے ٹوبولسک شہر کی بنیاد ڈالی، ۱۶۰۴ء میں ٹومسک کی، ۱۶۱۹ء میں ینی سیک کی، ۱۶۳۲ء میں کوٹسک کی اور ۱۶۳۸ء میں کھوٹسک کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد روسیوں نے سائبیریا کے جنوب میں واقع ان علاقوں کی طرف رخ کیا جو اب قازقستان کا حصہ ہیں۔ یہاں قازقوں کے سردار قازق خاں نے ۱۷۳۱ء میں روسیوں کی بالادستی قبول کرلی۔ یہ صورت حال تقریباً ایک سو سال قائم رہی۔ اس کے بعد روس نے ایک قدم اور بڑھایا ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان قازقوں کی ان تمام خودمختار حکومتوں کو بھی ختم کردیا جنھوں نے روسی بالادستی تسلیم کرلی تھی اور ۱۸۳۴ء میں بحیرۂ خزر (بحیرہ کیپپین) کے شمالی کنارے پر ''نوواالیکزینڈروس'' کا قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان اورسک (orsk) اور ٹروئٹسک (troitsk) کے قلعے تعمیر کیے۔

کینیسری

روسیوں کی اس جارحانہ کاروائی نے سارے قازقستان میں آگ لگادی اور قازق قبائل روسیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سرداروں میں کینیسری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس نے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۶ء تک روسیوں کا سخت مقابلہ کیا اور ان کو قازقستان سے نکال باہر کیا، لیکن یہ عظیم مسلمان سردار باہمی چپقلش کا شکار ہوکر اپنے ہی ہم مذہب کرغیزوں کے ہاتھ مارا گیا۔ ترک اس کو ترکستان کا ہیرو قرار دیتے ہیں اور قازقستان کی تاریخ میں اس کا وہی مقام ہے جو

(1)Philp van Ness Myers:The Modern Age, Part II, P.276 Ginn & Co.London1904

شمالی قفقاز یا داغستان میں امام شامل کا ہے۔ قازق لوک گیتوں میں آج تک اس کو یاد کیا جاتا ہے۔ اب قازقوں کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ روسیوں نے قازقستان میں اورنبرگ اور سیمی پلاٹنسک اور بحیرۂ خزر کے مشرقی کنارے پر کراسنو ووڈسٹک (crasno vodstk) کی چھاؤنیاں قائم کرلیں۔ ۱۸۴۷ء میں روسی فوجیں سیر دریا (دریائے سیحوں) کے دہانے تک پہنچ گئیں اور جھیل ارال اور اورنبرگ کے درمیان سڑک تعمیر کرلی۔ اب روسی سلطنت کی حدود خوقند، بخارا اور خیوہ کی تین ریاستوں سے مل گئیں جو ازبکوں کے زوال کے بعد ترکستان میں قائم ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے پہلے خوقند کی ریاست روسیوں کی جارحانہ کاروائی کا نشانہ بنی جہاں ۱۸۵۲ء میں روسیوں نے سیر دریا کے کنارے آق مسجد (قزل اوردہ) پر قبضہ کرلیا جو ریاست خوقند کا علاقہ تھا۔

داغستان اور امام شامل

روس کے جنوب میں قفقاز کے علاقے پر مسلمان خلافت راشدہ کے زمانے ہی میں قابض ہوگئے تھے۔ یہ علاقہ گرجستان، آرمینیہ، داغستان اور آذربائیجان پر مشتمل ہے۔ ان میں گرجستان اور آرمینیہ میں عیسائیوں کی اکثریت ہے، لیکن داغستان اور آذربائیجان میں منگولوں کے بعد یعنی تیرھویں صدی سے مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ یہاں کے باشندے مختلف زبانیں بولتے ہیں جن میں ترکی سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ جس طرح وسط ایشیا کی ترکی قرون وسطیٰ میں چغتائی ترکی کہلاتی تھی آذربائیجان کی ترکی آذری کہلاتی ہے۔

روسیوں کے قبضے سے پہلے قفقاز کے یہ علاقے کبھی ایران کی حکومت کے تحت آجاتے تھے اور کبھی ان پر عثمانی ترک قابض ہوجاتے تھے۔ شروان کا علاقہ جہاں سے اسمٰعیل صفوی نے اپنی حکومت کا آغاز کیا آذربائیجان کا ایک حصہ ہے۔ جب افغانوں نے اصفہان پر قبضہ کر کے صفوی سلطنت کا خاتمہ کردیا تھا، تو ایران کے ابتر حالات سے فائدہ اٹھا کر روس نے داغستان اور شمالی آذربائیجان پر اور عثمانی ترکوں نے گرجستان اور آرمینیہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن نادر شاہ نے ان علاقوں کو جلد ہی واپس لے لیا۔ اس کے بعد روسی ۱۷۹۷ء میں پھر داغستان پر قابض ہوگئے اور چند سال میں دریائے اردس تک پورے آذربائیجان پر قبضہ کرلیا۔ فتح علی شاہ قاچار ۱۸۲۸ء میں

معاہدۂ ترکمانچی کے تحت ان تمام علاقوں پر سے ایران کے حق سے دست بردار ہوگیا۔

روسیوں کی اس جارحانہ پیش قدمی کے دوران جس علاقے کے باشندوں نے حملہ آوروں کا سب سے سخت مقابلہ کیا وہ داغستان ہے۔ یہاں کے جری باشندوں نے بار بار بغاوت کی اور روسیوں کو اپنے وطن سے نکال باہر کیا۔ آزادی کی اس جنگ میں جس شخص نے سب سے زیادہ شہرت اور نیک نامی حاصل کی وہ امام شامل (۱۷۹۷ء تا ۱۸۷۱ء) ہیں۔ ۱۸۳۴ء میں امام حمزہ بیگ کی شہادت کے بعد امام شامل کو داغستان کا سربراہ منتخب کرلیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پچیس سال تک بے مثل شجاعت سے روسیوں کی لاتعداد فوجوں کا مقابلہ کیا اور ۱۸۴۵ء تک داغستان کے ہر حصے سے روسیوں کو نکال دیا، لیکن روسی بار بار حملہ آور ہوتے تھے اور امام شامل کے لیے ان کی کثیر تعداد فوجوں کا جو بہترین اسلحہ سے لیس ہوتی تھیں، تنہا مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہا۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ سے مدد حاصل کرنا چاہی، لیکن ناکام رہے۔ آخرکار انہوں نے ۲۵۔ اگست ۱۸۵۹ء کو عبدالقادر الجزائری کی طرح ہتھیار ڈال دیئے۔ روسی کمانڈر نے جو زار روس کا بھائی تھا زار کو مبارک باد کا تار دیا کہ آج قفقاز کی جنگ جو ایک سو سال سے جاری تھی ختم ہوگئی۔ اس دن کلیساؤں میں اس کامیابی پر نماز شکرانہ ادا کی گئی اور دعائیں مانگی گئیں۔

روسی حکومت امام شامل کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئی، ان کی پنشن مقرر کردی گئی اور رہنے کے لیے مکان دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء تک امام شامل روس میں رہے، اس کے بعد روسی حکومت سے اجازت لے کر حج کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے اور اگلے سال ۱۸۷۱ء میں انتقال کیا۔

امام شامل کی عظمت محض ان کی دلیرانہ جنگ کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان کی سیاسی بصیرت، سوجھ بوجھ، انتظامی صلاحیت اور کردار کی بلندی نے عبدالقادر الجزائری اور ٹیپو سلطان کی طرح ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کا زمانہ داغستان کی تاریخ میں ''شریعت کا دور'' کہلاتا ہے۔ امام شامل تصوف کے نقشبندی سلسلے کے سربراہ تھے۔ ان کے مرتب کردہ انتظامی اور قانونی ضابطے ''نظام شامل'' کہلاتے ہیں۔ اس کے تحت داغستان کو بتیس (۳۲) انتظامی اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ انتظامیہ اور عدلیہ الگ الگ تھے۔ ہر ضلع کا مفتی عدالت کے محکمہ کا ذمہ دار تھا اور ضلع کا حاکم اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ ہر مفتی کے تحت چار قاضی ہوتے تھے اگر کسی معاملے کو قاضی طے نہ کرسکتے تو وہ مفتی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور مفتی اس معاملے کو

امام شامل یا مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرتا تھا جس کو دیوان کا نام دیا گیا تھا۔ امام شامل نے احتساب کا محکمہ بھی قائم کیا تھا جس کے ذریعہ عہدے داروں پر نگرانی رکھی جاتی تھی۔ فوجوں کی تنظیم بھی جدید ترین طرز پر کی گئی تھی اور دارالحکومت وَدینو (vedeno) میں بندوقوں اور توپوں کو ڈھالنے کا کارخانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ ایک زمانہ میں داغستان کی فوجوں کی تعداد ساٹھ ہزار سوار و پیادہ تک پہنچ گئی تھی۔ فوجی تربیت کے لیے جو مراکز قائم کیے گئے تھے ان میں قید کیے جانے والے روسی افسر تربیت دیتے تھے۔

امام شامل کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد داغستان میں پانچ سال تک روسیوں کی مزاحمت اور جاری رہی، یہاں تک کہ ۲۱۔ مئی ۱۸۶۴ء کو داغستان کا آخری پہاڑی قلعہ بھی روسیوں کے قبضے میں آ گیا۔ داغستان کی آزادی کی جنگ اب ختم ہو چکی تھی۔ روسی فوجوں کے کمانڈر گرانڈ ڈیوک نے اپنے بھائی زار روس کو مبارک باد کا تار بھیجا اور اطلاع دی کہ قفقاز کی صد سالہ جنگ آج ختم ہو گئی۔

روسی فوجیں اب فارغ ہو چکی تھیں۔ زار روس نے اب ان کا رخ ترکستان کی طرف کر دیا، لیکن ترکستان پر روسی حملے سے قبل آیئے ہم ان تین ریاستوں کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو ازبکوں کے زوال کے بعد خوقند، بخارا اور خیوہ میں قائم ہوئی تھیں اور جو اب روس کی جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بننے والی تھیں۔

خوقند

استرخانی حکمران عبدالعزیز کی ۱۶۸۰ء میں وفات کے بعد بخارا کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ خیوہ پر بخارا کی بالادستی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، ۱۷۰۰ء کے قریب ایک منگول شہزادے شاہرخ نے فرغانہ کی آزادی کا اعلان کر دیا اور فرغانہ کے شہر خوقند کے نام پر نئی ریاست کا نام خوقند رکھا۔ ۱۷۶۰ء میں چین نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کیا تو یہاں کے حکمران نے بھی کچھ مدت کے لیے چین کی بالادستی قبول کر لی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں دو بھائیوں، عالم اور عمر نے خوقند کی ریاست کو اتنا بڑھا لیا کہ وہ بخارا کی ہم پلہ ہو گئی۔ خوقند کی جامع مسجد ۱۸۱۵ء میں عمر خاں نے بنوائی جو مدرسہ کی حیثیت سے استعمال ہونے کی وجہ سے مدرسہ جامع کہلاتی تھی۔ عمر خاں نے

زراعت کو بھی ترقی دی اور پچھتر میل لمبی ایک نہر کھدوائی۔ عمر کے بیٹے محمد علی کے دور میں خوقند کی ریاست عروج پر پہنچ گئی۔ کرغیز اور قازق قبیلوں کو مطیع کیا گیا۔ محمد علی نے بھی ایک مدرسہ تعمیر کیا۔ تاشقند کے بیگلر بیگی یعنی صوبے دار نے جو شمالی حصوں کا صوبہ دار تھا ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کیا جو اس کے نام پر مدرسہ بیگلر بیگی کہلاتا ہے۔

روسیوں نے جب خوقند پر حملہ کیا تو وہاں کا حکمران مظفر (۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۵ء) تھا۔ ۱۸۶۴ء میں روسیوں نے اولیا اتا پر قبضہ کیا اور پھر تاشقند پر۔ تاشقند میں روسیوں کا ایک ایک گھر اور ایک ایک انچ پر مقابلہ کیا گیا اور ان کو پسپا کر دیا گیا۔ بالآخر اہل شہر نے ۲۸۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ہتھیار ڈال دیئے اور خوقند کی حکومت روسیوں کی محکوم ریاست بن گئی۔ ۱۸۶۵ء میں خدا یار ریاست خوقند میں حکمران ہوا لیکن عوام اس کے طرز عمل سے بیزار تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۵ء میں اس کو معزول کر دیا اور اس کے لڑکے نصر الدین کو جانشین مقرر کیا۔ خان خدا یار نے روسیوں سے مدد مانگی اور روسی حفاظت میں تاشقند پہنچ گیا۔ اہل خوقند نے روسیوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا، لیکن روسیوں نے ان کو شکست دے کر خوقند پر قبضہ کر لیا اور ۲۔ مارچ ۱۸۷۶ء کو براہ راست روس میں ضم کر کے اس کا نام فرغانہ کر دیا جو اس علاقے کا قدیم نام تھا۔

بخارا

روس نے جب وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے خلاف کاروائی شروع کی تو اس نے اپنی جارحانہ کاروائیوں کو جائز قرار دینے اور یورپی حکومتوں کو مطمئن کرنے کے لیے ۲۱۔ نومبر ۱۸۶۴ء کو ایک مراسلہ یورپی حکومتوں کو بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ روس یہ کاروائی اس لیے کر رہا ہے کہ ان غیر مہذب حکومتوں کی طرف سے اس کو خطرہ ہے اور روس کی یہ کاروائی بالکل ویسی ہی ہے جیسی امریکہ، برطانیہ اور فرانس اپنے اپنے علاقوں میں کر چکے ہیں۔

بخارا میں استراخانی حکومت کے خاتمہ کے بعد منگیت خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس خاندان کا پہلا حکمران میر معصوم (۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ تا ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ) تھا جو استراخیوں کا ایک عہدیدار تھا، لیکن آخر میں اس نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ استراخانی حکمران ابوالغازی کو ہٹا کر خود امیر بخارا بن گیا۔ امیر معصوم سادہ اور مذہبی زندگی گذارتا تھا۔ اس کے دور میں شرعی احکام پر

سختی سے عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ اس نے رئیس شریعت کا عہدہ قائم کیا۔ ڈاکوؤں، چوروں، شرابیوں اور تمباکو نوشوں کو اس کے دور میں سخت سزا دی جاتی تھی۔ بخارا کے یہ حکمران اسلام پر ظاہری عمل درآمد میں تو سخت تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے اسلام کی حقیقی روح ان کے درمیان سے ختم ہوتی جارہی تھی۔ امیر معصوم خراسان پر بارہ سال تک حملے کرتا رہا جن کا کوئی مقصد سوائے اس کے نہ تھا کہ ایرانی شیعوں کو تباہ کیا جائے۔ ان حملوں میں اس نے مرو کا تاریخی شہر اور وہاں کا نظام آبپاشی برباد کردیا۔

امیر معصوم کا جانشین امیر سعید حیدر (۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ تا ۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ) ایک عبادت گزار مگر کمزور حکمراں تھا۔ اس نے شرعی احکام کی باپ سے بھی زیادہ پابندی کرائی۔ اس کا جانشین امیر نصر اللہ خاں (۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ تا ۱۸۶۰ء/۱۲۷۷ھ) حریص، جابر اور خون آشام حکمراں تھا۔ اس کے دور میں روس دریائے سیحوں تک پہنچ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ خوقند کی ریاست سے لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا امیر مظفر الدین (۱۸۶۰ء/۱۲۷۷ھ تا ۱۸۸۵ء/۱۲۸۷ھ) تخت نشین ہوا تو روسی دریائے سیحوں کو پار کر چکے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں خوقند کو تسخیر کرنے کے بعد انہوں نے ۱۸۶۶ء کے موسم بہار میں بخارا کے خلاف فوجی کاروائی شروع کردی۔ ۲۰۔ مئی ۱۸۶۶ء کو یرجار کی فیصلہ کن جنگ میں اہل بخارا کو شکست ہوئی۔ ایک ہزار مسلمان شہید اور پچاس روسی مارے گئے۔ اس کے بعد ایک شہر کے بعد دوسرا شہر روس کے قبضے میں آتا چلا گیا اور ۱۴۔ مئی ۱۸۶۸ء کو سمرقند پر بھی روسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۔ جون کو امیر بخارا نے تاوانِ جنگ دے کر اطاعت قبول کرلی۔ اس دوران میں سمرقند میں بغاوت ہوگئی جسے روسیوں نے سختی سے کچل دیا اور تین دن تک شہر میں قتل عام کیا۔ پروفیسر ویمبری سمرقند پر روسی تسلط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روسی عیسائیوں نے سمرقند پر قبضہ کرلیا جو کبھی تیمور کا شان و شوکت والا دارالحکومت تھا۔ اسلام کی تاریخ میں ممتاز جگہ حاصل کرنے والوں کی جائے پیدائش اور آخری آرام گاہ اور اسلامی علم و ادب کا درخشندہ مرکز''

روسیوں نے بخارا کی ریاست کو خوقند کی طرح ختم نہیں کیا۔ انہوں نے سمرقند سمیت ریاست کے زرخیز ترین علاقے چھین لیے اور باقی ریاست کو ایک محکوم ریاست کی حیثیت سے

برقرار رکھا۔ امیر مظفر الدین کے بعد امیر عبدالاحد (۱۸۸۵ء تا ۱۹۱۰ء) اور پھر امیر عالم (۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء) نے روسیوں کے باجگذار کی حیثیت سے اپنا تخت برقرار رکھا۔ ۱۹۲۰ء میں روس کے اشتراکیوں کی زیر حمایت بخارا کو جمہوریہ کی شکل دے دی گئی اور امیر عالم فرار ہو کر افغانستان چلا گیا، جہاں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک کابل میں مقیم رہا۔

خیوہ

ترکستان میں اب صرف خیوہ کی آزاد ریاست باقی تھی۔ خیوہ دراصل خوارزم کا قدیم نام ہے۔ خوارزم کے نام کا شہر سے زیادہ ایک علاقے پر اطلاق ہوتا ہے۔ دریائے جیحوں کے شمالی کنارے پر دریا کی زرخیز وادی میں اور گنج، اور کاث کے نام سے دو شہر مختلف زمانوں میں موجود رہے ہیں خیوہ ان میں تیسرا اور آخری شہر ہے۔ ان میں جو بھی شہر دارالحکومت بنا اس کو خوارزم کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

منگولوں کے زوال کے بعد ۱۳۶۰ء میں حسین صوفی نامی ایک منگول سردار نے یہاں ایک آزاد حکومت قائم کر لی جو ۱۳۷۹ء کے بعد تیموریوں کے زیر اثر رہی۔ ۱۵۰۵ء/۹۱۱ھ میں شیبانی خاں نے خیوہ پر قبضہ کر لیا، لیکن ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں یہاں تونفرت خاندان نے اپنی آزاد قائم حکومت کر لی۔ یہ حکومت بخارا سے برسرِ پیکار رہتی تھی۔ کبھی بخارا کی اطاعت کر لیتی تھی اور کبھی آزاد ہو جاتی تھی۔ اس خاندان کا سب سے ممتاز حکمران ابوالغازی بہادر خاں (۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ تا ۱۶۶۲ء/۱۰۷۴ھ) ہوا جو اپنی سیرت اور کردار میں بابر سے بہت مشابہ ہے۔ وہ عرب محمد خاں کا بیٹا تھا جو شیبانی ازبکوں کے خاندان سے تھا۔ اس نے ۱۶۴۴ء میں بخارا سے آزادی حاصل کر لی اور خیوہ کو ایک آزاد ریاست بنا دیا، لیکن ابو الغازی بہادر خاں کی شہرت حکمراں سے زیادہ ایک مصنف کی حیثیت سے ہے۔ وہ جدید دور سے قبل چغتائی ترکی کا آخری بڑی مصنف تھا۔ اس کی دو کتابیں شجرۂ ترک اور شجرۂ تراکمہ بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور سرائے اور خوارزم کی حکومتوں اور ازبکوں کا حال معلوم کرنے کا ایک مستند ماخذ ہیں۔

خیوہ کے آخری حکمرانوں میں محمد امین (۱۸۴۶ء تا ۱۸۵۵ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ جدید خیوہ کی سب سے اہم عمارت نیلا مینار جو ایک سو ساٹھ فٹ بلند ہے اسی کے دَور میں تعمیر ہوا۔

خیوہ پر روسیوں نے سترہویں صدی سے ہی حملے شروع کر دیئے تھے۔ ابوالغازی بہادر خاں کو بھی ان حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، لیکن ان حملوں میں روسیوں کو ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ پیٹر اعظم نے ۱۷۱۷ء اور اس کے بعد دو مرتبہ خیوہ پر فوج کشی کی تھی، لیکن دونوں مرتبہ شکست ہوئی اور حملہ آور تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ ۱۸۳۴ء میں بحیرہ خزر کے شہر الیکز نیڈروسک کی طرف سے اور ۱۸۳۹ء میں اورنبرگ کی طرف سے روسیوں نے لشکر کشی کی، لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ روسیوں نے خیوہ پر آخری حملہ بخارا کو تسخیر کرنے کے بعد ۱۸۷۲ء میں کیا۔ اس وقت سید محمد رحیم خاں (۱۸۶۴ء تا ۱۹۱۰ء) خیوہ کا خان تھا۔ سید محمد رحیم خاں نے ایران اور ہندوستان کی برطانوی حکومت سے مدد مانگی، لیکن کسی نے مدد نہیں کی۔ بالآخر جون ۱۸۷۳ء میں اس نے روسیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ انہوں نے آمو دریا کے دائیں کنارے اور ڈیلٹا کے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور خیوہ پر خان کو برقرار رہنے دیا۔ سید محمد رحیم خاں کے جانشین خان اسفندیار (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۸ء) اور سید عبداللہ (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء) روسیوں کے باجگذار کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد خیوہ میں اشتراکی جمہوریت قائم کر دی گئی۔

ترکستان میں روسیوں کی آخری فوجی کاروائی اُن ترکمانوں کے خلاف تھی جو دریائے آمو (جیحوں) اور بحیرۂ خزر کے درمیان ایران کی شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ یہ کاروائی ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۴ء تک جاری رہی۔ ۹۔ فروری ۱۸۸۴ء کو روسیوں نے عشق آباد پر اور ۱۴۔ فروری ۱۸۸۴ء کو مرو پر قبضہ کر لیا اور یہ مہم بھی مکمل ہو گئی۔ ان فوجی کاروائیوں کے دوران روسی ترکمانوں کے ساتھ جس وحشت اور بربریت کے ساتھ پیش آئے اور انہوں نے ترکمان عورتوں اور بچوں کا جس طرح قتلِ عام کیا، اس کو خود مغربی مورّخوں نے ''جدید تاریخ کے عظیم ترین جرائم'' میں شمار کیا ہے۔

اسلامی دَور کا خاتمہ

روسیوں کے ہاتھوں ترکستان کی تسخیر سے اسلامی تاریخ کا وہ گیارہ سو سالہ دَور ختم ہو گیا جس کا آغاز پہلی صدی ہجری میں اموی فاتح قتیبہ بن مسلم کی فتح ترکستان سے ہوا تھا۔

ہنگری کے مستشرق پروفیسر ویمبری نے جو روسی فتح کے بعد ترکستان گئے تھے ترکستان پر

روسی تسلط کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

''جس وقت سمرقند پر روسی جھنڈا لہرایا تھا اس وقت یہ پرانا اور دور افتادہ ملک نئی دنیا اور نئے خیالات کے راستے پر قدم زن ہوا۔ ایسے شہر اور بستیاں جو مغرب کے باسیوں کو معلوم نہ تھیں اب سامنے آ گئیں۔ وہ مقامات جہاں یوروپین سیاح بھیس بدل کر اور جان کا خطرہ مول لے کر ہی جا سکتے تھے اب نہ صرف محفوظ اور آزاد ہیں، بلکہ عیسائیوں کے زیر حکومت ہیں۔ تاشقند میں گرجے اور کلب بن گئے ہیں، اسی طرح خنجد اور سمرقند میں۔ تاشقند میں ایک اخبار بھی ہے اور مؤذن کی اداس آواز میں یونانی گرجے کے گھنٹے لطف پیدا کرتے ہیں اور گھنٹوں کی یہ آواز مسلمان کو توپ کی آواز سے بھی بُری لگتی ہے۔ ان مقامات پر جہاں چند سال پہلے راقم الحروف مسلمانوں کی دعا پڑھتا ہوا باہر نکلتا تھا، اب پادری، سپاہی اور سوداگر فاتحانہ انداز میں بخارا کی گلیوں میں پھرتے ہیں۔ تیمور کے شاندار محل میں روسی شفاخانہ اور مال گودام قائم کیے گئے ہیں۔ اس محل میں گذشتہ زمانے میں ایشیا کے تمام شہزادوں کی طرف سے سفیر اذن باریابی حاصل کرتے تھے۔ تحفے لاتے تھے۔ جہاں اسپین کے عالی دماغ بادشاہ نے سفیر بھیجا اور عاجزی سے دوستی کی خواہش کی اور جہاں تورانیوں کے ورثا اس نیک مقصد کے لیے آتے تھے کہ ''نیلے پتھر'' پر ماتھا رگڑیں جو تیمور کے تخت کا زیریں حصہ تھا.......... یہ اہم واقعہ کہ وسط ایشیا میں روسی کامیاب ہوئے اسلام پر ایسی کاری ضرب ہے کہ ایک ہزار سال کے عرصے میں ایسی ضرب نہیں لگی۔ مکہ کے بعد بخارا اسلام کا روحانی مرکز بن گیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ، مصر اور مراکش تک کے مسلمان تعلیم حاصل کرنے یہاں آتے تھے، جس کی وجہ سے وہ (اہل بخارا) مذہب کے اس قدر دیوانے بن گئے تھے۔ اسلامی دنیا کے مسلمانوں کے دل میں اس بات کا بہت رنج ہوگا کہ یہ مقدس سرزمین کفار کی موجودگی سے ناپاک ہوئی۔ اسلام کے اس ستون کے گرنے سے جو گرد اڑی ہے وہ سیاہ بادل کی طرح (بہت عرصے تک اگر ہمیشہ کے لیے نہیں) اسلام کے مستقبل پر چھائی رہے گی۔''[1]

---

(1) ویمبری: تاریخ بخارا صفحہ ۵۱۸۔ ۵۲۰ (اردو ترجمہ)

حقیقت یہ ہے کہ ترکستان پر روسیوں کا قبضہ تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ اندلس کے المیہ سے زیادہ دلخراش ہے اور ہندوستان پر انگریزی تسلط سے زیادہ بھیانک۔ اس لیے کہ اندلس میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی اور ہندوستان سے انگریزی اقتدار ختم ہو گیا اور اکثریت کے علاقوں میں آزاد پاکستان اور بنگلہ دیش وجود میں آ گئے، لیکن ترکستان مسلمانوں اور ترکوں کا ہزار سالہ وطن ہے، لیکن وہاں کے باشندے ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ہی وطن میں بتدریج اقلیت میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔

[روسی قبضے کے بعد سے موجودہ دور تک، روسی مسلمانوں کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

اہم واقعات

۱۵۸۰ء روسیوں نے سائبیریا کا صدر مقام سبری فتح کیا۔

۱۵۸۷ء دریائے ارتش کے کنارے شہر توبولسک کی بنیاد پڑی۔

۱۶۹۷ء تا ۱۶۹۸ء زار روس پیٹر اعظم نے یورپ کا دورہ کیا تاکہ ترکوں کے خلاف حلیف حاصل کرے اور روس کو مغربی انداز پر ترقی دے سکے۔

۱۷۱۷ء خیوہ کے خلاف پیٹر اعظم نے مہم بھیجی۔ خان خیوہ کے مقابلے میں ساری فوج ماری گئی۔

۱۷۶۰ء مشرقی ترکستان پر چین کا قبضہ۔

۱۸۱۳ء داغستان، شمالی آذربائیجان اور گرجستان پر روس کا قبضہ۔

۱۸۲۰ء تا ۱۸۳۰ء قازقستان کے قبائل پر روسی بالادستی قائم کر دی گئی۔

۱۸۲۸ء آرمینیہ پر روس کا قبضہ۔

۱۸۳۴ء بحیرۂ کیسپین کے شمال مشرقی کنارہ پر قلعہ نوو الیکز ینڈروس کی تعمیر۔

۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۶ء قازق سردار کینے سری نے روسیوں کو قازقستان سے نکال دیا۔ لیکن اس کی موت کے بعد روسیوں نے پھر قازقستان پر اقتدار قائم کر لیا۔

۱۸۳۹ء خیوہ کے خلاف روسیوں کی دوسری ناکام مہم۔

۱۸۴۷ء سیر دریا (سیحوں) کے دہانہ پر روس کا قبضہ۔

۱۸۵۳ء آق مسجد (قزل اوردہ) پر جو خوقند کا علاقہ تھا روس کا قبضہ۔

۱۸۵۹ء داغستان میں امام شامل نے ہتھیار ڈال دیئے۔

۱۸۶۳ء مشرقی ترکستان سے چینی نکال دیئے گئے۔

۱۸۶۴ء چمقند، اولیا اتا اور تاشقند پر روس کا قبضہ۔

۱۸۶۵ء مشرقی ترکستان پر یعقوب بیگ کی حکومت کا آغاز۔

۱۸۶۸ء سمرقند پر روس کا قبضہ (۱۴۔مئی)

۱۸۷۰ء یعقوب بیگ نے عثمانی خلیفہ کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔

۱۸۷۳ء خیوہ پر روس کا قبضہ۔

۱۸۷۶ء مشرقی ترکستان پر چین کا دوبارہ قبضہ۔

۱۸۸۴ء ۹۔فروری کو عشق آباد اور ۱۴۔فروری کو مرو پر روس کا قبضہ۔

باب ۳۳

آلِ عثمان کی تلوار ٹوٹ گئی

(۱۷۰۰ء تا ۱۹۲۴ء)

(۱) معاہدۂ کارلووٹز سے دوسری مشروطیت تک

۱۶۹۹ء کے معاہدۂ کارلووٹز کے بعد سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ۱۶۹۹ء سے ۱۷۷۴ء تک کا دَور۔

۲۔ ۱۷۷۴ء سے ۱۹۲۴ء تک کا دَور۔

معاہدۂ کارلووٹز کے بعد یورپ میں ترکوں کی پیش قدمی رُک گئی اور ان کو ہنگری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، لیکن وہ باقی سلطنت کو ۱۷۷۴ء تک بچائے رہے۔ اس مدت میں ان کو یورپی قوموں کے مقابلے میں ناکامیاں بھی ہوئیں اور کامیابیاں بھی، لیکن ۱۷۷۴ء کے بعد ترکوں کا تیزی سے زوال شروع ہوگیا۔ اب ان کو مسلسل شکستیں ہونے لگیں اور ان کے مقبوضات ایک ایک کرکے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ دوسرے الفاظ میں ۱۷۷۴ء کے بعد سے عثمانی ترکوں کا زوال شروع ہوگیا، لیکن عثمانی ترک برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی طرح اتنے کمزور کبھی نہیں ہوئے کہ دشمن ان کو آسانی سے ختم کردیتا۔ اسلامی ہند میں اورنگ زیب کے بعد کوئی طاقتور حکمران پیدا نہیں ہوا جو مرہٹوں اور ان کے بعد انگریزوں کا کامیاب مقابلہ کرتا۔ تیموری سلطنت کی عمارت نصف صدی کے اندر دھڑام سے گر پڑی۔ بس جنوبی ہند میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے مسلمانوں کی لاج رکھ لی اور انگریزوں کا تقریباً چالیس سال تک کامیابی سے مقابلہ کیا۔

احمد ثالث

اسلامی ہند اور باقی اسلامی دنیا کے برخلاف عثمانی ترک بڑے جاندار ثابت ہوئے اور انہوں نے یورپ کی بڑھتی ہوئی قوت کا دو سو سال تک سخت مقابلہ کیا۔ اس دوران میں سلطنت

عثمانیہ میں کئی اعلیٰ صلاحیت کے بادشاہ ہوئے۔ احمد ثالث (۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء) کے زمانے میں روس اور آسٹریا سے لڑائیاں جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کے دوران ۱۷۱۱ء میں بحیرۂ اسود کے شمال مشرقی کنارے پر ازوف کا علاقہ واپس لے لیا۔ ایران میں افغانوں کے حملے کے بعد جو بدامنی پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے گرجستان کے علاوہ ہمدان اور تبریز تک ایران پر قبضہ کرلیا۔

احمد ثالث کا دَور تعمیری لحاظ سے بھی اہم ہے۔ وہ صاحب علم اور علم دوست حکمران تھا۔ اس کے زمانہ میں ۱۷۲۷ء میں استنبول میں پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ یہ اسلامی دنیا کا پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ مفتی اعظم نے اس شرط پر اس کو قائم کرنے کی اجازت دی تھی کہ اس میں قرآن مجید اور دینی کتابیں نہ شائع کی جائیں۔ احمد ثالث کا وزیر اعظم داماد ابراہیم پاشا نوشہرلی جس نے ۱۷۱۸ء سے ۱۷۳۰ء تک وزارت کی، عثمانی سلطنت کے قابل وزیروں میں شمار ہوتا ہے اور اس زمانے میں تعمیر و ترقی کے کئی کام اس کے رہینِ منت ہیں، لیکن وہ جنگ کے زمانے سے زیادہ امن کے زمانے کے لیے موزوں تھا۔

محمود اوّل

محمود اول (۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء) پہلا عثمانی بادشاہ ہے جس نے ترکوں کے فوجی نظام کی کمزوری کو محسوس کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ترکوں کی شکست کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ترک فوجوں کی تنظیم یورپ کی فوجوں کے مقابلے میں اچھی نہیں رہی اور ان کے پاس ہتھیار بھی یورپ کے مقابلے میں اچھے نہیں۔ عثمانی فوج کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے محمود اوّل نے فرانسیسی ماہرین حرب کو بلا کر نوکر رکھا۔ ان ماہرین کی کوششوں سے ترک فوج کی تنظیم اچھی ہوگئی اور جب روس اور آسٹریا نے جنگ چھیڑی تو ترک فوجوں نے دونوں ملکوں کو شکست دی اور ۱۷۳۹ء میں ان کو صلح کرنے پر مجبور کردیا۔ اس صلحنامہ کے تحت جو صلحنامہ بلغراد کہلاتا ہے بلغراد، بوسینیا، سرویا اور ولاچیا کے علاقے ترکوں کو واپس مل گئے اور روس نے یہ تسلیم کرلیا کہ وہ بحیرۂ ازوف اور بحیرۂ اسود میں روسی بحیری بیڑہ نہیں رکھے گا۔ ان سمندروں میں روس کے جنگی اور تجارتی دونوں قسم کے جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان میں صرف ترکی کے جہازوں کو تجارت کی اجازت دی

گئی۔ مشرق میں محمود اول نے ایرانی حکمران نادر شاہ سے ۱۷۳۶ء میں صلح کر لی اور یہ طے پایا کہ آئندہ سلطنت عثمانیہ اور ایران کے درمیان وہ سرحد قائم رہے گی جو سلطان مراد چہارم کے دَور میں طے پائی تھی۔ محمود اوّل علم دوست حکمران تھا۔ اس نے استنبول میں چار کتب خانے بھی قائم کیے۔

مصطفیٰ ثالث (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۳ء) کے دَور میں روس سے لڑائیاں جاری رہیں اور روس نے ۱۷۷۱ء میں کریمیا پر قبضہ کر لیا، لیکن جزیرہ نما پر براہ راست قبضہ کرنے کی بجائے حکمران خاندان کو برقرار رکھا۔ اس زمانے میں عثمانی امیر البحر حسن الجزائری نے ترکی بحری بیڑے کو ترقی دی اور روس کے مقابلے میں بحری جنگوں میں بھی کامیابی حاصل کی۔

معاہدہ کوچک کناری

مصطفیٰ ثالث کے زمانے میں روس سے جو جنگ شروع ہوئی تھی وہ اس کے جانشین سلطان عبدالحمید اول (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۹ء) کے عہد میں بھی جاری رہی، لیکن اس جنگ میں ترکوں کو مسلسل شکستیں ہوئیں اور وہ ۱۶۔ جولائی ۱۷۷۴ء معاہدہ کوچک کناری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس صلحنامے کی رو سے کریمیا کو ایک آزاد مملکت قرار دے دیا گیا اور روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق حاصل ہو گیا۔ اس معاہدے سے روس کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق مل گیا جس سے فائدہ اٹھا کر انیسویں صدی میں روس نے بلقان کی مسیحی آبادی کو بار بار عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور اس آبادی کا سہارا لے کر عثمانی سلطنت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ معاہدہ کوچک کناری نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اب ترکوں کے لیے اپنے مقبوضات کی حفاظت کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ترکوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روس نے ۱۷۸۲ء میں سلطنت عثمانیہ کو روس اور آسٹریا کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن اگلی صدی میں ترکوں کی سخت مدافعت نے اس منصوبہ کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

روس نے معاہدہ کوچک کناری کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۱۷۸۳ء میں کریمیا کی

آزادی کا خاتمہ کر دیا اور اس پر براہِ راست قبضہ کر لیا۔[1]

(1) کریمیا جسے ترکی میں قرِم (kirim) لکھا جاتا ہے سرائے کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ پندرہویں صدی میں جب سرائے کی قوت کو زوال ہوا تو کریمیا کے تاتاریوں نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت کا بانی سرائے کے آلتن اوردہ خاندان ہی کا ایک شخص حاجی گیرائی (1441ء تا 1466ء) تھا۔ کریمیا کی اس حکومت میں کریمیا کے علاوہ وہ سارا علاقہ شامل تھا جو دریائے ڈنیپر اور دریائے ڈان کے زیریں حصوں اور دریائے نوبان کے درمیان ہے۔ حاجی گیرائی کے بعد اس کا لڑکا منگلی گیرائی (1467ء تا 1515ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں محمد فاتح نے 1475ء میں کریمیا کی اہم بندرگاہ کافہ جو اہل جنیوا کے قبضے میں تھی، فتح کر لی۔ منگلی گیرائی نے اس موقع پر خود کو عثمانی سلطنت کے تحفظ میں دے کر اپنی ریاست کو بچالیا۔ اب کریمیا کی حیثیت ایک نیم خودمختار مملکت کی ہو گئی۔ منگلی گیرائی نے دارالحکومت سولخت سے باغچی سرائے میں منتقل کر دیا اور یہاں اس نے ترک ماہرین کی مدد سے شاندار محل اور مشہور زنجیر لی مدرسہ تعمیر کیا۔ منگلی گیرائی نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی اور وہ کریمیا کے حکمرانوں میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔

خانانِ کریمیا کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر تیس ہزار سوار اور ایک لاکھ بیس ہزار سے دو لاکھ تک پیدل فوج میدان میں لا سکتے تھے۔ اس عظیم طاقت کے بل پر اور عثمانی سلطنت کی پشت پناہی کی وجہ سے خانانِ کریمیا عرصے تک روس اور مشرقی یورپ کے معاملات میں مداخلت کرتے رہے۔ 1521ء میں خان صاحب گیرائی نے کازان پر قبضہ کر لیا اور موسکو کا محاصرہ کر کے گرانڈ ڈیوک باسل سے خراج وصول کیا۔ 1552ء میں روسیوں نے کازان پر اور 1554ء میں استراخان پر قبضہ کر لیا۔ خانانِ کریمیا اگرچہ ان شہروں کو روسیوں کے قبضے میں جانے سے بچا نہیں سکے، لیکن روس دو سو سال تک کریمیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکا، بلکہ خانانِ کریمیا روس کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ 1571ء میں خان دولت گیرائی (1551ء تا 1577ء) نے موسکو پر قبضہ کر لیا اور ایوان مہیب کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ موسکو پر مسلمانوں کا یہ آخری کامیاب حملہ تھا۔ دولت گیرائی کے لڑکے غازی گیرائی (1588ء تا 1607ء) نے، جس کو پُرزور حملوں کی وجہ سے بورا یعنی طوفان کا خطاب ملا تھا 1591ء میں پھر موسکو پر حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ خانانِ کریمیا، روس کے علاوہ پولینڈ اور لتھوانیہ تک حملے کرتے تھے اور 1649ء میں انہوں نے پولینڈ سے خراج بھی وصول کیا۔ ان کا آخری بڑا فوجی کارنامہ عثمانی ترکوں اور یوکرین کے کاسکوں کے ساتھ مل کر 1672ء میں روسیوں کو دریائے ڈنیپر کے پار دھکیلنا ہے۔ معاہدہ کارلووٹز کے بعد جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو خانانِ کریمیا کا زور بھی ٹوٹ گیا اور روسیوں کا غلبہ شروع ہو گیا۔ سلطان محمود اول کے زمانے میں جب ترکی اور روس میں لڑائی چھڑی تو روسیوں نے 1736ء میں کریمیا میں داخل ہو کر بڑی تباہی پھیلائی۔ باغچی سرائے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سلیم گیرائی (1684ء/1095ھ تا 1691/1102ھ) کا قائم کیا ہوا عالیشان کتب خانہ بھی جلا دیا۔ 1771ء میں روسیوں نے کریمیا پر قبضہ کر کے اس کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت دے دی، لیکن پھر معاہدے کی خلاف ورزی کر کے 1783ء میں کریمیا کو روس میں ضم کر لیا اور خانانِ کریمیا کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔ جب کریمیا کے باشندوں نے بغاوت کی تو اس کو سختی سے کچل دیا گیا اور قتل عام میں تیس ہزار بوڑھے، عورتیں اور بچے مارے گئے۔ روسی مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں نے ہجرت شروع کر دی جس کا سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہا۔ اس دوران میں روسیوں کو لا لا کر کریمیا میں آباد کیا گیا۔ اندازہ ہے کہ 1783ء سے 1900ء تک تقریباً بیس لاکھ مسلمانوں نے کریمیا اور اس کے نواحی علاقوں سے ہجرت کی، نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خالص مسلم آبادی کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور 1897ء میں وہاں مسلمانوں کا تناسب صرف 35 فی صد رہ گیا۔

خانانِ کریمیا کے زمانہ میں جزیرۂ کریمیا ایک خوشحال خطہ تھا۔ مملکت 28 انتظامی حصوں میں تقسیم تھی۔ انگور، گیہوں، تمباکو اور روئی خاص زرعی پیداوار تھیں۔ مویشی بانی عروج پر تھی۔ دو لاکھ مویشی اور بے شمار غلہ ہر سال استنبول بھیجا جاتا تھا۔ قالین سازی کی صنعت ترقی پر تھی۔ فن تعمیر نے بھی ترکوں کے زیر اثر بڑی ترقی کر لی تھی۔ شاندار محلات، مسجدیں، کتب خانے اور مدرسے تعمیر کیے گئے، لیکن خان کے محل اور زنجیر لی مدرسے کے علاوہ روسیوں نے باغچی سرائے کی اور دوسرے شہروں کی تمام عمارتیں تباہ کر دیں۔ خان کا محل تاتاریوں کا الحمرا کہلاتا تھا اور روس کے عظیم شاعر پشکن نے اپنی مشہور نظم "باغچی سرائے کا فوارہ" میں اس کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ باغچی سرائے میں صرف دو ہزار گھر تھے، لیکن بندرگاہ کافہ میں مکانوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ ستر مسجدیں، 32 گرجے اور یہودیوں کے دو صومعے تھے۔ جامع مسجد کے مرکزی گنبد کا قطر 96 فٹ اور دو میناروں کی بلندی ایک سو پندرہ فٹ تھی۔

سلیم ثالث

سلطنت عثمانیہ کے زوال کو روکنے اور اس کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے جن عثمانی سلاطین نے قابل قدر کوششیں کیں ان میں سلطان سلیم ثالث (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) کا نام سرفہرست ہے۔ سلطان سلیم میسور کے ٹیپو سلطان کا ہمعصر تھا۔ اس نے تعلیم عام کرنے اور جدید علوم کی اشاعت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دور میں فن جنگ سے متعلق کتابوں کا فرانسیسی زبان سے ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ بری اور بحری فوجوں کو نئے سرے سے منظم کیا گیا اور اسی نئی تنظیم کو نظام جدید کا نام دیا گیا۔ فرانسیسی انجینئروں اور توپچیوں کی مدد سے توپ ڈھالنے کے جدید طرز کے کارخانے قائم کیے گئے۔ جاگیرداری نظام اصلاحات کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھا، اس لیے سلیم نے جاگیرداری بھی ختم کردی۔

لیکن سلیم ان اصلاحات میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ سلطان ٹیپو کی طرح مفاد پرست اور تنگ نظر لوگ سلیم کے خلاف ہو گئے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ینی چری فوج جو کسی زمانے میں ترکی کی سب سے منظم اور طاقتور فوج تھی، نظام جدید کے خلاف تھی اور وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ینی چری کے سپاہیوں نے جدید یوروپی اسلحہ اور جنگی طریقوں کو اختیار کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ شیخ الاسلام اسعد آفندی اصلاحات کے حامی تھے، لیکن ۱۸۰۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نئے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی ینی چری کے زیر اثر تھے۔ ''جاہل صوفیوں'' تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یوروپی طرز پر فوجوں کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا، جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا، سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔ ''یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا''[1]

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی: تنقیحات ص ۷۳۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔

محمود ثانی

سلیم ثالث کے بعد جس سلطان نے اصلاح کا کام جاری رکھنے کی کوشش کی وہ محمود ثانی (۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء) ہے۔ محمود ثانی سلطان عبدالحمید اول کا بیٹا تھا۔ بدامنی، سرکشی اور بغاوتوں سے اس کے دَور کا آغاز ہوا۔ مصر میں مقامی مملوک سردار بے لگام ہو چکے تھے اور عرب میں نجد کے سعودی خاندان کو عروج حاصل ہوا اور سعودی فوجوں نے حجاز پر قبضہ کر کے عراق اور شام تک چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ یونان نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ محمود نے اٹھارہ سال کے اندر تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مصر کے والی محمد علی نے مصر و شام میں امن قائم کر دیا۔ حجاز کو سعودی فوجوں سے واپس لے لیا اور ۱۸۲۶ء میں یونان کی بغاوت بھی فرو کر دی گئی۔ اسی سال ینی چری فوج کا بھی خاتمہ کر دیا گیا، جس کے سردار اور سپاہی سلطنت کے لیے ایک مصیبت بن گئے تھے۔ محمود نے اب ان کی جگہ جدید طرز پر ایک نئی فوج تیار کی جس کی وردی یورپی طرز کی تھی اور پگڑی کی بجائے ترکی ٹوپی پہنتی تھی۔ سلطان نے بکتاشی درویشوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو اصلاحات کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ اس کے علاوہ محمود نے جاگیرداری نظام پر بھی پابندیاں لگائیں اور یہ حکم جاری کیا کہ کوئی شخص مقدمے کے بغیر قتل نہ کیا جائے۔ سلیمان قانونی کے زمانے سے یہ قاعدہ ہو گیا تھا کہ سلاطین نے دربار میں آنا چھوڑ دیا تھا، جہاں ساری کاروائی وزیراعظم کی صدارت میں ہوتی تھی۔ محمود نے اس دستور کو توڑا اور پابندی سے دربار میں آنا شروع کیا۔ ان اصلاحات کے بعد توقع تھی کہ سلطنت عثمانیہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتی، لیکن مغربی قوتیں اور خاص طور پر روس نہیں چاہتا تھا کہ سلطنت عثمانی پھر ایک بڑی طاقت بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی۔

۲۰۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو یونان میں نوارینو کے مقام پر روس، انگلستان اور فرانس کے متحدہ بحری بیڑے نے حملہ کر کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ کر دیا۔ روسی فوجیں بلقان کی طرف سے بڑھتی ہوئی ۱۸۲۹ء میں ادرنہ تک پہنچ گئیں، سلطان کو روس سے پھر صلح کرنی پڑی۔ روسی دباؤ کے تحت یونان کو آزادی دے دی گئی (۱۸۲۹ء) روسی فوجوں نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے، لیکن دریائے ڈنیوب کے دہانہ اور دریا کے شمال میں واقع رومانیہ کے علاقہ پر قابض ہو گیا۔ ادھر سے اطمینان

ہوا تو ۱۸۳۰ء میں فرانس الجزائر پر قابض ہو گیا۔ ۱۸۳۱ء میں مصر کے والی محمد علی نے بھی بغاوت کر دی اور اس کی فوجیں محمد علی کے لڑکے ابراہیم کی قیادت میں جو اپنے زمانہ کا بڑا تجربہ کار اور ماہر سپہ سالار تھا شام کو فتح کرتی ہوئیں ترکی کے قلب میں کوتاہیہ تک پہنچ گئیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا جلد ہی استنبول پر بھی قبضہ ہو جائے گا۔ یہ حالات تھے کہ محمود ثانی کا انتقال ہو گیا۔

عبدالمجید خاں (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء)

محمود ثانی کے بعد اس کا بڑا لڑکا عبدالمجید خاں سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے مصر سے صلح کر لی۔ شام دولت عثمانیہ کو واپس مل گیا اور محمد علی نے مصر پر عثمانی سلطنت کی بالادستی بھی تسلیم کر لی۔ محمود ثانی نے وفات سے پہلے اصلاحات کا ایک پروگرام تیار کیا تھا لیکن محمود کو اس پر عمل درآمد کا موقع نہیں ملا۔ سلطان عبدالمجید نے تخت نشین ہونے کے بعد ۳۔ نومبر ۱۸۳۹ء کو ان اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ یہ اصلاحات ترکی میں ''تنظیمات خیریہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان اصلاحات کے ذریعے سلطنت کی رعایا کو جان، مال اور آبرو کی ضمانت دی گئی۔ سب کے ساتھ مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر یکساں سلوک کا وعدہ کیا گیا۔ قانون کی بالادستی قائم کی گئی۔ انتظامی، فوجی اور تعلیمی میدانوں میں اصلاحات کی گئیں۔ سلطان عبدالمجید نے غلامی کے رواج کو بھی قانوناً ختم کر دیا۔

جنگ کریمیا

روس نے جب سلطنت عثمانیہ کو ایک بار پھر ترقی کے راستے پر گامزن دیکھا تو اس نے پھر مداخلت کی۔

روس نے سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کے لیے سلطنت کے یورپی صوبوں میں آباد عیسائی باشندوں کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ان عیسائی باشندوں پر مشتمل ۱۸۴۰ء میں ایک تنظیم قائم کی جس کا نام جمعیت سلافیہ تھا۔ یہ سلافی نسل کے باشندوں پر مشتمل تھی اور اس کا مقصد رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویا کے باشندوں کو بغاوت پر اُکسانا اور ان ملکوں کی آزاد حکومتیں قائم کرنا تھا۔ اس سال کے بعد سے روس نے جنگ بلقان تک سلافی باشندوں کے تحفظ کے بہانے بار بار مداخلت کی۔ اس سلسلے میں پہلی بڑی مداخلت ۱۸۵۴ء میں

کی۔ زار روس نے ترکی کو یورپ کا بیمار آدمی قرار دیا اور برطانیہ کے سامنے سلطنت عثمانیہ کو روس اور برطانیہ میں تقسیم کر لینے کی تجویز پیش کی لیکن برطانیہ نے اس مرتبہ روس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ روس نے تنہا عثمانی مملکت پر حملہ کر دیا اور اس طرح کریمیا کی جنگ شروع ہوئی ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک دو سال جاری رہی اس میں برطانیہ نے ترکوں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے روس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور جنگ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالمجید کے زمانے میں اصلاحات کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ نے جو ترقی کی اس کا ذکر برطانوی وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن (PALMERSTON) نے ۱۸۵۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ان الفاظ کے ساتھ کیا:

''جتنی ترقی و اصلاح سلطنت عثمانیہ نے گذشتہ بیس سالوں میں کی ہے کسی دوسری حکومت نے نہیں کی۔''

یہ زمانہ وہی تھا جب ہندوستان اور پاکستان میں انگریزوں کی حکومت پوری طرح قائم ہو چکی تھی اور ۱۸۵۷ء میں آخری تیموری حکمران، بہادر شاہ کو انگریزوں نے جلاوطن کر کے دہلی کے تیموری خاندان کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جب ہم اسلامی ہند کی اس صورت حال کا ترکوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ ہم جو اورنگ زیب کے زمانے میں اتنے بڑے ملک کے مالک تھے ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر سیاسی حیثیت سے ختم کر دیئے گئے، لیکن ترکوں کی مختصر قوم نے اپنے زوال کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی اتنی طاقت حاصل کر لی تھی اور اتنی ترقی کر لی تھی کہ مخالف بھی ان کی تعریف کرنے پر مجبور تھے۔

سلطان عبدالمجید کے بعد اس کا بھائی عبدالعزیز (۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ کے بحری بیڑے کو اتنی ترقی دی گئی کہ عثمانی ترک یورپ کی تیسری بڑی بحری طاقت بن گئے۔ تنظیمات کی اصلاحات کے روح رواں وزیر اعظم مصطفیٰ رشید پاشا (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۸ء) تھے جنہوں نے ۳۔ نومبر ۱۸۳۹ء کو اصلاحات کا اعلان کیا تھا۔ ان کے بعد وزیر اعظم فواد پاشا (۱۸۱۵ء تا ۱۸۶۹ء) اور وزیر اعظم عالی پاشا (۱۸۱۵ء تا ۱۸۷۱ء) نے یہ کام جاری رکھا، لیکن اصلاحات کے سلسلے میں رشید پاشا کے بعد سب سے زیادہ شہرت جس شخصیت نے حاصل کی وہ مدحت پاشا (۱۸۲۰ء تا ۱۸۸۳ء) ہیں۔ سلطان

عبدالعزیز کے زمانے میں اصلاحات کے کام میں رکاوٹیں بڑھیں اور بادشاہ نے آمرانہ انداز اختیار کیا۔ بادشاہ نے فضول خرچیاں اختیار کیں اور بڑے بڑے محلوں کی تعمیر پر کثیر رقم صرف کی۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے قرض لیے اور ٹیکس لگائے۔ ۱۸۶۷ء میں سرویا نے آزادی حاصل کرلی۔ اس کی ان کاروائیوں کی وجہ سے ملک میں بے چینی بڑھی۔ کچھ محبان وطن نے جن میں نامق کمال شامل ہیں ۱۸۶۵ء میں ینی عثمانی جمعیت یعنی نوجوان عثمانی جمعیت کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جس کا مقصد بادشاہ کے آمرانہ اختیارات پر پابندی لگا کر دستوری حکومت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ جب سلطان عبدالعزیز کے خلاف بے چینی بڑھی تو مدحت پاشا نے جو دستوری حکومت کے زبردست حامی تھے، عثمانی محبان وطن کے تعاون سے سلطان عبدالعزیز کو معزول کردیا اور سلطان عبدالمجید کے لڑکے مراد کو تخت نشین کیا، جو دستوری حکومت کے نظریہ سے دلچسپی رکھتا تھا، لیکن چند ماہ بعد ہی دماغی خلل کی وجہ سے سلطان مراد کو بھی معزول کرنا پڑا اور اس کی جگہ سلطان عبدالمجید کے دوسرے لڑکے عبدالحمید خاں کو تخت نشین کیا۔ مدحت پاشا نے سلطان عبدالحمید کو تخت نشین کرنے سے پہلے ان سے دستوری حکومت قائم کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

عبدالحمید خاں دوم (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء)

۲۳۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جب سلطان عبدالحمید خاں نے وعدے کے مطابق دستور اساسی کا اعلان کیا تو سلطنت عثمانیہ میں عوام نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ شہروں میں چراغاں کیا گیا اور لوگوں نے سلطان زندہ باد اور مدحت پاشا زندہ باد کے نعرے لگائے۔ دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ قائم کی گئی جس کا ۲۰۔ مارچ ۱۸۷۷ء کو افتتاح ہوا۔ اسلامی دنیا میں مغربی انداز کی یہ پہلی مجلس شوریٰ تھی اور سلطنت عثمانیہ پہلی بادشاہت تھی جس نے دستوری اور آئینی پابندیوں کو قبول کیا۔

ترکوں نے ابھی آئینی حکومت کا آغاز کیا ہی تھا کہ ۲۴۔ اپریل ۱۸۷۷ء کو روس نے حملہ کردیا۔ دریائے ڈینیوب کے جنوب میں پلونا کے مقام میں جنرل عثمان پاشا نے غیر معمولی شجاعت کا اظہار کیا اور روس کی دو لاکھ فوج کے حملوں کو پچاس ہزار باضابطہ اور بے ضابطہ فوجیوں کی مدد سے پانچ ماہ تک پسپا کرتے رہے۔ آخرکار ہر طرف سے گھر جانے اور رسد بند ہوجانے کی وجہ سے ۱۰۔ دسمبر ۱۸۷۷ء کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ زارِ روس عثمان پاشا کی شجاعت سے اتنا

متاثر ہوا کہ ان کو شرف باریابی عطا کر کے ان کی شجاعت پر مبارک باد دی اور ان کی مدافعت کو فوجی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ قرار دیا۔

عثمان پاشا کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد روسی فوجیں آسانی سے آگے بڑھ گئیں اور ۲۸۔جنوری ۱۸۷۸ء کو ادرنہ کے تاریخی شہر میں داخل ہوگئیں جو دارالخلافہ استنبول سے صرف سوا سَو میل دُور تھا۔ بالآخر یورپی قوموں کی مداخلت سے جنگ بند ہوئی۔ ۱۳/جولائی ۱۸۷۸ء کو برلن میں ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت روس نے اپنے بیشتر مقاصد حاصل کر لیے۔ رومانیہ پر سے عثمانی بالادستی ختم ہوگئی اور وہ مکمل طور پر آزاد مملکت قرار دی گئی۔ بلغاریا سرویا اور قرہ داغ (مونٹی نگرو) میں خودمختار حکومتیں قائم کر دی گئیں جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج تک رہ گیا۔

برطانیہ نے اپنی ہمدردانہ مداخلت کے صلے میں جون ۱۸۷۸ء کو جزیرۂ قبرص سلطنت عثمانیہ سے پٹہ پر لے لیا۔ روس سے جنگ کے نتیجے میں اب یورپ میں جنوبی یونان اور کوہ بلقان کے درمیان مختصر سا علاقہ ترکوں کے پاس رہ گیا، جس کا رقبہ چند مربع میل تھا۔ تونس اور مصر اگرچہ پہلے ہی عملاً آزاد تھے، لیکن سلطنت عثمانیہ کی بالادستی تسلیم کرتے تھے۔ اب عثمانی ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونس پر اور برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔

پہلی مشروطیت کا خاتمہ

روس اور ترکی کی جنگ کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان عبدالحمید نے جنگ کے غیر معمولی حالات کو بہانہ بنا کر ۱۴۔جنوری ۱۸۷۸ء کو دستور معطل کر دیا، پارلیمنٹ برخاست کر دی گئی اور مدحت پاشا کو گرفتار کر لیا گیا اور چند سال بعد قید خانے میں خفیہ طریقے پر قتل کرا دیا گیا۔ ترکی کی پہلی مشروطیت جس کا آغاز ۲۳۔دسمبر ۱۸۷۶ء کو ہوا تھا، صرف ایک سال قائم رہی۔ اس کے بعد جو دَور شروع ہوا اس کو ترکی کی تاریخ میں استبداد کا دَور کہا جاتا ہے۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کے بعد پورے تیس سال ایک مطلق العنان بادشاہ اور ایک آمر مطلق کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں بیرونی سازشوں اور کوششوں کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی ایک چپہ زمین بھی انہوں نے ہاتھ سے نہیں نکلنے دی۔ جرمنی کی مدد سے فوجی نظام کو جدید ترین طریقے پر منظم کیا اور جب مغربی

حکومتوں کی شہ پر ۱۸۹۷ء میں یونان نے عثمانی علاقہ پر حملہ کیا تو ترک فوجوں نے یونانیوں کو شکست فاش دے کر فوجی قوت کی دھاک بٹھا دی۔ ترکی میں ریل کی پٹریاں بچھائی گئیں اور دمشق اور بغداد تک ریلوے لائن کی توسیع کی گئی۔ حجاز ریلوے کی تعمیر بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔ مدینہ تک تار برقی کا سلسلہ قائم ہوا۔ قانون، تجارت، انجینئرنگ اور زراعت کے کالج تعمیر ہوئے۔ استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ طب قائم ہوا۔ فنون لطیفہ کی اکادمی قائم ہوئی۔ مطبوعات پر سخت احتساب کے باوجود صرف ابتدائی پندرہ سالوں میں ترکی میں چار ہزار کتابیں شائع ہوئیں۔

سلطان عبدالحمید نے اتحاد اسلام کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی اور غیر ترک مسلمانوں کو اعلیٰ عہدے دے کر ان میں سلطنت عثمانیہ کے ایک ترک ریاست سے زیادہ ایک اسلامی ریاست ہونے کا احساس پیدا کیا اور غیر ترک مسلمانوں میں اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے فلسطین کو یہودی وطن بنانے کی کوششوں کو ناکام بنایا۔ ترکی قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور انگریزوں نے دو مرتبہ سلطان کو یہ قرض ادا کرنے کی پیشکش کی، بشرطیکہ وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں، لیکن سلطان نے اس پیشکش کو سختی سے رد کر دیا۔

سلطانی استبداد

سلطان کے عہد کے یہ تمام کارنامے یقیناً قابل قدر ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ترک قوم پرستوں میں سلطان عبدالحمید ایک انتہائی ناپسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو نظریاتی اختلاف تھا۔ سلطان عبدالحمید خلافت عثمانیہ کو ترکوں اور عربوں کے تعاون سے ایک مسلم مملکت کی شکل دینا چاہتے تھے جب کہ نوجوان ترکوں میں ترک قوم پرستی کے جذبات روز بروز زیادہ شدید ہوتے جا رہے تھے، لیکن سلطان سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ اُن کا استبدادی طرز حکومت تھا۔ سلطان نے ۱۸۷۸ء میں دستور معطل کر کے اس جمہوری عمل کو روک دیا تھا جس کا آغاز ۱۸۳۹ء میں ہوا تھا اور ترکوں کے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں جس نے جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ جدید تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ آئینی اور دستوری حکومت کے لیے ہمدردیاں بڑھتی چلی گئیں۔ جو طلبہ اعلیٰ اور خصوصی تعلیم کے لیے یورپ بھیجے جاتے تھے وہ یورپ کی جمہوری فضا سے متاثر ہو کر آتے تھے، حتیٰ کہ ترک فوج میں بھی دستور سے ہمدردی رکھنے والوں نے زور پکڑ لیا۔

سلطان نے اپنی سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے طرح طرح کی سختیاں کیں، ان کو ہزاروں کی تعداد میں قید و بند میں ڈالا، لیبیا، اور یمن جیسے دور دراز ملکوں میں جلاوطن کیا۔ زبردست جاسوسی نظام قائم کیا اور اخبار، رسالوں اور مطبوعات پر کڑی نگرانی قائم کی۔ لیکن استبدادی نظام کے خلاف تحریک زور پکڑتی گئی۔ ترکوں کے اس جذبے کو نامق کمال نے اپنی مشہور نظم 'قصیدۂ حریت' میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"آہ! اے آزادی تجھ میں کیا جادو ہے کہ ہم نے سب زنجیروں کو توڑ پھینکا مگر تیری غلامی کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا"

انجمن اتحاد و ترقی

عثمانی مملکت کی حدود میں چونکہ سیاسی سرگرمیاں ممکن نہیں تھیں اس لیے نوجوان ترکوں نے مئی ۱۸۸۹ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اس نے ۱۸۷۶ء کے دستور کی بحالی کے لیے مہم شروع کر دی۔ فوج میں انجمن کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ جولائی ۱۹۰۸ء میں مقدونیہ میں مقیم فوجی دستوں نے انور پاشا اور نیازی بے کی قیادت میں بغاوت کر دی اور ۱۸۷۶ء کے دستور کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو مطالبہ مانتے ہوئے دستور بحال کر دیا۔ اس طرح تیس سالہ استبدادی دور ختم ہوا اور ترکی میں دوسری مشروطیت کا آغاز ہوا جو ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست تک قائم رہی۔ ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو وہ مشہور حادثہ پیش آیا جسے ترکی کی تاریخ میں ۳۱۔ مارچ کا حادثہ کہا جاتا ہے۔ اس دن دارالخلافہ استنبول کے ایک گروہ نے شہر کے فوجی دستوں کو ملا کر نئی مشروطی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور شریعت کی حکمرانی کا مطالبہ کیا۔ محمود شوکت پاشا نے اس بغاوت کو جلد ہی فرو کر دیا۔ سلطان عبدالحمید کو بغاوت کرانے کے الزام میں ۲۷۔ اپریل کو معزول کر دیا گیا اور ان کی جگہ ان کے ایک بھائی رشاد (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء) کو خلیفہ اور بادشاہ مقرر کیا گیا۔

(۲) دوسری مشروطیت سے جمہوریت تک

آئینی حکومت بحال ہونے کے بعد ترکی میں سیاسی آزادی دے دی گئی، جس کے نتیجے میں

کئی سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔ پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے اور اس میں سلطنت عثمانیہ کی تمام رعایا کو بلالحاظ مذہب وملت آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی ملی، لیکن یورپی علاقوں میں آباد مسیحی باشندے سلطنت عثمانیہ سے مخلص نہیں تھے۔ وہ جمہوری اداروں کو اپنی مستقل آزادی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ روس ان عناصر کی کھلی طرفداری کر رہا تھا اور استنبول اور باسفورس پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مغربی ملکوں نے نوجوان ترکوں کو اطمینان سے کام نہیں کرنے دیا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا اور سال بھر کے اندر پورے علاقے پر قابض ہو گیا۔ اٹلی نے اس جنگ کے دوران رہوڈس اور بحیرۂ ایجین کے کئی جزیروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جنگ بلقان (۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء) چھڑ گئی جس میں یونان، سرویا اور بلغاریہ نے ترکوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور مغربی حکومتوں نے ان کی پشت پناہی کی۔ اس جنگ کے نتیجے میں استنبول سے ادرنہ تک کے علاقے کو چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ کے سارے یورپی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے، جن کا رقبہ ۵۵ ہزار مربع میل تھا اور آبادی ۴۲ لاکھ تھی۔

جنگ عظیم

جنگ بلقان ختم ہوئی تو ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) چھڑ گئی جس میں عثمانی ترک جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادی قوتوں کا جو روس، برطانیہ اور فرانس پر مشتمل تھیں، چار سال تک بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا اور درۂ دانیال، قفقاز اور عراق کے محاذوں پر دشمنوں کو کئی بار شکستیں دیں۔ لیکن جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ترکوں کو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بند ہو گئی۔ انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا جو ترکوں کو جنگ میں شامل کرنے کے ذمہ دار تھے، اتحادیوں کی نئی ذلت آمیز شرائط کو قبول نہیں کر سکتے تھے اور مزید مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے، اس لیے وہ ترکی سے باہر چلے گئے۔ انور پاشا ترکستان کی آزادی کی جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور طلعت پاشا برلن میں اور جمال پاشا طفلس میں ارمنی قوم پرستوں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ہوا اور ۱۶۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہو گئیں۔ ساڑھے چار سو سال کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنت عثمانیہ

کے دارالحکومت پر غیروں کا قبضہ ہوا ہو۔ اس واقعہ نے نہ صرف ترکی بلکہ ساری اسلامی دنیا کو غم و غصہ میں مبتلا کر دیا۔ خلیفہ اسلام اب انگریزوں کے بس میں تھا۔ اتحادی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کر دینا چاہتی تھی، لیکن اس دوران میں اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۲۲ء کے آخر تک ترکوں نے تمام دشمنوں کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ سلطان وحید الدین جس کو انگریزوں نے اپنے تسلط کے دور میں بادشاہ مقرر کیا تھا، ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ایک برطانوی جہاز میں فرار ہو گیا۔ قوم پرست ترکوں نے اس کی جگہ عبدالمجید کو خلیفہ منتخب کیا، لیکن ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو بادشاہت ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور ۳۔ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت بھی ختم کر دی گئی۔ اس طرح عثمانی سلطنت کا ۶۲۵ سال بعد خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی تاریخ میں کسی مسلمان خاندان نے اتنے طویل عرصے تک حکومت نہیں کی۔

انور پاشا

وہ ترک رہنما جن کی کوششوں سے ۱۸۷۷ء میں پہلی مشروطیت قائم ہوئی نوجوان عثمانی کہلاتے ہیں اور وہ رہنما جو دوسری مشروطیت کا باعث ہوئے نوجوان ترک کہلاتے ہیں۔ مشروطیت کے اس دور میں محمود شوکت پاشا (۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۳ء) اور انور پاشا (۱۸۸۱ء تا ۱۹۲۲ء) سب سے بااثر شخصیت تھے۔ ۱۹۱۳ء میں محمود شوکت پاشا کی شہادت کے بعد اگرچہ سعید حلیم پاشا وزیر اعظم منتخب ہوئے، لیکن ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۸ء تک حقیقی اقتدار ارکان ثلاثہ کے ہاتھ میں تھا جو انور پاشا، طلعت پاشا (۱۸۷۴ء تا ۱۹۲۱ء) اور جمال پاشا (۱۸۷۲ء تا ۱۹۲۲ء) پر مشتمل تھے اور جس میں سب سے اہم شخصیت انور پاشا کی تھی۔ انور پاشا نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے تھے جس کی وجہ سے وہ اسلامی دنیا کی مقبول ترین شخصیت بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سلطان عبدالمجید کی استبدادی حکومت کو ختم کر کے دستوری حکومت کے قیام میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ جنگ عظیم کے دوران وہ وزیر جنگ تھے، بلکہ ایک طرح سے پوری سلطنت کے مختار کل تھے۔ ان کے عہد میں ترکی کی فوجوں کی جرمن ماہرین کی نگرانی میں نئی تنظیم کی گئی اور یہ اسی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ ترکی جیسے چھوٹے اور زوال پذیر ملک نے جو یورپ کا مردِ بیمار کہلاتا تھا، روس، برطانیہ اور دوسرے اتحادی ملکوں کا چار سال تک مقابلہ

کیا۔ انور پاشا پاکیزہ سیرت کے مالک تھے اور ذہنی اور عملی دونوں حیثیت سے سچے مسلمان تھے، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود انور پاشا مفکر اور مصلح نہیں تھے۔ وہ مدبر بھی نہیں تھے بلکہ ایک جذباتی انسان تھے، ایک پر جوش مجاہد تھے۔ ان کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔

عربوں کی بغاوت

انجمن اتحاد و ترقی جس کے وہ ایک رہنما تھے کوئی نظریاتی جماعت نہیں تھی۔ وہ ترک اور غیر ترک، اسلام پسند اور اسلام دشمن، کٹر اور معتدل وطن پرستوں اور اتحاد توران اور اتحاد اسلام کے حامیوں پر مشتمل مختلف عناصر کا مجموعہ تھی۔ اسی وجہ سے یہ انجمن نظریاتی انقلاب نہیں لا سکی۔ اس کا مقصد صرف عبدالحمید خاں کی استبدادی حکومت کو ختم کر کے دستوری حکومت قائم کرنا تھا اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو انجمن میں انتشار پڑ گیا۔

نوجوان ترک اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے۔ ان کے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ۱۹۰۸ء میں بلغاریہ آزاد ہو گیا اور ۱۹۱۳ء تک یورپ کے تمام علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اب سلطنت عثمانیہ صرف ترک اور عرب علاقوں میں مشتمل رہ گئی۔ ۱۹۱۴ء میں سلطنت کی آبادی میں سوا کروڑ ترک اور ۵۳ لاکھ عرب تھے اور عثمانی پارلیمنٹ کے ۲۵۹ ممبروں کے ایوان میں ۱۴۴ ترک اور ۸۴ عرب تھے۔ گویا عربوں کی نمائندگی ان کے تناسب سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود عربوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکا۔ وہ عرب قومیت کا شکار ہو چکے تھے۔ یورپی قوموں کی طرح وہ بھی اپنی آزاد عرب ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ چند اسلام پسند عرب رہنماؤں یعنی شریف سنوسی، رشید رضا مصری اور امیر شکیب ارسلان وغیرہ نے عربوں اور ترکوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ عربوں نے حجاز، شام اور عراق میں جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں کی سازش کا شکار ہو کر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی (۱۹۱۶ء) اور اس طرح عرب علاقے سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئے۔

اس ساری کشمکش میں قصور صرف عربوں کا نہیں تھا، ترک بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ عربوں کی طرح ان میں بھی ایک طبقہ ترک قوم پرستی کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ کبھی اتحاد توران، کبھی عثمانی قومیت اور کبھی ترک قومیت کے نعرے لگاتا تھا اور سلطنت عثمانیہ میں ترکوں کی برتری کو

ہر شکل میں قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکوں میں بھی سعید حلیم پاشا، محمد عاکف اور اشرف ادیب جیسے اسلام پسند عناصر موجود تھے، جو اعتدال کی راہ اختیار کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے پاس کوئی واضح نظریاتی پروگرام نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کی آواز بھی صدا الصحرا ثابت ہوئی اور آخر میں فتح ترک قومیت اور عرب قومیت کی ہوئی اور اسلام کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

ترکوں کا قومی کردار

سلطنت عثمانیہ چھ سو سال سے زیادہ قائم رہی۔ اسلامی تاریخ میں کسی ایک خاندان نے اتنے عرصہ حکومت نہیں کی اور نہ کسی قوم کو اتنا عروج حاصل رہا جتنا عثمانی ترکوں کو۔ عثمانی ترکوں میں حکومت کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ چار سو سال تک تو ان کا عروج قائم رہا اور اسکے بعد جب زوال ہوا تو ان کی سلطنت امویوں، عباسیوں اور مغلوں کی طرح ایک دم ختم نہیں ہوئی، بلکہ دو سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ دشمنوں کو انہوں نے اپنے علاقے آسانی سے نہیں دیئے، بلکہ ایک ایک قدم کے لیے جنگ کرتے رہے اور بارہا انہوں نے اپنے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال لیا۔ عثمانی ترکوں کی یہ ایک ایسی خوصیت ہے جس کی مثال تاریخ اسلام میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔

عثمانی سلطنت کی اس مضبوطی اور استحکام کے کئی اسباب ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی حکومت اور حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ قانونی انداز کی تھی۔ بادشاہ کے مشورہ کے لیے باب عالی کے نام سے ایک ادارہ تھا جس میں ایک خاص صلاحیت کے لوگ لیے جاتے تھے اس مشاورتی ادارے کی وجہ سے سلطنت کا کام زیادہ خوبی سے انجام دیا جاتا تھا اور بادشاہ زیادہ من مانی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ عثمانی سلاطین کے پاس ینی چری کے نام سے ایک باقاعدہ اور منظم فوج تھی۔ یہ دنیا کی پہلی مستقل اور باقاعدہ فوج تھی۔ اس فوج کو سخت قسم کی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن اس فوج کا صدیوں تک مقابلہ نہیں کر سکے۔

لیکن سلطنت عثمانیہ کی مضبوطی اور استحکام کی سب سے بڑی وجہ ترکوں کا اخلاق اور ان کا اعلیٰ کردار ہے۔ ترک ہمیشہ سادگی پسند، جفاکش اور جانباز رہے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی سے

جو انسان کو آرام طلب بناتی اور خود غرضی سکھاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ دور رہے۔ اسی طرح وہ بددیانتی، شراب، جوا اور بے حیائی کے کاموں سے بھی دوسری مسلمان قوموں کے مقابلہ میں زیادہ بچے رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اخلاق و کردار میں عرصہ دراز تک خرابیاں پیدا نہ ہوسکیں۔ ترکوں کی ان خوبیوں کا تمام مورخوں نے جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ ان مؤرخوں اور مصنفوں کی رائے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اُردو کے مشہور مصنف مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے ان میں فضول شان و شوکت کا نام نہیں۔ بڑے بڑے وزراء، امراء بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں، مکانات اور معاشرت کی تمام چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں بجا ہے کہ انہوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پَن نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اندلس کے اموی اور تیموری تو سو دو سو برس ہی میں اچھے خاصے رنگیلے بن گئے تھے''

''ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے۔ امراء اور معزز عہدے دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں۔ میں نے دس ہزار کی تنخواہ سے لے کر بیس روپے آمدنی والوں تک کے مکان دیکھے، اگرچہ دونوں حالتوں میں بڑا فرق تھا اور ہونا چاہیے تھا، لیکن خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر تھے''

ایک انگریز لکھتا ہے:

''اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیزگار قوم بنا دیا ہے۔ اسلام نے انہیں جسمانی حیثیت سے بھی ایک صاف ستھری قوم بنا دیا ہے۔ ان کو دن میں کم سے کم پانچ دفعہ نماز پڑھنی پڑتی ہے اور ہر نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں نجاست سے پاک کرنے کے لیے پورے جسم کو دھونے کی تعلیم، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، ہمیشہ اپنے گھروں اور جسموں کو صاف ستھرا رکھنا، ان چیزوں نے ان میں صفائی کی عادت پیدا کر دی ہے۔ غریب سے غریب ترک کی گھر کی غیر معمولی

صفائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی مثال کا کچھ اثر ان کے عیسائی ہمسایوں پر بھی ہوا ہے۔ اگرچہ اکثر و بیشتر عیسائی اپنے مکانوں کے قریب غلاظت اور گندگی ڈال دیتے ہیں جسے کوئی ترک اپنے مکان کے قریب گوارا نہ کرے گا۔ جسمانی صفائی کے معاملہ میں بھی دونوں میں یہی فرق ہے، ایک دیہاتی قہوہ خانہ میں جب ایک عیسائی کسان سے یہ پوچھا گیا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کیا وہ پسند نہیں کرتا کہ ہاتھ مُنہ دھو ڈالے تو اس نے جواب دیا کہ ''میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ اپنے مُنہ کو دھوتا رہوں''

(دولت عثمانیہ جلد دوم صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۰ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

''ڈاکہ، نقب زنی، یہاں تک کہ چھوٹی اور معمولی چیزوں کی چوری بھی ترکوں کے ہاں مطلق نہیں ہوتی۔ چور عموماً بلغاریہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر جھگڑا فساد شاذ و نادر ہوتا ہے مگر جو چیز سیاح کے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتی وہ سڑکوں پر بدمست عورتوں اور بدمست مردوں کا نہ ہونا ہے۔ اگر کہیں کوئی شراب کے نشہ میں مست دیکھا بھی جائے گا تو وہ یقیناً ترک نہ ہوگا۔ اس خوبی کی قدر اس وقت بڑھ جاتی ہے جس وقت ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں ہر ایک جھگڑا فساد نیز ہر ایک ارتکاب جرم کا سبب، اگر غور سے دریافت کیا جائے تو یہی شراب خوری ہوگی'' (دولت عثمانیہ جلد دوم ص ۴۵۴)

ایک اور یوروپی مصنف ڈبلو۔ ایس منرو لکھتا ہے:

''مجھ سے قسطنطنیہ میں کاروباری آدمیوں نے بارہا کہا کہ جب ہم کو کوئی ایسا کام سپرد کرنا ہوتا ہے جس میں کامل ایمانداری کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ ہم بجائے کسی یونانی، ارمنی یا یہودی کے کسی ترک کو وہ کام سپرد کردیتے ہیں''

انگریز مصنف لارنپٹ لکھتا ہے:

''اگر کوئی شخص سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔ ترک بے شرم عورتوں سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور ان سے بچتے ہیں۔ اس لیے اگر عیسائیوں میں سے کسی کا ترکوں سے جھگڑا ہوجاتا ہے اور اس عیسائی کی بیوی لڑاکا ہوتی ہے، تو وہ اسے ترکوں سے جھگڑنے اور بدزبانی کرنے کے لیے کھڑا کردیتا ہے اور اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت اور شرم کی بات یہ ہے کہ

وہ عورت پر ہاتھ اٹھائے''

جوئے کے کھیل سے وہ بے حد نفرت کرتے ہیں اور قمار باز کو جو روپے کے لیے کھیلتا ہے چور سے بھی برا سمجھتے ہیں۔

اونچے بلکہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی رقص کا جہاں تک تعلق ہے اس کو انسانی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس فن کو نوع انسانی کے نہایت ادنیٰ افراد کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں۔ان کا قول ہے کہ کوئی بھی نہیں ناچتا جب تک کہ وہ بدمست یا مجنون نہ ہو۔

''ترک عورتوں سے سڑک پر کبھی بات نہیں کرتے، یہاں تک کہ خود اپنی بیویوں سے بھی نہیں۔کوئی شخص عورت کو گھورتا نہیں۔یہ رواج یورپ کے عیسائی ملکوں تک محدود ہے''

''عام طور پر ترک شراب خوری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افیون کھانے کی عادت کو بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں''

عثمانی ترکوں کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا تذکرہ ہنگری کے ایک نومسلم مصنف جولیس جرمانوس نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''ترک فطری طور پر سپاہی، منظم، منصف مزاج اور امن وامان کا محافظ تھا۔اس کی ساری دولت یا تو اس کی اپنی املاک ہوتی تھی یا پھر ذاتی تنخواہ۔عیسائی رعایا تجارت کے تمام نفع بخش شعبوں پر قبضہ کر کے اتنی مالدار ہوگئی تھی کہ مسلمان رعایا جن کی اولاد سلطنت کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں سر کٹاتی تھی ان کو رشک وحسد کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔عیسائی فوجی خدمت سے آزاد تھے اور اس کا بوجھ سب سے زیادہ مسلمان ترکوں ہی کے اوپر تھا اور جس بہادری اور حکم الٰہی کی سچی اطاعت کے ساتھ یہ مسلمان ترک اس بار کو اٹھاتے تھے وہ قابل تعریف ہے۔یہی لوگ اسلام کے بہادر ترین مجاہد تھے اور ایسے زمانہ میں جب کوئی اور مسلمان قوم یورپ کی چیرہ دستیوں کی تاب نہ لاسکتی تھی۔اسلامی تہذیب، اسلامی علوم وفنون، اسلامی ادبیات اور اسلامی زندگی کی خدمت کرنے والے اور اسے زندہ رکھنے والے یہی ترک تھے۔اپنے کارناموں سے انہوں نے مستقل مزاجی اور قوت ارادی کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کر دی ہے کہ اگر دوسری مسلمان قومیں اسے سمجھیں اور

اس سے کام لیں، تو ان میں خودی کا احساس اور خود اعتمادی کی صفت پیدا ہو جائے۔"

تنظیمات کا دور اور نظریاتی کشمکش

ترکی میں جدید دور کا آغاز تنظیمات کی اصلاحات سے ہوتا ہے۔ ان اصلاحات نے بلاشک وشبہ مادی میدان میں ترکوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ پہلی مرتبہ جدید افکار، جدید سائنس اور جدید علوم سے واقف ہوئے اور مسلمانوں کا فکری جمود جس میں وہ زوال بغداد کے بعد سے مبتلا تھے، ٹوٹ گیا۔ لیکن اس دور میں ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نظام تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم۔ ایسا کرنا یورپ میں تو صحیح تھا کیونکہ مسیحیت دنیوی امور میں لوگوں کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی، لیکن مسلمانوں کے لیے دین اور دنیا کی یا مذہب و سیاست کی یہ دوئی صحیح نہیں تھی۔ اسلام مسلمانوں کی ہمیشہ سے زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کرتا چلا آ رہا تھا اور اس کا نتیجہ معاشرہ اور مملکت کے لیے ہمیشہ مفید نکلا۔ عہد تنظیمات میں جب تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس نے دنیوی مدرسوں میں تعلیم پائی تھی اسلام کی رہنمائی سے محروم ہو گیا اور دینی مدارس میں تعلیم پانے والا طبقہ صرف مسجد کا ملا بن کر رہ گیا۔ اس نظام تعلیم نے علماء کے طبقے کو قدامت پسندی میں سخت کر دیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی طرف سے بے حس کر دیا۔

عہد تنظیمات کے رہنماؤں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات اور مغربی تصورات میں توازن قائم رکھا اور بقول خالدہ خانم ان کے رگ و پے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل و دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا، مگر مغرب کے مقابلے میں وہ احساس کمتری میں ہرگز مبتلا نہ تھے۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت اور اپنی کمزوریوں کو دور کریں، لیکن عہد تنظیمات کے دنیوی مدرسوں میں اور یورپ کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو نئی نسل تیار ہوئی وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو بقول خالدہ ادیب عہد تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں دور تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا مجمع تھا جو

اسلامی علوم میں کورے تھے، اسلامی تربیت میں ناقص تھے۔ مغربی علوم میں بھی گہری نظر نہ رکھتے تھے۔ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ مغرب سے مرعوبیت ان میں بدرجہ اتم پیدا ہوگئی تھی۔

یہ وہ نسل تھی جو سلطان عبدالحمید کا تختہ اُلٹ کر برسر اقتدار آئی تھی۔ سلطان عبدالحمید نے اپنے دَور میں رجعت پسند علماء اور مشائخ کی مدد سے عہد تنظیمات کے مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیڑنے اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقا کو روکنے اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کی جو کوششیں کیں ان کی وجہ سے یہ نئی نسل مذہب کو مانع ترقی سمجھنے لگی۔

انیسویں صدی میں ترکوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل کو جن مغربی تصورات نے متاثر کیا ان میں ایک وطن پرستی اور قومیت کا سیاسی تصور بھی تھا۔ شروع میں یہ تصور حُبِ وطن تک محدود رہا، لیکن بعد میں اس تصور نے ترکوں میں نسلی اور قومی برتری کا احساس پیدا کر دیا اور جب اس کا عرب قوم پرستی کے تصور سے ٹکراؤ ہوا تو سلطنت عثمانیہ پارہ پارہ ہوگئی۔ قوم پرستی اور لا مذہبی کے رجحان کو ترکوں میں فروغ دینے میں مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے علاوہ فری میسن تحریک کا بھی نمایاں ہاتھ ہے، جس نے انیسویں صدی کے وسط میں استنبول اور سالونیکا میں اپنے لاج بنا لیے تھے۔ عہد تنظیمات اور دوسری مشروطیت کے بیشتر رہنما فری میسن تحریک کے عزائم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان کے جال میں پھنس گئے تھے اور اس تحریک کے رکن ہو گئے تھے۔ سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کے لیے انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان پر مشتمل جو جماعت مقرر کی گئی تھی ان میں سالونیکا کے فری میسن لاج کا یہودی ماسٹر قرہ صو بھی شامل تھا۔

(۳) جدید ترکی ادب

اٹھارہویں صدی میں ترکی کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی میدان میں بھی زوال شروع ہوگیا۔ اس کے باوجود اٹھارہویں صدی کے ادب میں تین نام بہت ممتاز ہیں۔ ان میں ایک شاعر ندیم (۱۶۸۱ء تا ۱۷۳۰ء) ہے جو اپنی خالص اور خوبصورت ترکی زبان کی وجہ سے آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ ندیم نے منجم باشی کی کتاب ''شقائق النعمانیہ'' کا جو ترکی کے علماء کے

حالات میں ہے، ترکی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ اس دَور کے دوسرے ممتاز شاعر درویش صفت شیخ غالب (۱۷۵۷ء تا ۱۷۹۹ء) ہیں جن کی مثنوی ''حسن وعشق'' ترکی زبان کی سب سے اچھی مثنوی ہے۔ ندیم اور غالب کا شمار کلاسیکی دور کے سب سے بڑے پانچ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس صدی کے نثر نگاروں میں مصطفیٰ نعیما (۱۶۵۵ء تا ۱۷۱۶ء) بہت اہم ہیں۔ وہ ترکی کے پانچ سب سے بڑے موّرخوں میں شمار ہوتے ہیں اور بعض مصنف ان کو کلاسیکی دَور کا سب سے بڑا موّرخ قرار دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ ۱۵۹۱ء سے ۱۶۵۹ء تک کے حالات پر مشتمل ہے اور ۱۷۰۲ء میں مکمل ہوئی۔

انیسویں صدی میں جدید ترکی ادب وجود میں آیا جو ترکی تاریخ میں تنظیمات کے ادب کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۲۲ء میں حکومت عثمانیہ نے مغربی زبانوں سے ترکی میں کتابوں کے ترجے کے لیے ایک شعبہ ترجمہ قائم کیا۔ اس دَور میں عربی اور فارسی سے بھی بکثرت ترجے ہوئے۔ ترک ادیبوں اور شاعروں نے پرانی روش سے ہٹ کر نئے نئے تجربے کیے جن کے نتیجے میں جدید ترکی ادب کی بنیاد پڑی۔ اس دَور کے ترک ادیبوں میں ضیا پاشا (۱۸۲۵ء تا ۱۸۸۰ء) ابراہیم شناسی (۱۸۲۱ء تا ۱۸۷۱ء) نامق کمال (۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۸ء)، عبدالحق حامد (۱۸۵۲ء تا ۱۹۳۷ء) اور توفیق فکرت (۱۸۶۷ء تا ۱۹۱۵ء) کے نام بہت مشہور ہیں۔ ان ادیبوں کی حیثیت جدید ترکی ادب میں وہی ہے جو اردو میں سرسید، نذیر احمد، حالی اور محمد حسین آزاد کی ہے۔ اس دَور میں عربی، فارسی اور اردو کی طرح ترکی میں بھی مغربی اثر کے تحت ناول نویسی، افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی کا آغاز ہوا۔ یہ نیا ادب چونکہ تنظیمات کے دَور میں پیدا ہوا تھا اس لیے عہد تنظیمات کا ادب کہلاتا ہے۔

نامق کمال

ان ترک ادیبوں میں نامق کمال اس لحاظ سے زیادہ ممتاز ہیں کہ وہ ادب کی ہر نئی صنف میں پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ موّرخ، شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور نقاد سب کچھ تھے اور انہوں نے مستقبل کے ترکی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے اسلامی ہند کے رہنما مولانا محمد علی جوہر سے بہت مشابہ تھے۔ وہ آزادی اور جمہوریت کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اپنی

کتابوں اور مضامین کے ذریعے بڑی جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اس کے نتیجے میں جلاوطنی اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ نامق کمال سچے اور پر جوش مسلمان تھے۔ انہوں نے مغربی تہذیب اور علوم سے فائدہ اٹھانے کی دوسرے ترک رہنماؤں کے مقابلے میں زیادہ متوازن دعوت پیش کی۔ ان کی فکر اسلامی تھی۔ انہوں نے عہد تنظیمات کے رہنماؤں پر تند و تیز تنقیدیں کیں کہ وہ اسلامی روایات کے تحفظ میں ناکام رہے اور یورپ کی غلط انداز میں تقلید کر رہے ہیں۔ انہوں نے سلطان عبدالحمید کے استبداد کی سختی سے مخالفت کی اور خلافت عثمانیہ کو ایک آئینی اور اسلامی حکومت بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ نامق کمال نے اسلامی تصورات کا دفاع کیا اور یورپی مصنفوں نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ان کے مدلل جواب دیئے۔ نامق کمال نے عثمانی ترکوں کی قیادت میں ایک بین الاقوامی اسلامی اتحاد کا تصور بھی پیش کیا جو جمال الدین افغانی کے اتحاد اسلام کے تصور سے قریب تر تھا۔ مشہور ترک مصنفہ خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ ''نامق کمال جدید ترکی کی محبوب ترین شخصیت تھے۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی۔''

نامق کمال ایک بے باک صحافی بھی تھے۔ انہوں نے تصویر افکار، حریت اور عبرت کی ادارت کی جو ترکی صحافت کی تاریخ میں بہت ممتاز اخبار ہیں۔ مضامین اور علمی و تنقیدی کتابوں کے علاوہ نامق کمال نے ڈراموں اور ناولوں کے ذریعے آزادی اور حب الوطنی کا جذبہ عام کیا۔ ان کے ڈراموں میں ''وطن'' بہت مشہور ہے۔ ان کے ایک اور ڈرامے ''جلال الدین خوارزم شاہ'' کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

عبدالحق حامد جدید ترکی نظم کے بانی ہیں۔ وہ بہت باکمال شاعر تھے انہوں نے نظم و نثر میں کئی ڈرامے لکھے جو بڑے فکر انگیز ہیں۔ خالدہ ادیب نے لکھا ہے کہ اگر ان کی تصانیف کا مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو جائے تو عبدالحق حامد کو بین الاقوامی شخصیت تسلیم کر لیا جائے گا۔ ان کا ڈرامہ ''طارق'' ان کے اسلامی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔

انیسویں صدی کی ایک اور اہم علمی شخصیت جودت پاشا (۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۵ء) کی ہے۔ ان کو ترکی کے کلاسیکی دور کے پانچ سب سے بڑے مورخوں کے سلسلے کی آخری کڑی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف میں ''تاریخ جودت (بارہ جلدیں) اور قصص انبیا و تواریخ الخلفا (بارہ

جلدیں)'' بہت مشہور ہیں۔ سلطان عبدالعزیز کے زمانے میں عثمانی خلافت کے قوانین کو اسلام کے مطابق مرتب کرنے کے لیے ''مجلہ'' کے نام سے ایک کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ جودت پاشا اس کے صدر تھے۔ اس کمیشن نے مجلہ کے نام سے قوانین کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔

اس دور کے ناول نویسوں میں احمد مدحت (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۲ء) نے کثرت تصانیف کی وجہ سے نام پیدا کیا۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا لیکن سب سے زیادہ ناولیں لکھیں۔ ان کی ڈیڑھ سو تصانیف میں سے ایک سو ناول ہیں۔ احمد مدحت کو ہم ترکی کا شرر کہہ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی میں ترکی میں جو ناولیں لکھی گئیں۔ وہ فنی لحاظ سے کمزور ہوتی تھیں لیکن ان میں اسلامی روایات کا احترام پایا جاتا ہے لیکن بیسویں صدی میں ترکی ناول اور افسانہ بالکل مغربی اثر کے تحت آ گیا اور بعض ناول نگاروں نے اسلامی اور مشرقی روایات کی کھل کر مخالفت کی۔ سمیع پاشا زادہ شزائی (۱۸۶۰ء تا ۱۹۳۶ء) اس طرز کی جدید ناول نویسی کے باوا آدم ہیں اور مکمل ترین نمونہ خالد ضیا اُشاکلی گل (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۵ء) ہیں۔ ان جدید طرز کے ناول نگاروں میں حسین رحمی گور پنار (۱۸۶۴ء تا ۱۹۴۴ء) استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں اسلامی روایات کا احترام پایا جاتا ہے۔ وہ نہایت چابکدست طنز نگار اور مزاح نگار تھے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔

سعید حلیم پاشا

بیسویں صدی میں مغرب اور مشرق یا اسلام اور غیر اسلامی افکار کی کشمکش عروج پر پہنچ گئی۔ اس کا اثر اس زمانے کے ادب پر بھی پڑا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے قیام جمہوریت تک کے زمانے میں اسلامی عناصر کی فکری رہنمائی سعید حلیم پاشا (۱۸۶۵ء تا ۱۹۲۲ء) نے کی۔ وہ محمد علی والئ مصر کے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے شہزادہ سعید حلیم کہلاتے تھے۔ وہ مجلس اتحاد ترقی کے سکرٹری تھے اور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک خلافت عثمانیہ کے وزیر اعظم بھی رہے۔ انہوں نے ترکوں کی سیاست سے متعلق جو مضامین لکھے وہ تقریباً سب ایک کتاب بحران لر امیز (ہمارے بحران) میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایک مضمون جو اس کتاب میں شامل نہیں اس کا اردو ترجمہ ''اللہ کی بادشاہت اور اسلامی حکومت کی عملی تشکیل'' کے نام سے اردو میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا

ہے۔سعید حلیم پاشا کا نقطۂ نظر مختصراً یہ تھا۔

''اسلام مذاہب عالم کی سب سے اعلیٰ اور سب سے مکمل صورت ہے اور وہ ایک جامع ترین تہذیب اور تمدن ہے۔جس طرح اسلام سے ہٹ کر ابدی نجات ممکن نہیں اسی طرح تمدنی نجات بھی نہیں ہوسکتی۔شریعت کی فرمانروائی کا قانون بنا کر اسلام نے انسان کی سچی مساوات اور آزادی کی بنیاد قائم کردی۔شریعت خدائی دستور العمل ہے جو سراسر طبیعی قوانین پر مشتمل ہے''(۱)

اس دور کے دوسرے اسلام پسند مصنفوں میں اسمٰعیل حقی ازمیرلی (۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۶ء) محمد طاہر برصالی (۱۸۶۱ء تا ۱۹۲۶ء) اور محمد عاکف (۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۶ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔اسمٰعیل حقی نے دینی اور فلسفیانہ موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں اور محمد طاہر سوانح عمریوں کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تین جلدوں پر مشتمل عثمانلی موئفلری (عثمانی مؤلف) سب سے اہم ہے اور عثمانی ترکی ادب کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔محمد عاکف ترکی زبان کے سب سے بڑے اسلام پسند شاعر تھے اور انہوں نے اپنی نظموں سے وہی کام لیا جو اردو اور فارسی میں اقبال نے اپنی شاعری سے لیا۔ہم ان کو ترکی کا اقبال کہہ سکتے ہیں۔یہ تمام اسلام پسند اہل قلم ترکی کے مشہور صحافی اشرف ادیب متوفی ۱۹۷۱ء کے ہفت روزہ ''سبیل الرشاد'' میں مضامین لکھتے تھے جو اسلام پسندوں کا سب سے بڑا ترجمان تھا اور ترکی کے باہر والگا اور کاشغر تک ترکی بولنے والے تمام ملکوں میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔اس کی ترکی میں وہی حیثیت تھی جو اسلامی ہند میں مولانا ابوالکلام کے ہفت روزہ ''الہلال'' کی تھی۔

ضیا گوک الپ

مغرب پرستوں کے سب سے بڑے ترجمان جلال نوری اسیدی (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) اور ضیا گوک الپ (۱۸۷۵ء تا ۱۹۲۴ء) تھے۔ان دونوں نے اپنے اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ان میں ضیا گوک الپ کی ''ترک قومیت کی اساس'' بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ضیا گوک الپ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ''مذہب کو عقیدے اور عبادت

(۱) سعید حلیم پاشا: اسلامی حکومت کی عملی تشکیل (شرکت علمی لمیٹڈ، لاہور ۱۹۴۹ء)۔سعید حلیم پاشا نے کتابیں نہیں لکھیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ان کی مشہور ترین تحریر ''اسلام شمق'' بھی ایک مقالہ ہے، کتاب نہیں ہے اور دوسرے مضامین کے ساتھ ''بحران لرامیز'' میں شامل ہے۔

تک محدود رکھنا چاہیے اور سیاست کو مذہب کے اثر سے آزاد ہونا چاہیے'' ضیا گوک الپ ترک قوم پرستی کے بہت بڑے علمبردار تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ترکی بولنے والی تمام قوموں کے درمیان قریبی تعلق قائم ہو۔ ضیا گوک الپ کو جدید ترکی کا فکری معمار کہا جاتا ہے، لیکن جمہوریت کے قیام کے فوراً بعد ترکی میں جو اصلاحات کی گئیں وہ سب ضیا گوک الپ کے خیالات کے مطابق نہیں تھیں۔ وہ خلافت کے حامی تھے، ترکی زبان سے عربی اور فارسی الفاظ نکالنے کے حق میں نہیں تھے اور اگرچہ وہ سیکولرازم کے حامی تھے لیکن مذہب دشمن نہیں تھے اور مسلمان طلبہ کے لیے دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔

[قیام جمہوریت کے بعد سے موجودہ زمانہ تک ترکی کی تاریخ، معاشی اور سماجی حالات اور نظریاتی کشمکش کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

سلاطین عثمانیہ

عہد زوال

(۱۶۹۹ء تا ۱۹۲۲ء)

(۱) مصطفیٰ دوم	۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء تا ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء
(۲) احمد سوم	۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء
(۳) محمود اول	۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء
(۴) عثمان سوم	۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء
(۵) مصطفیٰ سوم	۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء تا ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء
(۶) عبدالحمید اول	۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء تا ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء
(۷) سلیم سوم	۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء تا ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء
(۸) مصطفیٰ چہارم	۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء تا ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء

(۹) محمود دوم	۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء تا ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء
(۱۰) عبدالمجید خاں	۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء تا ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء
(۱۱) عبدالعزیز	۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء تا ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء
(۱۲) عبدالحمید خاں دوم	۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء
(۱۳) محمد پنجم	۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء
(۱۴) محمد ششم	۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء

خانان کریمیا

(۱۴۴۰ء/۸۴۴ھ تا ۱۷۸۳ء/۱۱۹۷ھ)

(۱) حاجی گرائی خان	۱۴۴۰ء/۸۴۴ھ تا ۱۴۶۶ء/۸۷۱ھ
(۲) نور دولت خان	۱۴۶۶ء/۸۷۱ھ تا ۱۴۶۹ء/۸۷۳ھ
(۳) منگلی گرائی خان اول	۱۴۶۹ء/۸۷۳ھ تا ۱۴۷۴ء/۸۷۸ھ
(۴) نور دولت خان (دوبارہ)	۱۴۷۴ء/۸۷۸ھ تا ۱۴۷۷ء/۸۸۲ھ
(۵) جان بک (آلتن اوردہ کا امیر)	۱۴۷۷ء/۸۸۲ھ تا ۱۴۷۸ء/۸۸۳ھ
(۶) منگلی گرائی (دوبارہ)	۱۴۷۸ء/۸۸۳ھ تا ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ
(۷) محمد گرائی خان اول	۱۵۱۵ء/۹۲۱ھ تا ۱۵۲۳ء/۹۲۹ھ
(۸) غازی گرائی خان اول	۱۵۲۳ء/۹۲۹ھ تا ۱۵۲۳ء/۹۲۹ھ
(۹) سعادت گرائی خان اول	۱۵۲۳ء/۹۲۹ھ تا ۱۵۳۲ء/۹۳۹ھ
(۱۰) اسلام گرائی خان اول	۱۵۳۲ء/۹۳۸ھ تا ۱۵۳۲ء/۹۳۸ھ
(۱۱) صاحب گرائی خان اول	۱۵۳۲ء/۹۳۸ھ تا ۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ
(۱۲) دولت گرائی خان اول	۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ تا ۱۵۷۷ء/۹۸۵ھ
(۱۳) محمد گرائی خاں دوم	۱۵۷۷ء/۹۸۵ھ تا ۱۵۸۴ء/۹۹۲ھ
(۱۴) اسلام گرائی خاں دوم	۱۵۸۴ء/۹۹۲ھ تا ۱۵۸۸ء/۹۹۶ھ

(۱۵) غازی گرائی خاں دوم (بورا)	۱۵۸۸ء/۹۹۶ھ تا ۱۵۹۴ء/۱۰۰۲ھ
(۱۶) فتح گرائی خاں	۱۵۹۴ء/۱۰۰۲ھ تا ۱۵۹۴ء/۱۰۰۲ھ
(۱۷) غازی گرائی خاں دوم (دوبارہ)	۱۵۹۴ء/۱۰۰۲ھ تا ۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ
(۱۸) توقتمش گرائی خاں	۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ تا ۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ
(۱۹) سلامت گرائی خاں اول	۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ تا ۱۶۱۰ء/۱۰۱۹ھ
(۲۰) جان بک گرائی خان	۱۶۱۰ء/۱۰۱۹ھ تا ۱۶۲۲ء/۱۰۳۱ھ
(۲۱) محمد گرائی خان سوم	۱۶۲۲ء/۱۰۳۱ھ تا ۱۶۲۷ء/۱۰۳۶ھ
(۲۲) جان بک گرائی خاں (دوبارہ)	۱۶۲۷ء/۱۰۳۶ھ تا ۱۶۳۸ء/۱۰۴۵ھ
(۲۳) عنایت گرائی خان	۱۶۳۵ء/۱۰۴۵ھ تا ۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ
(۲۴) بہادر گرائی خان اول	۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ تا ۱۶۴۲ء/۱۰۵۲ھ
(۲۵) محمد گرائی خاں چہارم	۱۶۴۲ء/۱۰۵۲ھ تا ۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ
(۲۶) اسلام گرائی خان سوم	۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ تا ۱۶۵۴ء/۱۰۶۴ھ
(۲۷) محمد گرائی خان چہارم (دوبارہ)	۱۶۵۴ء/۱۰۶۴ھ تا ۱۶۶۵ء/۱۰۷۵ھ
(۲۸) عادل گرائی خاں	۱۶۶۵ء/۱۰۷۵ھ تا ۱۶۷۰ء/۱۰۸۱ھ
(۲۹) الحاج سلیم گرائی خاں اول	۱۶۷۰ء/۱۰۸۱ھ تا ۱۶۷۷ء/۱۰۸۸ھ
(۳۰) مراد گرائی	۱۶۷۷ء/۱۰۸۸ھ تا ۱۶۸۳ء/۱۰۹۴ھ
(۳۱) حاجی گرائی خاں دوم	۱۶۸۲ء/۱۰۹۴ھ تا ۱۶۸۴ء/۱۰۹۵ھ
(۳۲) سلیم گرائی خاں اول (دوسری بار)	۱۶۸۴ء/۱۰۹۵ھ تا ۱۶۹۱ء/۱۱۰۲ھ
(۳۳) سعادت گرائی خاں دوم	۱۶۹۱ء/۱۱۰۲ھ تا ۱۶۹۱ء/۱۱۰۲ھ
(۳۴) صفا گرائی خاں	۱۶۹۱ء/۱۱۰۲ھ تا ۱۶۹۲ء/۱۱۰۳ھ
(۳۵) سلیم گرائی خاں اول (تیسری بار)	۱۶۹۲ء/۱۱۰۳ھ تا ۱۶۹۸ء/۱۱۰۹ھ
(۳۶) دولت گرائی خاں دوم	۱۶۹۸ء/۱۱۰۹ھ تا ۱۷۰۲ء/۱۱۱۴ھ

(۳۷)سلیم گرائی خاں اول (چوتھی بار) ۱۷۰۲ء/۱۱۱۴ھ تا ۱۷۰۴ء/۱۱۱۶ھ

(۳۸)غازی گرائی سوم ۱۷۰۴ء/۱۱۱۶ھ تا ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ

(۳۹) کپلان گرائی خان اوّل ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ تا ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ

(۴۰)دولت گرائی خاں دوم (دوسری بار) ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ تا ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ

(۴۱) کپلان گرائی خان اول (دوسری بار) ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ تا ۱۷۱۶ء/۱۱۲۸ھ

(۴۲)قرہ دولت گرائی خان ۱۷۱۶ء/۱۱۲۸ھ تا ۱۷۱۷ء/۱۱۲۹ھ

(۴۳)سعادت گرائی خاں سوم ۱۷۱۷ء/۱۱۲۹ھ تا ۱۷۲۴ء/۱۱۳۶ھ

(۴۴)منگلی گرائی خاں دوم ۱۷۲۴ء/۱۱۳۶ھ تا ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ

(۴۵) کپلان گرائی خاں اول (تیسری بار) ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ تا ۱۷۳۶ء/۱۱۴۳ھ

(۴۶)فتح گرائی خاں دوم ۱۷۳۶ء/۱۱۴۹ھ تا ۱۷۳۷ء/۱۱۵۰ھ

(۴۷)منگلی گرائی خاں دوم (دوسری بار) ۱۷۳۷ء/۱۱۵۰ھ تا ۱۷۳۹ء/۱۱۵۲ھ

(۴۸)سلامت گرائی خاں دوم ۱۷۳۹ء/۱۱۵۲ھ تا ۱۷۴۳ء/۱۱۵۶ھ

(۴۹)سلیم گرائی خاں دوم ۱۷۴۳ء/۱۱۵۶ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ

(۵۰)ارسلان گرائی خان ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ تا ۱۷۵۶ء/۱۱۶۹ھ

(۵۱)حلیم گرائی خاں ۱۷۵۶ء/۱۱۶۹ھ تا ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ

(۵۲)قرم گرائی خاں ۱۷۶۴ء/۱۱۷۲ھ تا ۱۷۶۷ء/۱۱۷۸ھ

(۵۳)سلیم گرائی خاں سوم ۱۷۶۴ء/۱۱۷۸ھ تا ۱۷۶۷ء/۱۱۸۰ھ

(۵۴)ارسلان گرائی خاں (دوسری بار) ۱۷۶۷ء/۱۱۸۰ھ تا ۱۷۶۸ء/۱۱۸۱ھ

(۵۵)مقصود گرائی خان ۱۷۶۸ء/۱۱۸۱ھ تا ۱۷۶۸ء/۱۱۸۱ھ

(۵۶)قرم گرائی خاں (دوسری بار) ۱۷۶۸ء/۱۱۸۱ھ تا ۱۷۶۹ء/۱۱۸۲ھ

(۵۷)دولت گرائی خاں سوم ۱۷۶۹ء/۱۱۸۲ھ تا ۱۷۷۰ء/۱۱۸۳ھ

(۵۸) کپلان گرائی خان دوم ۱۷۷۰ء/۱۱۸۳ھ تا ۱۷۷۰ء/۱۱۸۴ھ

(۵۹)سلیم گرائی خان سوم (دوسری بار) ۱۷۷۰ء/۱۱۸۴ھ تا ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ

(۶۰)مقصود گرائی خاں (دوسری بار) ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ تا ۱۷۷۲ء/۱۱۸۵ھ

(٦١) صاحب گرائی خاں دوم ١٧٧٢ء/١١٨٩ھ تا ١٧٧٥ء/١١٩١ھ

(٦٢) دولت گرائی خاں سوم ١٧٧٥ء/١١٨٩ھ تا ١٧٧٧ء/١١٩١ھ

(٦٣) شاہین گرائی خاں ١٧٧٧ء/١١٩١ھ تا ١٧٨٢ء/١١٩٦ھ

(٦٤) بہادر گرائی خاں دوم ١٧٨٢ء/١١٩٦ھ تا ١٧٨٣ء/١١٩٧ھ

(٦٥) شاہین گرائی خاں (دوسری بار) ١٧٨٣ء/١١٩٧ھ تا ـــــ

اہم واقعات

١٧١٥ء ترکی اور وینس کی جنگ۔

١٧١٦ء ترکی اور آسٹریا کی جنگ۔

١٧١٧ء بلغراد ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

١٧١٨ء۔ ١١٣٠ھ ٢٢۔شعبان ٢١۔جولائی معاہدۂ پساروویچ، بلغراد، ولاچیا اور سرویا پر آسٹریا کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔

١٧٢٧ء ترکی میں پہلے چھاپہ خانہ کا قیام۔

١٧٣٦ء ترکی سے روس اور آسٹریا کی جنگ کا آغاز۔

١٧٣٩ء صلحنامہ بلغراد، ترکوں کو بوسینیا، سرویا اور ولاچیا واپس مل گئے۔روس ازوف سے دست بردار ہوگیا۔

١٧٦٨ء ترکی اور روس کی جنگ۔

١٧٧٠ء چشمہ (اناطولیہ) کے مقام پر روس نے ترکی بیڑے کو تباہ کردیا۔

١٧٧٤ء معاہدہ کوچک کینارجی۔

١٧٨٣ء کریمیا پر روس کا قبضہ۔

١٧٨٧ء ترکی سے روس اور آسٹریا کی جنگ۔

١٢١٣ھ/١٧٩٨ء مصر پر نپولین کا قبضہ۔

١٨٠٢ء مصر سے فرانسیسیوں کی واپسی۔

١٢٢١ھ/١٨٠٦ء روس سے ترکی کی جنگ۔سرویا آزاد ہوگیا۔

۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء روس سے ترکی کی جنگ۔ سرویا آزاد ہو گیا۔

۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء ۲۸۔ مئی صلحنامہ بخارسٹ۔ ولاچیا اور دریائے پرتھ کے مغرب میں مولڈ اویا کا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا۔

۱۸۲۱ء موریا میں ترکوں کا قتل عام۔

۱۸۲۵ء ۱۵۔ جون ینی چری فوج کا خاتمہ۔

۱۸۲۷ء مصر کے والی محمد علی کی مدد سے یونان کی بغاوت کا خاتمہ ۲۰۔ اکتوبر کو نوارینو (موریا) میں متحدہ یورپی بیڑہ نے عثمانی اور مصری بیڑے کو تباہ کر دیا۔

۱۸۲۸ء ترکی اور روس کی جنگ کا آغاز۔

۱۸۲۹ء ۲۰۔ اگست کو ادرنہ پر روسی قبضہ۔ صلحنامہ ادرنہ کی رو سے روس بیشتر فتوحات سے دست بردار ہو گیا۔

۱۸۳۰ء (جولائی) الجزائر پر فرانس کا قبضہ۔

۱۸۳۱ء محمد علی پاشا والی مصر کی بغاوت۔

۱۸۳۳ء (۸۔ اپریل) معاہدۂ کوتاہیہ۔ محمد علی کو فلسطین اور شام کا والی بنا دیا گیا۔

۱۸۳۹ء (۳۔ نومبر) تنظیمات کا اعلان۔ غلاموں کی تجارت کا خاتمہ۔

۱۸۵۳ء ترکی اور روس کی جنگ۔

۱۸۵۴ء جنگ کریمیا۔ انگریزوں نے ترکی کے حلیف کی حیثیت سے روس سے جنگ کی۔

۱۸۵۶ء ۲۳۔ رجب ۳۰۔ مارچ صلحنامہ پیرس۔ فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے۔

۱۸۶۷ء سرویا آزاد۔

۱۸۷۶ء (۲۳۔ دسمبر) دستور اساسی کا اعلان۔

۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء ترکی اور روس میں جنگ کا آغاز۔

۱۸۷۷ء (۲۰۔ مارچ) پہلی عثمانی پارلیمنٹ کا قیام۔

۱۸۷۸ء (فروری) سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ توڑ دی۔ ۱۲۔ جولائی معاہدہ برلن۔ یونان، رومانیا، سرویا، مونٹی نگرو اور بلغاریہ کی حیثیت عثمانی صوبوں کی بجائے خودمختار حکومتوں کی ہو گئی، جن کا تعلق باب عالی سے صرف خراج کی حد تک تھا۔ قبرص پر برطانوی قبضہ۔

۱۸۸۱ء تونس پر فرانس کا قبضہ۔

۱۸۸۹ء (۲۱۔مئی) انجمن اتحاد وترقی کا قیام۔

۱۸۹۰ء قیصر جرمنی کا دورہ ترکی۔

۱۸۹۷ء ترکی اور روس میں جنگ۔

۱۸۹۸ء قیصر جرمنی کا ترکی کا دوسرا دورہ۔

۱۹۰۸ء انجمن اتحاد محمدی کا قیام (۵۔اپریل)

۱۳۔اپریل کو استنبول میں فوجی دستوں کی بغاوت جسے ترکی تاریخ (۳۱۔مارچ کا واقعہ کہا جاتا ہے۔ ۲۷۔اپریل کو سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا گیا۔

۱۹۱۱ء جنگ طرابلس۔

۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء جنگ بلقان۔ ۱۰۔جولائی ۱۹۱۳ء کو ادرنہ ترکوں نے واپس لے لیا۔

۱۹۱۴ء جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت (۳۰۔اکتوبر)

۱۹۱۸ء جنگ عظیم کا خاتمہ۔ ۳۰۔اکتوبر معاہدہ متارکہ جنگ۔

۱۹۱۹ء ۱۵۔مئی کو یونانی فوجوں کا ازمیر (سمرنا) میں داخلہ۔

۱۹۱۹ء ۱۸۔دسمبر کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری انتخاب۔

۱۹۲۰ء ۱۶۔مارچ کو اتحادی فوج کا استنبول میں داخلہ۔ ۱۸۔مارچ کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری اجلاس۔ ۱۱۔اپریل کو سلطان نے پارلیمنٹ توڑ دی۔ ۲۳۔اپریل کو انقرہ میں مجلس کبیر ملی کا اجلاس۔ ۱۰۔اگست کو معاہدہ سیورے پر دستخط۔

۱۹۲۱ء (۱۲۔مارچ) مجلس کبیر ملی نے ترکی کا قومی ترانہ منظور کیا جو محمد عاکف کا لکھا ہوا تھا۔

۱۹۲۲ء ۳۰۔اگست کو اتاترک نے یونانیوں کو فیصلہ کن شکست دی اور ۹۔ستمبر تک پورا اناطولیہ حملہ آوروں سے خالی کرالیا۔ یکم نومبر کو مجلس کبیر ملی نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۷۔نومبر کو جب سلطان وحیدالدین برطانوی جہاز میں فرار ہو گئے تو مجلس کبیر ملی نے عبدالمجید کو خلیفہ منتخب کیا۔

۱۹۲۳ء ۲۹۔اکتوبر کو ترکی میں قیام جمہوریت کا اعلان۔

۱۹۲۴ء ۳۔مارچ کو مجلس کبیر ملی نے خلافت کا نظام ختم کر دیا۔

۳۴

شمالی افریقہ عثمانی ترکوں کے زوال کے بعد

(۱) الجزائر

مصر سے لے کر الجزائر تک سارا شمالی افریقہ سولہویں صدی میں عثمانی سلطنت کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ صرف مراکش ایک ایسا ملک تھا جس پر عثمانی ترکوں کا اقتدار قائم نہ ہوسکا، اگرچہ وہاں کی انتظامی، فوجی اور ثقافتی زندگی پر ترکوں کے گہرے اثرات پڑے۔ شمالی افریقہ کے ان ملکوں میں سب سے پہلے الجزائر ترکوں کے ہاتھ سے نکلا اور سب سے آخر میں لیبیا نکلا۔

الجزائر پر ترکوں کا قبضہ ۱۵۵۳ء سے ۱۸۳۰ء تک رہا۔ الجزائر نے اپنی موجودہ شکل اسی زمانے میں اختیار کی اور شہر الجزائر کے نام پر پورے ملک کا نام الجزائر پڑا۔ یہاں جو ترک گورنر مقرر کیے جاتے تھے وہ پہلے بے کہلاتے تھے، پھر ان کو داعی یا دے کہا جانے لگا۔ یہ گورنر رفتہ رفتہ باب عالی کے اثر سے آزاد ہوتے گئے اور سترہویں صدی میں عملاً خودمختار ہو گئے۔ لیکن الجزائر کے یہ تمام حکمران عثمانی سلطنت کی بالادستی کو تسلیم کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب شمالی افریقہ کے تین ملکوں تونس، الجزائر اور مراکش کے ساحلی علاقوں میں ان بحری مہم بازوں کو عروج حاصل ہوا جن کو یورپ کی تاریخوں میں ساحل بربر کے بحری قزاق لکھا جاتا ہے۔ الجزائر ان سمندری مہم بازوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسہ شروع میں ایک بحری قزاق ہی تھا اور وہی ترکوں کے تحت الجزائر کی پہلی حکومت کا بانی تھا۔

بحری قزاقوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے یورپ کی حکومتیں ان سے خوفزدہ رہتی تھیں کیونکہ ان کے تجارتی جہاز ان قزاقوں کے حملوں کا نشانہ بنتے رہتے تھے، لیکن عثمانی ترکوں کا علاقہ ہونے کی وجہ سے یورپی حکومتیں مداخلت کی جرأت نہیں کرسکتی تھیں۔ انیسویں صدی میں جب محمود ثانی کے دور میں عثمانی سلطنت اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی تو فرانس کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ ہوا یہ کہ اپریل ۱۸۲۷ء میں فرانس کو گیہوں کی فراہمی کے مسئلہ پر الجزائر اور

فرانس میں اختلاف ہو گیا۔ مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی کہ الجزائر کے حکمران داعی حسین نے فرانسیسی قونصل کو ایک چھڑی ماردی۔ بس فرانس نے اس کو بہانہ بنا کر الجزائر کے خلاف کارروائی شروع کردی۔ فرانسیسی بیڑے نے تین سال تک بندرگاہ الجزائر کی ناکہ بندی جاری رکھی اور جب ناکہ بندی سے فرانس اپنا مقصد حاصل نہ کرسکا تو ۱۴۔ جون ۱۸۳۰ء کو فرانس نے ۳۷ ہزار فوج الجزائر کے ساحل پر اتاردی اور ۵۔ جولائی کو شہر الجزائر پر قبضہ کرلیا۔ اگلے چند سالوں میں دہران (oran) بجایہ، بونا اور دوسرے ساحلی شہر بھی فرانس کے قبضے میں آ گئے اور فرانسیسی اقتدار اندرون ملک میں بھی پھیل گیا۔

عبدالقادر الجزائری

الجزائر کو فرانس کے تسلط سے بچانے کے لیے جس رہنما نے نمایاں اور قابل قدر کوشش کی اور تحریک آزادی کو عوامی مزاحمت بنادیا، وہ عبدالقادر الجزائری ہیں۔ عبدالقادر ۱۸۰۸ء میں ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد وہ اکیس سال کی عمر میں حج کرنے مکہ معظمہ گئے۔ اس سفر کے دوران ان کو بغداد، دمشق اور قاہرہ میں قیام کرنے اور علماء سے ملنے کا موقع بھی ملا۔ محمد علی پاشا والیٔ مصر اپنے ملک کو ترقی دینے کی جو کوششیں کر رہا تھا عبدالقادر اس سے بہت متاثر[1] ہوئے۔ وہ اپنے سفر سے اس سال واپس الجزائر آئے جس سال فرانس الجزائر پر قابض ہوا تھا۔ نئی صورت حال نے عبدالقادر کو بے چین کردیا اور انہوں نے فرانس سے جنگ کرنے کا عزم کرلیا۔

اس زمانے میں اندرون ملک مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جو آپس میں لڑتی

---

(۱) اس جگہ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اسی زمانے میں سنوسی قاہرہ سے بددل ہو کر گئے تھے۔ انہوں نے محمد علی کی غیر اسلامی اصلاحات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا، لیکن عبدالقادر الجزائری نے سنوسی کے برخلاف محمد علی کی اصلاحات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، حالانکہ عبدالقادر خود بھی اسلامی فکر کے علمبردار تھے۔ غالباً دونوں کے نقطۂ نظر کا یہ فرق شخصی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ سنوسی کی زندگی میں زہد اور تشقف غالب تھا، جب کہ عبدالقادر کی زندگی میں سیاسی سوجھ بوجھ کا غلبہ تھا۔ عبدالقادر خود بھی غیر اسلامی رجحانات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن محمد علی کی اصلاحات کے تمام پہلو غیر اسلامی نہیں تھے۔ اس کی یہ کوشش کہ مصر ایک جدید ملک بن جائے ایک قابل قدر کوشش تھی۔ جدید دور کے ایک مصلح کی حیثیت سے عبدالقادر کو اس کی اصلاحات کا یہ پہلو پسند تھا، لیکن وہ ان اصلاحات کو اسلامی رنگ دینا چاہتے تھے، جبکہ سنوسی وقت کے ان تقاضوں کو سمجھ نہیں سکے تھے اور انہوں نے اپنے اصلاحی کام کو محض اخلاقی حدود تک محدود رکھا۔

رہتی تھیں اور اس قابل نہیں تھیں کہ متحد ہو کر فرانس کا مقابلہ کر سکیں۔ عبدالقادر نے مختلف قبائل کے اختلافات ختم کیے اور ان کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر فرانس کا مقابلہ کریں۔ ان قبائل نے ۲۲۔ نومبر ۱۸۳۲ء کو عبدالقادر کو جن کی عمر صرف ۲۵ سال تھی اپنا امیر مقرر کر لیا۔ الجزائری مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے بعد امیر عبدالقادر نے قصبہ مسکرہ کی مسجد میں فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے جلد ہی مغربی الجزائر کے قبائل کو اپنے جھنڈے کے تحت متحدہ کر دیا اور فرانسیسی فوجوں کو کئی شکستیں دیں یہاں تک کہ فروری ۱۸۳۴ء میں فرانس عبدالقادر کو مغربی الجزائر کا امیر تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن اگلے سال فرانس سے پھر تصادم شروع ہو گئے اور جنگوں کا یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ اور ۱۸۳۹ء تک امیر عبدالقادر الجزائر کے ایک تہائی حصے پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی مشکلات بڑھ گئیں اور فرانسیسی فوجوں کی کثرت اور جدید اسلحہ کی وجہ سے عبدالقادر ۲۱۔ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

امیر عبدالقادر نے جو نظام حکومت قائم کیا تھا اس میں آزاد علاقے دارالاسلام کہلاتے تھے اور فرانسیسی علاقے دارالکفر، اور مسلمانوں کے لیے دارالکفر سے دارالاسلام میں آنا واجب تھا۔ امیر عبدالقادر نے اپنے لیے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا تھا اور مشورے کے لیے ایک مجلس شوریٰ بنائی تھی جو گیارہ علماء پر مشتمل تھی۔ نظام حکومت مختلف امور کے وزیروں کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ ریاست مختلف انتظامی حصوں میں تقسیم تھی اور ہر حصے میں ایک قاضی ہوتا تھا جو امور مملکت کی شرعی اصولوں سے مطابقت پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ مشکل کے وقت علمائے فاس یا جامعہ ازہر کے مالکی شیخ سے فتویٰ منگایا جاتا تھا۔ امیر عبدالقادر نے فوج کی جدید طرز پر تنظیم کی تھی اور اس سلسلے میں یوروپی ملکوں سے امداد بھی لی۔ بعض صورتوں میں امیر عبدالقادر کی فوج مراکش کی فوج سے بہتر تھی۔ امیر عبدالقادر نے اپنی ریاست میں اسلحہ سازی اور بندوق سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ الجزائر میں امیر عبدالقادر کی یہ ریاست بالاکوٹ میں سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے ایک سال بعد قائم ہوئی تھی۔ دونوں کی قائم کردہ ریاستوں میں بہت مماثلت تھی، لیکن ایک بڑا فرق یہ تھا کہ امیر عبدالقادر جدید دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو تحریک مجاہدین کے رہنماؤں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ شاید یورپ سے نزدیکی اور محمد علی کے مصر سے تعلق اس کی بڑی وجہ ہو۔

الجزائر کی تاریخ میں عقبہ بن نافع اور خیرالدین باربروسہ کے علاوہ کسی اور شخص کو وہ شہرت،

عظمت اور نیک نامی حاصل نہیں ہوئی جو عبدالقادر الجزائری کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے آدمیوں اور وسائل کی کمی کے باوجود جس بے جگری سے فرانسیسی حملہ آوروں کا پندرہ سال تک مقابلہ کیا، اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ مورخین نے ان کی انتظامی صلاحیت اور تدبّر کی بڑی تعریف کی ہے اور وہ اسلامی تاریخ کی ان ہستیوں میں سے ہیں جن کی ان کے مخالفین نے بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

چند سال نظر بند رکھنے کے بعد فرانسیسیوں نے امیر عبدالقادر کو رہا کر دیا۔ وہ شروع میں بروصہ (ترکی) گئے اور پھر دمشق میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ یہاں سلطان عبدالمجید کے دور میں ۱۸۶۰ء میں جب دروزیوں نے عیسائی آبادی کا قتل عام کیا تو امیر عبدالقادر نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ہزاروں عیسائیوں کی جانیں بچائیں اور اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے سارے یورپ سے خراج تحسین وصول کیا۔ امیر عبدالقادر کا دمشق میں ۲۶۔ مئی ۱۸۸۳ء میں انتقال ہوا۔

امیر عبدالقادر کی شکست کے بعد الجزائر میں فرانس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں رہا اور ایک سال کے اندر اندر پورے الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہو گیا اور الجزائر کو فرانس کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔

(۲) تونس

تونس ۱۵۷۴ء سے ۱۸۸۱ء تک سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ رہا۔ الجزائر کی طرح یہاں بھی شروع میں استنبول سے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے، لیکن ۱۵۹۰ء سے ینی چری فوجی خود اپنے گورنر مقرر کرنے لگے جو الجزائر کی طرح داعی کہلاتے تھے۔ باب عالی کی بالادستی بھی برائے نام رہ گئی اور ۱۶۴۰ء سے ۱۷۰۵ء تک مراد بے اور اس کی اولاد آزادانہ حکومت کرتی رہی۔ یہ نئے حکمران داعی کی بجائے بے یا بائے کہلاتے تھے۔ ۱۷۰۵ء میں حسین بے نے ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد رکھی جو ۱۹۵۷ء میں تونس کے جمہوریہ بننے تک پہلے آزاد حکمران کی حیثیت سے اور پھر فرانس کے زیر سیادت حکمران خاندان کی حیثیت سے برسر اقتدار رہا۔

انیسویں صدی میں حسین بے کے خاندان میں کئی بے دار مغز حکمران پیدا ہوئے۔ ان میں ایک احمد بے (۱۸۳۹ء تا ۱۸۵۵ء) تھا، جو سلطان عبدالمجید خاں کا ہمعصر تھا۔ انیسویں صدی

کے وسط میں تونس اور یورپ کے درمیان حجازی تعلقات شروع ہوئے اور ان کے ذریعے پہلی مرتبہ مغربی نظریات تونس میں پھیلنا شروع ہوئے۔ احمد بے نے یورپ کے مسیحی اداروں کو مدرسے قائم کرنے کی اجازت دی اور عثمانی بالادستی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدید طرز پر فوج منظم کی اور اس مقصد کے لیے انگریزی اور فرانسیسی مشیروں کی خدمات حاصل کیں۔ احمد بے نے تونس سے غلامی کا رواج بھی ختم کر دیا۔ اور جنگ کریمیا میں ترکوں کی مدد کے لیے چودہ ہزار فوج بھیجی تھی۔

احمد بے کے جانشین محمد بے (۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۹ء) نے جو ایک دیندار مسلمان تھا، ۹۔ستمبر ۱۸۵۷ء کو بنیادی حقوق سے متعلق ایک منشور جاری کیا۔ یہ غالباً ترکی تنظیمات کی صدائے بازگشت تھی، کیونکہ ترکی میں بنیادی حقوق اور تنظیمات سے متعلق پہلا فرمان ۱۸۳۹ء میں اور دوسرا ۱۸۵۶ء میں جاری ہوا تھا۔

محمد بے کے جانشین صادق بے (۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء) کا دور تونس کے اس خاندان کی تاریخ میں سب سے اہم ہے۔ اس دَور میں تونس کی حکومت نے مختلف تعمیری کاموں کے لیے بیرونی سرمایہ اس کثرت سے حاصل کیا کہ ملک یورپی ملکوں کا مقروض ہو گیا اور ان ملکوں کو تونس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ ۱۸۶۹ء میں تونس کے دیوالیہ ہو جانے پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے تونس کے مالی امور پر کنٹرول قائم کر دیا۔ ان مایوس کن حالات میں خیر الدین پاشا کا ظہور ہوا جو اسلامی دنیا کے عظیم رہنماؤں اور مصلحین میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

خیرالدین پاشا (۱۸۱۰ء تا ۱۸۸۹ء)

خیرالدین پاشا نسلاً سرکیشی چرکس ترک تھے۔ ان کو بچپن میں بردہ فروشوں نے غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا تھا۔ احمد بے نے استنبول کے ایک سفر میں ان کو خرید لیا اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی۔ محمد بے اور صادق بے کے زمانے میں خیرالدین پاشا نے اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ ۱۸۶۱ء میں صادق بے نے جو دستور نافذ کیا اور جسے ہم اسلامی دنیا کا پہلا جدید دستور کہہ سکتے ہیں اس کے تحت قائم ہونے والی مجلس مشاورت کا صدر خیرالدین پاشا کو مقرر کیا گیا، لیکن خیرالدین پاشا نے جب اہم سیاسی، انتظامی

اور سماجی اصلاحات نافذ کیں، تو رجعت پسند عناصر نے ان کی مخالفت کی اور ان کو اگلے سال صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں صادق بے نے خیر الدین پاشا کو وزیر اعظم بنا دیا اور وہ چار سال تک اس بلند عہدے پر فائز رہے۔

خیر الدین پاشا نے وزارت عظمیٰ اور اس سے قبل کے زمانے میں ایسی اصلاحات کیں جن سے ملک کی سیاسی اور مالی حالت مستحکم ہوگئی۔ ان کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ مجلس مشاورت یا اسٹیٹ کونسل کا قیام ہے۔ خیر الدین پاشا کا کہنا تھا کہ علم تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، لیکن علم کی توسیع صرف ایسے معاشرے میں ممکن ہے جس میں انصاف اور آزادی ہو۔ مگر انصاف اور آزادی کی ضمانت صرف نمائندہ ادارے دے سکتے ہیں۔ خیر الدین پاشا عوام کی نمائندہ حکومت کو مسلم ممالک کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت دیتے تھے اور انہوں نے اسی جذبے کے تحت نمائندہ حکومت کے قیام پر زور دیا اور اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مجلس شوریٰ یا اسٹیٹ کونسل قائم کی۔ فرانس اس زمانے میں الجزائر پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کے لیے الجزائر کے پڑوس میں ایک ترقی پذیر مملکت کا وجود سخت ناگوار تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب شہنشاہ فرانس نپولین سوم کے سامنے تونس کی اسٹیٹ کونسل کا مسودۂ قانون پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ "اگر عرب آزادی اور انصاف کے خوگر ہو گئے تو ہمیں ان کی طرف سے الجزائر میں سکون نصیب نہ ہوگا۔"

مجلس مشاورت کے علاوہ خیر الدین پاشا نے ایک کالج قائم کیا جس میں جدید علوم اور مغربی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ انہوں نے تونس کی جامعہ زیتونیہ میں جو جامع ازہر کے طرز کی درس گاہ تھی مفید اصلاحات کیں، تاکہ دینی تعلیم کا معیار بلند ہو سکے۔ خیر الدین پاشا عام لوگوں کی شکایات پر بہت توجہ دیتے تھے اور ان کی شکایات بذات خود سنتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تونس کے چوک میں ایک صندوق رکھ دیا تھا جس میں مظلوم اشخاص اپنی شکایتیں ڈال سکتے تھے۔ اس صندوق کی کنجی خود خیر الدین پاشا کے پاس رہتی تھی۔

خیر الدین پاشا نے اپنی وزارت کے آخری زمانے میں یورپی ملکوں، خصوصاً فرانس کے خطرناک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ سے اور زیادہ قریبی تعلق پیدا کرنا چاہا، لیکن خیر الدین پاشا کی اس پالیسی سے صادق بے کے دل میں شکوک پیدا ہوگئے کہ کہیں خیر الدین تونس کو پھر سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ کر دیں، چنانچہ صادق بے نے ان شکوک کی وجہ سے ان کو

۱۸۷۷ء میں وزارت عظمیٰ کے منصب سے علیحدہ کر دیا۔ خیرالدین پاشا اس کے بعد ترکی چلے گئے جہاں سلطان عبدالحمید خاں نے ان کو دسمبر ۱۸۷۸ء میں خلافت عثمانیہ کا وزیر اعظم مقرر کر دیا، لیکن سلطان کا ان سے نباہ نہ ہو سکا اور وہ ایک سال بعد وہاں بھی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے ہٹا دیئے گئے۔ انہوں نے باقی زندگی ترکی ہی میں گذاری اور ۱۸۸۹ء میں استنبول میں انتقال کیا۔

اقوم الممالک

خیرالدین پاشا ''اقوم الممالك فی معرفة احوال الممالك'' کے نام سے ایک کتاب کے مصنف بھی تھے۔ تونس کا وزیر اعظم بننے سے پہلے وہ ایک سرکاری کام سے فرانس بھیجے گئے تھے۔ اس موقع پر ان کو کئی سال یورپ میں رہ کر یورپی قوموں کو دیکھنے اور یورپ کے عروج و ترقی کے اسباب معلوم کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں ان ہی تاثرات کو اس طرح قلمبند کیا کہ اسلامی ممالک اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسلامی دنیا کو جدید دور میں داخل ہونے کے بعد جس نظریاتی کشمکش سے گزرنا پڑا، یہ کتاب اس کشمکش کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

اس کتاب میں خیرالدین پاشا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے اس لیے یورپ میں ہمیں جو چیز اچھی و مفید نظر آئے اسے قبول کر لینا چاہیے اور جو ناپسندیدہ ہو وہ رد کر دینا چاہیے۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک اور پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ مسلمانوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ دو ایسے گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک گروہ علمائے دین کا ہے جو شریعت سے واقف ہے لیکن دنیا سے ناواقف اور دوسرا گروہ سیاست دانوں کا ہے جو دنیا سے واقف ہے لیکن دین سے واقف نہیں اور چاہتا ہے کہ یورپ کا نظام پورا کا پورا دین کی طرف رجوع کیے بغیر مسلمانوں پر تھوپ دے۔ خیرالدین پاشا لکھتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں کا یہ فرق دور ہونا چاہیے۔ علماء کو دنیا سے واقفیت پیدا کرنا چاہیے اور سیاست دانوں کو دین سے واقف ہونا چاہیے۔ خیرالدین پاشا کے یہ خیالات تقریباً وہی تھے جو ترکی میں ان کے ہمعصر نامق کمال اور تنظیمات کے بعض رہنماؤں کے تھے۔

خیرالدین پاشا کے چلے جانے کے بعد تونس کے حالات اور ابتر ہو گئے۔ ملک بیرونی

قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان قرضوں کے بہانے مغربی ملکوں نے تونس میں مداخلت شروع کردی تھی۔ قرضوں کی ادائیگی کے لیے جب بہت زیادہ ٹیکس لگائے گئے تو ملک میں حکومت کے خلاف بے چینی پیدا ہوگئی اور اس عوامی بے چینی سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے فرانس نے جو تونس پر عرصے سے نظریں لگائے ہوئے تھا فوجی مداخلت کی اور ۱۲۔ مئی ۱۸۸۱ء کو صادق بے کو قصر السعید کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا جس کے تحت تونس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دے دیا گیا۔ صادق بے کی حکومت قائم رکھی گئی لیکن یہ حکومت اب بے دست و پا تھی۔ حقیقی حکمران تونس میں مقیم فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل تھا۔

تونس کے حسینی بے

(۱۷۰۵ء/۱۱۱۷ھ تا ۱۹۵۷ء/۱۳۷۶ھ)

(۱) حسین بن علی	۱۷۰۵ء تا ۱۷۳۵ء
(۲) علی پاشا	۱۷۳۵ء تا ۱۷۵۶ء
(۳) محمد بے	۱۷۵۶ء تا ۱۷۵۹ء
(۴) علی بے	۱۷۵۹ء تا ۱۷۸۲ء
(۵) حمودہ	۱۷۸۲ء تا ۱۸۱۴ء
(۶) محمود بن محمد	۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۴ء
(۷) بے حسین	۱۸۲۴ء تا ۱۸۳۵ء
(۸) بے احمد	۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۵ء
(۹) بے محمد	۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۹ء
(۱۰) محمد صادق بے	۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء

محمد صادق بے کے زمانے میں ۱۸۸۱ء میں فرانس کی تونس پر بالادستی قائم ہوگئی۔ اور تونس کی آزادی ختم ہوگئی۔

(۱۱) محمد صادق علی	۱۸۸۲ء تا ۱۹۰۲ء

(۱۲) محمد ہادی ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۶ء

(۱۳) محمد ناصر ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۲ء

(۱۴) محمد حبیب ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۹ء

(۱۵) احمد ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۲ء

اتحادیوں نے جنگ عظیم دوم کے دَوران جون ۱۹۴۳ء میں احمد معزول کر دیا۔

(۱۶) محمد المنصف ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء

(۱۷) محمد الامین ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۷ء

۲۵۔ جولائی ۱۹۵۷ء/۷۶/۱۳ھ کو تونس میں بادشاہت ختم کر دی گئی۔

(۳) مصر کے خدیو

مصر پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ۱۵۱۷ء میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی سے یہاں عثمانی ترکوں کا اقتدار کمزور پڑنے لگا اور یہاں کے عثمانی والی جو عموماً مملوک ترک ہوتے تھے، مصر کو نیم آزاد رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے۔ ان مملوک والیوں کے دَور میں فرانس نے اپنے مشہور سپہ سالار نپولین کی قیادت میں ۱۷۹۸ء میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ نپولین ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے مصر کو اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن مصر پر فرانس کا یہ تسلط دیر پا ثابت نہیں ہوا اور ترکوں نے برطانوی فوجوں کی مدد سے ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی فوجوں کو مصر سے نکال دیا۔ برطانیہ کے اس تعاون کی وجہ سے سلطان سلیم سوم (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) میسور کے ٹیپو سلطان کو انگریزوں کے خلاف مدد نہیں دے سکا اور ٹیپو کے سفیر کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ فرانسیسیوں کے ساتھ اس جنگ میں عثمانی فوج کے ایک البانوی افسر محمد علی نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لیے عثمانی حکومت نے ۱۸۰۵ء میں اسی کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔

محمد علی پاشا (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۹ء)

محمد علی نے شروع میں عثمانی سلطنت کے ایک وفادار والی کی حیثیت سے کام کیا۔ حجاز کو محمد بن عبد الوہاب کی پیرو سعودی حکومت سے واپس لیا اور نجد پر لشکر کشی کر کے ۱۸۱۸ء میں نجد کی اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۱ء میں یونان کی بغاوت کو فرو کیا، لیکن جب

سلطان محمود ثانی نے اس کے بعض مطالبات تسلیم نہ کیے تو ۱۸۳۱ء میں اس نے بغاوت کر دی۔ اس کا لڑکا ابراہیم جو اپنے وقت کا بہت بڑا سپہ سالار اور ماہر فن جنگ تھا، شام اور ایشیائے کوچک کو فتح کرتا اور ترک فوجوں کو مسلسل شکست دیتا ہوا قونیہ اور پھر کوتاہیہ تک پہنچ گیا۔ اگر ۱۸۳۲ء میں مغربی طاقتیں محمد علی پر دباؤ ڈال کر اس کو سلطان سے صلح کر لینے پر مجبور نہ کر دیتیں تو شاید ابراہیم پاشا استنبول تک پہنچ جاتا۔ صلح کے نتیجے میں محمد علی کو شام کا والی بھی بنا دیا گیا، لیکن اس ملک کو وہ زیادہ مدت اپنے پاس نہ رکھ سکا اور ۱۸۴۱ء میں سلطان نے شام واپس لے کر محمد علی کو موروثی بنیاد پر مصر کا مستقل والی بنا دیا۔ محمد علی اس سے قبل ۱۸۲۰ء میں نوبیہ اور ۱۸۲۱ء میں شہر سنار تک سوڈان بھی فتح کر چکا تھا۔ اس کے پوتے اسمٰعیل کے زمانے میں ۱۸۷۰ء تک سوڈان کے جنوبی حصے بھی فتح کر لیے گئے اور حبش اور زیلع کے ساحلی علاقوں پر بھی مصر اور باب عالی کی بالادستی قائم ہوگئی۔

فتوحات سے قطع نظر محمد علی کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ جدید مصر کا بانی ہے۔ وہ پہلا حکمران ہے جس نے ملک کے فوجی، سیاسی اور سماجی نظام کو قرون وسطیٰ کے نظام سے ہٹا کر جدید انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ محمد علی کے دَور سے مصر کی وہ سابقہ خوش حالی جو مملوکوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد عثمانی ترکوں کے دَورِ حکومت میں ختم[1] ہوگئی تھی، بحال ہونا شروع ہوگئی۔

محمد علی نے فرانسیسی مشیروں اور ماہروں کی مدد سے جدید فوجی نظام قائم کیا اور مصر کے باشندوں کو پہلی مرتبہ فوج میں بھرتی کیا۔ اس سے پہلے چرکس، ترک اور عرب باشندے فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ محمد علی نے جدید طرز کے فوجی مدرسے، انجینئرنگ کالج اور ڈاکٹری کی تعلیم

(۱) اس جگہ یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ مصر کی خوشحالی میں اس زوال کا باعث عثمانی ترک تھے جیسا کہ عام طور پر قوم پرست عرب مؤرخین اور بعض مغربی مصنف الزام لگاتے ہیں۔ عثمانی ترکوں نے جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ زمانہ اسلامی دنیا کے علمی اور ذہنی انحطاط کا دَور تھا اور ان میدانوں میں اسلامی دنیا کے ہر حصے میں مسلمان روبہ زوال تھے۔ خود عثمانی ترک بھی عربوں کے دَور کی طرح تخلیقی اور اعلیٰ علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ اس کے علاوہ ۱۴۹۲ء میں یورپ سے ایشیا تک پہنچنے کا بحری راستہ بھی دریافت ہوگیا تھا۔ اس راستے کی دریافت سے پہلے ایشیا اور یورپ کی بیشتر تجارت مصر اور شام کے راستے ہوتی تھی جس کی وجہ سے ان دونوں ملکوں میں خوشحالی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن جب جنوبی افریقہ کی طرف سے گزرنے والا بحری راستہ دریافت ہوگیا تو یہ تجارت ختم ہوگئی اور مصر و شام کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں نہر سوئیز کی تعمیر تک برقرار رہی۔ سوئیز کا راستہ کھل جانے کے بعد مصر کو پھر معاشی خوشحالی حاصل ہوگئی۔

کے مدرسے قائم کیے اور مصریوں کو فنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا۔ اس نے بندرگاہ اسکندریہ کو ترقی دی اور جہاز سازی کا کارخانہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ ملک میں اور بھی کارخانے قائم کیے اور ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی۔ نظام حکومت میں جدید اصولوں کے تحت اصلاح کی۔ زراعت کو ترقی دی۔ دریائے نیل پر قاہرہ کے پاس بند تعمیر کرایا جو اسلامی دنیا میں جدید نظام آبپاشی کا غالباً پہلا بڑا منصوبہ تھا۔ اس کے علاوہ لمبے ریشے کی روئی جو آج مصر کی سب سے قیمتی پیداوار ہے اس کی کاشت کا آغاز بھی محمد علی کے زمانے میں ہوا۔

۱۸۲۲ء میں محمد علی نے قاہرہ کے پاس بولاق میں ایک چھاپہ خانہ قائم کیا جو مصر کا پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ اس چھاپہ خانے سے ۱۸۲۲ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان دوسو تینتالیس کتابیں ترکی اور عربی زبان میں شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فنِ حرب، ریاضی اور تاریخ پر تھیں اور ان کی ایک بڑی تعداد مغربی زبانوں سے ترجمہ کی گئی تھی۔

محمد علی، میسور کے حیدر علی کی طرح اَن پڑھ تھا، لیکن اسی کی طرح غیر معمولی صلاحیت کا مالک۔ اگر وہ جبر واستبداد سے کام نہ لیتا تو حیدر علی کی طرح نیک نام بھی ہوتا۔ بہرحال ۱۸۴۹ء میں جب محمد علی کا انتقال ہوا تو مصر فوجی لحاظ سے طاقتور اور سیاسی اور مالی لحاظ سے ایک مستحکم ملک بن چکا تھا اور جدید دَور میں داخل ہو چکا تھا۔

اسمٰعیل پاشا (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء)

محمد علی کا بڑا لڑکا ابراہیم اپنے باپ کے انتقال سے چند ماہ قبل انتقال کر گیا تھا، اس لیے محمد علی کے بعد پہلے اس کا پوتا عباس (۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۴ء) جو محمد علی کے دوسرے لڑکے طوسون سے تھا اور پھر محمد علی کا بیٹا محمد سعید (۱۸۵۴ء تا ۱۸۶۳ء) مصر کا والی ہوا۔ نہر سوئیز کی تعمیر سعید کے زمانہ میں شروع ہوئی۔

سعید کے بعد ابراہیم پاشا کا لڑکا اسمٰعیل (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء) تخت نشین ہوا۔ سلطان ترکی نے اس کو خدیو مصر کا خطاب دیا اور اس کے بعد سے مصر کے تمام حکمران خدیو کہلانے لگے۔ اسمٰعیل پاشا نے اپنے دادا کے شروع کیے ہوئے کاموں کو جاری رکھا اس کے عہد میں تعمیر وترقی کے جو کام انجام دیئے گئے ان کی وجہ سے مصری مورخ اسمٰعیل کو ''ذی شان'' کے لقب سے یاد کرتے

ہیں، لیکن اس لقب میں صرف نصف صداقت تھی۔

اسمٰعیل پاشا کے عہد میں محکمہ کسٹم کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی۔ ڈاک کا جدید نظام قائم کیا گیا، ریلوے لائن بچھائی گئی، تار کے سلسلے قائم کیے گئے، نظام مواصلات اور بندرگاہوں کو ترقی دی گئی اور مصر میں گنے کی کاشت شروع ہوئی۔ نہر سویز جس کی تعمیر سعید پاشا کے دَور میں شروع ہوئی تھی، اسمٰعیل پاشا کے عہد ہی میں مکمل ہوئی اور مصری بیڑے نے صومالیہ اور کینیا تک مہمیں سر کر کے مصری اثرات بحر ہند تک پہنچا دیے۔

اسمٰعیل ہی کے عہد میں ۱۸۷۰ء میں قاہرہ میں کتب خانہ عام قائم ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں جغرافیائی سوسائٹی قائم ہوئی۔ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام تین سو سال کے وقفے کے بعد پھر جوش و خروش سے شروع ہوا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصر میں انیسویں صدی کے آخر میں اسلامی علوم کا جو احیاء شروع ہوا اور جدید علوم کو جو فروغ ہوا، اس کی داغ بیل اسمٰعیل ہی کے عہد میں پڑی۔

لندن ٹائمز نے ۱۸۷۶ء میں مصر کی حیرت انگیز ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ مصر نے ستر سال کے اندر ایسی ترقی کی ہے جیسی بہت سے دوسرے ملکوں نے پانچ سو سال کی مدت میں کی۔ مصر کی اس تیز رفتار ترقی نے اسمٰعیل کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ مصر مشرق کا حصہ نہیں ہے، بلکہ یورپ کا ایک حصہ ہے۔ احساس کمتری کے اس جذبے نے مصر میں یورپ کی نقالی اور تقلید کی تحریک کا آغاز کیا جو مصر کو صحیح اسلامی خطوط میں بڑھانے والوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

تعمیر و ترقی کے ان کاموں کے باوجود اسمٰعیل میں محمد علی جیسا مدبر اور دور اندیشی نہیں تھی۔ محمد علی نے مصر کی مالی حالت مستحکم کر دی، لیکن اسمٰعیل نے فضول خرچیوں اور غلط قسم کے منصوبوں پر بے تحاشا رقم صرف کی جو صرف اظہار شان و شوکت کے لیے شروع کیے گئے تھے، اور ملک کا دیوالیہ نکال دیا۔ اس نے صرف نہر سویز کے افتتاح کی رسم پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ خرچ کر ڈالے۔ جب ملکی وسائل اس کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ثابت ہوئے تو اس نے یورپ کے ملکوں سے بڑے بڑے قرض لینا شروع کر دیے، حالانکہ محمد علی غیر ملکی قرضوں میں کبھی نہیں الجھا اور اس نے اہل یورپ کو اس کی اجازت کبھی نہیں دی کہ وہ اسے اپنے اشاروں پر چلانے کی

جرأت کریں، لیکن اسمٰعیل نے اس کثرت سے قرض لیے کہ ملک ان قرضوں کو ادا کرنے کے قابل نہیں رہا اور جب مزید رقم وصول کرنے کے لیے حکومت نے ٹیکس لگائے تو عوام میں بے چینی پھیل گئی، چنانچہ مصر میں بھی بالکل ویسی ہی صورت حال پیدا ہوگئی جو اسمٰعیل کے ہمعصر صادق بے کے زمانے میں تونس میں پیدا ہوگئی تھی۔ ملک کی بگڑتی ہوئی مالی حالت اور عوام کی بے چینی سے خوفزدہ ہوکر برطانیہ اور فرانس، جنہوں نے سب سے زیادہ قرض دیا تھا، ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور ۱۸۷۸ء میں اسمٰعیل کو مجبور کیا کہ مالیات کی نگرانی کے لیے برطانوی اور فرانسیسی نمائندوں کا تقرر منظور کرے۔ ان نمائندوں کی مداخلت سے تنگ آ کر جب اسمٰعیل نے بغاوت کی تو برطانیہ اور فرانس نے ترکی پر دباؤ ڈال کر اسمٰعیل کو معزول کرا دیا اور اس کی جگہ اس کے لڑکے توفیق (۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۲ء) کو مصر کا خدیو بنا دیا گیا۔ اسمٰعیل اس کے بعد ترکی چلا گیا جہاں اس کا استنبول میں ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔

توفیق پاشا اور برطانوی تسلط

توفیق جب تخت پر بیٹھا تو ملک دیوالیہ ہو چکا تھا اور مصر میں سیاسی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ملکی معاملات میں بیرونی مداخلت اور ملکی مالیات کی برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ نگرانی نے اصلاحی اور قومی تحریک کے لیے راہ ہموار کر دی۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۹ء تک عظیم مسلمان رہنما جمال الدین افغانی بھی قاہرہ میں مقیم رہے تھے اور بیرونی مداخلت کے خلاف مسلسل آواز بلند کر کے قومی تحریک کو فروغ دے رہے تھے۔ ایک فوجی افسر احمد عرابی پاشا (۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۱ء) نے جلد ہی اس نئی قومی تحریک کی قیادت سنبھال لی۔ خدیو توفیق ان کے زیر اثر آ گیا اور ۱۸۸۲ء کو انہیں وزیر جنگ مقرر کر دیا، لیکن پھر جلد ہی ان کو برطانوی مداخلت پر برطرف کر دیا گیا۔ قومی رہنماؤں کی طرف سے اس موقع پر ایسے دستور کا مطالبہ کیا جا رہا تھا جو غیر ملکی مداخلت کی روک تھام کر سکے، لیکن عین اس زمانے میں انگلستان اور فرانس نے اپنے سرمایہ کے مفاد کے تحفظ کے لیے مداخلت کی دھمکی دی، بلکہ برطانوی بحری بیڑے نے جولائی ۱۸۸۲ء کو اسکندریہ پر گولہ باری بھی کر دی۔ مغربی طاقتوں کے اس تشدد پسندانہ طرزِ عمل نے مصر کی پرامن دستوری جدوجہد کو جنگ کے راستے پر ڈال دیا۔ عرابی پاشا نے بغاوت کر دی جس کو کچلنے کے لیے برطانیہ نے اسمٰعیلیہ میں اپنی فوجیں

اتار دیں۔ ۱۳۔ ستمبر ۱۸۸۲ء کو تل الکبیر کے مقام پر عرابی پاشا نے ان کو روکنا چاہا لیکن شکست کھائی اور برطانوی فوجیں قاہرہ میں داخل ہوگئیں۔ عرابی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے ان کو سزائے موت دی گئی، پھر سزائے موت کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کر کے ان کو سری لنکا جلاوطن کر دیا گیا۔ آخر میں اُن کی سزا معاف کر دی گئی اور وہ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آ گئے جہاں ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔

اس طرح مصر میں برطانوی دَور کا آغاز ہوا جو ۱۹۲۲ء تک قائم رہا۔ مصر پر خلافت عثمانیہ کی نام نہاد بالادستی اب بھی قائم تھی اور وہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑنے پر ختم ہوئی۔

طہطاوی

اس دَور کی علمی شخصیتوں میں دو نام قابل ذکر ہیں۔ ایک عبدالرحمن جبرتی (۱۷۵۳ء تا ۱۸۲۶ء) اور دوسرے رفاعہ رافع طہطاوی۔ جبرتی محمد علی کے دَور کے مورّخ ہیں۔ ان کی کتاب عجائب الآثار (۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ تا ۱۸۲۱ء/۱۲۳۶ھ) مصر کی مفصل تاریخ ہے۔ یہ تاریخ فرانسیسی قبضہ کے بعد کے سالوں کے لیے سب سے بڑا ماخذ ہے۔ اس میں لوگوں کی سوانح عمریاں بھی شامل ہیں۔ جبرتی نے محمد علی کی حکومت پر شدید حملے کیے ہیں۔ انہوں نے مصر پر فرانسیسی تسلط کی تاریخ ایک دوسری کتاب میں تفصیل سے پیش کی ہیں۔

رفاعہ رافع طہطاوی (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۳ء) اس دَور کے سب سے بڑے اہل علم اور مفکر ہیں۔ اسلام اور مغربی افکار کی کشمکش کی تاریخ میں ان کو جمال الدین افغانی، نامق کمال اور خیر الدین پاشا کی طرح ایک اہم مقام حاصل ہے۔

محمد علی پاشا نے ۱۸۲۵ء میں مصری طلبہ کی ایک جماعت کو تعلیم کے لیے فرانس بھیجا تھا۔ طہطاوی اس جماعت کے ساتھ دینی معلم اور امام کی حیثیت سے بھیجے گئے تھے، کیونکہ محمد علی چاہتا تھا کہ مصری طلبہ یورپ میں رہ کر مذہب سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ طہطاوی ۱۸۳۱ء تک یورپ میں رہے۔ انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور فرانسیسی ادب اور جدید علوم اور مغربی تہذیب کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ مصر واپس آنے کے بعد وہ بیرونی زبانوں کے مدرسے کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ یہ مدرسہ محمد علی نے قاہرہ میں قائم کیا تھا۔ اس مدرسے نے عربوں کے ذہنی ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں طہطاوی اور مدرسہ کے طلبہ نے ۱۸ء تک جب کہ یہ مدرسہ بند کر دیا گیا، ہر

موضوع سے متعلق دو ہزار کتابوں کا بیرونی زبانوں سے ترجمہ کیا۔

طہطاوی نے ترجموں کے علاوہ کئی کتابیں خود بھی لکھیں۔ ان میں بعض کتابیں یورپ اور وہاں کی تہذیب اور تمدن کے بارے میں ان کے تاثرات سے متعلق ہیں اور خیرالدین پاشا کی طرح ان کا مقصد ان کتابوں کے لکھنے سے یہ تھا کہ مصری بھی ان مفید باتوں کو اپنا کر جو یورپ کے عروج کا سبب بنیں اپنے ملک کو ترقی دے سکیں۔

طہطاوی فرانس کو کفر وعناد کی سرزمین سمجھنے کے باوجود فرانسیسیوں کی صداقت، انصاف کردار اور محنت کی تعریف کرتے ہیں اور مصریوں کو مغربی تہذیب اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مغربی تہذیب مصری تہذیب سے برتر ہے اور مصری اس تہذیب کو اپنا کر اپنی کمزوریاں دُور کر سکتے ہیں، لیکن طہطاوی مغربی تہذیب کو اسلامی حدود کی پابندی میں رہ کر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی لبرل ازم کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ وہی چیز ہے جسے اسلام میں عدل وانصاف کہا گیا ہے اور آئینی اور نمائندہ حکومت کو وہ شوریٰ ہی کی ایک شکل سمجھتے ہیں اور اسے استبدادی شخصی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں۔ طہطاوی نے مصری جاگیرداری نظام پر سخت تنقید کی ہے۔ عربوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے وطن کا لفظ اور اصطلاح مغربی تصور وطن کے مطابق استعمال کی۔ گویا وہ عربوں کے نامتِ کمال ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر مسلم ملک ان تمام مسلمانوں کا وطن ہو سکتا ہے جو وہاں رہتے ہیں۔ وہ پہلے عرب ہیں جنہوں نے وطنی نظمیں لکھیں اور ان میں مصر کی عظمت کے گیت گائے ہیں اور قبل از اسلام کے دَور پر بھی فخر کیا ہے۔

مصر کے خدیو حکمران

(۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تا ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء)

(۱) محمد علی پاشا	۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تا ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء
(۲) عباس اول	۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء تا ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء
(۳) سعید پاشا	۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء تا ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء
(۴) اسمٰعیل پاشا	۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء تا ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء

(۵) توفیق پاشا	۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء تا ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء
(۶) عباس حلمی	۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء تا ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء
(۷) حسین کامل	۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۷ء
(۸) فواد اول	۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۶ء
(۹) فاروق	۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۲ء/۱۳۷۱ھ

(۴) مراکش یا المغرب

مولائے اسمٰعیل کے بعد جو حکمران مراکش کے تخت پر بیٹھے ان میں سب نااہل نہیں تھے، لیکن مراکش کے زوال کو ان میں سے کوئی بھی نہ روک سکا۔ اس کے علاوہ مراکش میں اپنی کمزوریوں کی اصلاح کے لیے اس قسم کی کوششیں بھی نہیں کی گئیں جیسی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ترکی اور مصر میں کی گئیں اور خود شمالی افریقہ میں خیرالدین پاشا کی وزارت اور صادق بے کی حکومت کے زمانے میں کی گئی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مراکش شاید اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے یورپ کی جارحانہ کاروائیوں سے محفوظ رہا اور مراکش شمالی افریقہ کا وہ ملک ہے جو سب سے آخر میں مغربی تسلط میں آیا۔

مولائے اسمٰعیل کے بعد مراکش میں جو حکمران ہوئے ان کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ملک میں بڑی حد تک امن قائم کرنے میں کامیاب رہے اور انہوں نے مدرسوں، مسجدوں اور دیگر عمارتوں کی شکل میں تعمیراتی کام بھی انجام دیا۔ اسمٰعیل کے بعد اس کے لڑکے مولائے عبداللہ (۱۷۲۷ء تا ۱۷۹۰ء) کا دور ہنگاموں کی نذر ہو گیا وہ پانچ مرتبہ تخت سے اترا اور پھر بیٹھا۔ عبداللہ کا لڑکا مولائے محمد (۱۷۵۷ء تا ۱۷۹۰ء) ملک میں امن بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے یورپ کے ملکوں سے وسیع پیمانے پر سفارتی تعلقات قائم کیے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو تسلیم کیا۔ مراکش کا شمار امریکہ کو تسلیم کرنے والے اولین ملکوں میں ہوتا ہے۔ مولائے سلیمان (۱۷۹۲ء تا ۱۸۲۲ء) اس لحاظ سے مراکش کا آخری طاقتور حکمران ہے کہ اس کے زمانے تک مراکش کا وقار قائم رہا۔ اس کے دور میں مغربی ملکوں سے تعلقات اور استوار

ہوئے اور تعمیر و ترقی کا کام بھی کسی نہ کسی قدر انجام دیا گیا۔ اس کے بعد مراکش واضح طور پر روبہ زوال ہوگیا۔

مولائے عبدالرحمن (۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۹ء) کے زمانے میں جو مولائے سلیمان کا بھتیجہ تھا جب مراکش اور فرانس کے درمیان پہلی مرتبہ تصادم ہوا، تو مراکش کی داخلی کمزوریاں ظاہر ہوگئیں۔ فرانس نے جب الجزائر پر قبضہ کیا تو مراکش میں مولائے عبدالرحمن کی حکومت تھی، لیکن یہ حکومت نہ صرف یہ کہ الجزائر کو بچا نہ سکی بلکہ خود اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ۱۸۴۳ء میں امیر عبدالقادر الجزائری فرانس سے جنگ کے دوران مراکش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ مولائے عبدالرحمن کو عوام کے دباؤ کے تحت ان کی مدد کرنی پڑی۔ اس مدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگست ۱۸۴۴ء میں طنجہ اور الصویرہ (mogador) کی بندرگاہوں پر فرانسیسی بحریہ نے بمباری کی اور وجدہ کے سرحدی مقام پر فرانس نے مراکشی فوج کو شکست دے کر مراکشی حکومت کو مجبور کیا کہ اگر امیر عبدالقادر نے پھر مراکش فوج کو شکست دے کر مراکشی حکومت کو مجبور کیا کہ اگر امیر عبدالقادر نے پھر مراکش میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ ان کو نکال دے گی یا نظر بند کردے گی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۴۵ء میں مراکش اور الجزائر کے درمیان حد بندی کی گئی جو آج تک قائم ہے۔

فرانس کی اس مداخلت نے مراکش کی فوجی کمزوری سب پر ظاہر کردی اور چند سال بعد اسپین نے بھی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۸۶۰ء میں شمالی مراکش کے شہر تطوان پر قبضہ کرلیا۔ مراکش کے آخری دور کے حکمرانوں میں مولائے حسن (۱۸۷۳ء تا ۱۸۹۴ء) ایک مضبوط حکمران ثابت ہوا۔ اس نے اپنے عہد میں پورے ملک میں امن قائم رکھا اور بیرونی ملکوں کو مداخلت سے باز رکھا، لیکن یہ سب کچھ مولائے حسن کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ تھا، ورنہ مراکش جدید فنون حرب اور نئے معاشی، سماجی اور سیاسی رجحانات سے اب بھی اتنا ہی دور تھا جتنا اس سے پہلے کے حکمرانوں کے زمانے میں دور تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کی حکومتوں نے ایشیا اور خاص طور پر افریقہ میں اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر قائم کرلیے تھے اور انہوں نے طے کرلیا تھا کہ ایک ملک کے حلقۂ اثر میں دوسرا ملک مداخلت نہیں کرے گا۔ فرانس، مصر پر انگریزی تسلط پر اور برطانیہ تونس پر فرانس کے تسلط پر

راضی ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں فرانس اور اسپین نے بھی ایک ایسے ہی خفیہ معاہدہ کے ذریعے مراکش کو تقسیم کرلیا۔ دو سال بعد برطانیہ نے بھی اس کی تائید کردی۔ یورپ کی تین بڑی حکومتوں کے درمیان اس تصفیے کے بعد مراکش میں فرانس اور اسپین کی مداخلت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں اسپین نے شمالی مراکش پر جو ریف کہلاتا ہے اور فرانس نے باقی ملک پر قبضہ کرلیا۔

مارچ ۱۹۱۲ء میں مولائے عبدالحفیظ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء) کو بمقام فاس ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا جس کے تحت مراکش کو تونس کی طرح فرانس کا زیر حفاظت علاقہ (protectorate) قرار دیا گیا۔ نومبر میں ایک اور معاہدے کے تحت ''ریف'' کو اسپین کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔ اگرچہ ''ریف'' پر سلطان مراکش کی بالادستی تسلیم کی گئی۔ فرانس کے سامنے اس طرح ہتھیار ڈال دینے پر احتجاج کے طور پر پورے ملک میں بغاوت ہوگئی، لیکن فرانسیسی فوجوں نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا۔

مراکش شمالی افریقہ کا آخری ملک ہے جس پر یورپ کا تسلط قائم ہوا۔ لیبیا پر ایک سال قبل اٹلی قابض ہو چکا تھا۔

[فرانسیسی تسلط کے بعد مصر اور شمالی افریقہ کی تاریخ اور معاشی اور سماجی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ]

(فلالی سلاطین کے شجرہ کے لیے دیکھیے باب۔ ۲۵)

اہم واقعات

۱۸۱۱ء (یکم مارچ) محمد علی نے قاہرہ میں تمام مملوک سرداروں کو قتل کرادیا۔

۱۸۱۸ء نجد پر قبضہ اور آل سعود کے ساتھ سات سالہ جنگ کا خاتمہ۔

۱۸۲۲ء مصری فوجوں نے سوڈان فتح کیا۔ بولاق (قاہرہ) میں چھاپہ خانہ قائم ہوا۔

۱۸۲۳ء سوڈان میں شہر خرطوم آباد کیا گیا۔

۱۸۲۶ء ابراہیم پاشا کی موریا (یونان) میں کامیاب مہم۔

۱۸۳۰ء (۵۔ جولائی) الجزائر پر فرانسیسی قبضہ۔

۱۸۳۲ء مسکرہ میں امیر عبدالقادر کی حکومت کا آغاز۔ ۲۹/ جولائی کو ابراہیم پاشا نے حلب کے پاس اور ۲۹۔ اکتوبر کو قونیو کی جنگ میں ترکوں کو شکست دی۔

۱۸۳۳ء (۸۔اپریل) معاہدۂ کوتاہیہ جس کے تحت محمد علی کو مصر کے علاوہ ادرنہ اور شام کا عثمانی والی تسلیم کر لیا گیا۔

۱۸۳۵ء طرابلس میں قرہ مانلی خاندان کی حکومت کا خاتمہ اور ترک گورنر کا تقرر۔ یہ خاندان ۱۷۱۴ء سے آزادانہ حکومت کر رہا تھا۔

۱۸۳۷ء معاہدۂ تفنہ (tafna) فرانسیسیوں نے الجزائر کا بیشتر حصہ امیر عبدالقادر کے سپرد کر دیا۔

۱۸۳۹ء نزیب کی جنگ میں ابراہیم پاشا نے ترکوں کو شکست دی (۲۵۔جون)

۱۸۴۱ء امیر عبدالقادر نے الجزائر میں پناہ لی۔ ۳۰۔ ستمبر کو مصر کی حکومت محمد علی کے خاندان میں موروثی کر دی گئی۔ شام عثمانی سلطنت کو واپس کر دیا گیا۔

۱۸۴۴ء فرانسیسیوں نے طنجہ پر بمباری کی اور الصویرہ (مراکش) پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۴۵ء الجزائر اور مراکش کی سرحدی حد بندی۔

۱۸۴۷ء (۲۳۔دسمبر) امیر عبدالقادر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

۱۸۵۷ء اسکندریہ اور قاہرہ کے درمیان ریلوے لائن مکمل۔ تونس میں بنیادی حقوق کے منشور کا نفاذ (۹۔ستمبر)

۱۸۶۱ء تونس میں ''دستور'' کا نفاذ جو اسلامی دنیا میں جدید طرز کا پہلا دستور تھا۔

۱۸۶۹ء (۱۷۔نومبر) نہر سویز کا افتتاح۔

۱۸۸۲ء (۱۲۔مئی تونس پر فرانس کا قبضہ) (۱۱۔جولائی اسکندریہ پر برطانوی بحریہ کی بمباری)۔ ۱۳۔ستمبر تل کبیر کی جنگ میں عرابی پاشا کی شکست اور مصر پر انگریزوں کا قبضہ۔

۱۹۰۶ء الجزیرہ (algecivas) کانفرنس۔ سلطان مراکش نے اصلاحات جاری کرنے سے متعلق فرانس اور اسپین کا کنٹرول تسلیم کر لیا۔

۱۹۰۷ء فرانسیسیوں کا وجدہ (مراکش) پر قبضہ اور دارالبیضا پر بمباری۔

۱۹۱۰ء سلطان کی طرف سے اصلاحات کا منصوبہ منظور کرنے پر فرانس نے وجدہ خالی کر دیا۔

۱۹۱۱ء فرانس نے بیرونی باشندوں کے تحفظ کا بہانہ بنا کر فاس (مراکش) پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۱۲ء (۳۰۔ مارچ) مراکش پر فرانس کا قبضہ۔

باب ۳۵

افریقہ مغربی استعمار کے چنگل میں

(۱) مغربی افریقہ

غلاموں کی تجارت

پندرھویں صدی میں یورپی قوموں نے جن میں پرتگالی آگے آگے تھے افریقہ کا سارا مغربی ساحل دریافت کرلیا تھا۔ ان یورپی قوموں کو شروع میں صرف سونے اور ہاتھی دانت سے دلچسپی تھی جو ان ملکوں میں کثرت سے موجود تھا۔ اس کے بعد ان قوموں نے افریقی غلاموں کی تجارت شروع کر دی۔ یورپی قوموں کی طرف سے غلاموں کی یہ تجارت جو ۱۵۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک پورے تین سو سال جاری رہی، انسانی تاریخ کا انتہائی بھیانک اور دردناک باب ہے۔ امریکہ میں جب مقامی آبادی کو کھیتوں اور کانوں میں جانوروں کی طرح کام لے کر اور اس پر تشدد کر کے ختم کر دیا گیا، تو وہاں کے سفید آقاؤں نے افریقہ سے سیاہ فام غلام حاصل کرنا شروع کر دیے۔ اس کام میں یورپ کی تقریباً تمام قوموں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ افریقہ کے سارے ساحل پر خصوصاً مغربی افریقہ کے ساحلوں پر ان قوموں نے جن میں پرتگالی، ہسپانوی، فرانسیسی، انگریز، جرمن، اہلِ ڈنمارک اور اہلِ سویڈن شامل تھے، جگہ جگہ قلعے اور چوکیاں تعمیر کرلیں جہاں سے ان قوموں کے بندوق بند سپاہی اندرونِ ملک سیاہ فام باشندوں کی پر امن بستیوں پر چھاپے مارا کرتے تھے اور مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر لاتے تھے۔ پھر ان بے بس لوگوں کو جانوروں کی طرح سے جہازوں میں ٹھونس کر امریکہ پہنچا دیتے تھے راستے میں بے شمار افریقی تشدد اور بھوک کا شکار ہو کر ختم ہو جاتے تھے۔ مغربی قوموں کی یہ انسانیت سوز تجارت پورے تین سو سال جاری رہی۔ انسانوں کے ساتھ ان کے اس دردناک طرزِ عمل نے آخر کار کچھ نیک طبیعت

لوگوں کو متاثر کیا اور یورپ میں غلامی کے خلاف تحریک چلی اور ۱۹۲۰ء تک سارے یورپ اور امریکہ میں غلامی کے رسم و رواج اور غلاموں کی تجارت پر پابندی لگادی گئی۔

تقسیم افریقہ

غلاموں کی تجارت بند ہو جانے کے بعد اہل یورپ نے افریقہ کو لوٹنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ افریقہ کو مہذب بنانے کی ضرورت ہے اور یہ کام اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ افریقہ کے جو ملک موسم اور آب و ہوا کے لحاظ سے اہل یورپ کی آبادکاری کے لیے موزوں ہیں وہاں یورپی باشندوں کو آباد کر دیا جائے اور باقی افریقہ پر قبضہ کر کے اس کو یورپی نوآبادی میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۸۲ء الجزائر، تونس اور مصر پر فرانس اور برطانیہ پہلے ہی قابض ہو گئے تھے۔ اب ۱۸۸۵ء میں برلن کانفرنس میں یورپ کی قوموں نے باقی افریقہ کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا۔ اس کے بعد فرانسیسی، انگریز، جرمن اور اطالوی قدیم شکاری جانوروں کی طرح سے اپنے اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے اور پندرہ سال کے اندر اندر سارے براعظم افریقہ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ ہمارا موضوع چونکہ تاریخ اسلام ہے اس لیے ہم یہاں افریقہ کے صرف ان علاقوں پر یورپی تسلط کی تاریخ بیان کریں گے جہاں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔

تقسیم افریقہ کے منصوبے کے تحت مغربی افریقہ فرانس کے حصے میں آیا تھا۔ چنانچہ فرانسیسیوں نے اپنی فوجی کارروائی سب سے پہلے سینیگال، گنی اور مالی کی طرف سے شروع کی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ سولھویں صدی میں مالی پر مراکش نے قبضہ کر لیا تھا لیکن مالی پر مراکش کا اقتدار زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا۔ صحرائے اعظم کے حائل ہونے کی وجہ سے مالی کے مراکشی فوجی اپنے وطن سے کٹ گئے اور انہوں نے یہاں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی جو کسی نہ کسی شکل میں ۱۸۹۳ء تک قائم رہی۔

حاجی عمر تیجانی

بیسویں صدی کے آغاز میں صوفیوں نے مختلف سلسلوں اور طریقوں کے ذریعے مالی، سینیگال اور گرد و نواح کے علاقوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ خاص طور پر مالی میں طریقہ تیجانیہ کے عثمان

دان فودیو کے ایک رفیق احمد ودوبو نے (۱۸۱۰ء تا ۱۸۴۴ء) ایک خالص اسلامی حکومت قائم کی۔ سینے گال میں حاجی عمر تجانی (۱۷۹۷ء تا ۱۸۲۵ء) کی کوششوں سے ہزاروں مظاہر پرستوں نے اسلام قبول کیا اور اس طرح مہذب دنیا کی حدود جنوب میں ساحلی علاقوں تک پہنچا دی۔ گنی کے شمالی حصوں میں بارہویں صدی ہی میں اسلام کا آغاز ہو گیا تھا۔ ۱۷۲۰ء میں یہاں کی خوبصورت سطح مرتفع فوتا جلوں میں شرعی حکومت قائم ہو گئی۔ اس حکومت کے قیام سے گنی کے علاقے میں اسلام کی توسیع واشاعت میں بڑی مدد ملی اور جنوب کے علاقوں میں بتدریج اسلام پھیلتا گیا یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک سوسو قبیلے کے مبلغوں نے ساحل بحر اوقیانوس تک اسلام پھیلا دیا۔ احمد ولوبو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جو حکومت مالی میں قائم کی تھی وہ شرعی نقطہ نظر سے صحرائے اعظم کے جنوب میں قائم ہونے والی مکمل ترین اسلامی حکومت تھی۔

فرانسیسی دریائے سینے گال کے دہانہ پر ۱۶۴۵ء سے قابض تھے وہاں انہوں نے سینٹ لوئی کے نام سے ایک شہر کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے گنی اور آئیوری کوسٹ تک ساحلی علاقوں میں جگہ جگہ اپنی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ حاجی عمر تجانی نے جب سینیگال کے اندرونی علاقوں میں ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تو یہ چوکیاں خطرے میں پڑ گئیں۔ ۱۸۵۴ء میں فرانسیسی گورنر جنرل فید ہربے (Faid Harbe) نے جو فرانسیسی نوآبادیوں کا نپولین کہلاتا ہے حاجی عمر تجانی کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ کے مقام پر ایک قلعہ بنوایا۔ جس کی تعمیر کے بعد فرانسیسیوں اور حاجی عمر تجانی میں جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ حاجی عمر تجانی ۱۸۶۴ء میں جب کہ وہ قولانیوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے شہید ہو گئے۔ اس وقت تک فرانسیسی سینیگال پر قابض ہو چکے تھے۔

امام صمد

فرانسیسیوں نے بیس سال بعد جب دوسری لشکر کشی شروع کی تو مالی کے علاقہ میں حاجی عمر تجانی کے بیٹے احمدو نے اور گنی کے علاقے میں امام صمد (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۰ء) نے جو سموری کے نام سے مشہور ہیں ان کا قدم قدم پر مقابلہ کیا۔ لیکن جدید اسلحہ اور جدید فوجی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ فرانسیسیوں کا جم کر مقابلہ نہیں کر سکے۔ ۱۸۸۱ء میں فرانسیسیوں نے فوتا جلوں پر

۱۸۹۰ء میں شہر سیگو پر اور ۱۸۹۳ء میں جینی اور ٹمبکٹو پر قبضہ کرلیا۔ امام صمد نے فرانسیسیوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے پوری کوشش کی لیکن اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور فرانسیسیوں نے ۱۸۹۳ء میں ان کے دارالحکومت بساندوگو (besandugu) پر جو لائبیریا کی سرحد پر واقع تھا، قبضہ کرلیا۔ لیکن اس حوصلہ مند انسان نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور بالائی نائیجر اور سیاہ وولٹا کے درمیان، مظاہر پرست قبیلوں کو مفتوح کر کے ایک نئی مملکت قائم کر لی اور لائبیریا کی سرحد سے اشانتی اور ڈیہومی کی سرحد تک فرانسیسی علاقوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ اپنے ان حملوں کی وجہ سے امام صمد نے اس زمانے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ آخر کار ۱۸۹۸ء میں لائبیریا کے شمال میں کولا (cavalla) کے مقام پر ان کو آخری شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لئے گئے۔ فرانسیسیوں نے ان کو وسطی افریقہ کے علاقے گابون میں جلاوطن کر دیا جہاں اس عظیم مجاہد کا ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوگیا۔ احمدو کا انتقال اس سے دو سال قبل ۱۸۹۸ء میں ہو چکا تھا۔ مغربی افریقہ میں فرانسیسیوں کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ فرانسیسیوں نے نئے مقبوضات کو فرانسیسی مغربی افریقہ کا نام دیا اور ایک گورنر جنرل مقرر کر دیا جس کا صدر مقام سینیگال میں ''ڈاکر'' کا شہر تھا۔

اس کے بعد الجزائر، سینیگال اور لبریول [1] سے تین فوجیں مغربی افریقہ اور وسطی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کو ایک دوسرے سے ملانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ سینیگال سے جو فوج روانہ ہوئی وہ راستے میں مسلمانوں کا قتل عام کرتی اور ان کی بستیوں کو جلاتی اور برباد کرتی آگے بڑھی۔ یہ تینوں فوجیں ۲۲۔ اپریل ۱۹۰۰ء کو جھیل چاڈ کے پاس ایک دوسری سے مل گئیں۔ ان کو بورنو کے سلطان ربیع زبیر کو کچلنے کا حکم دیا گیا تھا جس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

(مغربی افریقہ کے مسلم ممالک پر فرانسیسی تسلط کے بعد ان کے موجودہ زمانے تک کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس تاریخ کا تیسرا حصہ)

(۲) نائیجیریا

افریقہ کی تاریخ کے سلسلے میں اب تک ہم نے نائیجریا کا تذکرہ نہیں کیا جو اس وقت آبادی کے لحاظ سے براعظم افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ نائیجریا میں اسلام کا آغاز گیارہویں صدی

---

(۱) اب یہ شہر مملکت گابون کا بندرگاہ اور دارالحکومت ہے۔

میں صوبہ بورنو سے ہوا جو موجودہ نائیجیریا کا انتہائی شمال مشرقی صوبہ ہے اور جھیل چاڈ کے کنارے واقع ہے۔ اُس زمانہ میں یہ علاقہ کانم کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ نائیجیریا کے دوسرے شمالی صوبوں میں اسلام کی توسیع اور اشاعت بہت بعد میں چودھویں صدی عیسویں میں ہوئی۔ اس صدی میں مغربی افریقہ سے آنے والے تاجروں نے علاقہ نائیجریا اور شمالی نائیجیریا کے فولانی اور ہاوسا قبیلوں کو مسلمان کیا اور پھر ان باشندوں نے باقی ملک میں اسلام پھیلایا۔

چودھویں صدی میں شمالی اور شمال مغربی نائیجیریا اور نائیجر کے علاقے میں ہاوسا باشندوں کی کئی حکومتیں قائم تھیں، جن میں کٹسینا (katsina) کانو، زاریا اور گوبیر کی ریاستوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ غالباً ان میں سب سے پہلے کٹسینا کے ہاوسا باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں کا حکمران محمد کورا (۱۳۲۰ء تا ۱۳۵۳ء) نائیجیریا میں پہلا مسلمان حکمران کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد کانو کے حکمران علی یازجی (۱۳۴۹ء تا ۱۳۸۵ء) نے اسلام قبول کیا۔ بعد میں کئی اور ریاستوں کے حکمران بھی مسلمان ہو گئے اور شمالی نائیجیریا میں دور دور تک اسلام پھیل گیا۔ اسلام کے غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں کا مالی اور عدالتی نظام شریعت اسلامی کے مطابق مرتب کیا گیا۔ علماء کی قدردانی ہوئی جس کی وجہ سے علوم کو فروغ ہوا اور سولھویں صدی میں کانو اور کٹسینا نائیجیریا میں سب سے بڑے علمی مرکز بن گئے۔ عربی میں کتابیں لکھی جانے لگیں اور ہاوسا زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا گیا۔

سولھویں صدی کے آغاز میں نائیجیریا کی ان ہاؤسا ریاستوں پر کچھ مدت کے لیے مالی کے حکمران محمد اسکیائے اعظم کی بالادستی قائم ہوگئی، لیکن یہ ریاستیں محمد اسکیا کے بعد پھر آزاد ہوگئیں اور ان کا وجود اٹھارہویں صدی کے آخر تک قائم رہا۔ اس کے بعد فولانی باشندوں نے ہاوسا باشندوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا۔

عثمان دان فودیو اور فولانی جہاد

فولانی باشندے تیرھویں صدی میں مغرب کی طرف سے نائیجیریا آئے۔ ان کی بڑی تعداد اس وقت تک مسلمان ہو چکی تھی۔ ان میں چونکہ شروع ہی سے اسلامی تعلیمات کا چرچا رہا تھا اس لیے وہ نائیجیریا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں مذہب پر زیادہ سختی سے عامل تھے۔

نائیجیریا کے ہاؤسا اور دوسرے باشندے مسلمان ہونے کے بعد بھی بہت سی پرانی باتوں اور مشرکانہ رسوم پر عمل کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ایک فولانی عالم اور مصلح عثمان دان فودیو (۱۷۵۴ء تا ۱۸۱۷ء) نے ان غیر اسلامی اثرات کو ختم کرنے حقیقی اسلامی تعلیمات کے احیاء کے لیے ایک تحریک شروع کی جو عام طور پر فولانی جہاد کے نام سے مشہور ہے۔

عثمان دان فودیو نے فقہ مالکی کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ ان میں شروع ہی سے دین سے محبت اور اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ ابھی ان کی عمر صرف بیس سال تھی کہ انہوں نے اپنے استاد الحاج جبریل بن عمر کے ساتھ مل کر غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ شروع کردی۔ ۱۷۸۶ء کے قریب عثمان حج کے لیے مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں کے قیام کے دوران حجاز کے علماء سے مزید تعلیم حاصل کی۔ ان کا اس زمانے میں ان علماء سے بھی تعلق ہوا جو نجدی عالم محمد بن عبدالوہاب کے خیالات سے متاثر تھے۔ عثمان جب حجاز سے واپس وطن آئے تو ان کے دل میں اسلام کا ایک نیا جوش اور جذبہ کام کررہا تھا۔ اب انہوں نے غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے سے پہلے خود مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے ان مسلمانوں کی حمایت بھی کی جو غیر مسلم ہاؤسا حکمرانوں کے ظلم کا شکار بن رہے تھے۔ ان کی ان کوششوں کی وجہ سے ریاست گوبیر کے غیر مسلم حکمران سے ان کا تصادم ہوگیا۔ فروری ۱۸۰۴ء میں جب عثمان دان فودیو نے گوبیر کے حکمران کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو تمام مسلمان ان کے علم کے نیچے جمع ہوگئے، لیکن ان کی سب سے زیادہ مدد فولانیوں نے کی جن کے درمیان عثمان رہتے تھے اور جو عثمان کے اخلاق، کردار اور تعلیمات سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ جنگ کا یہ سلسلہ چھ سال تک جاری رہا۔ اس مدت میں نہ صرف گوبیر کی ریاست پر فولانی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا بلکہ انہوں نے دوسری تمام ہاؤسا ریاستوں کو بھی فتح کرلیا۔ ۱۸۱۰ء تک جہاد ختم ہوگیا اور دریائے بینو اور نائیجر تک شمالی نائیجیریا کا تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ شمال مشرق میں صرف بورنو کی مسلم ریاست فولانی اثر سے آزاد رہی۔

۱۸۱۷ء میں عثمان کا انتقال ہوگیا۔ ان کو سوکوٹو میں دفن کیا گیا جہاں ان کا مقبرہ آج تک زیارت گاہ عام ہے۔ مغربی افریقہ اور نائیجیریا کے مسلمان عثمان دان فودیو کو اپنے وقت کا مجدد اور قطب سمجھتے ہیں۔ بانی سلطنت ہونے کے علاوہ عثمان ایک عظیم مصلح اور عالم دین بھی تھے۔ وہ کئی

کتابوں کے مصنف تھے، جن میں 'احیاء السنہ و اخماد البدعة' ان کی سب سے اہم کتاب ہے۔ یہ بڑی فکر انگیز کتاب ہے۔ مغربی افریقہ میں اس کتاب نے وہی کام کیا جو جزیرۃ العرب میں محمد بن عبدالوہاب کی کتاب 'التوحید' نے اور برصغیر پاکستان و ہند میں اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم" نے کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے اور اس کا ایک نسخہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد میں موجود ہے۔

عثمان دان فودیو کی تحریک کو عام طور پر فولانی جہاد کہا جاتا ہے، لیکن یہ قبائلی تحریک نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فولانی باشندے اس تحریک کے روح رواں تھے، لیکن تحریک اصلاح فولانیوں تک محدود نہیں تھی۔ ہاوسا مسلمان بھی اس تحریک میں شامل تھے جب کہ غیر مسلم فولانیوں نے عثمان دان فودیو سے جنگ کی۔ یہ درحقیقت ایک اصلاحی اور اسلامی تحریک تھی۔

عثمان دان فودیو کے بعد ان کے بڑے بیٹے سلطان محمد بلو (۱۸۱۷ء تا ۱۸۳۷ء) ان کے جانشین ہوئے۔ محمد بلو کے دور میں فولانی سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ جنوب مشرق میں آدماوا اور جنوب مغرب میں دریائے نائیجر کے پار الورین تک کا علاقہ فتح کر لیا گیا اور اس طرح تقریباً وہ سارا علاقہ فولانیوں کے زیر سیادت آ گیا جو برطانوی دور میں شمالی نائیجیریا کہلاتا تھا اور موجودہ نائیجیریا کے تین چوتھائی رقبہ پر مشتمل ہے۔

سلطان محمد بلو ایک قابل حکمران تھے اور اپنے باپ کی طرح عالم اور مصنف تھے۔ انہوں نے اسلام اور جغرافیے کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں کئی چھپ گئی ہیں۔ یہ کتابیں نائیجیریا کی تاریخ اور فولانی جہاد اور اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اس دور کی خصوصیات

فولانی سلطنت ایک مضبوط مرکزی حکومت نہیں تھی، بلکہ مختلف ریاستوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق تھی۔ ان ریاستوں میں کانو، آدماوا، باچی، کٹسینا، زاریا، سوکوٹو اور الورین بڑی ریاستیں تھیں۔ یہ تمام ریاستیں سلطان سوکوٹو کی بالادستی تسلیم کرتی تھیں جو سلطان سودان یا ہاوسا زبان میں سارکین مسلمان یعنی امیر المومنین کہلاتا تھا۔ محمد بلو کے بعد یہ تمام ریاستیں سوکوٹو کی بالادستی سے آزاد ہو گئیں۔ سوکوٹو کے موجودہ حکمران سر ابوبکر اور نائیجیریا کے مشہور رہنما احمد وبلو

(۱۹۰۹ء تا ۱۹۶۶ء) جو سوکوٹو کے سردونا (کمانڈر انچیف) کہلاتے تھے اور آزادی کے بعد شمالی نائیجیریا کے وزیر اعظم بنے عثمان دان فودیو کی اولاد میں سے ہیں۔

سلطان بلو کی وفات پر اگرچہ نائیجیریا کا مختصر عہد زرّیں ختم ہو گیا مگر جنوب کی سمت اسلامی اقتدار میں اس کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہا۔ دریائے نائیجر اور دریائے بینو کے سنگھم پر نوپے قبائل میں اٹھارہویں صدی سے ہی اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور نوپے حکمران جبریل (۱۷۳۰ء تا ۱۷۴۰ء) پہلا نوپے بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا تھا۔ فولانی دَور میں نہ صرف نوپے باشندوں میں، بلکہ نائیجیریا کے مغربی صوبے کے یوروبا باشندوں میں بھی اسلام کی توسیع و اشاعت کی رفتار تیز ہو گئی۔ فولانیوں نے نہ صرف یہ کہ نائیجیریا کے مسلم معاشرے کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کیا بلکہ شمالی نائیجیریا کو پہلی مرتبہ سیاسی وحدت سے روشناس کیا۔ اس سیاسی وحدت نے جلد ہی تہذیبی وحدت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ آج شمالی نائیجیریا کا مذہب اسلام ہے اور مشترکہ زبان ہاوسا ہے۔

اسلامی دَور میں نائیجیریا میں کئی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ اسلامی تعلیمات عام ہونے سے توہم پرستی کا خاتمہ ہوا۔ مردم خوری اور انسانی قربانی جیسی ظالمانہ رسوم بند ہو گئیں۔ ملک کو سیاسی استحکام حاصل ہوا اور عدالتی اور مالی نظام، اعلیٰ اصولوں پر مرتب ہوا۔ ملک میں پہلی مرتبہ علم و ادب کو فروغ ملا اور عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔ یہی دَور ہے جب نائیجیریا میں تاریخ لکھنے کا رواج ہوا اور پہلی مرتبہ بلند پایہ مصنف اور ادیب پیدا ہوئے۔ ہاوسا زبان کا رسم الخط تیار ہوا اور ایک نئے فن تعمیر کا آغاز ہوا جو سوڈانی فن تعمیر کہلاتا ہے۔ ایسے لباسوں کا رواج ہوا جو شمالی افریقہ کے ترقی یافتہ علاقوں میں پہنے جاتے تھے اور اس طرح تہذیبی لحاظ سے نائیجیریا اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کی باقی دنیا کی طرح نائیجیریا میں بھی غلامی کی رسم موجود تھی، لیکن اسلام نے غلاموں کو جو حقوق دیئے تھے ان کی وجہ سے اسلامی نائیجیریا میں غلام اس بربریت اور مظالم کا کبھی بھی شکار نہیں ہوئے جس کا شکار افریقی غلام یورپی تاجروں کے ہاتھوں کئی سو سال تک ہوتے رہے۔

انگریزوں کی آمد

انیسویں صدی میں جب انگریز سمندر کے راستے نائیجیریا پہنچے تو ملک کا جنوبی حصہ متعدد

قبائلی حکومتوں میں تقسیم تھا۔ وسطی اور شمالی حصوں میں فولانی ریاستیں اور بورنو کی حکومت قائم تھی۔ اس وقت تک نائیجیریا کا نام اختیار نہیں کیا گیا تھا اور سوکوٹو کا حکمران جس کی بالادستی تمام فولانی ریاستیں تسلیم کرتی تھیں، سلطان سوڈان کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۶۱ء میں بندرگاہ لاگوس پر قبضہ کرنے کے بعد جلد ہی جنوبی نائیجیریا کی مظاہر پرست حکومتوں کو اپنا محکوم بنالیا۔ اس کے بعد انہوں نے دریائے نائیجر اور دریائے بینو کو پار کر کے شمال کی مسلم ریاستوں پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں پولا اور کونٹا گارا اور ۱۹۰۲ء میں کٹسینا، کانو اور سوکوٹو پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اگلے سال بورنو کی ریاست بھی انگریزوں کے زیر اقتدار آ گئی اور اس طرح اس سارے علاقے پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی جو آج نائیجیریا کہلاتا ہے۔ نئی مملکت کا یہ نام انگریزوں ہی کا دیا ہوا ہے۔

(برطانوی تسلط کے بعد موجودہ زمانے تک نائیجیریا کی تاریخ اور وہاں کے معاشی اور سماجی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے، اس کتاب کا تیسرا حصہ)

نائیجیریا کے فولانی حکمران

(۱) عثمان دان فودیو	۱۸۰۴ء تا ۱۸۱۷ء
(۲) محمد بلو	۱۸۱۷ء تا ۱۸۳۷ء
(۳) ابوبکر عتیق	۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء
(۴) علی بابا	۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۹ء
(۵) احمد و عتیق	۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۶ء
(۶) علی بوکرامی	۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۷ء
(۷) ابوبکر عتیق دوم	۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۷ء
(۸) مُعز و	۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۱ء
(۹) عمر	۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۱ء
(۱۰) عبدالرحمن	۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۲ء
(۱۱) محمد الطاہر و	۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء

(۱۲) محمد الطاہر دوم ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۵ء

(۱۳) محمد ومیتو رارے ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۴ء

(۱۴) محمد و ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۱ء

(۱۵) حسن ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۸ء

(۱۶) ابوبکر ۱۹۳۸ء تا ـــــ

(۳) بورنو، ودائی اور بگیرمی

ہم پڑھ چکے ہیں کہ چودھویں صدی کے آخر میں کانم پر ایک غیر مسلم قبیلے بلالا [illegible] تھا جس کی وجہ سے کانم کے قدیم شاہی خاندان کو اپنا دارالحکومت جیمی چھوڑنا پڑا [illegible] شاہی خاندان کے ایک فرد علی ابن دوناما (۱۴۷۶ء تا ۱۵۰۳ء) نے جھیل چاڈ کے [illegible] گوشے میں جو بورنو کہلاتا ہے، نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ علی بن دوناما کے جانشین [illegible] (۱۵۰۳ء تا ۱۵۲۶ء) کے زمانے میں اگرچہ کانم پھر فتح کرلیا گیا، لیکن اب کانم کی تاریخ بورنو کی تاریخ بن گئی۔ بورنو اس وقت نائیجیریا کا ایک صوبہ ہے۔

ادریس الوما

بورنو کے حکمرانوں میں ادریس ابن علی (۱۵۷۰ء تا ۱۶۰۲ء) جو ادریس الوما کے نام سے مشہور ہے، سب سے نامور ہوا ہے۔ وہ دہلی کے تیموری حکمران اکبر کا ہمعصر تھا۔ ادریس الوما ایک دانشمند اور منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے بورنو کے قبائل کو متحد کیا اور مشرق اور مغرب میں سلطنت کو توسیع دی۔ اس کے عہد حکومت میں پہلی مرتبہ وسطی سوڈان کے علاقے میں بندوقوں کا استعمال شروع ہوا۔ یہ بندوقیں وہ ترک دستے اپنے ساتھ لائے تھے جن کو ادریس حج [illegible] نے کے بعد اپنے ساتھ بورنو لایا تھا۔ ادریس نے عربوں کی ایک اونٹ سوار فوج بھی تیار کی تھی۔

ادریس الوما کا سب سے بڑا کارنامہ محمد اسکیا اور عثمان دان فودیو کی طرح اسلام کی تجدید و احیاء ہے۔ اب تک بورنو کے شاہی خاندان میں غیر اسلامی اثرات اور رسوم موجود تھے، لیکن ادریس الوما کے عہد میں یہ اثرات ختم ہو گئے اور سلطنت کے تمام افراد مسلمان ہو گئے۔ اس کے عہد میں رواجی قانون کی جگہ شرعی قانون رائج کرنے کی کوشش کی گئی، اسلامی عدالتیں قائم کی گئیں

اور پہلی مرتبہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا گیا۔ اس دَور میں علاقہ چاڈ اور بورنو کے کئی مظاہر پرست قبائل نے اسلام قبول کیا۔

محمد کانمی

ادریس الوما کے بعد بورنو کی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ بورنو کے آخری دَور کے حکمرانوں میں محمد کانمی متوفی ۱۸۳۵ء کا نام بہت مشہور ہے۔ لیکن محمد کانمی کا تعلق کانم یا بورنو کے قدیم سیفی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ نسلاً عرب تھا اور لیبیا کے جنوبی صوبے فزان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے مصر میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے علم اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے ممتاز تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نائیجیریا میں عثمان دان فودیو نے تحریک اصلاح وتجدید شروع کر رکھی تھی، جسے فولانی جہاد کہا جاتا ہے۔ اس جہاد کے دوران جب ۱۸۰۸ء میں بورنو پر فولانیوں کا قبضہ ہو گیا تو سیفی خاندان کے حکمران نے محمد کانمی سے مدد طلب کی۔ محمد کانمی نے اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں سے کام لے کر بورنو کو فولانیوں کے تسلط سے آزاد کرا لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بورنو کا آمر مطلق بن گیا۔ قدیم سیفی خاندان اب بھی موجود تھا، لیکن اصل اقتدار اندلس کے المنصور کی طرح محمد کانمی کے ہاتھ میں تھا جس نے شیہو (Shehu) یعنی شیخ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ محمد کانمی کے بعد اس کا لڑکا عمر (۱۸۳۵ء تا ۱۸۸۰ء) اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد کانم اور بورنو کے علاقے میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور ۱۹۰۰ء میں کانم پر فرانس کا تسلط قائم ہو گیا۔

کانم اور بورنو کے سیفی خاندان کے حکمرانوں کا لقب مائی تھا۔ شروع میں ان کا دارالحکومت جیمی تھا، پھر 'انگازارگامو' اور اس کے بعد 'کوکا' دارالحکومت بنا۔ یہ تینوں شہر جھیل چاڈ کے قریب واقع تھے اور پہلا اور آخری شہر موجودہ نائیجیریا کی حدود میں واقع ہے۔

ربیع ابن فضل اللہ

بورنو میں ۱۸۸۰ء کے بعد جب طوائف الملوکی کا دَور دورہ ہوا تو ایک طالع آزما شخص ربیع ابن فضل اللہ بورنو اور اس سے متصل علاقوں پر قابض ہو گیا۔ وہ علاقہ چاڈ کی تاریخ کے ایک ایسے عبوری دَور سے تعلق رکھتا ہے جسے ہم قومی آزادی کی حفاظت کا دَور کہہ سکتے ہیں۔ افریقہ کے نصف شمالی حصے کی تاریخ کا ایک قابل غور پہلو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں یہاں کے مختلف حصوں

میں متعدد حوصلہ مند انسان پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر وسیع وعریض مملکتیں قائم کیں، لیکن آخر میں یہ سب بڑھتے ہوئے مغربی استعمال کا شکار ہو گئے۔ مہدی سوڈانی، احمد دلوبو، عمر تیجانی اور امام صمد یا سموری کا شمار ان ہی لوگوں میں سے ہے۔ یہ سب اسی نقشِ قدم پر چلے جس کی نشان دہی ان سے ذرا پہلے اسی صدی میں مغربی ترکستان میں کینے سری، مشرقی ترکستان میں یعقوب بیگ اور الجزائر میں امیر عبدالقادر کر چکے تھے۔ ربیع بن فضل اللہ کو بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، اگرچہ وہ کردار کے لحاظ سے ان سے بہت کمتر تھا۔ ربیع سوڈان کا رہنے والا تھا اور وہاں غلاموں کے ایک تاجر زبیر پاشا کا ملازم تھا۔ شروع میں یہ شخص غلام حاصل کرنے کے لیے سوڈان کے جنوبی حصوں میں چھاپے مارا کرتا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں اس نے غلاموں کی ایک فوج تیار کر لی جس کی مدد سے اس نے دو سال کے اندر بورنو، ودائی اور بگیرمی پر تسلط قائم کر لیا اور جھیل چاڈ کے جنوب میں 'ڈکوا' کے مقام پر جو اَب نائیجیریا میں شامل ہے، اپنا دارالحکومت قائم کیا۔ ربیع اب کانو کے مشرقی صوبوں پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ فرانسیسی فوجوں کی آمد کی وجہ سے اسے ۱۸۹۸ء میں بگیرمی واپس آنا پڑا۔ فرانسیسی فوجوں سے اس کے کئی سخت معرکے ہوئے اور آخر کار وہ ۱۹۰۰ء میں ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی موت سے فرانس کو کانم اور بورنو کے علاقہ میں اپنے سب سے بڑے دشمن سے نجات مل گئی اور فرانس اس علاقے پر آسانی سے قابض ہو گیا۔

ربیع ابن فضل اللہ اگرچہ کسی تحریک کا علمبردار نہیں تھا لیکن اس نے خود کو ایک زمانے میں مہدی سوڈانی سے وابستہ کر لیا تھا۔ ربیع کی فوج کی تعداد بیس ہزار تھی اور یہ اچھی تربیت یافتہ تھی۔ ان میں تقریباً پانچ ہزار سپاہی بندوقوں سے مسلح تھے۔ مغربی مصنفوں نے ربیع کو غلاموں کا تاجر، لٹیرا اور چھاپہ مار قرار دیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی معلومات نہیں کہ اس معاملے میں کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں اور علاقہ چاڈ کی قومی تاریخ میں ربیع کے مقام کا تعین کر سکیں۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ مغربی مصنفوں نے مہدی سوڈانی جیسی عظیم شخصیت کو بھی بدنام کرنے کی کم کوشش نہیں کی تھی، لیکن اب اسی مہدی سوڈانی کو سوڈان کی تحریک بیداری کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔

بگیرمی

بورنو کے بعد علاقہ چاڈ کی دوسری اہم مملکت بگیرمی کی تھی۔ یہ مملکت جھیل چاڈ کے جنوب مشرق میں دریائے شاری کی زیریں وادی میں واقع تھی۔ بگیرمی کی حکومت ۱۵۲۲ء کے قریب قائم ہوئی تھی۔ اس کے ابتدائی تین حکمران غیر مسلم تھے۔ چوتھے حکمران نے اسلام قبول کر کے اپنا نام عبداللہ (۱۵۶۸ء تا ۱۶۰۸ء) رکھا۔ اس نے اسلامی رسوم جاری کیے اور مبانگ کا لقب اختیار کیا جو آئندہ بگیرمی کے تمام حکمرانوں کا لقب بن گیا۔ عبداللہ نے بگیرمی کا سیاسی اور فوجی ڈھانچہ بورنو کے انداز پر قائم کیا۔ بگیرمی کی ریاست اگرچہ مائی ادریس الوما کے زمانے میں بورنو کی باجگذار بن گئی تھی لیکن بعد میں آزاد ہوگئی۔

بگیرمی کا سب سے مشہور حکمران محمد امین (۱۷۵۱ء تا ۱۷۸۵ء) ہوا ہے۔ اس کے زمانے میں بگیرمی کے باشندوں نے عام طور پر اسلام قبول کرلیا۔ آخر میں بگیرمی کی ریاست چاڈ کے مشرقی حصے میں واقع ایک دوسری ریاست ودائی کی باجگذار بن گئی۔ ۱۸۹۰ء میں بگیرمی کے سلطان گوارنگ دوم نے بگیرمی کو فرانس کے حوالے کر دیا۔ شروع میں فرانسیسیوں نے سلطان کے اختیارات قائم رکھے، پھر بتدریج اس کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا۔

ودائی

علاقہ چاڈ کی تیسری مسلم مملکت ودائی کی تھی۔ ودائی کا علاقہ بگیرمی اور سوڈان کے صوبے دارفور کے درمیان واقع ہے۔ سولھویں صدی کے آغاز میں اس علاقے پر تنجور قبائل حکمران تھے جو دارفور سے یہاں آئے تھے۔ تنجور قبائل کے ایک حصے نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا تھا لیکن ودائی میں اسلام کی اشاعت ایک شخص صالح نے کی، جس نے تنجور حکمران داؤد کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ جس طرح کانم کے حکمران 'مائی' اور بگیرمی کے حکمران 'مبانگ' کہلاتے تھے، اسی طرح ودائی کے حکمران 'کولاک' کہلاتے تھے۔ صالح پہلا کولاک تھا۔ ودائی کی حکومت شروع میں دارفور اور بورنو کی باجگذار تھی، لیکن محمد جودت (۱۷۴۵ء تا ۱۷۹۵ء) کے زمانے میں اس نے آزادی حاصل کرلی۔ محمد جودت نے جنوب میں مظاہر پرستوں کے علاقوں میں بھی سلطنت کو توسیع دی۔ اس کے زمانے میں سنار کی فنج مملکت سے بہت سے علماء اور

فقہاء ودائی پہنچے اور ودائی کے طلبہ سنار جا کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس طرح ودائی، علاقہ چاڈ میں اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

ودائی کے حکمرانوں میں عبدالکریم صابون (۱۸۰۳ء تا ۱۸۱۳ء) اور علی ابن شریف (۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۴ء) قابل حکمران ہوئے ہیں۔ ودائی کی بگیرمی سے اکثر لڑائیاں رہتی تھیں اور انیسویں صدی کے آغاز میں عبدالکریم صابون نے بگیرمی کو باجگذار بنالیا تھا۔ ودائی کی بگیرمی پر یہ بالادستی علی ابن شریف کے زمانے تک قائم رہی۔ اس کے بعد اس کے بھائی یوسف (۱۸۷۸ء تا ۱۸۹۸ء) کے دور میں بگیرمی نے ودائی سے آزادی حاصل کرلی۔ ودائی پر فرانس کا تسلط ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان قائم ہوا۔ فرانس نے بورنو، ودائی، بگیرمی، کانم اور دوسرے متصلہ علاقوں کو ملا کر چاڈ کے نام سے ایک نئی مملکت قائم کردی۔

[فرانسیسی تسلط کے بعد سے موجودہ دور تک چاڈ کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس تاریخ کا تیسرا حصہ]

(۴) مشرقی افریقہ

سلطنت زنج کے حالات کے تحت ہم پڑھ چکے ہیں کہ سلطنت زنج کے زوال کے بعد ممباسہ سے موزمبیق تک مشرقی افریقہ کے سارے ساحلی علاقہ پر پرتگالی قابض ہو چکے تھے۔ ان کا یہ اقتدار ۱۵۰۰ء سے ۱۶۵۰ء تک پورے ڈیڑھ سو سال قائم رہا۔ اس دوران میں ممباسہ اور دوسرے شہروں کے مسلمانوں نے بار بار بغاوتیں کیں، لیکن پرتگالیوں نے ہر بار ان کو سختی سے کچل دیا۔ ۱۶۵۰ء میں جزیرہ نمائے عرب میں عمان کے باشندوں نے پرتگالیوں کو مسقط سے نکال دیا۔ عمان کے لوگ شروع ہی سے ایک طاقتور بحری بیڑے کے مالک تھے اس لیے ممباسہ اور دوسرے شہروں نے پرتگالیوں کے خلاف ۱۶۵۲ء میں عمان سے مدد مانگی۔ اہل عمان نے پورے نصف صدی تک پرتگالیوں سے جنگ کی اور ایک ایک کرکے تمام بستیاں ان سے چھین لیں۔ ۱۶۹۸ء میں ایک طویل محاصرے کے بعد عمان کے عربوں نے ممباسہ بھی فتح کرلیا۔ ۱۶۹۹ء تک موزمبیق کے شمال میں پرتگال کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ عربوں نے کلوا، زنجبار اور پیمبا میں اپنے دستے تعینات کردیئے۔ مشرقی افریقہ اب سلطان عمان کے زیر اقتدار تھا۔ یہ صورت حال تقریباً سوا سو سال تک قائم رہی۔

سعید بن سلطان

۱۸۰۶ء میں سعید بن سلطان ....

(۱۸۰۶ء تا ۱۸۵۶ء) پندرہ سال کی عمر میں عمان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ کبھی مسقط میں رہتا تھا اور کبھی زنجبار میں۔ سعید جس وقت تخت نشین ہوا تو خلیج فارس میں بحری قزاقوں کا زور تھا اور مشرقی افریقہ پر عمان کا اقتدار کمزور پڑ گیا تھا۔ سعید بن سلطان نے سب سے پہلے بحری قزاقوں کا زور توڑا ... کے بعد اس نے ممباسہ، پمبا، زنجبار اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر اپنی گرفت مضبوط ... ۱۸... ء میں وہ مستقل طور پر زنجبار آ گیا اور اس کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اس کے بعد سے ... اور زنجبار کی حکومتیں علیحدہ علیحدہ ہو گئیں۔

... بن سلطان اور اس کے خاندان کو مشرقی افریقہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱۸۲۲ء میں سعید بن سلطان نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت برطانیہ نے افریقہ کے مشرقی ... پر سلطان کی بالادستی تسلیم کر لی اور سلطان نے غلاموں کی تجارت پر پابندی لگانا ... سلطان سعید جب زنجبار آیا تو وہ ایک غیر اہم جزیرہ تھا۔ اس نے اس علاقے کی ترقی کی طرف پوری توجہ دی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک 'لونگ' صرف جزائر شرق الہند میں پیدا ... سلطان سعید نے زنجبار میں لونگ کی کاشت شروع کی اور یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر کیا ... دنیا میں سب سے زیادہ لونگ زنجبار میں ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں غلاموں اور ہاتھی دانت کے کاروبار کو بھی فروغ ہوا اور تنزانیہ میں جھیل ٹانگانیکا کے کنارے 'یوجیجی' کے مقام تک چوکیاں قائم کر دی گئیں۔ زنجبار سے جو قافلے اندرون ملک جاتے تھے وہ سلطان کا سرخ جھنڈا ... تے تھے۔ سلطان نے تجارت کو فروغ دینے کے لیے بیرونی ملکوں کے تاجروں کی حوصلہ ... میں ... کے ہندو تاجر بھی شامل تھے۔ ان ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی تھی اور ... نہیں لیا جاتا تھا۔ زنجبار کی مالیات کا انتظام بھی ان ہی ہندوؤں کے ... ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ زنجبار جو مچھیروں کی معمولی بستی تھی سلطان ... کے وقت ... ہزار آبادی کا شہر بن گیا۔

سلطان سعید کے انتقال کے بعد انگریزوں کے دباؤ کے تحت، جواب مشرقی افریقہ کے

معاملات میں مداخلت کرنے لگے تھے، سلطنت عمان سلطان سعید کے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ سب سے بڑے لڑکے کو عمان ملا، اور دوسرے لڑکے مجید (۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۰ء) کو زنجبار ملا۔ مجید کے بعد اس کا بھائی برغش (۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۸ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں انگریزی دباؤ کے تحت زنجبار سے غلاموں کی برآمد بند کردی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں ٹانگانیکا پر جرمن قابض ہوگئے۔ ۱۸۸۷ء میں ٹانگانیکا کے شمال میں سارا ساحلی علاقہ برطانیہ نے سلطان سے پٹہ پر لے لیا اور ۱۸۹۰ء میں زنجبار پر بھی قبضہ کرلیا۔ سلطان کو جزیرہ زنجبار کے حکمران کی حیثیت سے قائم رکھا، لیکن ساحلی علاقہ براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا۔ ساتویں سلطان حمود کے زمانے میں ۱۸۹۷ء میں غلامی قانوناً ختم کردی گئی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زنجبار کے عربوں کے اس دور میں مشرقی افریقہ میں غلاموں کی تجارت نے بہت فروغ پایا اور انیسویں صدی کے آغاز میں تقریباً پندرہ ہزار غلام، ہر سال عرب، مصر اور ایران، بھیجے جاتے تھے۔ لیکن غلاموں کی یہ تجارت اور ان کو حاصل کرنے کے لیے چھاپے مارنا بلاشک وشبہ ایک ناپسندیدہ اور خلاف انسانیت فعل تھا، لیکن مشرقی افریقہ میں غلاموں کی اس تجارت اور مغربی افریقہ میں غلاموں کی اس تجارت کے درمیان جو یوروپی قومیں تین سو سال تک کرتی رہیں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ خود یوروپی مورخ اس بات کے معترف ہیں کہ مشرقی افریقہ میں غلاموں کو پکڑنے کے بعد وہ انسانیت سوز سلوک نہیں کیا جاتا تھا جو غلاموں کے یوروپی تاجران سے کیا کرتے تھے اور پھر ان غلاموں کو فروخت کردینے کے بعد تو بدسلوکی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی حالت غلام ہونے کے باوجود آزادوں کے لیے قابل رشک ہوتی تھی۔ ان سے کھیتوں اور کانوں میں مشقت نہیں لی جاتی تھی بلکہ وہ اپنے سرپرست خاندان کے قابل اعتماد رکن اور خادم ہوتے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوجاتے تھے۔ سترھویں صدی میں احمد نگر کے نظام شاہی دور میں ملک عنبر کی عظیم شخصیت اس کی ایک روشن مثال ہے۔

اندرون ملک بھی اس زمانے میں کئی شہر قائم ہوئے۔ سلطان سعید کے زمانے میں یوجیجی اور تبورا آباد ہوئے اور سلطان مجید کے زمانے میں ۱۸۶۲ء میں دارالسلام آباد ہوا جو اب تنزانیہ کا صدر مقام ہے۔ یہاں سلطان نے اپنے لیے محل اور ضروری عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ دارالسلام کی

مشہور (acacia avenue) نامی سڑک اسی دَور کی تعمیر ہے۔

مشرقی افریقہ پر مسلمانوں کے اثرات صرف زنجبار، کینیا اور تنزانیہ کے ساحل تک محدود نہیں رہے۔ نیا سالینڈ اور یوگنڈا کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر بھی عربوں اور مقامی مسلمانوں نے گہرے اثرات ڈالے ہیں لیکن ان علاقوں میں مسلمان مستقل حکومت نہیں قائم کر سکے۔

اریٹیریا اور صومالیہ

جہاں تک مشرقی افریقہ کے اس گوشہ کا تعلق ہے جہاں صومالیہ اور حبش واقع ہیں تو اس کی تاریخ پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔ زیلع کا مشہور تاریخی شہر جو عدل کی مسلم حکومت میں شامل تھا اور حبش کی بندرگاہ کہلاتا تھا آج صومالیہ ہی کی حدود میں ہے اور موجودہ بندرگاہ جیبوتی کے قریب واقع تھا۔ یہ شہر اسلامی دَور میں صرف تجارتی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہاں بڑے بڑے اہل علم اور مصنف بھی پیدا ہوئے ہیں، جو تاریخ میں زیلعی کے نام سے مشہور ہیں۔ عدل کی سلطنت زیلع کی سلطنت بھی کہلاتی تھی اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں زیلع کی یہ سلطنت دراصل حبش قدیم کا ایک حصہ تھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب حبش کی موجودہ حدود قائم ہوئیں تو اس وقت حبش کے شمال مشرق میں اری ٹیریا کا پہاڑی علاقہ حبش کے تحت تھا اور ساحلی علاقہ صومالیہ کے جنوبی حصے تک مصری حکومت کے قبضہ میں تھا۔ اسی زمانے میں یورپی حکومتوں نے مشرقی افریقہ میں مداخلت شروع کر دی جس کے نتیجے میں ۱۸۸۵ء میں اٹلی نے اری ٹیریا پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے ساحلی علاقوں پر جو اَب صومالیہ کہلاتا ہے مسلمانوں کی متعدد حکومتیں قائم تھیں۔ اری ٹیریا کے بعد یورپی حملہ آوروں نے ادھر کا رخ کیا اور ۱۸۸۵ء میں اس کے ایک حصہ پر برطانیہ نے، دوسرے حصے پر فرانس نے اور ۱۸۸۹ء میں تیسرے حصے پر اٹلی نے قبضہ کر لیا اور ان تینوں حصوں کو وہاں کی قابض حکومتوں کی نسبت سے برطانوی صومالی لینڈ، فرانسیسی صومالی لینڈ اور اطالوی صومالی لینڈ کا نام دیا گیا۔ حبش سے مسلمانوں کا اقتدار پہلے ہی ختم ہو گیا تھا، اب مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں سے بھی اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

صومالیہ میں جن حریت پسندوں نے برطانوی اور اطالوی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کیا ان

میں محمد بن عبداللہ حسن کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک برطانیہ اور اٹلی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن ان سامراجی طاقتوں نے صومالی قبائل کو روپیہ دے کر ملا لیا جس کی وجہ سے محمد بن عبداللہ کو ناکامی ہوئی اور وہ حبش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، جہاں ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ محمد بن عبداللہ نے چونکہ برطانوی فوجوں کا آخر دم تک سخت مقابلہ کیا تھا اس لیے ہمعصر انگریز مصنف ان کو ''پاگل ملا'' کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

خاندان سعید بن سلطان (زنجبار)

(۱) سید سعید بن سلطان	۱۸۰۶ء تا ۱۸۵۶ء
(۲) مجید	۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۰ء
(۳) برغش	۱۸۷۰ء ۱۸۸۸ء
(۴) خلیفہ اوّل	۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۰ء
(۵) علی	۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۳ء
(۶) حمید	۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۶ء
(۷) حمود	۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۲ء
(۸) علی دوم	۱۹۰۲ء تا ۱۹۱۱ء
(۹) خلیفہ دوم	۱۹۱۱ء

(۵) سوڈان

ہم پڑھ چکے ہیں کہ فنج خاندان کے زوال کے بعد جب سوڈان انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا تو مصر کے عثمانی والی محمد علی پاشا نے ۱۸۲۰ء میں نوبیہ اور اس کے اگلے سال سنار فتح کر لیا۔ اس کے بعد مصری حدود آہستہ آہستہ جنوب کی طرف بڑھتی گئیں یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں استوائیہ (equatoria) یعنی موجودہ سوڈان کا انتہائی جنوبی صوبہ بھی مصری سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح موجودہ سوڈان وجود میں آیا۔ عرب بحیرۂ قلزم سے بحر اوقیانوس تک

سارے صحرائے اعظم کو اور اس سے متصل جنوبی حصوں کو ارض سوڈان کہہ کر پکارتے تھے، لیکن آخر میں یہ اصطلاح مصر کے جنوب میں واقع دریائے نیل کی وادی کے لیے مخصوص ہوگئی۔

مہدی سوڈانی (۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۵ء)

مصریوں نے سوڈانی باشندوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جس کا سوڈانیوں پر شدید ردعمل ہوا اور ۱۸۸۳ء میں انہوں نے ایک درویش محمد احمد کی رہنمائی میں جو مہدی سوڈانی کے نام سے مشہور ہیں علم بغاوت بلند کر دیا۔ مہدی سوڈانی کے پیرووں نے جو درویش کہلاتے تھے دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ چنانچہ مصری حکومت نے جو انگریزوں کی محکوم تھی بغاوت کچلنے کے لیے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن گورڈن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ۲۶۔ جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہوگیا۔ مہدی سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے، بلکہ نائیجیریا کے عثمان دان فودیوں کی طرح ایک مصلح بھی تھے۔ انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مصر میں جمال الدین افغانی سے بھی ملاقات کی تھی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ اپنی تمام زندگی احکام اسلام کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سوڈان کے شہر بربرہ میں اپنے استاد کا پیش کیا ہوا کھانا محض اس وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا کہ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے مرشد سے محض اس وجہ سے قطع تعلق کر لیا کہ شیخ نے اپنے بچوں کی ختنہ کی تقریب میں ناچ گانے کا انتظام کیا تھا۔

۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدی سوڈانی تصوف کے سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہوگئے۔ انہوں نے کئی سال سے دریائے نیل کے ایک جزیرے آبا (ABA) میں رہائش اختیار کر لی تھی اور یہیں سے انہوں نے اپنی تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک ۲۹۔ جون ۱۸۸۱ء کو اس وقت شروع ہوئی جب مہدی سوڈانی نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب وسنت کی بالادستی قائم کرنے

کی دعوت دی اور کہا کہ اس مقصد کے لیے تیار رہنا چاہیے اور یہ کہ ان کے پیروؤں کو چاہیے کہ وہ ہجرت کر کے جزیرہ آبا میں آ جائیں، پس اس واقعہ کے بعد سے سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوئیں۔

مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل ام درمان کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ مہدی سوڈانی نے حکومت سنبھالتے ہی اصلاحات شروع کر دیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے۔ ان لوگوں کو جن کو سابقہ حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا، ان کو ان کی زمینیں واپس کر دی گئیں۔ ان رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں، شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور عورتوں کو پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ شادی بیاہ پر فضول خرچیوں سے روکا گیا اور جہیز پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ مہدی سوڈانی اپنے پیروؤں سے حسب ذیل حلف لیتے تھے:

"ہم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خیرباد کہہ دیں گے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے کام کریں گے اور جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے"

برطانوی تسلط

مہدی سوڈانی کا جانشین خلیفہ عبداللہ (۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۸ء) حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہو گیا اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچنر کی قیادت میں ۱۸۹۸ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن جدید اسلحہ سے لیس فوج کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر ۱۸۹۹ء میں جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں مشہور درویش سپہ سالار عثمان دغنہ جس نے مہدی سوڈانی کے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا تھا گرفتار ہو گیا۔ کچنر نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا دی اور ان کی

ہڈیاں جلا ڈالیں۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء میں درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں، لیکن وہ کچل دی گئیں۔

انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروؤں کو اپنے دور میں بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اب سوڈان میں مہدی محمد احمد کو سوڈان کی تحریک بیداری کا پیش رَو سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ہڈیاں اگرچہ کچنر نے قبر سے نکلوا کر جلا ڈالیں لیکن ام درمان میں ان کا مقبرہ آج سوڈان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

(برطانوی تسلط کے بعد صومالیہ اور سوڈان کے دورِ جدید کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس تاریخ کا تیسرا حصہ)

اہم واقعات

۱۴۴۲ء پرتگالی جہاز ران خلیج گنی پہنچے اور نیگرو باشندوں کو غلام بنا کر لے گئے اور اس طرح یورپ میں نیگرو باشندوں کو غلام بنا کر انکی خرید و فروخت کا کاروبار شروع ہوا۔

۱۵۰۱ء جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) میں نیگرو غلاموں کی درآمد اور غلاموں کی تجارت کا زور شور سے شروع ہونا۔ سترھویں صدی میں برطانیہ غلاموں کا سب سے بڑا تاجر بن گیا۔ اسپین سے ایک معاہدہ کے تحت برطانیہ ہر سال چار ہزار آٹھ سو غلام امریکہ کی ہسپانوی نو آبادیوں کو تیس سال تک بھیجتا رہا۔

۱۵۰۵ء تا ۱۵۰۷ء پرتگالیوں نے صوفالا اور کلوا پر قبضہ کر لیا اور موزمبیق کی بنیاد ڈالی۔ تقریباً دو سو سال تک افریقہ کا مشرقی ساحل ان کے زیر اثر رہا۔

۱۶۴۵ء سینیگال میں فرانس نے سینٹ لوئی کی بنیاد ڈالی۔

۱۶۹۸ء پرتگالی مشرقی افریقہ سے بے دخل کر دیئے گئے۔

۱۷۲۰ء فوتا جلوں (گنی) میں شرعی حکومت کا قیام۔

۱۸۰۴ء فولانی جہاد کا آغاز جو ۱۹۱۰ء تک جاری رہا۔

۱۸۱۰ء احمد ولوبو متوفی ۱۸۴۴ء نے مالی میں شرعی حکومت قائم کی۔

۱۸۲۸ء انگریزوں کا ممباسہ پر قبضہ۔

۱۸۴۰ء سید سعید نے زنجبار کو دارالحکومت بنایا۔

۱۸۴۹ء گنی پر فرانس کا قبضہ۔

۱۸۵۴ء تا ۱۸۶۵ء فرانس کا سینیگال پر قبضہ۔ حاجی عمر تجانی سے جنگ۔

۱۸۶۱ء انگریزی دباؤ کے تحت عمان کی سلطنت عمان اور زنجبار دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ لاگو میں (نائیجیریا) پر انگریزوں کا قبضہ۔

۱۸۶۲ء برطانیہ اور فرانس نے زنجبار کی آزادی تسلیم کر لی۔ دارالسلام کی بنیاد پڑی۔

۱۸۸۱ء فوتا جلوں (گنی) پر فرانس کا قبضہ (۲۹۔ جون کو مہدی سوڈانی کی تحریک کا آغاز)

۱۸۸۳ء (۵۔ نومبر) سوڈان میں الغبید کی جنگ۔ مہدی سوڈانی نے جنرل ہکس کو شکست دی۔

۱۸۸۵ء (۲۶۔ جنوری) خرطوم پر مہدی سوڈانی کا قبضہ۔ ۲۱۔ جون کو مہدی کی وفات۔ ٹانگا پر جرمنوں کا قبضہ، اریٹیریا پر اٹلی کا اور شمالی صومالیہ پر فرانس اور برطانیہ کا قبضہ۔ اسپین کا ریوڈی اورو پر قبضہ۔ برلن کانفرنس میں افریقہ کی تقسیم پر مفاہمت۔

۱۸۸۷ء برطانیہ کے کینیا کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۸۹ء اٹلی کا جنوبی صومالیہ پر قبضہ۔

۱۸۹۰ء (۱۴۔ جون) زنجبار پر انگریزوں کا قبضہ۔ سیگو پر فرانس کا قبضہ۔

۱۸۹۳ء جنہ اور ٹمبکٹو پر فرانس کا قبضہ۔

۱۸۹۸ء (۲۔ ستمبر) جنگ ام درمان۔ درویشوں کی شکست اور خرطوم پر انگریزوں کا قبضہ۔ ۲۹۔ ستمبر کو کولا کی جنگ میں فرانسیسیوں کی فتح اور امام صمد کی گرفتاری۔

۱۹۰۰ء کانم اور چاڈ پر فرانس کا قبضہ۔

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۳ء شمالی نائیجیریا پر انگریزوں کا قبضہ۔

۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۱ء ودائی (چاڈ) پر فرانس کا قبضہ۔

باب ۳۶

اسلامی دنیا کی بیداری

اٹھارہویں اور انیسویں صدی مسلمانوں کے صرف سیاسی زوال کی صدیاں نہیں تھیں مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور علمی زوال کی صدیاں بھی تھیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مذہبی، علمی اور معاشرتی میدانوں میں مسلمانوں کا زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسلامی عقائد کے پیچھے جو روح کارفرما تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ اسلام نے ایک رواجی مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی اور مسلمان حکمرانوں کے سامنے فتوحات، ملک گیری، شہرت اور ناموری کے علاوہ کوئی اعلیٰ مقصد سامنے نہیں رہا تھا۔ عوام و خواص میں تلاش و جستجو کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ ریاضی، طب اور علوم حکمت یعنی طبیعیات اور سائنس سے مسلمان زوال بغداد کے بعد ہی دست بردار ہو گئے تھے، لیکن اب دینی علوم میں بھی اجتہاد کو ترک کر دیا گیا اور علماء کا کام دورِ اول کے علماء کی کتابوں کی تشریح کرنا اور ان پر حاشیے لکھنا رہ گیا تھا۔ ذہنی جمود کا یہ عالم تھا کہ علماء اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ دورِ اول کے اہل علم جو کچھ لکھ گئے اب اس پر اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ سیر و سیاحت کا جذبہ جو قوموں میں زندگی کی علامت ہوتا ہے سرد پڑ چکا تھا۔ زوالِ بغداد سے پہلے ہمیں ایک سے ایک بڑے سیاح نظر آتے ہیں، لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایک بھی قابل ذکر سیاح نظر نہیں آتا۔ چودہویں صدی میں ابن خلدون ہمارا آخری بڑا مفکر ہے۔ اس کے بعد ایک بھی ایسا مفکر نظر نہیں آتا جس نے علم و افکار کی دنیا میں کوئی اضافہ کیا ہو۔

اسلامی روح چونکہ مردہ ہو چکی تھی اس لیے مسلمانوں میں طرح طرح کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ امراء کا کام عیش و عشرت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ شراب خوری جو کبھی مسلمانوں میں عام نہیں ہوئی دورِ زوال میں خاصی عام ہو گئی تھی۔ ایک مسلمان عورت کا طوائف بننا تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا لیکن اس زمانے میں یہ بھی ممکن ہو گیا۔ بددیانتی اور فرض سے کوتاہی مسلمانوں کا شعار بن گئی تھی۔ ابتدائی اسلامی معاشرے میں انسان کی عظمت کا معیار صرف تقویٰ تھا لیکن اب

خصوصاً اسلامی ہند میں مسلمانوں میں حسب ونسب کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور مسلم معاشرہ اشراف اور رذیل دو طبقوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اسلام کے عائلی قوانین کی جگہ رواجی قوانین کو ترجیح دی جاتی تھی پٹھان اور ترک پختون ولی اور چنگیز خانی قوانین سے ابھی تک پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔ اسلام کے قانون وراثت پر بھی پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا تھا اور میراث کی تقسیم مقامی رواجوں کے مطابق ہوتی تھی۔ زکوٰۃ کا وہ نظام جس کی بدولت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مسلمانوں میں اتنی خوشحالی حاصل ہوگئی تھی کہ زکوٰۃ لینے والے نہیں ملتے تھے، اب بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا اور انفرادی ذمہ داری تک محدود رہ گیا تھا۔

سب سے اہم بات یہ کہ اسلام جس کی بنیاد خالص توحید پر ہے اور جس میں شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں، تصوف کے نظام کے زوال، اس کے اصل اسلام سے ہٹ جانے اور غیر اسلامی نظریات کی آمیزش کی وجہ سے اسلام شرک اور بدعت کا مجموعہ بنتا جا رہا تھا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں اسلامی دنیا اٹھارہویں صدی تک پوری طرح مبتلا ہو چکی تھی۔ شروع میں تو ان کمزوریوں اور خرابیوں کو اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی کہ مسلمانوں کو ہر جگہ سیاسی غلبہ حاصل تھا جس نے تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال رکھا تھا، لیکن اٹھارہویں صدی میں جب سیاسی اقتدار کی عمارت دھڑام سے گر پڑی اور غیر اسلامی قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو یہ تمام کمزوریاں نمایاں ہوگئیں اور مسلمان ان کمزوریوں کے اسباب اور ان کو دور کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اصل اسلام سے بہت دُور چلے گئے تھے اور کتاب وسنت کو نظر انداز کر کے تقلید جامد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے علماء میں جنہوں نے اس انداز پر سوچا ان میں ایک شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جن کے حالات پچھلے صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں اور دوسرے عالم نجد کے محمد بن عبدالوہاب ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ تا ۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ)

محمد بن عبدالوہاب عرب کے علاقے نجد میں اسی سال پیدا ہوئے جس سال دہلی میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ وہ بڑے ذہین اور حافظہ کے قوی تھے۔ دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر قرآن اور حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس وقت باقی اسلامی دنیا کی طرح نجد اور عرب کے مسلمانوں میں بھی طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ لوگ بزرگوں کی قبروں پر جا کر ان سے مدد مانگا کرتے تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن سے شریعت نے روکا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب تعلیم ختم کرنے کے بعد ان برائیوں اور بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے میدان عمل میں اتر پڑے۔ انہوں نے لوگوں کو کتاب و سنت کی طرف بلایا، خالص توحید کی دعوت دی، قبروں اور انسانوں سے مدد مانگنے اور مرادیں چاہنے سے روکا اور قبروں کی زیارت میں مسنون طریقوں کے خلاف جو بدعتیں رائج ہوگئی تھیں ان کو مٹانے کے لیے عملی قدم اٹھایا۔ بس اب کیا تھا سارے ملک میں ان کی مخالفت کا طوفان اٹھ گیا۔ قبر پرستوں اور مجاوروں نے اس لیے مخالفت کی کہ محمد بن عبدالوہاب کی کامیابی کی صورت میں ان کے ہاتھ سے روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہاتھ سے نکل جائے گا جس سے وہ صدیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور امراء کے طبقے نے اس لیے مخالفت کی کہ کتاب و سنت پر عمل کرنے کے بعد ان کو عیاشیوں، بدکاریوں اور عوام پر ظلم و ستم کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

محمد بن عبدالوہاب کئی سال تک وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اس راہ میں ان کو طرح طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ان تکالیف کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام کو جاری رکھا۔ آخر کار ۱۱۵۸ء کے قریب نجد کے ایک شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود متوفی ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ ہاتھ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے کا عہد کیا اور کتاب و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ امیر محمد بن سعود کی مدد سے ان کی تحریک سارے نجد میں پھیل گئی اور امیر کی حکومت بھی شہر درعیہ سے بڑھ کر سارے نجد میں قائم ہوگئی۔

محمد بن عبدالوہاب نے پچاس سال تبلیغ و اصلاح کا کام انجام دینے کے بعد ۱۷۹۲ء میں وفات پائی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''کتاب التوحید'' بہت اہم ہے۔ اس کتاب کی احیاءِ اسلام کی تاریخ میں وہی اہمیت ہے جو اسلامی ہند میں شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کی اور مغربی افریقہ میں عثمان دان فودیو کی ''احیاء السنۃ'' کی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح نے اسلامی دنیا پر گہرا اثر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ نائیجیریا کے مصلح عثمان دان فودیو اور

مالی کے عظیم مصلح احمد ولوبو دونوں محمد بن عبدالوہاب سے متاثر تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے خیالات پر بھی محمد بن عبدالوہابؒ کا اثر پڑا ہے۔ اگرچہ اس دعویٰ کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتاب التوحید اور محمد بن عبدالوہاب کی دوسری تصانیف سید اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے ۱۸۲۰ء میں حج پر جانے سے بہت پہلے عرب میں عام ہو چکی تھیں۔ بہرحال ان مصلحین کا ایک دوسرے پر اثر پڑا ہو یا نہ ہو لیکن ان کے خیالات کی ہم آہنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اٹھارہویں صدی میں اہل فکر مسلمان علماء کے سوچنے کا انداز تقریباً یکساں تھا اور وہ سب مسلمانوں کو اپنی خرابیاں دُور کرنے کے لئے کتاب و سنت کی طرف بلا رہے تھے۔

ان تمام مصلحین کے درمیان ایک اور مشترک بات یہ ہے کہ ان میں سے سب ایسی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو انیسویں صدی میں اسلامی حکومت کا مکمل ترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ عثمان دان فودیو نے نائیجیریا میں، احمد ولوبو نے مالی میں اور سید احمد شہید نے پشاور میں حکومتیں قائم کیں۔ محمد بن عبدالوہاب ان میں زیادہ خوش قسمت تھے کہ ان کے زیر اثر جو حکومت قائم ہوئی وہ زیادہ پائیدار ثابت ہوئی اور وہ آج تک اسلامی دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

مملکت سعودیہ

درعیہ کی اسلامی حکومت کے پہلے امیر محمد بن سعود کا محمد بن عبدالوہاب ہی کی زندگی میں ۱۷۶۵ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کا لڑکا امیر عبدالعزیز (۱۷۶۵ء تا ۱۸۰۳ء) تخت نشین ہوا جس کے زمانے میں سعودی حکومت بحرین اور ساحل عمان تک پھیل گئی۔ اس کے بعد سعود بن عبدالعزیز (۱۸۰۳ء تا ۱۸۱۴ء) کے دَور میں سعودی حکومت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ حجاز پر بھی سعودیوں کا قبضہ ہو گیا اور سعودی فوجیں بصرہ، کربلا اور شام تک چھاپے مارنے لگیں۔

سعودی حکومت کے قائم ہو جانے سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جزیرہ نمائے عرب میں جہاں چوری ڈکیتی عام تھی اور بڑے بڑے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے ایسا امن قائم ہوا کہ خلافت راشدہ کے بعد کبھی ایسا امن قائم نہیں ہوا اور مساوات کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے قبیلے کے سردار کو یک وتنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا۔ اس دَور میں ناجائز

ٹیکس اٹھا لیے گئے، شراب نوشی اور دوسری نشہ آور چیزوں کا استعمال جو عرب میں عام ہو گیا تھا ختم کر دیا گیا۔ قبر پرستی اور اسی قسم کی دوسری بدعتیں ختم ہو گئیں اور شریعت پر لوگوں کا عمل بڑھ گیا۔ لڑائیوں میں اسلامی اصولوں کے مطابق عمل کیا جاتا تھا اور مالِ غنیمت منصفانہ طریقہ پر سب فوج میں تقسیم ہوتا تھا۔ حکومت اگرچہ موروثی تھی لیکن حکمران اور عوام کے ایک فرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں تھا۔ حکمران بادشاہ کی بجائے امیر کہلاتا تھا۔ امیر سعود عام لوگوں کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتا تھا۔ سب کے ساتھ قرآن و حدیث کے درس میں شریک ہوتا تھا اور خود بھی درس دیتا تھا۔ تمام فیصلے علماء کے مشورے سے کیے جاتے تھے۔ نظام حکومت ملوکیت پر مبنی تھا لیکن حکومت کسی طرح استبدادی حکومت نہیں تھی۔

سعودی حکومت کا سلطنت عثمانیہ سے ٹکراؤ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ سلطان محمود ثانی کا زمانہ تھا کہ حجاز پر سعودیوں کا قبضہ ہو گیا۔ عثمانی سلطان نے مصر کے والی محمد علی پاشا کو آل سعود کے خلاف کاروائی کرنے کا حکم دیا۔ یہ جنگ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۸ء تک جاری رہی۔ امیر سعود کا لڑکا عبداللہ (۱۸۱۴ء تا ۱۸۱۸ء) اپنی شجاعت کے باوجود عثمانی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ محمد علی کے لڑکے ابراہیم پاشا نے ۱۸۱۸ء میں درعیہ پر قبضہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابراہیم کی فوج کے سپاہی شرابی تھے، عیاش تھے۔ عام طور پر دینی فرائض سے غافل تھے انہوں نے جو ظلم و ستم کیا اور عورتوں کی جس طرح بے آبروئی کی وہ مسلمانوں کے لیے باعث شرم رہے گی، لیکن ان کا یہ طرز عمل مسلمانوں کے گرتے ہوئے اخلاق کا ایک ثبوت ضرور ہے۔ اس طرح یہ اسلامی تحریک کچھ عرصے کے لیے خود مسلمانوں کے ہاتھوں کچل دی گئی۔ لیکن نظریات مرتے نہیں ہیں۔ تقریباً ایک صدی کے بعد سعودی خاندان نے عرب پر پھر اقتدار قائم کر لیا اور پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح زندہ ہو گئی، لیکن اس زمانے کے حالات ہماری تاریخ کے اس حصے کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کے لیے تیسرا حصہ ملاحظہ کیجیے۔

سعودی حکومت حجاز میں بزرگوں کی قبروں کو ڈھانے اور ان پر بنے ہوئے قبوں کو گرانے کی وجہ سے بہت بدنام ہے، لیکن انہوں نے یہ کام ان احادیث کے مطابق کیا جن میں پختہ قبریں بنانے اور ان پر قبے تعمیر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین کی یہ قبریں مشرکانہ رسوم اور بدعتوں کا مرکز بن گئی تھی۔ سعودی حکومت کو بدنام کرنے میں ان مجاوروں اور قبر

پرستوں کا بڑا ہاتھ ہے جن کی روزی ان قبروں سے وابستہ تھی اور جو مقبروں کے منہدم ہونے کے بعد مفت خوری کی روزی سے محروم ہو گئے تھے۔ سلطنت عثمانیہ اور انگریزوں نے بھی سعودی حکمرانوں کو بدنام کیا۔ ان کے بارے میں غلط یا مبالغہ آمیز خبریں ساری دنیا میں پھیلائیں، یہ دونوں حکومتیں آلِ سعود کی حریف تھیں۔ عثمانی ترکوں سے ان کا براہِ راست ٹکراؤ تھا اور خلیج فارس کے ساحلی علاقہ پر سعودی قبضہ وہاں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر کی راہ میں حائل تھا اور انگریزوں نے امیر عمان سعید بن سلطان کو شہ دے کر آلِ سعود سے لڑا دیا تھا۔ اسی زمانے میں اسلامی ہند میں تحریک مجاہدین قوت پکڑ رہی تھی اس کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان میں مشہور کیا کہ یہ لوگ بھی محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کے عقیدے کے بارے میں طرح طرح کی غلط باتیں مشہور کیں اور ان کو وہابی فرقہ کا بانی قرار دیا۔ حالانکہ محمد بن عبدالوہاب کسی نئے فرقے کے بانی نہیں تھے۔ وہ اہل سنت کے حنبلی مدرسے کے پیرو تھے اور ان کا مقصد کتاب وسنت کے احیاء کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

(دورِ جدید میں سعودی مملکت کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا تیسرا حصہ)

سعودی خاندان

پہلا دَور

(۱) محمد بن سعود	۱۷۳۴ء/	۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ تا
(۲) عبدالعزیز بن محمد	۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ	تا ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ
(۳) سعود بن عبدالعزیز	۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ	تا ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ
(۴) عبداللہ بن سعود	۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ	تا ۱۸۱۸ء/۱۲۳۳ھ

دوسرا دَور

(۱) عبدالعزیز (ابن سعود)	۱۹۰۲ء	تا ۱۹۵۳ء
(۲) سعود بن عبدالعزیز	۱۹۵۳ء	تا ۱۹۶۴ء

(۳) فیصل بن عبدالعزیز ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۵ء

(۴) خالد بن عبدالعزیز ۱۹۷۵ء تا ـــــــ

سنوسی تحریک

تقریباً اسی زمانے میں جب عرب میں آلِ سعود کو عروج حاصل ہو رہا تھا اور محمد بن عبدالوہاب کی تحریک پھیل رہی تھی، شمالی اور مغربی افریقہ میں بھی ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک سنوسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بانی ایک بزرگ محمد بن علی سنوسی (۱۷۹۱ء تا ۱۸۵۱ء) ہوئے ہیں۔ انہوں نے لیبیا کے صحرا میں جغبوب کے نخلستان میں ۱۸۳۷ء میں اس تحریک کا مرکز قائم کیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اخلاق و عادات میں بالکل قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح بنا دیا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے افریقہ کے حبشی باشندوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کی۔ سنوسی تحریک کی وجہ سے مغربی افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں میں بسنے والے لاکھوں وحشی اور نیم وحشی باشندوں نے اسلام قبول کیا اور مہذب انسانوں کی طرح زندگی گذارنے لگے۔

شاہ ولی اللہ، محمد بن عبدالوہاب اور محمد بن علی سنوسی کی تحریکیں خالص مذہبی تحریکیں تھیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح تھا۔ اس زمانے میں چونکہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ شراب، جُوا عام تھا، دیانت اور ایمانداری ختم ہوگئی تھی۔ مسلمان محنت سے جی چراتے تھے، عیش اور آرام کی زندگی گذارنا چاہتے تھے۔ ایک خدا کی عبادت کی بجائے پیروں اور قبروں کی زیارت کر کے مقصد پورا کرنا چاہتے تھے، غریبوں کا خیال نہیں تھا اس لیے ان بزرگوں کا مقصد ان خرابیوں کو دُور کرنا تھا اور بات ٹھیک بھی ہے، جب تک کسی قوم میں یہ خرابیاں موجود ہوں گی وہ ترقی نہیں کرسکتی۔ ترقی کے لیے ضروری ہے کہ لوگ ایماندار اور محنتی ہوں اور بری باتوں سے بچتے ہوں، لیکن اس کے باوجود ترقی کے لیے اور بھی چیزیں ضروری ہیں۔ دنیاوی ترقی کے لیے وہ ہتھیار اور اوزار بھی ہونے چاہئیں جو دنیا والے استعمال کرتے ہیں۔ بندوق کے مقابلے کے لیے بندوق اور توپ کے مقابلے کے لیے توپ ہونا ضروری ہے۔ بھاپ سے چلنے والے تیز رفتار بحری جہاز ہونے چاہئیں۔ بادبان سے چلنے والے جہاز ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے اگر

ہمارے دشمن کے پاس فوجوں کو لے جانے کے لیے ریلیں اور موٹریں ہیں تو ہمارے پاس بھی ریلیں اور موٹریں ہونی چاہئیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ دشمن ریل کے ذریعے فوج بھیجے اور ہم گھوڑوں پر جائیں اگر ایسا ہوگا تو دشمن مورچہ پر پہنچ کر قبضہ کر لے گا۔ اور ہم پہنچ بھی نہیں سکیں گے۔ پھر توپوں، بحری جہازوں وغیرہ کو بنانے کے لیے کارخانے بھی ہونے چاہئیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس سائنسدان اور انجینئر ہوں اور ہمارے مدرسوں میں سائنس اور انجینئری وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہو اور طب بھی پڑھائی جاتی ہو۔

ہمارے بزرگوں نے جو تحریکیں چلائیں ان میں انہوں نے ان باتوں کا خیال نہیں رکھا۔ یورپ والے ان تمام باتوں سے واقف تھے۔ ان کے پاس جتنی اچھی توپیں اور لڑائی کا دوسرا سامان تھا اور ان کی فوجیں جتنی اچھی طرح منظم ہوتی تھیں ان کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے صرف تین ہزار فوج سے سراج الدولہ کی ستر ہزار فوج کو شکست دی اور سمرقند کے پاس روسیوں کی ڈیڑھ ہزار فوج نے ازبکوں کی تیس ہزار فوج کو شکست دے دی۔

جدید افکار

ہمارے ان بزرگوں نے ان باتوں پر سوچا ہی نہیں اور چونکہ یورپ سے ان کا زیادہ واسطہ نہیں پڑا، اس لیے وہ یورپ کی ترقی اور عروج کے اصل اسباب کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ ان کو اس بات کا خیال بھی نہیں آیا کہ تجدید دین اور اسلام کے غلبے کے لیے صرف علوم دینی کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کرنا کافی نہیں بلکہ ان جدید علوم وفنون کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے جن کی بدولت یورپ کی قومیں اتنی طاقتور بن گئی تھیں کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں ساری اسلامی دنیا پر چھا گئیں۔ عالم اسلام کی اس ضرورت کی طرف ان علماء اور مفکرین نے توجہ دلائی جن کا یورپ سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ اور جنہوں نے یورپ جا کر وہاں کے علوم وفنون کا مطالعہ کر کے یورپ کی ترقی کے اسباب معلوم کیے۔ مسلمان قوموں میں یورپ سے سب سے قریب عثمانی ترک تھے اس لیے انہوں نے ہی سب سے پہلے یورپ سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ عثمانی سلطنت کے ان سفیروں میں احمد رسمی (۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۳ء) اور یری سیکز چلیپی محمد متوفی ۱۷۳۲ء کے نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انہوں نے آسٹریا، جرمنی اور فرانس کے بارے میں

جہاں وہ سفیر بن کر گئے پہلی مرتبہ اپنے تاثرات کتابی شکل میں لکھے۔ یورپ سے مسلمانوں کو قریب لانے میں ان یوروپی نومسلموں کا بھی حصہ ہے جو یورپ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے عام مسلمانوں کی نسبت یورپ سے زیادہ واقف تھے۔ اسی قسم کے نومسلموں میں ہنگری کا ایک شخص ابراہیم متفرقہ (۱۶۷۴ء تا ۱۷۴۵ء) بھی تھا۔ استنبول میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ اسی نے ۱۴ دسمبر ۱۷۲۷ء کو قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مغربی ماخذ کی مدد سے جغرافیہ، ریاضی اور علم طبیعیات پر کتابیں بھی لکھیں۔ اس کی سب سے اہم کتاب ''اصول الحکم فی نظام الامم'' ہے جس میں اس نے عثمانی سلطنت کے سیاسی اور فوجی نظام کو یورپ کے نمونے پر ڈھالنے کی سفارش کی۔

ان ابتدائی کوششوں کے بعد ہمارے سامنے وہ لوگ آتے ہیں جنھوں نے یورپ کی ترقی کے اسباب کا زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان میں تونس کے خیر الدین پاشا اور مصر کے طہطاوی کے نام ممتاز ہیں۔ یہ دونوں ایک طرف اسلامی علوم سے واقف تھے اور دوسری طرف یورپ کا بھی قریب سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کو ایسے اہل علم کی ضرورت ہے جو ایک طرف جدید علوم اور جدید مسائل سے واقف ہوں اور دوسری طرف دینی علوم پر بھی ان کی نظر ہو۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ اسلامی ممالک میں ملوکیت اور استبدادی نظام کی جگہ نمائندہ حکومت کو لینی چاہیے جو قانون اور شوریٰ کی پابند ہو۔ انہوں نے اجتماعی عدل کی اہمیت بھی واضح کی اور یورپ سے ان تمام علوم اور فنون کو حاصل کرنے کی حمایت کی جو اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی زمانے میں ترکی میں ضیاء پاشا اور نامق کمال نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اسلامی ہند میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ تا ۱۸۹۸ء/۱۳۱۵ھ) نے اور روس میں شہاب الدین مرجانی (۱۸۱۵ء تا ۱۸۸۹ء) نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور تعلیمی نظام میں انقلابی اصلاحات لانے کی ضرورت واضح کی، لیکن انیسویں صدی میں جس عظیم شخصیت نے مسلمانوں کے سیاسی اور اجتماعی مسائل پر گہری بصیرت کا اظہار کیا اور جو جدید علوم اور دینی علوم دونوں پر یکساں طور پر قادر تھا وہ جمال الدین افغانی ہیں۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء/۱۲۵۴ھ تا ۱۸۹۷ء/۱۳۱۴ھ)

جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء/۱۲۵۴ھ میں افغانستان میں پیدا ہوئے۔ امیر دوست محمد

خاں اور اس کے بیٹے اعظم خاں کے زمانے میں وزیر بنے تھے اور افغانستان کی سیاست میں حصہ لیا۔ ۱۸۶۹ء میں انہوں نے کابل چھوڑ دیا اور ہندوستان اور مصر میں مختصر قیام کے بعد ۱۸۷۰ء میں ترکی پہنچے جہاں وزیر اعظم عالی پاشا نے ان کا خیر مقدم کیا، لیکن ان کے انقلابی خیالات کو وہاں کے تنگ نظر علماء برداشت نہ کر سکے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور ملک چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اب جمال الدین افغانی مصر آ گئے جہاں ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۹ء تک قیام رہا۔ اس کے بعد خدیو توفیق نے جس کو تخت دلانے میں جمال الدین افغانی کا بڑا حصہ تھا ان کو مصر سے جلا وطن کر دیا۔ اب جمال الدین افغانی ہندوستان آ گئے۔ تقریباً دو سال تک حیدر آباد دکن میں رہے اور مسلمانان ہند کی رہنمائی کا کام انجام دیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا جہاں سے وہ ۱۸۸۳ء میں لندن اور پھر پیرس گئے۔ پیرس سے ''العروۃ الوثقیٰ'' نامی ایک رسالہ جاری کیا جس نے عالم اسلام کی بیداری اور رہنمائی میں بڑا حصہ لیا۔ ۱۸۸۶ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کی دعوت پر ایران گئے، لیکن جلد ہی ایران چھوڑنا پڑا۔ اب وہ روس چلے گئے جہاں ۱۸۸۹ء تک قیام رہا۔ روسی حکومت اپنی مسلمان رعایا کو قرآن مجید چھاپنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، جمال الدین افغانی نے کوشش کر کے مسلمانوں کو یہ حق دلایا۔ اس کے بعد ناصر الدین شاہ قاچار کی دعوت پر وہ پھر ایران چلے گئے جہاں ۱۸۹۱ء تک قیام رہا، لیکن اس مرتبہ شاہ ایران کے حکم پر ان کو گرفتار کر کے ایران سے نکال دیا گیا۔ جمال الدین افغانی اب لندن چلے گئے جہاں سے سلطان عبد الحمید خاں کی دعوت پر ۱۸۹۲ء میں استنبول پہنچے اور وہیں ۹۔ مارچ ۱۸۹۷ء/۱۳۱۴ھ کو انتقال کیا۔

جمال الدین افغانی کی علمی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ دینی علوم اور جدید فلسفہ و حکمت پر بھی گہری نظر تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ حریت فکر کے علمبردار تھے اور استبدادی نظام کے سخت مخالف، یہی وجہ ہے کہ ان کا مصر میں خدیو اسمٰعیل، خدیو توفیق سے، ایران میں ناصر الدین شاہ قاچار سے اور ترکی میں سلطان عبد الحمید سے نباہ نہ ہو سکا۔ یہ حکمران ان کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور جمال الدین افغانی کے پیش نظر عوام کا مفاد ہوتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے، وہ مصر ایران اور ترکی سے بار بار جلا وطن کیے گئے۔

جمال الدین افغانی مغربی استعمار خاص طور پر انگریزی استعمار کے سخت دشمن تھے۔ یہی

وجہ ہے کہ برطانوی علاقوں میں ان پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ وہ مغرب کی محکوم مسلمان قوموں میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اس سے کام لے کر مغربی استعمار کا مقابلہ کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اتحاد اسلام کے بھی بہت بڑے داعی تھے۔ وہ تمام مسلمانوں کو مغربی استعمار کے خلاف متحد کرنا چاہتے تھے۔ ایران، ترکی اور مصر کی قومی تحریکوں پر ان کے گہرے اثرات پڑے۔ ترکی کے پہلے قوم پرست شاعر محمد امین یورداکل (Yurdakul) نے ترکی میں قومی شاعری کا آغاز ان ہی کے زیر اثر کیا۔ مصر کے تمام قوم پرست رہنما جنہوں نے بعد میں برطانوی غلامی کے خلاف جنگ کی، ان کے شاگرد تھے۔ ایران میں دستوری انقلاب لانے میں بھی ان کی کوشش کا بڑا دخل ہے۔ ہندوستان اور شمالی افریقہ کی تحریکوں پر بھی ان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی ایک ملک یا قوم کے رہنما نہیں تھے۔ وہ پوری اسلامی دنیا کے رہنما تھے۔ جمال الدین افغانی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے جدید دنیا کے اجتماعی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کرنے کا راستہ بتایا اور قدیم اور جدید انداز فکر کو ملا کر ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی انداز فکر کی بنیاد ڈالی۔

انیسویں صدی میں پیدا ہونے والی نظریاتی کشمکش نے بیسویں صدی میں کیا شکل اختیار کی اس سے ہم نے اس کتاب کے تیسرے حصے میں بحث کی ہے۔ اس جگہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ترکی میں ہمیں محمد جونپوری، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور شاہ اسمٰعیل شہید جیسی ہستیاں نظر نہیں آتیں اور نہ ہی وہاں نجد کی وہابی تحریک اور مغربی افریقہ کی فولانی تحریک کی طرح احیائے اسلام اور تجدید اسلام کی کوئی تحریک نظر آتی ہے۔ ترکی میں جدید افکار اور اصلاح کی انیسویں صدی میں جو سخت مزاحمت ہوئی اور ہر نئی چیز کی مخالفت کی گئی شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں اس قسم کی دینی و اصلاحی تحریکوں کا فقدان رہا۔ ایسی تحریکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ترکی میں اجتہاد کے راستے بند ہوگئے اور علماء سخت قسم کی تقلید اور ذہنی جمود کا شکار ہوگئے اور جب دینی راستے سے اصلاح کا دروازہ بند ہوگیا تو یہ کام بے دینی کے راستے سے انجام دیا گیا۔ قیام جمہوریت کے بعد ترک رہنماؤں کا مذہب دشمن طرز عمل اور زاویوں اور خانقاہوں کا بند کیا جانا دراصل ترکی کے علماء کی تنگ نظری کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ اگر وہاں اسلامی ہند اور عرب اور افریقی ممالک کی طرح تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں موجود ہوتیں تو شاید ترکوں کی نئی نسل کا ردعمل اتنا سخت نہ ہوتا۔ اس

معاملے میں ترکستان کی صورت حال ترکی سے بھی خراب تھی اور وہاں کے علماء تقلید، ذہنی جمود، تعصب اور تنگ نظری میں شاید ساری اسلامی دنیا سے بڑھ گئے تھے۔ ترکستان کے مسلمان ان کی اس کمزوری کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں۔

اہم واقعات کی تاریخیں

۱۷۹۳ء عثمانی فوجوں کے لیے ''نظام جدید'' کا نفاذ جس نے عثمانی فوجوں کو یوروپی طرز پر منظم کرنے کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۰۰ء/۱۲۱۴ھ (۴۔مئی) کلکتہ فورٹ ولیم کالج کا قیام۔ اردو میں کتابوں کے ترجمہ کا آغاز۔

۱۸۱۰ء مولوی اکرم علی نے کلکتہ سے پہلا اردو اخبار جاری کیا۔

۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔

۱۸۱۶ء استنبول میں عربی کا پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ ترکی زبان کا چھاپہ خانہ ۱۷۲۷ء میں قائم ہو چکا تھا۔

۱۸۲۲ء باب عالی (استنبول) میں شعبہ ترجمہ قائم ہوا۔ بولاق (قاہرہ) میں محمد علی نے چھاپہ خانہ قائم کیا جہاں سے بائیس سال میں ۲۴۳ کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۸۳۱ء میں ترکی زبان کا پہلا اخبار تقویم وقائع شائع ہوا۔

۱۸۳۶ء دہلی سے مولوی باقر علی نے دہلی اردو اخبار جاری کیا جو اردو کا دوسرا اخبار تھا۔

۱۸۳۹ء (۳۔نومبر) ترکی میں تنظیمات کے نام سے اصلاحات کا اعلان اور مغربی طرز کے رشدیہ مدرسوں کا آغاز۔

۱۸۴۰ء استنبول سے ''جریدہ حوادث'' جاری ہوا۔

۱۸۴۷ء بیروت میں مسیحی باشندوں نے مغربی افکار کے فروغ کے لیے سوسائٹی آف آرٹس اینڈ سائنس قائم کی۔

۱۵۸۰ء استنبول میں انجمن دانش قائم ہوئی۔ مقصد مجوزہ یونیورسٹی کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری تھا۔ بیروت میں مسیحی باشندوں نے اورینٹل سوسائٹی قائم کی۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان آذربائیجان کے ادیب فتح علی اخوندزادہ نے پہلی مرتبہ ڈرامے لکھے۔

۱۸۵۷ء دمشق میں ''جامعہ علمیہ السوریہ'' کا قیام۔

۱۸۵۹ء استنبول سے ''ترجمان احوال'' کے نام سے آزاد اخبار کا اجراء۔

۱۸۶۰ء تونس میں احمد بے نے ''آئین'' کا اعلان کیا جو اسلامی دنیا کا دَورِ جدید میں پہلا آئین ہے۔

۱۸۶۱ء استنبول میں جمعیت علمیہ عثمانیہ قائم ہوئی۔ شناسی نے ''تصویرِ افکار'' جاری کیا جو نامق کمال کی ادارت میں ترکی میں سیاسی اور علمی نشاۃ ثانیہ کا اولین نقیب بن گیا۔

۱۸۶۳ء سرسید نے غازی پور میں علمی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

۱۸۶۳ء استنبول میں دارالفنون کے نام سے پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی اور ۱۸۶۹ء میں اس نے باقاعدہ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔

۱۸۶۴ء نامق کمال نے ''تصویرِ افکار'' کی ادارت براہ راست سنبھال لی۔

۱۸۶۵ء ترکی میں وزارتِ تعلیم میں ترجمہ کا شعبہ قائم ہوا۔ ماہ جون میں ''نوجوان عثمانیوں'' کی انجمن قائم ہوئی جو آئینی اصلاحات کی علمبردار تھی۔

۱۸۶۶ء میں بیروت میں مسیحی باشندوں نے کالج قائم کیا۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی ۱۵۔محرم ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

۱۸۶۷ء خیرالدین پاشا نے ''اقوم المسالك فی معرفة احوال الممالك'' لکھی۔ اس کتاب نے طہطاوی اور کواکبی کو بھی متاثر کیا۔

۱۸۶۸ء نامق کمال نے پیرس سے ''حریت'' جاری کیا۔

۱۸۶۹ء طہطاوی کی کتاب ''مناہج'' شائع ہوئی جس میں جاگیرداری نظام پر پہلی مرتبہ تنقید کی گئی۔ وہ اس سے پہلے ''مرشد الامین اور تخلیص الابریز'' شائع کر چکے تھے جو مسلمانوں کے جدید افکار کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۸۷۰ء سرسید احمد خاں نے جدید معاشرہ کے قیام کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔

۱۸۷۱ء جمال الدین افغانی مصر آئے اور ۱۸۷۹ء تک قیام کرکے مصر میں برطانیہ کے خلاف قومی تحریک کو فروغ دیا۔

۱۸۷۲ء (۱۳۔جون) نامق کمال نے ''عبرت'' جاری کیا اور ایسے جدید معاشرے کے قیام پر زور دیا جو اسلامی بنیادوں پر قائم ہو۔ تنظیمات کے رہنماؤں پر شدید تنقیدیں کیں۔

۱۸۷۳ء نامق کمال کا مشہور ڈرامہ ''وطن'' اسٹیج ہوا۔ جس نے ترکی میں استبدادی حکومت کے خلاف شدید جذبہ پیدا کیا (یکم اپریل)۔

۱۸۷۶ء (۲۳۔دسمبر) عثمانی آئین کا اعلان۔ انفرادی آزادی، آزادیٔ ضمیر اور مساوی سلوک کی ضمانت دی گئی۔

۱۸۷۷ء ۸۔جنوری علی گڑھ کالج قائم ہوا جو بعد میں اسلامی ہند کی پہلی یونیورسٹی بنا۔

۱۸۸۳ء جمال الدین افغانی نے محمد عبدہٗ کے ساتھ مل کر لندن سے ''العروۃ الوثقیٰ'' جاری کیا جس نے اسلامی دنیا کی بیداری اور مغربی سامراج کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

۱۸۸۵ء روسی مسلمانوں کے رہنما اسمٰعیل گسرالی نے کریمیا سے اخبار ''ترجمان'' جاری کیا جس نے ترکی بولنے والے ملکوں کے مسلمانوں کی بیداری میں اہم حصہ لیا۔ اخبار کا نعرہ ''لسانی فکری اور عملی وحدت'' تھا۔ تعلیم میں اصول جدید کا حامی تھا۔

۱۸۸۸ء (۱۲۔اگست) ہنگری اور استنبول کے درمیان ریلوے لائن کا افتتاح۔

۱۸۸۹ء (۲۱۔مئی) انجمن اتحاد و ترقی کا قیام۔

۱۸۹۲ء استنبول سے انقرہ تک ریلوے لائن مکمل۔

۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا جس کا مقصد ایسی تعلیم تھا جو اسلامی فکر کے ساتھ جدید ضرورتوں کی تکمیل کرسکے۔

۱۸۹۹ء ترکی نے جرمنی سے بغداد ریلوے تعمیر کرنے کا معاہدہ کیا۔

۱۹۰۰ء عبدالرحمن کواکبی کی کتابیں طبائع الاستبداد اور امم القریٰ قاہرہ سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں نے ترک دشمنی اور عرب قومیت کے جذبہ کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

کتابیات

(الف) اردو کتابیں

۱۔ تاریخ فیروز شاہی: ضیاء الدین برنی، ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور ۱۹۶۹ء (بلبن کے عہد سے فیروز شاہ تغلق کے دَور کے اوائل تک کی تاریخ ہے)

۲۔ تاریخ فیروز شاہی: شمس سراج عفیف، (فیروز شاہ تغلق کے دَور کی تاریخ ہے)

۳۔ منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی، ترجمہ محمود احمد فاروقی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء (محمود غزنوی سے اکبر تک کے دَور کی تاریخ ہے)

۴۔ تاریخ شیر شاہی: عباس خان شیروانی، ترجمہ مظہر علی خان ولا، سلمان اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء

۵۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ خواجہ عبدالحی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء (یہ کتاب محمود غزنوی سے اکبر کے عہد کے آخر تک شمالی ہند کی تاریخ کے علاوہ، کشمیر، سندھ، بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات، خاندیس اور دکن کی ریاستوں کی تاریخ کے لئے ایک اہم ماخذ ہے)

۶۔ منتخب اللباب: خافی خان، ترجمہ محمود احمد فاروقی، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء (حصہ اول: بابر سے جہانگیر تک، حصہ دوم: شاہ جہاں، حصہ سوم: اورنگ زیب، اور حصہ چہارم: اورنگ زیب سے محمود شاہ تک)

۷۔ اقبال نامۂ جہانگیری: معتمد خان، ترجمہ محمد زکریا مائل، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء

۸۔ تزک بابری: بابر، ترجمہ، رشید اختر ندوی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء

۹۔ ہمایوں نامہ: گلبدن بیگم، رشید اختر ندوی سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۶ء

۱۰۔ تزکِ جہانگیری: جہانگیر، ترجمہ، سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۰ء

۱۱۔ ہمایوں نامہ: جوہر آفتابچی، ترجمہ احمد الدین احمد۔ کاروانِ ادب کراچی ۱۹۰۱ء

۱۲۔ خلاصۃ التواریخ: سبحان رائے بٹالوی، ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور

۱۹۶۶ء (ہندوؤں کے دَور سے اورنگ زیب کے عہد تک کی شمالی ہند کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے)

۱۳۔ ماثر عالمگیری: محمد ساقی مستعد خاں، ترجمہ مولوی محمد فدا علی طلب، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۲ء

۱۴۔ سفر نامہ: ڈاکٹر برنیئر اردو ترجمہ، خلیفہ سید محمد حسین (برنیئر کے اس سفر نامہ کو نفیس اکیڈمی، کراچی نے ''شاہجہاں کے ایام اسیری، اور عہد اورنگ زیب'' کے نام سے شائع کیا ہے) ۱۹۶۰ء

۱۵۔ رقعات عالمگیر: ترجمہ شمس بریلوی، (سید نجیب اشرف ندوی کے مرتب کردہ اورنگ زیب کے خطوط کا مجموعہ ''رقعات عالمگیر'' کا ترجمہ ہے جو'' اورنگ زیب خطوط کے آئینے میں'' کے نام سے مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء)

۱۶۔ مقدمہ رقعات عالمگیر: سید نجیب اشرف ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستان (نجیب اشرف ندوی نے اورنگ زیب کے خطوط کی روشنی میں اورنگ زیب کے عہد شاہزادگی اور اس کے تخت نشینی تک کے حالات پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے)

۱۷۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر: شبلی نعمانی، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۶۰ء

۱۸۔ مآثر الامراء: صمصام الدولہ شاہنواز خاں، ترجمہ محمد ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ء

۱۹۔ تاریخ ہندوستان: مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی، مطبوعہ علی گڈھ، ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۹ء (یہ اردو زبان میں ہندوستان کی سب سے مفصل تاریخ ہے اور ہندوستان کی فارسی کی تمام قدیم تاریخوں کا نچوڑ ہے اور انگریزی مآخذ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ دس حصوں اور نو جلدوں میں ہے۔ جلد اول: عربوں کی آمد غزنوی دور غوری دور اور سلاطین غلاماں پر، جلد دوم: خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں کی تاریخ، جلد سوم: بابر، ہمایوں اور سوری خاندان، جلد چہارم: کشمیر، بنگال، جونپور، سندھ، مالوہ، گجرات اور سلاطین دکن، جلد پنجم: اکبر، جلد ششم: جہانگیر، جلد ہفتم: شاہجہاں، جلد ہشتم: اورنگ زیب اور جلد نہم: بہادر شاہ اول تا بہادر شاہ دوم کے حالات پر مشتمل ہے)

۲۰۔ آئینہ حقیقت نما: اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۸ء (عربوں کی آمد سے خاندان تغلق کے خاتمہ تک، اسلامی ہند کی تاریخ ہے اور اس نقطۂ نظر سے انتہائی اہم

ہے کہ غیر مسلم مورخین کے اعتراضات کا مدلّل جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے)

۲۱۔ بزمِ مملوکیہ: صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، (خاندانِ غلاماں کے دَور کی علمی وتمدنی تاریخ)

۲۲۔ بزمِ تیموریہ: صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ (سلاطین تیموریہ (ہندوستان) کی علمی سرپرستی کی تاریخ)

۲۳۔ بزمِ صوفیہ: صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ (ہندوستان اور پاکستان کے صوفیہ اور اولیاء اللہ کے حالات پر مشتمل ہے)

۲۴۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رُجحانات: خلیق احمد نظامی، (ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۰۸ء)

۲۵۔ عہد مغلیہ: صباح الدین عبدالرحمن (ہر دَور کی خصوصیات اسی دَور کے مورخین کی تحریروں کے اقتباسات دے کر واضح کی گئی ہیں)

۲۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء (تعلیم، کتب خانے، خطاطی، کاغذ سازی اور شہربانی کی تاریخ سے متعلق قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے)

۲۷۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: صباح الدین عبدالرحمن، (دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء)۔ پارچہ بافی، ملبوسات، زیورات، موسیقی، مصوری اور تہواروں کے حالات پر مشتمل ہے)

۲۸۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک: صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۰۸ء (تیموری دَور سے پہلے سلاطین دہلی کے عہد کی تمدنی تاریخ ہے)

۲۹۔ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں: سید ابوظفر ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۶۲ء

۳۰۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں: محب الحسن، ترجمہ دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۶۷ء

۳۱۔ دکن کی سیاسی تاریخ: سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۶۹ء (دورِ مغلیہ کے آغاز، زوال اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کے حالات میں اردو میں سب سے اچھی اور فکر انگیز تاریخ ہے)

۳۲۔ تاریخ دعوت وعزیمت: ابوالحسن علی ندوی، حصہ دوم وسوم (دارالمصنفین ،اعظم گڈھ)

۳۳۔ آبِ کوثر: شیخ محمد اکرام، فیروزسنز، لاہور ۱۹۰۲ء

۳۴۔ رودِکوثر: شیخ محمد اکرام، تاج آفس، کراچی

۳۵۔ موجِ کوثر: شیخ محمد اکرام، فیروزسنز، لاہور

(شیخ محمد اکرام کی یہ تینوں کتابیں اسلامی ہند کے علمی وادبی تاریخ اورصوفیائے کرام کی دینی خدمات کے مطالعہ کے لئے بہت مفید ہیں۔ یہ اسی قسم کی ہیں جیسی صباح الدین احمد کی بزم مملوکیت، بزم صوفیہ اور بزمِ تیموریہ وغیرہ۔ صباح الدین احمد صاحب کی کتابوں میں اگرچہ معلومات کی کثرت ہے تو شیخ محمد اکرام صاحب کی کتابوں کا اندازِ تحریر فکرانگیز ہے۔ ان میں تجزیہ وتحلیل بھی ہے۔ جس کی صباح الدین احمد صاحب کی کتابوں میں کمی ہے)

۳۶۔ سفرنامہ ابن بطوطہ: ترجمہ رئیس احمد جعفری۔

۳۷۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند: حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ چہارم، اور پنجم۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء (اسلامی ہند کی ادبی اور علمی تاریخ پر اس سے زیادہ جامع اور پُراز معلومات کتاب ابھی تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔)

۳۸۔ خسرو شیریں مقال: اقبال صلاح الدین، میری لائبریری، لاہور ۱۹۷۰ء

۳۹۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ابوالحسنات ندوی، دارالمصنفین ،اعظم گڈھ، ۱۹۳۶ء

۴۰۔ اطبائے عہد مغلیہ: حکیم سید علی کوثر چاندپوری: ہمدرد اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۰ء

۴۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: خلیق احمد نظامی، علی گڑھ

۴۲۔ فقہائے ہند، حصہ اول، حصہ دوم: محمد اسحاق بھٹی، (ادارہ ثقافتِ اسلامی، لاہور)

۴۳۔ تجدید واحیائے دین: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۶ء)

۴۴۔ تنقیحات: سید ابوالاعلیٰ مودودی (مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، لاہور) چوتھا ایڈیشن

۴۵۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر (غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

۴۶۔ جماعت مجاہدین: غلام رسول مہر (غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

۴۷۔ سرگذشت مجاہدین: غلام رسول مہر، (غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

۴۸۔ تاریخ سندھ، حصہ پنجم وششم (عہد کلہوڑا) غلام رسول مہر، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۰۸ء)

۴۹۔ کمپنی کی حکومت: باری، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۶۹ء

۵۰۔ تاریخ سلطنت خداداد، میسور، بنگلور، ۱۹۳۹ء۔ محمود بنگلوری۔
(اردو میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سب سے مفصل اور مستند حالات اِسی کتاب میں ہیں)

۵۱۔ تاریخ جنوبی ہند (بہمنی سلطنت اور وِجیا نگر کی تاریخ ہے) محمود بنگلوری۔

۵۲۔ ثقافتِ پاکستان: شیخ محمد اکرام، ادارہ مطبوعات پاکستان۔ کراچی۔

۵۳۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، (اردو ترجمہ کراچی یونیورسٹی)

۵۴۔ دربارِ اکبری: محمد حسین آزاد۔

۵۵۔ نقوش: لاہور نمبر، لاہور ۱۹۶۲ء

۵۶۔ تاریخ اسلام حصہ سوم: اکبر شاہ خاں (چنگیز خاں اور ایل خانی سلاطین کے حالات میں مفید ہے)

۵۷۔ تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولان: ایڈورڈ براؤن۔

۵۸۔ تاریخ ادبیات ایران حصہ چہارم: ایڈورڈ براؤن (صفوی اور قاچار دَور)
(یہ دونوں کتابیں سقوط بغداد کے بعد ایران کی سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ کے لئے انتہائی مفید ہیں۔ دونوں حصوں کا اردو ترجمہ ہوگیا ہے)

۵۹۔ چنگیز خاں: ہیرلڈ لیمب، ترجمہ محمد عنایت اللہ (دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

۶۰۔ تیمور: ہیرلڈ لیمب، ترجمہ محمد عنایت اللہ (دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

۶۱۔ شعر العجم حصہ دوم اور سوم: شبلی نعمانی (دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

۶۲۔ تاریخ بخارا: ویمبری، ترجمہ نفیس الدین احمد۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۵۹ء (ترجمہ میں خامیاں ہیں اور طباعت کی بھی غلطیاں ہیں، لیکن ازبکوں اور بعد کے دَور کے لئے اردو میں واحد ماخذ ہے)

۶۳۔ تاریخ الامت، حصہ ششم: اسلم جیراجپوری (ادارہ طلوع اسلام، کراچی) (نورالدین زنگی، ایوبی دور اور مملوک سلاطین کی تاریخ ہے)

۶۴۔ تاریخ عرب: حتی: اردو ترجمہ (مملوک دَور کی علمی اور اَدبی تاریخ پر آخر میں روشنی ڈالی گئی ہے)

۶۵۔ تاریخ شام: حتی، ترجمہ غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، ۱۹۶۸ء (اگرچہ یہ شام کی قبل از

اسلام کی تاریخ ہے، لیکن آخری حصہ مملوک دور سے شام کے فرانس کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے تک کے حالات پر مشتمل ہے)

۶۶۔ عربوں کی جہاز رانی: سید سلیمان ندوی۔ (جہاز ران، ابن ماجد کے حالات کا اردو میں واحد ماخذ ہے)

۶۷۔ افریقہ ایک چیلنج: عبداللہ المسدوسی۔

۶۸۔ تذکرۂ افریقہ: بریگیڈیر گلزار احمد۔

۶۹۔ تاریخ وتمدن انڈونیشیا: نور احمد قادری (شائع کردہ انڈونیشی سفارتخانہ کراچی)

۷۰۔ انڈونیشیا: شاہد حسین رزاقی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۴ء

۷۱۔ دولتِ عثمانیہ (دو جلد) محمد عزیر، دار المصنفین، اعظم گڑھ، جلد اول ۱۹۳۹ء اور جلد دوم ۱۹۴۳ء

۷۲۔ دولتِ عثمانیہ (دو جلد) جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد

۷۳۔ سلاطین ترکیہ: اسٹینلے سٹیلے لین پول، ترجمہ و حواشی از نصیب اختر، سعید اینڈ کمپنی کراچی ۱۹۷۰ء

۷۴۔ ترکانِ عثمانی: محمد صابر، کراچی ۱۹۶۷ء (عثمان خاں سے بایزید یلدرم کے عہد تک دولت عثمانیہ کی تاریخ ہے جو ترکی ماخذ کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ آخر میں عثمانیوں کے نظام سلطنت پر ایک مستقل باب ہے)

۷۵۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش: خالدہ ادیب (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین، مکتبہ جامعہ، دہلی)

۷۶۔ جرمانوس: عبدالکریم (جولیس)، ترکوں کی اسلامی خدمات۔ ترجمہ سید وہاج الدین، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن ۱۹۳۲ء (ترکی کے نظامِ حکومت تمدن اور علمی و ادبی تاریخ کے لئے بیش بہا ماخذ ہے)

۷۷۔ محمد بن عبدالوہاب: مسعود عالم ندوی، مکتبہ خدام ملت، کراچی ۱۹۴۹ء

۷۸۔ اسلام ایک نظریہ ایک تحریک: مریم جمیلہ، ترجمہ آباد شاہ پوری، مکتبہ یوسفیہ، لاہور ۱۹۶۹ء (محمد بن عبدالوہاب، سنوسی تحریک، شاہ ولی اللہ سید احمد شہید، سعید حلیم پاشا، سعید نورسی، جمال الدین افغانی اور رشید رضا مصری سے متعلق فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ ہے)

۷۹۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ابوالحسن علی ندوی (مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۴ء)

۸۰۔ چین و عرب کے تعلقات: بدرالدین چینی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۴۹ء

۸۱۔ مقالات شبلی: شبلی نعمانی، (دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

۸۲۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

(ب) فارسی اور عربی کتابیں

۱۔ طبقات ناصری: قاضی منہاج سراج، (مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، کتاب خانہ نورس، لاہور، ۱۹۵۲ء

۲۔ تاریخ حبیب السیر جلد سوم: خواندمیر (مطبوعہ ایران ۱۳۳۳ء شمسی)

۳۔ روضۃ الصفا: میر خواندند (نول کشور، لکھنؤ)

۴۔ منتخب التواریخ: معین الدین نطنزی (تہران ۱۳۳۶ء شمسی)

۵۔ تاریخ (ادبیات ایران): دکتر رضا زادہ شفق (تہران ۱۳۴۲ء شمسی)

۶۔ واقعات عالمگیری: عاقل خان رازی (مرتبہ محمد عبداللہ چغتائی، لاہور ۱۹۳۵ء) (ایک ہمعصر مؤرخ ہونے کی وجہ سے عاقل خان کی یہ کتاب اورنگ زیب کی تخت نشینی اور برادرانہ جنگ کا اہم اور مستند ماخذ ہے)

۷۔ معجم الانساب والاسرات الحاکمہ فی تاریخ الاسلامی: ازز رمباور

(د) انگریزی کتابیں

1. "The Mongol Empire."Michael prawdin: Allen and Unwin 1953.
2. "Mongols and Russia."George Vernadsky.
3. "Four Studies on the History of Central Asia" V.V. Barthold London 1956.
4. "Muslim World"Bartold Spuler" . Vol. I, II.
5. "A History of Russia"George Vernadsky:
6. "Siberia, its conquest and development". Yuri Semynov: (Hollis Carter, London)
7. "Russia in Asia"Alexis Krausse. London, 1899.
8. A History of the U.S.S.R, Vol. I, II. Mosoow, 1948.
9. "History of Persia"Sykes, Sir percy: Vol, I, II.
10. "History of Afghanistan",, ,, ,, :
11. A Short History of Pakistan (four volumes). Karachi University. 1967.
12. History of the Freedom Movement, Vol I, II Pakistan Historical Societry, Karachi, 1960.
13. "The Administration of the Mughal Empire' I H. Qureshi: . Karachi Universtry 1966
14. "The Administration of the sultanate of Delhi" I.H.Qureshi:
15. "The Modern Age" Philip Van Ness Myress: Ginn and co. London, 1904.

(ب) ترکی زبان کی کتابیں

1. Karadeniz Kuzeyindeki Turk kavimler ve Devletleri Akdes Nimet Kurat: (Turk Tarih Kurumu, Ankara, 1972)

(بحیرۂ اسود کے شمال کے ترک قبائل اور ترک حکومتیں: اقدس نعمت کُرات، (آلتن اوردہ، کازاق استرخان اور کریمیا کے ترکوں کی تاریخ ہے۔)

2. Kazan Turkleri: Taymas, Abdullah Battal: (Turk Kulturunu Arastirma Enstitusu Yayinlari, Ankara, 1966)

(کازان کے ترک: عبداللہ بطال تایماس: (کازان کے ترکوں کی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ ہے۔)

3. Dogu Turkistan Davasi: Alptekin, Isa Yusuf: (Otag Yayinlari, Istanbul, 1973)

(مشرقی ترکستان کا دعویٰ: عیسیٰ یوسف الپ تکین (چینی ترکستان کی تاریخ ہے۔)

4. Tarih, I, II, III(Atlas Yayinevi, Istanbul, 1972). :Emin Oktay:

(تاریخ امین اوقتائی۔ (حصہ اول، دوم، سوم)

5. Osmanli Turklerinde Ilim: Adnan Adivar: (Remzi Kitabevi, Istanbul, 1970)

(عثمانی ترک اور علوم حکمت: عدنان آدیوار)

6. Koci Bey Risalesi(Zuhuri Danisman,Istanbul,1972)

(قوچی بے کا رسالہ)

7. Turkiye de Cagdas Dusunco Tarihi: Ulkeu, Hilmi Ziya: . (Irfan Yayinevi, Konya, 1966).

(ترکی ادبیات کی تاریخ: وصفی ماہر کوجاتورک۔)

9. Necatigil, Behcet: Edebiyatimizda Isimler Sozlugu. (Varlik Yayinlari, Istanbul, 1972)

ہمارے ادبی ناموں کی لُغت: بہجت نجاتی گل (ترک مصنفین اور شاعروں کا تذکرہ ہے۔)

10. Buhranlarimiz:Said Halim Pasa: (Tercuman Gazete, Istanbul) Istanbul.

ہمارے بُحران: سعید حلیم پاشا (سعید حلیم پاشا کی تحریروں کا مجموعہ)

11. Osmanli Seyhulislamlari: Altunsu, Abdulkadir: Ankara, 1972)

عثمانی سلطنت کے شیخ الاسلام: عبدالقادر آلتونسو۔ (سوانح عمریاں)

12. Demokrasimizin Kronolojisi: Karaibrahimoglu, Sacit: . (Ankara, 1972).

(ہماری جمہوریت کے واقعات کی تاریخ وار ترتیب: ساجد قرہ ابراہیم اوغلو)

13. Necla Islami Turk Edebiyati:Pekolecay. (Islam Medeniyeti Yayinlari, Istanbnl. 1968).

(ترکوں کا اسلامی روپ: نجلا پیکولجائے۔)

14. Hayat Turkiye Ansiklopedisi. Istanbul.

(حیات ترکیہ انسائیکلوپیڈیا)

15. Atsiz Evliya Celebden Secmeler (Deviet Kitaplari, Istanbul, 1971).

(اولیا چلپی کے سفرنامہ سے انتخاب: اُتسز۔)

16. Evliya Celebi: Cafer Erkilic: (Varlik Yayinlari, Istanbul. 1969).

(اولیا چلپی: جعفر ارقلیچ۔)

17. Islam Ansiklopedisi.

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

18. Turk Kulturu, Ankara.

(ترکی ثقافت: یہ رسالہ ترکی ثقافت کی تحقیق کا ادارہ شائع کرتا ہے۔)

ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ سوم)

مؤلف: ثروت صولت

یہ اسلامی دنیا کے دَورِ جدید کی تاریخ ہے جو اس طرح مرتب کی گئی ہے:

☆ انڈونیشیا اور ملائیشیا: مغربی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک۔

☆ اسلامی ہند اور پاکستان: برطانوی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک۔

☆ افغانستان: نادر شاہ سے موجودہ دَور تک۔

☆ ایران: رضا شاہ پہلوی سے موجودہ دَور تک۔

☆ ترکی: قیامِ جمہوریت کے بعد سے موجودہ دَور تک۔

☆ عراق، شام اور فلسطین: عربوں کی بغاوت کے بعد سے موجودہ دَور تک۔

☆ عرب: جدید سعودی مملکت کا قیام یمن، عمان اور عرب امارتوں کے حالات موجودہ دَور تک۔

☆ مصر اور سوڈان: برطانوی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک۔

☆ شمالی افریقہ: فرانس اور اٹلی کے تسلط کے بعد سے لیبیا، تونس، الجزائر، مراکش اور ماریطانیہ کی تاریخ موجودہ دَور تک۔

☆ افریقہ: فرانسیسی اور برطانوی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک۔ سینے گال، گنی، مالی، نائیجر، نائیجیریا، چاڈ اور صومالیہ کی تاریخ۔

☆ ترکستان اور روس: چینی اور روسی تسلط کے بعد سے موجودہ دَور تک مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی داستان۔

مختصر یہ کہ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ 'حصہ سوم' جدید دنیائے اسلام کی ایک ایسی تاریخ ہے جس میں اسلام اور مغرب کی نظریاتی کشمکش اور ہر مسلم ملک کی سیاسی تاریخ کے علاوہ اس کے سماجی، معاشی اور علمی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آبادی اور پیداوار وغیرہ سے متعلق ضروری اور دلچسپ اعداد و شمار، نقشے اور خاکے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

عالمِ اسلام کے معروف مصنفین کی چار مقبول ترین کتابیں

خطبات

اسلام اور ایمان کی جامع تعریف اور عبادات کی منفرد تشریح
ایسی کتاب جس نے لاکھوں زندگیوں کو تبدیل کر دیا

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

محمدِ عربی ﷺ

اسوۂ رسول ﷺ کا تحریکی انداز میں مطالعہ
سیرت پاک ﷺ کی مقبول ترین کتاب

محمد عنایت اللہ سبحانی

راہِ عمل

احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں راہنمائی کا انمول خزینہ
مختصر مگر جامع تشریح

مولانا جلیل احسن ندوی

آدابِ زندگی

بندگانِ خدا کے دلوں میں اسلام کا جذبۂ شوق
وعقیدت بیدار کرنے کے لیے قرآن اور حدیث
کی روشنی میں کامیاب زندگی کے سنہری اصول
ہر طبقہ فکر میں یکساں مقبول

مولانا محمد یوسف اصلاحی

- ★ چاروں کتابیں یکساں سائز، خوبصورت ٹائٹل، امپورٹڈ کاغذ، معیاری طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ
- ★ عید، شادی اور دیگر خوشی کے مواقع پر خوبصورت تحفہ

: 978-969-423-062-7
U00309

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان 2-042-35252501